

TAJALLY DEOBAND U. P.

جانب اول



ایڈیٹر: عامر عثمانی

عقل آنکھ پر
اور وحی روشنی



تاریخ میں مسیحیت

3-

سالانہ
204
44

فہرست، اگست و ستمبر ۱۹۷۲ء

ماہنامہ تجلی دیوبند

چھبیسویں سال کا چوتھا اور پانچواں شمارہ

ایڈیٹر: عامر عثمانی

۴	ادارہ
۸	عامر عثمانی
۱۰	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۱۳	عامر عثمانی
۱۹	عامر عثمانی
۳۶	"
۳۷	"
۴۳	"
۵۷	عبد الکریم پارکھ
۵۹	عامر عثمانی
۷۱	حافظ ابو محمد امام الدین
۷۵	عامر عثمانی
۸۳	ملا ابن العربی
۹۹	عامر عثمانی
۱۱۲	عبدالمستین نیاز
۱۱۳	محمد سلیمان میرٹھی

احوال واقعی
صلی اللہ علیہ وسلم
تفہیم القرآن
شہرچ کی بحث
تجلی کی ڈاک
غزل
تفسیر ماجدی
تین طلاؤں کے بارے میں مسئلہ
اور صحابہؓ کے فتوے
کامیاب نکاح
مدیر زندگی کا مراسلہ اور اس کا جواب
عجائب اسلامی کے خلاف جمعیت علماء کی نئی فتنہ پردازی
ایک ہندو دوست کا مکتوب دراصل جواب
مسجد سے سچائے تک
کھرے کھوٹے
غزل
مولانا اسحاق علی کے نام

امریکہ - انگلینڈ - ناٹجیریا - کینڈا -
فرانس - انڈونیشیا اور ملینیا سے
بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ -
بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ -
بحرین افریقہ - سعودی عرب قطر
وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک
ایک پونڈ اور دس شلنگ - بذریعہ
ہوائی ڈاک تین پونڈ -



اس دائرے میں شرح نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پر چھپ رہا آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا دی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ دی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرق ہو گا۔
دی پی سترہ روپے کا ہو گا۔ منی آرڈر بھیج کر آپ دی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

سالانہ قیمت بیس روپے

اس شمارے کی قیمت تین روپے

اسلامی پریس - دیوبند

احوال واقعی

پچھلی اشاعت میں "نوسو کی چوری" کا عنوان آپ دیکھ چکے۔ کہانی لمبی تو نہیں مگر ایسی پہلو دار ضرور ہے کہ کوئی افسانہ نگار اس پر اچھا خاصہ طویل افسانہ لکھ سکتا ہے مگر ہم سادگی اور اختصار سے کام لیں گے۔ مقصد بیان نہ کسی کی رسوائی ہے نہ اپنے نقصان کا نوہ۔ بیان کا محرک بس یہ خیال ہے کہ ممکن ہے یہ واقعہ پڑھ کر ہمارا کوئی اور بھائی شکار ہونے سے بچ جائے۔

۱۷ جون کی صبح میں ایک صاحب زادے تشریف لائے۔ نیلے ڈبلے۔ عمر ۲۵ سال رہی ہوگی۔ قد چھوٹا۔ رنگ سیاہی مائل گندمی۔ ہونٹ باریک۔ پیشانی تنگ۔ مجموعی چہرہ تقریباً چوچ نما تھا۔ لباس وہی پستلون اور پوسٹرٹ۔ فرمایا کہ سردار جعفری کا لڑکا ہوں۔ علی جاوید جعفری نام ہے۔ اردو بلٹر میں کام کرتا ہوں۔ جالندھریا شاید کسی اور مقام کا نام لیا، کسی شاعرے میں گیا تھا لوٹتے ہوئے سہارنپور پھیرا۔ وہاں سے آپ کی ملاقات کا شوق لے آیا ہے۔

ہمارے لئے اجنبی ملاقاتیوں کی آمد و رفت کوئی غیر معمولی چیز نہیں۔ خاطر تواضع کی۔ اتفاق سے گھر میں تو عیال میں چندا ایسے عزیز بھی آئے ہوئے تھے جو جوں سال ہیں اور شعرو سخن کا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ ان سے گھل مل گئے اور پھر اسی شام میں ایک شہری نشست کا انعقاد ہوا۔ غریب خانے کے صحن یاد لاں میں ایسی نشستیں بعض شوقین اعزاز سال میں دو چار بار کرتے ہی رہتے ہیں۔

رات کو تین بجے نشست برخواست ہوئی اور جاوید میاں کو ہم نے مردانہ مکان میں لٹایا۔ یہاں اور کوئی نہ تھا۔ خود ہم اندر سوئے۔ سچویشن کچھ ایسی ہے کہ مردانے اور زنانے کے درمیان پردے کی دیوار ہے اور اس کے علاوہ ایک دروازہ جسے بند کر لیا جائے تو باہر سے اندر نہیں آیا جاسکتا۔ اگر قلب میں ادنیٰ سا بھی وسوسہ ہوتا کہ صبح جڑا دیا جائے تو یہ دروازہ اندر سے بند کر لیا جاتا مگر کوئی وجہ ایسے وسوسے کی نہیں تھی۔ مگر میں میں ہماری عادت یہ ہے کہ کمرہ اتار کر کھوٹی پرٹانگ تیتے ہیں۔ اس میں ہمیشہ ایک بغلی جیب ہوتی ہے جس میں بہت کچھ سما جاتا ہے آج اس میں کم و بیش تیرہ سو روپے تھے۔ ان روپوں کو کاغذ کی مطلوبہ رقم جمع کرنے کے سلسلے میں بینک جانا تھا مگر ضرورت میں بینک کا وقت گزر گیا۔ سوچا کہ کل داخل کر دوں گے۔ دن کا بڑا حصہ صاحب زادے کی معیت میں گزرا اور مختلف قسم کی ضروریات میں جیب سے کچھ پیسے نکالتے ہوئے یہ رقم موصوف کی نظروں میں یقیناً آگئی۔ تقریباً ساڑھے تین سو تو خرچ ہو گئے تھے باقی جیب ہی میں تھے۔

ہماری عادت ہے خواہ کسی وقت سوئیں صبح طلوع آفتاب سے قبل آنکھ ضرور کھلتی ہے۔ آج بھی کھلی۔ پونے پانچ بج رہے تھے۔ کمرہ نہ پہنا۔ پہننے ہی منکف ہو گیا کہ جیب خالی ہے۔ اس میں صرف رقم ہی نہ تھی اور بھی بہت سے کاغذات تھے اس لئے خاصی وزندار تھی۔ بے وزنی کا احساس ہوتے دیر کیا لگتی۔ قدم بڑھا کر مردانے میں پہنچے۔ دبا فقط آٹو پول رہا تھا۔ صاحب زادے نے کادروازہ اوپر نیچے کے پھانک کی کھڑکی کھول کر وہاں تشریف لے جا چکے تھے۔

داستان ختم ہو گئی۔ شکر کا پہلو یہ ہے کہ اسی دن جیب میں تقریباً سات ہزار کے ڈرافٹ بھی موجود تھے۔ پانچ ہزار کا ڈرافٹ تو تھا ایک ہی کم فرمایا سعودی عرب بھیجا تھا۔ بینک کا وقت شکل گیا تو بغیر کسی منطقی وجہ کے ہم نے ان ڈرافٹوں کو جیب سے نکال کر پونہ ایک کھلی الماری میں رکھ دیا۔ یہ الماری ہمارے ادارتی کمرے میں ہے جو مردانے سے متصل

ہے کہ عادی مجرم ہیں ورنہ کسی نو مشق کے لئے یہ جہازات بڑی مشکل ہے کہ ایک قدم نہ مانے میں رکھ کر کھینچنی سے کرتا اُتار لے۔ اگر انھیں نیک تو متیق نہ ملی تو ڈر ہے کہ انجام بھیاناک ہوگا۔ وہ جس کے بھی صاحب زادے ہوں ان کے والد صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ اصلاح کی طرف توجہ فرمائیں۔ ابھی پانی شاید سرسے نہیں گزرا ہے۔

کاغذ کی کہانی

کوٹے کا کاغذ ہمیشہ ہی ملا کرتا تھا مگر اب کی اس نے بھی ایک چھوٹی سی کہانی کو جنم دیا۔ گورنمنٹ نے ایک تجارتی کارپوریشن کلکتہ اور بمبئی میں قائم کی ہے۔ ہمارے کوٹے کے کاغذات میں کلکتہ کا پتہ دیا گیا تھا۔ دہلی والے نیوز پرنٹ ڈیلر کے واسطے سے نصف سے کچھ زیادہ روپیہ کلکتہ روانہ کیا گیا۔ متوقع ہی تھا کہ کاغذ دہلی بھیجا جائے گا مگر خلاف توقع ہمارا دیکھن دیون بھیج دیا گیا۔ اگر کاغذ دیون کی شکل میں ہوتا تب تو یہ اچھا ہی تھا کہ دیون میں مل جائے مگر اب ہم نہیں رہیں دیونے جارہے ہیں اور سائز بھی مطلوبہ سائز سے خلافت ہے۔ لہذا رہیلیوں کو بہر حال دہلی ہی میں نکلتا تھا۔ اب اگر کارپوریشن کاغذ کی طرح بلٹی بھی دیون بند ہی کے کسی بینک میں بھجوا دیتی تو بلٹی فوراً وصول کر کے ہم دیکھن کو جوں کا توں دہلی واپس کر دیتے اور دیر باری فقط ساڑھے چار سو روپے کی ہوتی مگر بلٹی کو دہلی سے وصول کر کے دیون لانے تک دیکھن یوں ہی بند کھڑا نہیں رہ سکتا تھا کہ نیک دیونے کو دام کے انچارج صاحب نے قاعدہ بیان فرمایا کہ دیکھن کے رکھنے کا جرمانہ ایک سو ساڑھ روپے فی پوم ادا کرنا پڑتا ہے۔ اب سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ اسے خالی کر کے ہیل پلٹ فارم پر رکھ دیتے جاتیں۔

چند روز بعد بلٹی آئی۔ کہہ رہے کہ علاوہ کچھ ڈیمارچ بھی ادا کر کے مال چھڑایا گیا۔ اب لطف یہ تھا کہ مال گاڑی

ہے۔ صاحب زادے کو اگر علم غیب ہو تا تو اس الماری تک پہنچے اور ڈرافٹ اٹھانے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لیکن مشیت ایزدی کو ڈرافٹوں کی چوری منظور تھی ہی نہیں شاید اسی لئے اس نے ہمارے دیں ڈالا تھا کہ انھیں جیتے الگ کر دیں۔ صاف ظاہر ہے کہ چوسات ہزار کے نقصان سے بچ گیا ہو وہ نو سو ساڑھے نو سو کے نقصان پر ملول کیا ہوگا۔

بہر حال صاحب زادے اپنی آمد کو یادگار بنا کر شریف لے گئے۔ پچھلے ماہ یہ تفصیل بیان کرنا اس لئے خلاف مصلحت معلوم ہوا تھا کہ ہم نے واقعہ کے کچھ روز بعد جناب سردار جعفری کو ایک خط لکھا تھا۔ وہ ایک آل انڈیا شہرت کے بڑے شاعر ہیں۔ غالباً پدم شری کا خطاب بھی پائے ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ اگر واقعی وہ ایسے صاحبزادے کے والد ہیں تو یہ کوئی شریفانہ بات نہ ہوگی کہ ان کا نام نامی ایسے گھٹیا سلسلے میں لایا جائے۔ خط میں ہم نے واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ ان سے صرف اتنا دریافت کیا تھا کہ کیا واقعی وہ اس نام کے کسی بیٹے کے باپ ہیں اور اگر ہیں تو یہ بتایا جائے کہ ارجون میں بمبئی پایا جا رہا تھا یا باہر گیا ہوا تھا۔ یہ خط کل ۲۹ جولائی کو دیون آگیا ہے اور ڈاکخانے کا نوٹ یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا پتا نہیں چلا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سچائی کیا ہے۔ بعض خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک ذات شریف اپنے آپ کو جانشین اختر کا لڑکا بتا کر چھوٹا موٹا کھیل کچھ اور مقامات پر بھی کھیل چکے ہیں۔ کون جانے وہ یہی صاحب زادے ہوں یا کوئی اور بلند اختر۔ بہر کیف قدرت کا سبق ہم سر کے لئے اس طرح کے حوادث میں یہ ہے کہ زود اعتیاری سے بچو عقل استعمال کرو اور دوسروں کو یہ موقع مت دو کہ وہ تمہیں حلوے کی طرح حلق سے اُتار لے جائیں۔ اللہ تعالیٰ مذکورہ صاحبزادے کو نیک تو متیق دے۔ ہمارے معاملے میں انھوں نے جس جرات کا ثبوت دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا

ٹھیک کرے تو شاید ٹھیک ہو جائے لیکن ہر اوقات وہ ٹھیک سے ٹھیک کرتا ہے اور بعض اوقات تو ٹھیک ہی نہیں کرتا تو اب بھی مشکل اور ہنسنا بھی۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ طلاق نمبر کی تصحیح میں ہم نے غیر معمولی اہتمام کیا تھا مگر جیسے کے بعد مطالعہ کیا تو اچھی خاصی غلطیاں موجود۔ ان غلطیوں کی تصحیح کا اب بظاہر کوئی نتیجہ نہیں لیکن طلاق نمبر جو ٹھیک ایک اہم نمبر ہے اور بے شمار حضرات اسے محفوظ رکھیں گے اس لئے ہم ذیل میں "تصحیح الاغلاط" کا گوشوارہ پیش کئے دیتے ہیں۔ اس کے مطابق قلم سے غلطیاں درست کر لی جائیں۔ رنگ کھانے کے بعد آیا مگر آ تو گیا اسے بھی غنیمت ہی جانئے۔ تصحیح الاغلاط تجلی طلاق نمبر۔

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۲۲	۱	۲۹	بنت	بتہ
۲۹	۲	۱۹	خالی جگہ	اگر
"	"	۲۱	بہر	ہر
۳۶	۱	۲۰	یہ	x
۴۱	۱	۲۲	بلاشبہ اور	بلاشبہ صرف اور
۵۸	۲	۳۱	مالک	غالب
۷۴	۲	۹	قوالحافظہ	قوی الحافظہ
"	"	۲۸	متصنت	متعنت
"	"	۲۹	پائی جائے	پایا جائے
۹۹	۲	۲۹	-----	اور اس
۱۱۹	۱	۷	بیان میں ہے	بیان ہوا ہے
۱۲۲	۱	۲۳	مخالفت	ممانعت
۱۳۲	۱	۴	چھوڑ	چھوڑ کر

صفحہ ۱۳۲ پر کالم ۲ میں کچھ حروف مٹ گئے ہیں۔ صحیح عبارت یوں ہے۔
 "طاؤس کا بھی۔ باوجود ان کے زہر دوزخ اور کثرتِ تحدیث کے نفقہ اور اجتہاد میں یہ درجہ تسلیم نہیں کیا گیا۔"

لو ٹھیک ہی ان تاریخوں میں بند تھا۔ کاغذ دوبارہ بلی نوکر نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ لو ٹھیک کھلنے کے انتظار میں وہ دیر پڑا ہے تو کم و بیش ساٹھ روپے پورے ہو کر جانے لگے۔ جبکہ اور نگرانی لگ کر آئے۔ جمہور انرا سب روٹ کے ٹکڑوں کا سہارا لیا گیا اور دو کی جگہ پانچ خرچ کر کے یہ بلا ٹھی۔
 بلا تو فی الحال ٹل گئی لیکن یہ اندازہ فرمایئے کہ نصف رقم داخل کرنے کے وقت جو بھادو کار پوریشن نے بتایا تھا اب کاغذ روانہ کرتے وقت اس میں مجموعاً کم و بیش چار ہزار روپے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ریٹ بڑھ گئے ہیں۔ کہنا ٹھیک ہی ہو گا۔ اپنے دیس میں رواں دو سالوں میں جو فصل بہار سے زیادہ اہلپاتی ہے وہ گمرانی ہی کی فصل بہا ہے۔ لہذا اپنا فضل کرے۔ ہمیں نہ کسی سے شکایت ہے نہ نوحہ و تلام کرنے کی فرصت۔ جو کچھ بیان ہوا اسکا بیڑہ ہوا۔ حکومت بے چاری خود گونا گوں مشکلات کے جال میں ہے اور ہمارے اپنے اعمال بھی جتن جتن کر رہے ہیں کہ وہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

آگے کا نقشہ

الحمد للہ کاغذ کی فکر تو فی الحال ختم ہوئی۔ مگر تاخیر اتنی ہو گئی ہے کہ یہ شمارہ بھی ہم دو ماہ مشتمل کر رہے۔ گنت اور ستمبر۔ اس کے بعد سے ہمیں امید ہے کہ ہر شمارہ میں پابندی وقت کے ساتھ آسکے گا بشرطیکہ بجلی کے امراض رو جانی کو اٹھنے کچھ افادہ دیا۔ تمام شہروں کا حال کیسا نہیں اس لئے تمام شہروں کے باشندے دیوبند کے "مسئلہ برق" کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں آکھ چو لی پلتی ہے۔ بڑا دلچسپ کھیل۔ کتابت شدہ کامیوں کو بھی دے کر پریس میں داب دینے کو رکھا جا چکا ہے۔ ابھی داب کا آغاز ہی ہوا تھا کہ بجلی غائب۔ کاپی بے چاریوں کا اوپر کا سانس پور اور نیچے کا پیچ۔ اب یہ مشکل ہی ہے کہ سارے حروف نقص کے بغیر لپیٹ پر منتقل ہو جائیں۔ کچھ سطریں پھکی ہیں۔ کچھ حروف ہی ہر جگہ نہیں۔ سنگ ساز مسودہ لے کر لپیٹ

پرچی کی قیمت کا مسئلہ

تخلی محض ایک کاروبار ہی نہیں مشن بھی ہے اسی لئے اس کے معاملے میں ہم صرف کاروباری مصلح کو سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ ایسے اقدامات بھی کر گزرتے ہیں جنہیں کوئی بھی کاروباری ماہر حماقت اور خود کشی کے سوا کوئی نام نہیں دے سکتا۔ ان اقدامات کا ذرا بھی احسان قارئین کی گمراہی پر نہیں۔ یہ تو بہار اور اللہ معاملہ ہے جو کچھ حسن نیت سے جب جب ہم نے کیا ہے وہ تمام کا تمام فردِ عمل میں درج ہوتا رہا ہے۔ نیکی کا اجر اور بدی کی پاداش سب مل کر ہی رہی ہے۔ البتہ قارئین ہی کا کچھ احسان ہمارے گمراہی پر ہے کہ وہ ہر طرح کے بدلتے بدلتے حالات میں ہمارا ساتھ دیتے چلے جا رہے ہیں۔ کہاں یہ راگ رنگ اور لذت ورامش کا عہد زریں اور کہاں تخلی جیسا خشک اور مریوانہ پرچہ۔ قدرت کا اعجاز ہے کہ یہ اب تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنے ایڈیٹر کی آخری سانس تک زندہ رہنے پر مصمم بھی ہے شہادتِ کاروبار یہی یقین دلا رہا ہے کہ ابھی اس کا وقت موعود دور ہے۔ اس کامرض الموت ہنوز شروع نہیں ہوا۔

اب آپ یہ بتائیے کہ ہم قیمت کے مسئلے پر مغرور نہ کریں تو کیا کریں۔ تخلی والے کاغذ کی جو مستند قیمت پچھلے سال بھی وہ ڈھائی سے ضرب کھا گئی ہے۔ فالتو مد میں جو خرچ ہوا وہ الگ۔ مطبع کا سامان بھی کہیں اور بھی وغیرہ کی حرص میں جو کڑیاں بھر کر صفا اول میں پہنچا۔ کارگیروں کی اجرت۔ دفتری کارکنوں کا معاوضہ۔ مجبوریہ ایک۔ کون سی شے ہے جو ترقی پذیر نہیں۔ تخلی کی قیمت اگر اضافہ لاگت کے تناسب سے بڑھائیں تو لوگوں کے لئے خریدنا مشکل ہو جائے لہذا قابلِ عمل صورت یہی معلوم ہوئی ہے کہ تھوڑی سی قیمت بڑھائیں اور تھوڑے سے صفحات گھٹائیں۔ عام شمارہ اب تک ڈیڑھ روپے کا چل رہا تھا۔ اب اسے دو روپے کا ہو جانا چاہیے اور سالانہ چندہ بجائے پندرہ

کے بیس روپے۔ زیر نظر شمارے کی قیمت صفحات کے تناسب سے تین روپے رکھی گئی ہے۔ آگے انشاء اللہ دو روپے رہے گی۔ ہمیں اُمید ہے کہ جس طرح گزریے ہوئے چوبیس سالوں میں ہمارے دینی بھائیوں نے برابر قدر افزائی فرمائی ہے اسی طرح اب بھی وہ حوصلہ بڑھاتے رہیں گے اور ہولناک آندھیوں کی زد پر چلتا ہوا یہ ننھا چراغ فی الحال نہ بجھے گا۔ بقائے دوام تو بہر حال خدا کے سوا کسی کو نہیں۔

نہایت تحقیق (اردو شرح) مسند ابوبکر صدیق رضی

یعنی جو کلام مبارک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ سب کا سب کچا خوشی کی بات ہے کہ ایک مستند اور دقیق درس عالم نے مسند احمد بن حنبل کی اردو شرح کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے اور اسی سلسلے کی پہلی کڑی نہایت تحقیق کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ یہ بڑے سائز کے ۲۷۴ صفحہ پر مشتمل ہے۔ اور قیمت صرف بیس روپے۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ فاضل شائع نے شروع کتاب میں ایک طویل مقدمہ دیا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے اردو خواں طبقے کیلئے فہم حدیث کی باریکوں اور اصطلاحوں اور اصولوں کو پوری تحقیق کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ بلند پایہ کتابوں کا پتھر۔ فہم حدیث کی معلومات کا بیش بہا خزانہ۔ اُمید ہے شائقین اس تحفہ نادرہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ قیمت۔ بیس روپے (مجلد بائیں کپڑے)

مکتبہ تخلی۔ دیوبند (دیوبند)

صلی اللہ علیہ وسلم

اے کہ تو وادیِ ظلمت میں ہے مینارہ نور میں تھی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور
تجھ کو معلوم تو ہو گا کہ مرا آئینہ ہو چکا میرے ہی اوہام کی بوچھاڑ سے چور
تجھ کو معلوم تو ہو گا کہ مری دنیا میں روشنی کی نہیں کوئی بھی کرن پاس نہ دور
تحفہ نعت بھی لاؤں تو کہاں سے لاؤں زہر سے پاک نہ سینہ نہ تختل نہ شستور

اے کہ توڑا ہے ترے فقر نے شاہی کا غور

میں تھی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

صرف الفاظ کے موتی ہیں مرے دامن میں ہے مگر تیری حُجرت کا تقاضا کچھ اور
صرف ایمان کے دعوے ہیں مرے ہونٹوں میں ہے مگر تیری اطاعت کا تقاضا کچھ اور
میں مر شوق کی معراج درود اور سلام ہے مگر تیری شریعت کا تقاضا کچھ اور
دل عقیدت کی تہِ تاب سے خالی تو نہیں ہے مگر عشق کی غیرت کا تقاضا کچھ اور

نہ غلامی کا سلیقہ ہے نہ جینے کا شعور

میں تھی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں نے تجھ سے کبھی بیانِ وفا باندھا تھا وہ مگر قصہ ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں
تجھ گئی شمع جنوں، سرد ہوا سوزِ یقیں موجِ عھسیاں کے تھپیڑوں سے کچھ بھی نہیں

یاد تو آج بھی ہے نعرۂ تکبیر کی گونج ایسی یادوں کا مگر ذکر ہی کیا کچھ بھی نہیں
جنسِ اخلاص کو طوفانِ ہوس لے ڈوبا اب کوئی قول و قسم، عہد و فاکچہ بھی نہیں
میری نظروں سے ہوئی اپنی حقیقت مستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کرو تیرے حضور

ہر نئے قرن میں، دل اور زباں کے مابین فاصلے اور بڑھے، اور بڑھے، اور بڑھے
حسنِ کردار کی پونجی تو گھٹی روز بروز جن سے سر کاٹنے روکا تھا وہی طور بڑھے
اب مرگ ہاتھ میں نیزہ ہے نہ تلوار نہ ڈھال کیوں نہ پھر اہلِ ستم کا ستم و جور بڑھے
میں تو اک جامِ سفالیں کا بھی حقدار نہیں کس نے میری طرف ساغرِ بلور بڑھے
خونِ انصافِ مشیت کا نہیں ہے دستور

میں تہی دست ہوں کیا پیش کرو تیرے حضور
میں کسی اور کو الزام نہیں دے سکتا اپنی تالنج کو خود قتل کیا ہے میں نے
تو نے جس زہر سے بچنے کی ہدایت کی تھی اپنے ہاتھوں سے وہی زہر پیلا ہے میں نے
دل کی دنیا ہے تصادفِ بربتاں سے آباد صرف ہونٹوں سے ترانام لیا ہے میں نے
کھا چکی زنگ مرے ذوقِ عمل کی شمشیر راستہ خود ہی تباہی کو دیا ہے میں نے

نہ مقدر کی خطا ہے نہ زمانے کا قصور
اے کہ تو وادیِ ظلمت میں ہے میں سارہ نور
اے کہ توڑا ہے ترے فقر نے شاہی کا غور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کرو تیرے حضور



تفہیم القرآن (القیامۃ)

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بد اعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے ”آخر کب آئے گا وہ“

۱۳ اور یہی دو دلیلیں جو قسم کی صورت میں بیان کی گئی ہیں، صرف دو باتیں ثابت کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کا خاتمہ (یعنی قیامت کا پہلا مرحلہ) ایک یقینی امر ہے۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد دوسری زندگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کے منطقی اور فطری تقاضے پورے نہیں ہو سکتے، اور یہ امر ضرور واقع ہونے والا ہے، کیونکہ انسان کے اندر ضمیر کی موجودگی اس پر گواہی دے رہی ہے۔ اب یہ تیسری دلیل یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے کہ زندگی بعد موت ممکن ہے۔ مگر میں جو لوگ اس کا انکار کرتے تھے وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جس کے جسم کا ذرہ ذرہ خاک میں مل کر پر اُگتہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر پھلجھلیں کی غار میں چکا ہو، ان سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اُٹھ کھڑا ہو جو دس بیس ہزار برس پہلے بھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی ضرورہ جو اب اللہ تعالیٰ نے اس شخص سے سوال کی شکل میں دیدیا ہے کہ ”کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟“ یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہو تاکہ تمہارے منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپس آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپس آپ اسی جسم کے ساتھ جی اٹھو گے، تو بلاشبہ تمہارا اس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہو سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالق کائنات مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا ابھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جاسکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اس وقت موجود ہو اس کے بے شمار اجزاء کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنادیا جس سے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا؟

۱۴ یعنی بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کر کے تمہارا ڈھانچہ پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم حتیٰ کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنادیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

۱۵ اس چھوٹے سے فقرے میں منکرین آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی ہے۔ ان لوگوں کو ہر چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کرتی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع وہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کے اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انھیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اب تک زمین میں بے انتہے میل کی طرح پھرتے رہے ہیں اُسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور جو بدکرداریاں وہ اب تک کرتے رہے ہیں، آئندہ بھی ان کو اس کی کھلی چھوٹ ملتی رہے، اور یہ خیال بھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انھیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ان اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اس لئے دراصل اُن کی عقل انھیں آخرت

قیامت کا دن؟“ پھر جواب دیدے تھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے اُس وقت یہی انسان کہے گا ”کہاں بھاگ کر جاؤں؟“ ہرگز نہیں وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی وہ اُس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھیرنا ہوگا۔ اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پھل کیا کرایا بتا دیا جائیگا بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔

پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشات نفس اس میں مانع ہیں۔

۱۵۔ یہ سوال استفسار کے طور پر نہیں بلکہ انکار اور استہزام کے طور پر تھا۔ یعنی وہ یہ پوچھنا نہیں چاہتے تھے کہ قیامت کس روز آئے گی بلکہ مذاق کے طور پر کہتے تھے کہ حضرت! جس دن کی آپ خبر دے رہے ہیں آخر وہ کتنے دن لگے رہے کہاں گئے؟
۱۶۔ اصل میں بَرَقُ الْبَصَرِ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے لغوی معنی بکلی کی چمک کے آنکھوں کے چندھیا جانے کے ہیں۔ لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اسی معنی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ خوفِ زندگی، حیرت، یا کسی اچانک حادثہ سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ہلک دگ رہ جائے اور اس کی نگاہ اُس پریشان کن منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اس کو نظر آ رہا ہو تو اس کے لئے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّمَا يُوَفِّرُكُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُونَ فِيهِ اَلْاَبْصَارُ اَللّٰهُ تَوَّافٌ اَنْفِيسَ مَالٍ رہا ہے اُس دن کیلئے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی (ابراہیم علیہ السلام)۔
۱۷۔ یہ قیامت کے پہلے مرحلے میں نظامِ عالم کے درجہ بدرجہ ہو جانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہوجانے اور چاند سورج کے مل کر ایک ہو جانے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے بلکہ خود سورج بھی تاریک ہو جائے گا اور بے نور ہو جانے میں دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین بیکایک اٹنی چل پڑے گی اور اُس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوں گے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ چاند یک نخت زمین کی گرفت سے چھوٹ کر نکل جائے گا اور سورج میں جا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو اُس جہم نہیں سمجھ سکتے۔

۱۸۔ اصل الفاظ ہیں بِمَآ قَدْ هَرَبْتَ وَآخِرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کیا کر کر اُس نے اپنی آخرت کے لئے آگے بھی بھی اور یہ سب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آتا تھا جو اس کے بعد مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اسے کرنا چاہئے تھا مگر اُس نے نہیں کیا۔ اور کچھ نہ کرنا چاہئے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اس کا پورا احساب تالیف دار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اس نے کی وہ بھی اسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اُس سے بھی اسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

۱۹۔ یعنی آدمی کا نامہ اعمال اس کے سامنے رکھنے کی غرض درحقیقت یہ نہیں ہوگی کہ محرم کو اس کا جرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اس وجہ سے ضروری ہوگا کہ انصاف کے تقاضے پر سر عدالت جو م کا ثبوت پیش کئے بغیر لوہے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لئے وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا اسے

بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے، لیکن اسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ چیلے اپنی چوری چھپانے کے لئے اختیار کر سکتا ہے۔ مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزاروں میلین پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کفر یا ہریت یا شرک کا قائل ہے وہ درحقیقت اسکی ایسا انداز نہ رکھتا ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ان عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے اور ان کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بددیانت، ایک بدکردار، ایک حرم آخور، اپنی بد اعمالیوں کے لئے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آجائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریاں، کچھ مصیحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کو یہ علم تو بہر حال ہوتا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن ناجائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لئے آخرت کی عدالت میں پیش ہونے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہوگا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

جمال مصطفیٰ دمرد فریخی کی لغتوں کا دلی کش مجموعہ
 دین و شریعت اردو ایڈیشن - قیمت مجلد ۲۵/۷
 قیمت — ایک روپیہ انگریزی ایڈیشن ۱۵/-

مکتبہ تجلی، دیوبند (دیوبند)

ایک وضاحت

ایک صاحب نے لکھا:۔ "آپ نے نظریہ ارتقاء نمبر میں تفسیر اجادی پر جو تنقید کی ہے اس میں الانعام آیت ۷۰ کے ضمن میں آپ نے فرمایا کہ "شاہ عبدالقادر کے ترجمہ میں کل عدل کا ترجمہ جھوٹ کیا ہے (عفی اللہ عنہ)۔ ہمارے پاس تاج چکنی لاہور کا مطبوعہ نسخہ ہے اس میں شاہ صاحب کا ترجمہ اس طرح ہے۔ "اگر بد لہ دے سارے بدلے قبول نہ ہوں اس سے" مولانا محمود الحسن کے ترجمے میں ہے "اگر بد لہ میں دے تو قبول نہ ہوں اس سے" مولانا اشرف علی کا ترجمہ ہے "اور یہ کیفیت ہو کہ اگر دنیا بھر کا معاوضہ بھی دے ڈالے تب بھی اس سے نہ لیا جائے" مولانا مودودی کا ترجمہ ہے "اگر وہ ہر ممکن چیز فدہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے۔"

ہم نے چند صاحب علم لوگوں سے وضاحت چاہی کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کل عدل کا جو ترجمہ کیا ہے وہ پورا ہے یا جھوٹ گیا۔ ان سب کی رائے ہے کہ نہیں جھوٹا ہے۔

آپ کے استدلال ہے کہ اس کا جواب غایت فرامیں کہ کل عدل کا ترجمہ مندرجہ بالا ترجمہ میں ہے کہ نہیں ہے۔
 ● جواب یہ ہے کہ جو ترجمہ آپ نے نقل فرمایا اس میں کسی لفظ کا ترجمہ نہیں چھوٹا ہے۔ "سارے بدلے" کل عدل ہی کا ترجمہ ہے لیکن ہمارے سامنے جو موضوع القرآن ہے مطبوعہ کتب خانہ رحیمہ دیوبند، اس میں ترجمہ یہ ہے۔
 "اور اگر بد لہ دے گا وہ نفس ٹٹھا یا گناہ کا نہ لیا جاوے گا اس سے۔"

اس میں "سارے بدلے" کے الفاظ نہیں ہیں۔ خدا جانے یہ تفاد کیوں۔ گمان ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا اصل ترجمہ وہی ہو گا جو آپ نے نقل کیا۔ ہمارے پیش نظر نسخے میں یہ ہو گا کہ انت کی نذر ہو گیا۔

شہ شطرنج کی بحث مراسلہ اور اس کا جواب

”قاموس میں لکھا ہے کہ کوبہ کہتے ہیں نرد اور شطرنج اور چھوٹے بلبل یعنی نقارہ اور بربط کو اور یہ سب ممنوع ہیں جو حیران میں سے یہاں مراد رکھیں صحیح ہے اور غیر از ایک قسم شراب کی ہے کہ چینی سے بنتی ہے جتنی بنا یا کرتے ہیں۔“
(مظاہر حق جلد سوم، ص ۱۳۱، کتاب النحر و باقی ان النحر نیز ص ۵۵ پر کتاب اللباس، باب التعداد میں لکھتے ہیں: ”ہدایہ میں لکھا ہے کہ مکروہ تحریمی ہے کھیلنا نرد کا اور شطرنج کا۔“ بموجب فرمانے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ جو کوئی کھیلے شطرنج یا نرد شیریں گو یا کدو یا با تھ اپنا شور کرے اہو میں۔“ اتنی۔ اور جامع صغیر میں حدیث نقل کی گئی ہے کہ ملعون ہے وہ شخص کہ کھیلے شطرنج اور دیکھنے والا طرف شطرنج کے مانند کھانے والے گوشت سور کے ہے۔“

۱۔ من لعب بالنرد شیریں کا ناما صبیغ یداء فی لحم خنزیر و دمه۔ (رواہ سلم) ۲۔ ملعون من لعب بالشطرنج و الناظر الیہا کالآکل لحم الخنزیر۔

نفاذ پور۔ ۱۷ جون ۱۹۷۷ء۔
محترمی! السلام علیکم۔ تجلی مارج داپر بل ۱۷۷۷ء کے شمارے میں آپ کا جواب پڑھا۔ مجھے آپ کا مدعا سمجھے میں اس وجہ سے دشواری پیش آئی کہ آپ اگست ۱۹۷۷ء کے تجلی میں قول صحابی پر لفظ ”حدیث“ کا اطلاق کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو ص ۲۷۷ و ۲۷۹) بہر حال شطرنج کھیلنے کی ممانعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی موجود ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

عن عبد اللہ بن عمرو ان حضرت عبداللہ بن عمرو سے النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ نہی عن الخمر والیسر و سلم نے شراب پینے اور جوا و الکوبہ والغیراء و قال کھیلنے اور کوبہ اور غیر از سے کل مسکوحہ ۴۔

درجہ اول (دود) نشہ آور چیز حریم ہے۔
نواب قطب الدین صاحب دہلوی اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

یہ آپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات ہیں جن میں شطرنج کھیلنے کی ممانعت اور اس کی برائی بیان کی گئی ہے۔

اب آگے چلیے۔ حضرت علیؓ کے قول کے متعلق آپ نے جس رائے کا اظہار کیا ہے بہت کچھ محل نظر ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اسے صحیح ترین قول قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:-

قال علی رضی اللہ عنہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے الشطرنج من المیسر وحر فرمایا شطرنج جو ہے میں اصل علی رضی اللہ عنہ علی ہے۔ آپ کا گذر ایسے لوگوں پر قوم یلعبون بالشطرنج ہو جو شطرنج کھیل رہے تھے فقال۔ ما هذه التماثيل تو فرمایا، یہ کیا سورتیاں ہیں التي انتم لها عاكفون؟ جن پر تم متکلف ہو؟ امام احمد قال احمد۔ اصح ما في بن حنبلؒ فرماتے ہیں۔ شطرنج الشطرنج قول علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں سب سے زیادہ اللہ عنہ۔ دامغنی، ابن القیما صحیح قول حضرت علیؓ کا ہے۔ آئیے لکھا ہے "ہیں حیرت ہے کہ ذی علم ہو کر آپ کے قول صحابی کو محض اس لئے قول رسولؐ کے درجے میں لکھ دیا کہ وہ مشکوٰۃ میں ذکر ہوا ہے۔ حالانکہ اسی غلط فہمی کا کوئی منطقی جو از موجود نہیں تھا۔"

اس اعتراض کا جواب مشکوٰۃ کے مشہور شارح ملا علی قاری حنفیؒ کی زبانی سنئے:-

قلنا "الشطرنج" فی القاموس حضرت علیؓ کا قول۔ الشطرنج الشطرنج بالکسر واد افتح ناموس ہیں ہے۔ شطرنج ش کے اولہ، لعبة وحر وفتا زبر سے نہ کہ زبر سے مشہور کھیل والسین لغة قیہ۔ ہے۔ س سے (شطرنج) بھی بولا جاتا ہے۔

"میسر والہ عاجم" ای میسر والہ عاجم یعنی عجموں کا جو قمار کھ حقیقۃً او صوریۃً، خواہ حقیقتاً ہو خواہ شکل و والنشہ بھم منھی عنہ۔ صورت کے اعتبار سے اور ان سے مشابہت منوع ہے۔

وقوله فی الحدیث الذی - بعد والی حدیث میں حضرت ابو "الذخاظمی" ای عاص وحر موسیٰؓ کے قول "ذخاظمی" کا مطلب باطلۃً شہل مایکون ہے گہکار اور اس میں شرط بکر بالشرط وغیرہ۔ والحدیث کھیلنا اور بغیر شرط کھیلنا شامل دان کان موقوفاً لکنہ ہے۔ یہ حدیث اگرچہ مرفوعہ، مرفوع حکما فان مثله لا لیکن حدیث مرفوعہ کے حکم میں يقال من قبل الرائی وسیلاً ہے کہ چونکہ اسی بات محض رائے عنہ مایعضداۃ اند مرفوعہ کی بنا پر نہیں کہی جاسکتی اور حقیقۃً (مرفوعہ) عنقریب انھی (حضرت ابو موسیٰؓ)

سے ایک روایت آئے گی جس سے اس بات کی تائید

ہوتی ہے کہ یہ حدیث واقعی مرفوعہ ہے۔

حضورؐ سے منسوب قول یا فعل کو مسنون کہنے پر آپ کا اعتراض بہت عجیب ہے کیونکہ اس کی ہی تعریف تجلی میں کی جا چکی ہے۔ "مسنون وہی چیز ہوگی جس کا انساب حضورؐ کی ذات بابرکات سے ثابت ہو جائے۔" تجلی، انستبرکۃ، ص ۲۸۱ حدیث ابو موسیٰؓ کے ترجمے کی تصحیح کا بہت بہت شکریہ واقعی اس میں "اور گہکار" کے الفاظ نہ آئے ہیں جس کیلئے میں آپ کے اور تارمین سے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل جس وقت میں نے آپ کو خط لکھا اس وقت مشکوٰۃ کا عربی نسخہ مراجعت کے لئے سامنے موجود نہ تھا۔ میں نے پور محمدؒ کا رخا نہ تجارت کتب والوں کے شائع کردہ ترجمہ سے روایت نقل کر دی مگر انفسوس کہ یہ ترجمہ غلط نکلا۔ دینی کتب کے مسائل میں اس قسم کی بے احتیاطیاں عموماً پائی جاتی ہیں۔

تجلی کے زیر بحث شمارے ہی کو لیجئے۔ اس کے صفحات ۳۵، ۳۶، ۳۷ اور ۶۲ پر سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۱۰ یوں لکھی گئی ہے:-

وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رَّبِّ جَالِكَمَ حَالًا لَّكُمَ

فسرآن میں "و" نہیں ہے۔

ص ۳۶ پر وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ جِئْتُمْ بِهِ جِبْهَ صَحِيح وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ هُوَ۔

ص ۱۱۹ پر وَمَا لَكُمْ مِّنْ وَلَا يَتِيمَةٍ مِّنْ شَيْءٍ جِئْتُمْ بِهِ

کا حکم بیان کیا گیا ہے نزد خیر اور کھیل ہے۔ اس پر عموماً جو کھیلایا جاتا ہے۔ لہذا اس حدیث کے حوالہ سے ”شطح“ کی حرمت نکالنا درست نہیں۔

جامع صغیر کی منقولہ روایت میں بے شک لفظ شطح ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف ہے۔ کچھ خنزیر کی حرمت قرآن کی نص صریح سے معلوم ہوئی ہے۔ کوئی بھی نے اس عیسوی حرام ذخیرہ نہیں مانی جاسکتی جب تک کہ اس کی حرمت و نجاست ایسی ہی قوی نص سے ثابت نہ ہو۔ یہ آپ کی منقولہ روایت گویا یہ بتا رہی ہے کہ شطح کھیلنا خنزیر کا گوشت کھانے کے برابر ہے اور شطح کھیلنے کسی کو دیکھنا ایسا ہے جیسے خنزیر کا گوشت کھانے والوں کو دیکھا جائے۔ اس قسم کی مبالغہ آرائی کو ”دعظ“ کے خانے میں رکھ سکتے ہیں قانون شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نیز اس طرح کی مبالغہ آرائیوں کی نسبت حضور کی طرف درست بھی نہیں مانی جاسکتی۔ حضور کا عام طریقہ یہ تھا کہ جو امور و اشیاء شدیدہ طور پر حرام و ممنوع ہوں ان کا حکم و ضاحت کے ساتھ متعدد بار بیان فرماتے تھے۔ کیسے ممکن ہے کہ شطح کچھ خنزیر جیسی شدیدہ نجاست و کبراہت رکھتی ہو اور صحاح ستہ میں حضور کی دو چار حدیثیں بھی — بلکہ ایک حدیث بھی اس کے سلسلہ میں منقول نہ ہو۔ عقائد شرعیہ کے لئے آپ کمزور بنیادیں پسند نہ کریں تو شوق سے کریں ہم بہر حال اپنے عقائد کو ضعیف روایات اور خلاف درایت تصورات کے حوالے کرنا نہیں چاہتے۔

(۳) المصنفی سے جو روایت آپ کے نقل کی اس کے بارے میں ہم پھر وہی کہیں گے جو پہلے کہہ چکے ہیں۔ شطح نجس و عفا جو اسے نہ عادت۔ بہ طور قمار نہیں کھیلی جاتی بلکہ انہی ذاتی دھبہ اور کشش کے لئے کھیلی جاتی ہے۔ اس پر اگر کبھی کوئی جو اٹھیلے تو یہ ایسا ہوگا جیسے جواری لوگ سگ اچھال کر کراچیت کر لیتے ہیں۔ سگے اصلاً جوئے کا آکر نہیں اس لئے ان کے ذریعہ اگرچہ لوگ جو کھیل لیتے ہوں تو بجائے خود سکون کا عام استعمال حرام نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح شطح پر اگر کچھ

حالانکہ صحیح مائکم میں وَلَا يَتَجَمَّرُونَ شَيْءٍ ہے رملہ ہو سورہ انفال (۷۲)

اسی طرح ۱۳۲ یروا نَاوَقَصْمُ قَاهِرُونَ چھپا ہے جب کہ صحیح وَاَتَاوَقَصْمُ قَاهِرُونَ ہے (الاعراف-۱۲۷) بہر حال ان اغلاط کی نشاندہی سے میرا مقصد اپنی غلطی کے لئے سند جو از حاصل کرنا نہیں ہے۔ مجھے یقیناً اعتقاد سے کام لینا چاہیے تھا اور میں اس اصلاح کے لئے آپ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فقط۔ محمد خالد ٹیبل (بھوانی ضلع تھانہ)

تجلی

(۱) ابوداؤد کی منقولہ روایت میں لفظ کوبہ ہے۔ جب تاؤس کی تشریح کے مطابق اس کے متعدد معنی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ یہاں لازماً ”شطح“ ہی مراد لی جائے نہ تو کیوں نہ مراد لی جائے۔ یہ تو ہوتا نہیں کہ اگر کسی لفظ کے کئی معنی آتے ہیں تو جہاں بھی وہ لفظ استعمال ہو اس کے سائے ہی معنی مراد لئے جائیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوبہ کے متعدد مخمل معنوں میں ایک معنی ”شطح“ بھی ہیں۔ مگر برابر کا احتمال موجود ہے کہ یہاں قائل کی مراد شطح نہ ہو نقارہ یا نرد ہو۔ جب دو طرح کے احتمال موجود ہیں تو اس سے خاص شطح کی حرمت پر استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے۔

دیے بھی ہم حضرت قطب الدین دہلویؒ کی اس رائے کو درست نہیں سمجھتے کہ نقارہ حرام ہے۔ اس کی حرمت کے لئے کوئی شانی دلیل موجود نہیں جب کہ حلت کے لئے متعدد دلائل موجود ہیں۔ نقارہ محض اعلان ہے۔ جہاد میں تو اس کا استعمال بعض مواقع پر ضروری ہو جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے اعلان میں بھی اس کا استعمال جائز ہے۔ یہ آلات وسیع میں سے نہیں ہے۔ اسے حرام کہنا غلو اور تشدد ہے۔

ہدایہ کی عبارت نقل کر کے آپ کے حاشیہ پر جو حدیث پیش کی اس میں ”شطح“ کا ذکر ہے ہی نہیں فقط ”نرد خیر“

لوگ پیسوں کی بازی لگائیں تو اس سے بجائے خود شطرنج ادا قرار نہیں بن جاتی۔ حضرت علیؓ پھر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ ان کی خیر سے تو لازماً اعتماد کرنا ہوگا کہ ان سے جھوٹ کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن رائے کے معاملہ میں وہ حرف آخر نہیں ہیں۔ انھوں نے اگر واقعی شطرنج کو جوئے کے خانے میں رکھا ہو تو یہ ایک خلاف واقعہ بات ہے۔ یا تو انھیں شطرنج کھیلنے والوں کا تجربہ نہیں تھا کہ یہ لوگ محض تفریحی کھیلے ہیں پیسوں کی بارجیت نہیں کرتے یا پھر انھیں کسی نے غلط اطلاع دیدی تھی کہ شطرنج جو اسے حقائق و واقعات کسی صحابی کے بدلنے سے نہیں بدل سکتے اور شطرنج کھیلنے والوں کو دیکھ کر منقولہ روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے جو کچھ فرمایا وہ بھی کسی قانون شرعی کی وضاحت نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے شطرنج نہیں دیکھی تھی۔ دفعتاً پہلی بار دیکھی تو طعن و تجسس کے محلے جذبے سے انشاد فرمایا کہ ارے بھی یہ کیا مودرتیاں ہی ہیں جن پر تم جھکے پڑے ہو؟ بظاہر ان کلمات آیت قرآنی کی تکجیم ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھ کر یہی فقرہ کہا تھا۔ اس کے جواب میں جنابیں بولے تھے کہ تم نے تو اپنے آبا و اجداد کو ان ہی بتوں کی پوجا کرتے پایا ہے۔ صاف ظاہر ہے یہ شرک مبین کا معاملہ تھا۔ مودرتوں کی عبادت کی جا رہی تھی۔ عقائد میں توحید کا نام و نشان نہ تھا۔ مگر شطرنج نہ پوجا ہے نہ اصطلاحی اعتکاف۔ اس کا عقائد دینیہ سے کوئی تعلق ہی نہیں اور اس کے ہرے اول تو مورتی کے ہم معنی ہوتے نہیں دوسرے ان پر جھکاؤ پرستش کے لئے نہیں ہوتا تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ لہذا دفعۃً اگر حضرت علیؓ نے شطرنج کھیلنے والوں کو مخاطب کر کے حضرت ابراہیمؑ والا فقرہ دہرایا تھا تو اس کا یہ مطلب کوئی جتن ہی سے کہتا ہے کہ شطرنج کا کھیل بھی مودرتوں کی پوجا کی طرح ممنوع و حرام ہو گیا۔ حضرت علیؓ شطرنج کو ناجائز سمجھتے ہوں یہ الگ بات ہے۔ انھیں رائے قائم کرنے کا

حق تھا لیکن تنہا ان کی رائے قوانین شریعت میں حجت نہیں ان کی بہتری ارادہ ہیں جن سے فقہاء نے اختلاف کیا ہے اور ائمہ اصول اس پر متفق ہیں کہ حلال و حرام کا فیصلہ اللہ اور رسول مقرر کرتے ہیں نہ کوئی صحابی۔ امام احمد نے اگر حضرت علیؓ کے اس قول کو صحیح ترین قول قرار دیا ہے تو ہم اس کی تردید نہیں کرتے۔ لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ قول علیؓ کی حیثیت قول نبیؐ کی نہیں ہے۔ نہ ہم یقین کر سکتے ہیں کہ شطرنج کے بارے میں جو رائے حضرت علیؓ نے ظاہر کی وہ رسول اللہؐ سے سن کر ظاہر کی ہوگی کیونکہ رسول اللہؐ دین کے معاملہ میں کبھی ایسی رائے ظاہر نہیں فرما سکتے جو خلاف واقعہ ہو۔ شطرنج کا ”میسر“ یعنی جوا ہونا خلاف واقعہ ہے۔ (۴) یہ بہت غلط بات ہے کہ دودان بحث آپ مرقاۃ جیسی ضخیم کتاب سے عبارت نقل فرمائیں تو والدہ نہ دیں کہ کس باب میں یا فلاں ایڈیشن کے کس صفحے پر یہ عبارت آئی ہے۔ ”مظاہر حق“ کی نقل میں تو آپ نے جلد اور صفحہ سب لکھ دیا۔ پھر مرقاۃ کی نقل میں اس سے گزری کیوں فرمایا؟ خیر۔ جواب سنئے۔ بلا علی قاری یا صاحب لغاموس یا کوئی اور بزرگ اگر شطرنج کو ”میسر والا عاجم“ قرار دیں تو یہ شخص ایک رائے ہے۔ قرآن یا حدیث نہیں۔ یہ رائے سراسر غلط ہے کیونکہ واقعے کے خلاف ہے۔ شاید اسی لئے انھیں کہنا پڑا کہ ”خواہ حقیقاً ہو یا صورتاً“۔ اس سے خود ظاہر ہے کہ کہنے والوں کے نزدیک بھی شطرنج کا قمار ہونا امر واقعہ نہیں بلکہ ایک مجازی اور سطحی اطلاق ہے دوسری اقوام سے جس تشبہ کی مناعت حدیث میں آئی ہے وہ اس طرح کا تشبہ ہرگز نہیں۔ اگر ایسے تشبہ بھی حرام ہونے لگیں تو ہائی فٹ بال، ٹینس، بیکم، لٹوڈو، کرکٹ سب حرام قرار پا جائیں۔ پھر ایک قیاسی تشبہ سے جو ہلکے درجے کی حدوت و کفر بہت ثابت ہو سکتی ہے اس کا انکار ہم نے کب کیا ہے۔ کیا ہم شطرنج کی قصیدہ خوانی کرتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنے جوا الفاظ پر بل میں نقل کیے انھیں پھر دہرائیے۔ ”حدیث میں شطرنج کی ممانعت آئی ہو یہ ہمارے

علم میں نہیں۔ تاہم ابو ولعب کی جو اقسام حدیث کی رو سے ممنوع و مکروہ ہیں ان میں بہر حال یہ داخل ہے۔

کیا تشبہ والے قول سے اس سے زیادہ بھی کچھ ثابت ہو سکتا ہے؟

آپ در اہل غلو اور تشدد کی رد میں بہرہ پہنچے ہیں۔ خواہ مخواہ شطرنج کو محکم خنزیر جیسا باور کرانے پر مصر ہیں۔ یہ حرکت جذباتی ہے۔ قانون کی متین اور بے لاگ بحث سے اس کا جوڑ نہیں۔ ماضی میں کچھ لوگ اگر غلو سے کام لے گئے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ اور ہم بھی ان کی پیروی کریں۔ حدیث کے لفظ حاطی کا ترجمہ عاص یعنی گناہگار بان لیا مگر کیا ہماری مذکورہ عبارت سے یہ واضح نہیں کہ شطرنج کا ”گناہ“ ہونا ہمیں بھی تسلیم ہے۔ جو چیز حدیث کی روشنی میں ”ممنوع و مکروہ“ ہوگی وہ گناہ و خطا نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ ہاں یہ بات ماننے کو ہم ہرگز تیار نہیں کہ اس کی حرمت محکم خنزیر یا ”مور قی پوجا“ جیسی ہو۔ آخر صاحب مرقاة نے بھی تو حاطی کا ترجمہ عاص کر کے یہ نہیں کہا کہ یہ گناہ زبردست کبیرہ گناہ ہے۔ شرک یا اکل خنزیر یا شرب خمر جیسا ہے۔ آپ خواہ مخواہ بات کو طول دینے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کو شاید یہ بھی یاد نہیں رہا کہ خبر واحد سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ تقییر کا فائدہ نہیں دیتا جبکہ قرآن سے ثابت شدہ امور یقینی و قطعی ہیں۔ کیسے ممکن ہے کہ قرآن نے صریحاً جن اشیاء کو حرام و نجس کہا ہو وہی ہی حرمت و نجاست کسی ایسی چیز کے لئے بھی ثابت ہو جائے جس کی حرمت قوی ترین ذرائع سے معلوم نہ ہوئی ہو۔

(۵) ہم نے اگر یہ کہا تھا کہ ”مسنون وہی چیز ہوگی جس کا انتساب حضورؐ کی ذات یا برکات سے ہو ثابت ہو جائے“ تو بالکل درست کہا تھا۔ آپ نے شاید منطق نہیں پڑھی اس لئے ”عام خاص من وجو“ اور ”عام خاص مطلق“ کا فرق نہیں سمجھتے اردو میں سمجھئے کہ دودھ تو لانا سفید ہوگا لیکن ہر سفید چیز

دودھ نہیں ہوگی۔ یا کاجل کا رنگ سیاہ ضرور ہوگا لیکن ہر سیاہ چیز کاجل نہیں ہوگی۔ ٹھیک یہی معاملہ ”سنت“ کا ہے۔ اصطلاح فقہ میں چیز کو مسنون کہا جاتا ہے وہ لازماً وہ ہوتی ہے جو حضورؐ کی ذات یا برکات سے منسوب ہو۔ لیکن ہر وہ چیز جو حضورؐ کی ذات یا برکات سے منسوب ہو لازماً سنت نہیں ہوگی۔ مثلاً حضورؐ نے ایک بار اپنے اوپر شہر حرام کر لیا تھا یا ایک بار آپؐ کھڑے ہو کر بھی پیشاب کیا تھا یا ایک بار آپؐ نے ایک غریب صحابی کی آمد پر ناخوشگواری محسوس فرمائی تھی یا ایک آپؐ نے فرمایا تھا کہ نرا دروازہ مادہ مجبوروں کا پیوند ہے کارے یا آپؐ بھولے سے چار کے بجائے پانچ یا تین رکعات پڑھ گئے تھے۔ یہ سب امور و افعال آپؐ کی طرف بہ دلائل قویہ منسوب ہیں لیکن کیا یہ سنت بھی ہیں؟

علاوہ اس کے وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہیں جن کا تعلق امور عادیہ یا خاص زمانے اور خاص احوال سے ہو۔ مثلاً آپؐ روم کی چادر یا فارس کا لباس پہن چکے ہیں۔ مگر روم و فارس کے ملبوسات کا استعمال مسنون نہیں قرار پایا۔ اسی طرح آپؐ نے متعدد چیزیں کھائی ہیں اور یہ سب مسنون نہیں ہیں۔

تو میرے محترم! اس تصریح کے بعد آپؐ اکتوبر ۱۳۵۷ھ کا تجلی بھی پڑھیں اور اپریل ۱۳۵۷ھ کا بھی۔ کوئی تضاد کہیں نظر نہ آئے گا۔ ہم اسی لئے ہانکے پکارے کہ چلے جاتے ہیں کہ اجتہاد و فقہ کی منسبل بہت دور ہے۔ چندادھر اُدھکی عبارتیں ڈھونڈنا لافقہ نہیں کہلاتا اور عافیت اسی میں ہے کہ اپنے علم و فہم کا مناسب اندازہ کرنے کے بعد زبان کھولی جائے۔ ہمارا تو خیال ہے آپؐ نے مرقاة بھی نہیں دیکھی۔ اگر دیکھتے تو تفصیلی حوالہ کیوں غائب ہو جاتا۔ ڈر ہے کہ لغوی اور ہدایہ اور البوداؤدی کی بھی براہ راست زیارت آپؐ نے نہ فرمائی ہو۔

(۶) اپنی ترجمے کی غلطی پر معذرت جانتے ہوئے آپؐ نے خواہ مخواہ یہ کوشش کی ہے کہ صاحب تجلی کی بھی کچھ خطائیں

تازہ نمک پاشی

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ڈاکٹر ذاکر مرحوم نے عہدہ صدارت ہند نبھاتے ہی ہندو دھرم اور عین میت کے دو مذہبی پیشواؤں کی بارگاہ میں حاضری دی تھی اور ان کے قدم چھونے اور آشر باد حاصل کی تھی۔ اس تھی کو ان کے رفیق طریق محمد نجیب صاحب وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک تازہ تقریر نے اب کھولا ہے۔

”یہ اسلئے کہ ذاکر صاحب اپنے فرقہ کی تنگ نظری کو ختم کرنا چاہتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوؤں کے تہذیبی اقدار کی عزت نہ کریں۔“

سبحان اللہ! ایسے مجرم کو کیل ایسا ہی ملنا تھا۔ واللہ عالم ان بزرگ کے ذہن میں تنگ نظری کی تعریف کیا اور کچھ ہے بھی یا سرے سے بے معنی لفظ بول دینے کی عادت ہی ہے؟ — مولانا ابوالکلامؒ سے بڑھ کر ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار کون ہوا ہے کیا انھوں نے کوئی حرکت اس کے قریب قریب بھی کی تھی۔ انھوں نے نہ سہی کیا رنج قدوائی بھی اس کے قریب کبھی گئے تھے؟ حکیم اجل خاںؒ۔ ڈاکٹر انصاریؒ۔ ڈاکٹر سید محمودؒ۔ حافظ امیرؒ۔ عبدالحجیدؒ و احمد شفیق الرحمنؒ قدوائیؒ۔ مولانا حفظ الرحمنؒ اور بیسیوں نہیں بچا سوں اور سیکڑوں بٹے سے بڑے نیشنلسٹ مسلمانوں میں کسی ایک کے بھی اپنی ذات اور اپنی ملت کو اس درجہ ذلیل اور رسوا کیا تھا۔ شہری چھا کلاچی کو مبارک ہو وہ دانستہ یا نادانستہ دہلی میں اپنا ایک ایسا جانشین چھوڑ آئے ہیں جو اسلامی تہذیب کو صفحہ چڑانے اسلامی غیرت و جنت کو چوچ دکھانے ملت کے دل پر کچھ کے دینے سے کسی وقت بھی باز نہیں رہتا!

(صدق جلیل)

شمار کرایے اپنا بار ہلکا کر لیں۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ تجلی کے صفحات سے اعراب و الفاظ کے سہو خطا کی جو مثالیں آپ نے ڈھونڈی ہیں ان کا تعلق صاحب تجلی سے نہیں بلکہ کاتب اور پریس سے ہے۔ حالانکہ آپ کے جس قصور کی نشاندہی ہم نے کی تھی اس کا تعلق کاتب اور پریس سے نہیں خود آپ سے ہے اور آپ کے اس اعتراف کے بعد کہ ”میں نے کارخانہ تجارت کتب والوں کے شائع کردہ ترجمہ سے روایت نقل کر دی تھی“ اگرچہ یہ صفائی تو ہو گئی کہ ترجمہ میں لفظ ”گناہگار“ کا اضافہ آپ نے نہیں کیا لیکن دوسرا یہ الزام آپ پر عائد ہو اگر عبادتیں لیتے تو آپ کہیں اور سے ہیں اور حوالہ دیتے ہیں کہیں اور کا علمی دیانت کا تقاضا تھا کہ آپ کارخانہ تجارت کتب کے شائع کردہ اردو ترجمہ مشکوٰۃ کا حوالہ دیتے مگر آپ نے حوالہ ٹانک دیا ”بیہقی“۔ گویا کام تو چلا رہے ہیں اردو کتب سے مگر عرب ڈال رہے ہیں عربی حوالوں کا۔ اسی لئے ہمیں شبہ ہوا ہے کہ مرقاۃ وغیرہ بھی آپ کے براہ راست نہیں دیکھیں۔ فرمایا جائے کہ آپ کا یہ قصور کیا اسی نوعیت کا تھا جس نوعیت کی غلطیاں آپ نے تجلی کی کتابت میں چھانچا ہیں؟

آئندہ کے لئے بڑے ادب سے گزارش ہے کہ اگر سیدان بحث میں کودنا ہی آپ کے لئے ضروری ہو تو پہلے موضوع کے محققانہ مطالعہ کی واجبی زحمت فرمایا کریں ہمارے گونا گوں انتقادات پر نظر ڈالئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ دوسروں کی علمی غلطیاں یوں نہیں ثابت نہیں کر دی جاتیں بلکہ تحقیق و تدقیق میں خون پسینہ ایک کیا جاتا ہے۔ انتہا پر کتب دیکھی جاتی ہیں۔ بینائی داغ اور وقت کو بے دریغ صرف کیا جاتا ہے تب کہیں جا کر تہہ کے موتی برآمد ہوتے ہیں۔ آپ بھی پوری روش اختیار کریں تو ہر مسئلہ سے کہ کوئی اہم اور قابل قدر تحریر آپ کے قلم سے نکل ہی جائے۔

تبلیغی جماعت • طاق عدد اور حدیث • وہی پرانا راگ • یا رسول اللہ کا نعرو • بدعات د
توہمات • بدعتی یا فاسق کے پیچھے ناز • لڑکیوں کی تعلیم • دارِ طبع کی بحث • مولوی کی بد عملی
• ڈاک خانے کے فارموں کی خرید و فروخت • ذبحہ کا ایک مسئلہ • تنگ یعنی چہیز کی رسم • عورتوں کی
ملازمت اور تعلیم وغیرہ • احباب کے تقاضے اور خواہشات • میلاد کا تہنہ • سیرت النبیؐ کے جلسے۔

تجلی کی ڈاک

تبلیغی جماعت

سوال ۱۔ از: عبد الرشید فیض پور۔ ضلع جلگاؤں۔
ابھی پچھلے جمعہ کو ایک تبلیغی جماعت مالی گھاؤں سے
آئی تھی۔ اُس کے امیر نے جو بیان دیا اُس میں تھا کہ حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے موقع پر اپنا سارا سرمایہ
حضورؐ کے سامنے پیش کر دیا حتیٰ کہ اپنے جسم کا لباس اُتار
کر ٹاٹ کا کرتہ پہن لیا۔ اس ادا کو پسند کر کے کائنات کے
تمام ملائکہ نے اُس دن ٹاٹ کے کپڑے پہنے۔ خود جبریلؑ
بھی یہی لباس پہن کر حضورؐ کے پاس پیغامِ وحی لائے۔
(۲) یہ تبلیغی کام اللہ جلّ جلالہٗ ہے ہیں وہیں سے اس عجم
کو تصدیق حاصل ہے۔ (۳) گفت والا عمل ایک لاکھ ۲۲
ہزار پیسہ والا عمل ہے۔ براہِ کرم ان سوالات پر آپ
تبصرہ فرمائیں۔

جواب ۱۔

موجودہ تبلیغی جماعت کا جو طریق کار ہے اس کا

نتیجہ لامحالہ یہی ہونا ہے کہ بے علم یا کم علم، اُن گھڑ اور غیر
تربیت یافتہ لوگ واعظ و مبلغ بن جائیں۔ پھر تصوف کا
جو مزاج اس جماعت کے اکابر میں رچا ہوا ہے اس کا ثمرہ
یہی بہر حال یہی ہونا ہے کہ ضعیف، غیر منطقی اور نشہ آور
قسم کی روایات اور کہانیاں اس جماعت میں خصوصاً
دلچسپی کا مرکز بن جائیں۔ جماعت تبلیغی کے موجودہ رابطین
میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کا نام نامی آپسے سنا ہی
ہوگا۔ ان کی ہی متعدد کتابیں اس جماعت کے اصاغر کا
وظیفہ ہیں اور ان کتابوں میں غیر مستند روایات غلطی تعداد
میں ہیں۔

تینوں سوالات کا جواب علی الترتیب یہ ہے۔

(۱) قابلِ اعتبار روایات سے صرف اتنا معلوم ہوا ہے
کہ خزوۃ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
اپنا سب کچھ حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ لیکن یہ
ہمیں معلوم ہوا کہ تن کے کپڑے اُتار کر ٹاٹ کا لباس پہن
لیا ہو۔ عین ممکن ہے کسی کمزور روایت میں ایسا کچھ بھی

بھی یہی خوش فہمی رکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کی نبوت اور
ہدایت کی تصدیق اللہ اور رسول کے یہاں سے حکم کھلا
ہو چکی ہے۔ نیز اسی طرح ہر فرستے اور گروہ میں آپ اسی نوع
کی خوش فہمیاں کافی مقدار میں دیکھ سکتے ہیں لہذا تبلیغی جماعت
والے کہوں نہ خوش فہمیوں کی فصل بوئیں اور خیال ہی خیال میں
جنت کے سونے نوش کریں۔

بزرگوں کے بہت سے خواب بھی اس سلسلے میں چلتے
ہیں۔ فلاں صاحب کے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرما ہیں اور ان بزرگ کی کمر پہ تھپکی دے کر فرما رہے ہیں کہ
بے شک تبلیغی جماعت ہی وہ واحد جماعت ہے جو جو صدیوں
صدی میں راہ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر قائم ہے۔ جاؤ اور
زیادہ سے زیادہ اسے پھیلاؤ۔

ایک بڑا مغالطہ یہ ہے کہ عوام سمجھتے ہیں جب خواب
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس سے بڑھ کر تصدیق اور کیا
ہوگی۔ عقیدہ یہ ہے۔ اور صحیح ہے کہ شیطان حضور کی شکل
میں نہیں آ سکتا لیکن اس کا صحیح مطلب عوام نہیں سمجھتے۔
اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو شکل و صورت واقعہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اسے اختیار کرنا شیطان کی طاقت
سے باہر ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے اور واقعہ بھی ہوتا ہے کہ شیطان
حضور سے ملتا جلتا میک اپ کر کے وارد ہوا اور کہہ دیا کہ
میں رسول ہوں۔ یا اپنے چہنچہلیوں کو صحابہ کا بھیس بدلوا کر
ان سے کہلوادیا کہ یہ رسول اللہ ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو
لوگ قابل اعتماد روایات کے ذریعہ حضور کی شکل و ہیئت
کو جان چکے ہیں اور ان ہی یہ صلاحیت ہے کہ کتابوں میں
لکھے ہوئے لفظ کو ایک زندہ پیکر سے مطابقت دے سکتے
ہوں اور ان کا حافظہ بھی اس حد تک قوی ہو کہ یہ کتابوں
میں پڑھا ہوا فقرہ ہر وقت مستحضر رہ سکے وہی تسلی بخش طور
پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو بزرگ خواب میں جلوہ فرما ہیں وہ
واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا شیطان حبشیہ دھندے کا دے رہا
ہے۔ جماعتین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ خوابوں میں حضور کی
زیارت کے جتنے قصے معروف و معلوم ہیں ان میں سب

آگیا ہو مگر عقل و قیاس کے خلاف ہے۔ یوں کہ ٹاٹ
بہر حال ایک قیمت رکھتا ہے اور دور رسالت کے مہینے میں تو
یہ اس سے کہیں زیادہ بیش قیمت تھا جتنا آج ہم تصور کرتے
ہیں۔ اگر اس روایت کو صحیح فرض کر لیا جائے تو مطلب
یہ ہو گا کہ عین اس وقت جب حضور کو غزوے کیلئے زیادہ
سے زیادہ مالی امداد درکار تھی حضرت ابو بکرؓ نے خواہ مخواہ
ایک رقم ٹاٹ کا لباس چھل کرنے میں صرف کی۔ حالانکہ اس کا
فائدہ سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ تن پر چوپرا نا لباس ہے
وہ پیش کردہ مال میں بڑھ جائے۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ
اس استعمال شدہ چوڑے سے کہیں زیادہ مفید وہ رقم ہو
سکتی تھی جو حضرت صدیقؓ ٹاٹ کا لباس خریدنے پر صرف
کرتے لہذا کیسے مان لیا جائے کہ انھوں نے مفید کو چھوڑ کر
غیر مفید راستہ اختیار کیا ہو گا۔

اور چلیے یہ مان ہی لیجئے کہ اس دن موصوف نے
ٹاٹ کا لباس زیب تن کیا مگر یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ
جملہ فرشتوں نے بھی ان کی تقلید میں اس روز ٹاٹ کا جوڑا
زیب تن فرمایا۔ فرشتوں کے بارے میں تو یہ تصور ہی
کمر ناسادہ لوگوں کا کام ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح
تن پوشی کے لئے قمیصیں اور پاجامے یا تہبذ پہنتے ہوں گے
ان کے نورانی جسموں پر کوئی عضو قابلِ استیعاب چھیلنے کے
قابل ہے بھی یا نہیں اسی کا علم نہیں۔ نہ ان کے یہاں دو
جسموں کا ثبوت ملتا ہے کہ انسانوں کی طرح جنسی تعلقات
رکھتے ہوں۔ نہ ایسی صورت میں یہ متوقع ہے کہ ان کے اجسام
میں وہ آلات و اعضاء بھی موجود ہوں گے جنہیں چھپانا
انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

در اصل موصوف کے فہم میں ہے ہی مبالغہ
پسندی اور منطق دشمنی۔ گھاؤں والے بڑے خوش
ہوئے ہوں گے یہ سن کر کہ سبحان اللہ جبریلؑ بھی ٹاٹ
پہنے آ رہے ہیں اور سارے فرشتے ٹاٹ لٹکائے
پھر رہے ہیں۔

(۲) آپ نے سنا ہو گا مرزا غلام احمد قادیانی کے ارادے

ہیں۔ مبالغے کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔ خبر سے کچھ رپاٹ بھی کچھ صالحین کی گھڑی ہوئی ہو تو بد میں نہیں ”حدیث“ کے ناک پریش کہ کے غلو کا شوق بخیر و خوبی پورا ہو جاتا ہے۔ پھر کہیں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے جب کہ عوام بے علم ہیں، سادہ دل ہیں، زود اعتبار ہیں اور قہوری شریعت نے ان کے مزاج کو ویسے ہی اتنا فارم کر دیا ہے کہ اب مکھی چھر سب انھیں بھم ہو جاتا ہے۔ باقی حد ادب!

طاق عدد اور حدیث

سوال ۲۔ از۔ اشفاق احمد عظمیٰ۔

ماہ دسمبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ایک سوال کا جواب نظر سے گذرا جو بہت حد تک غیر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سائل نے پوچھا یہ تھا ”بہت سے مسلمان چندہ دیتے وقت بھوٹا عدد کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ ہندوؤں کی کوئی نقل ہے یا اس کی کوئی حقیقت ہے؟“ تو آپ نے جواب غایت فرمایا کہ ”شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔“

حالانکہ بحاری شریف کی ج ۲ ص ۹۴۹ پر ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ”هو و ترو وحب الوتر و شکوہ شریف میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ”ان اللہ و ترو وحب الوتر“ اور اسی کے تحت یہ قول کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طبقات ارض و سما طاق تخلیق کئے۔ اور اسی طرح تسبیحات صلوٰۃ سبحان ربی الاعلیٰ وغیرہ طاق بار پڑھنا مروی ہے۔ اور بہت سی تسبیحات ہیں جن کو طاق ہی مرتبہ پڑھنا ثابت ہے۔ نیز انشاء طحج بھی اسی زمرے میں ہے۔

کیا اس حدیث کے موجود ہونے سے یہ کہنا کہ ”شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔“ ایک جہ سے معذور کہنہ مشفق مفتی کے لئے زیب دے گا؟ ہاں اگر زیب دیجائے تو ان کے لئے لازمی ہے کہ مذکورہ حدیث کی ایسی توجہ پیش کریں جو عقل و نقل کی کوئی پریمیج اترے۔ اور اگر اکتانہ زیب نہیں تو وہ اپنے غایت کردہ فتوے سے اسی طرح نہ جوڑے

قابل اعتماد نہیں ہیں کیونکہ کسی شخص کا عابد و زاہد اور پیر و مرشد ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ حضور کے صحیح خدو خال بھی ذہن میں محفوظ رکھتا ہو اور حالت خواب میں اپنی قوت تیزی سے ٹھیک ٹھیک کام لے سکے۔ آثار و قرائن کا جہاں تک تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ ابلیس ہم سے زیادہ عیار ہے اور ہماری کمزوریاں جانتا ہے۔ جب وہ دھوکا دینے آئے گا تو کیوں نہ کچھ خوشی میں اور رد ہندیاں ساتھ لائے گا۔ کیوں نہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ کے میک اپ میں چند جلیوں چاندیوں کو ساتھ لگائے گا۔ اب بزرگ صاحب خوش ہیں کہ سبحان اللہ فضا جہک رہی تھی، انوار بکھر رہے تھے اور صحابہؓ بھی تشریف فرما تھے۔

اسی طرح کے امکانات و احتمالات کے باعث علمائے حق اس پر متفق ہیں کہ خواب یا کشف والہام کو حجت نہیں مانا جاسکتا۔ یہ شریعت کے تابع ہیں اس پر قاضی اور امیر نہیں۔

خلاصہ یہ کہ کام تو ایک تبلیغی جماعت ہی کا کیا روس اور چین کے کیونٹوں کا بھی اللہ ہی چلا رہا ہے۔ اسرائیل کا کام بھی اللہ کی تکیہ نبی اجازت کے بغیر تو نہیں چل سکتا۔ بلیک مارکیٹس، ناجائز منافع خوردوں، غلڈوں اور عیاشوں سے زیادہ تبلیغی جماعت کے کام کو فروغ نہیں پھر کیا کوئی کہے گا کہ اللہ کے علاوہ کسی حاکم کائنات کی مرضی سے یہ سب ہو رہا ہے۔ نہیں۔ پتہ پتہ تو اسی ایک مالک الملک کی اجازت کا تابع اور فرمان کا مطیع ہے۔ کس کا کتنا کام چل رہا ہے یہ حق و باطل کا معیار نہیں۔ واحد معیار قرآن و سنت ہیں اور قرآن و سنت نے تا کی رد و امر کے ساتھ بتایا ہے کہ دین کے معاملے میں مضبوط بنیادوں پر جو۔ کمزور روایات، اور توہمات و غیلات کے پیچھے مت چلو اور خام و ناقص باتوں کی تبلیغ مت کرو۔

دس، گشت والے عمل ہی کے بارے میں نہیں دوسرے کتنے ہی اعمال اور اور معمولات کے بارے میں تبلیغی جماعت کے یہاں اسی طرح کی کھل افشائیاں مقبول

مگر جس طرح جواب دیا گیا ہے۔

جواب ب۔

کاش آپ اپنی ذہانت کو حقیقت پسندانہ انداز میں استعمال فرمائیے تو سوال و جواب کی فہم ہی آتی۔ آپ یہ تو دیکھ لیا کہ بخاری میں فلاں حدیث آئی ہے مگر یہ متفقہ نہ فرمایا کہ یہ کس باب اور کس فصل میں آئی ہے۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ امام بخاریؒ اسے کتاب الدعوات کے باب بسم اللہ تعالیٰ صائغ اسہم غیر واحد میں لائے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی حدیث نہیں جس کا مفہوم ہر جگہ چسپاں کیا جاسکتا ہو بلکہ اس کا تعلق محض دعاؤں سے ہے اور اصلاً اس کا جوڑ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں سے ہے۔

آپ نے بخاری کے حاشیہ پر تمثیل میں سات طبقات ارض و سما اور تسبیحات صلوٰۃ اور اشواط حج کا ذکر دیکھ لیا اور بغیر فکر و تدبیر کیے اسی کو نقل کر دیا حالانکہ بے لاگ انداز میں سوچتے تو فوراً ہی آپ کے ذہن میں عبادات و احکام اور حیات و کائنات کی کتنی ہی مثالیں ایسی آجائیں جن میں اللہ نے وتر دقاق کا عہد پسند نہیں فرمایا۔

سب سے پہلے اشرف المخلوقات انسان ہی کو لے لیجئے۔ اس کی پیدائش کا مدار اللہ تعالیٰ نے ایک جوڑے پر رکھا اور فتر آن میں یہاں تک فرمایا کہ زمین کے کئی شے خلقنا زد جبین داود ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے اس سے معلوم ہوا کہ صرف انسان ہی میں نہیں جوتا و نباتات تک میں اللہ کو جوڑے پسند ہیں کہ تربت۔ پھر آپ دیکھ سکتے ہیں کہ آدمی کے منہ پر دو کان لگائے۔

دو آنکھیں۔ دو ہاتھ۔ دو پاؤں۔ دو گمہ دے۔ ناک ایک لگائی تو سوراخ اس میں بھی دو کر دیئے۔ اگر بات یہی ہوتی کہ ہر معاملہ میں اللہ کو تربت یعنی طاق عدد رکھنا پسند آتا تو کیا اس کے لئے کچھ تدبیر نہ ہو کہ انسانی جسم کا ہر عضو فقط ایک یا تین بنا نا۔

عبادات و احکام پر نظر ڈالئے۔ دن کی پانچ فرض نمازوں میں فقط ایک نماز مغرب تو تین رکعات ہے باقی چاروں جفت رکعات پر مشتمل ہیں۔ سونے چاندی، نعت، زمین، سب کی زکوٰۃ میں دس فی صدی، بیس فی صدی، چالیس فی صدی کی شرحیں آخر وتر تو نہیں جفت ہی ہیں۔ آذان و اقامت میں ہر فقرے کو جفت ادا کرنے کا حکم دیا گیا حالانکہ مذکورہ حدیث اگر اتنی ہی عام ہوتی جتنی آپ سمجھ بیٹھے ہیں تو کیا رکاوٹ تھی کہ یہ فقرے یا تو اکہرے رکھے جاتے یا تہرے کر دیے جاتے۔ روزے تیس بھی ہیں اور ۲۹ بھی۔ حالانکہ اگر اللہ کو ہر معاملے میں۔ یا کم سے کم عبادات ہی کے معاملے میں بلا تخصیص تردد پسند ہوتا تو اس کے لئے کیا مشکل تھا کہ چاند کو اتیس دنوں میں مقید کر دیتا اور فوری ہینہ ہینہ ۲۹ یا ۳۱ دن کا ہو کر تار سال کی مدت بھی قرآن میں بارہ ہینے بیان ہوئی اور آپ جانتے ہی ہیں کہ بارہ کا عدد طاق نہیں جفت ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ارض و سما کے طبقات کا سات ہونا فقط ایک نکوینی راہ ہے جس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ اللہ کو وتر پسند ہے یا جفت۔ اگر اس سے تعلق ہوتا تو اسے کون روک سکتا تھا کہ تمام ہی نو امیں فطرت اور تمام ہی مظاہر کائنات اور جملہ احکام و عبادات میں طاق عدد کا التزام نہ فرمائے۔

آپ سیرت کا مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اہل کو جن لوگوں نے قبر میں آماران کی تعداد چار تھی نہ کہ تین یا پانچ حالانکہ اگر عند اللہ و ترکی عجوبیت والی حدیث اتنی ہی وسیع المصداق ہوتی جتنی آپ سمجھ لے پی تو کیا وجہ تھی کہ صحابہؓ اس اہم موقع پر وتر کو بھول جاتے۔

ہمارے جواب کا تعلق چند سے تھا۔ آپ کو علم ہی ہو گا کہ مختلف غزوات کے مواقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ال۔ اس بات کے تقاضا کی اپیل فرماتے رہے ہیں۔ اس اپیل پر بے شمار صحابہؓ نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق

ہے یا نہیں؟

(۳) جہ سے آمین کہنا جائز ہے یا نہیں؟

(۴) بزرگمان دین کی رو میں حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟

ہمیں اُمید ہے کہ آپ ہمارے مسائل کو ضرور حل کر کے جواب فرمائیں گے۔

جواب :-

اس طرح کے سوالوں کا جواب ہم پچاس بار دے چکے مگر زندہ ہیں تو ہزار بار اور دیں گے۔ نئے نئے قارئین ہمارے پچھلے جوابوں سے باخبر نہیں اور ہمارے جوابات ابھی کتابی شکل میں آئے نہیں لہذا حوالہ بھی نہیں دے سکتے کہ وہاں دیکھ لو۔ برادر ابن اسلام ہمارے پیارے بھائی ہیں۔ انھیں سادہ لوحی اور علم علمی کی بنا پر لوگ بہکا گیا تو ہم بار بار ڈوکیں گے۔

(۱) یا عبد القادر شیعاً لہذا کا وظیفہ ایسا اکل شرک ہے کہ اگر کہیں سچی اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ ایسا وظیفہ پڑھنے والوں اور ایسا غرہ لگانے والوں کو مرتد و فتنہ دے کر ان سے توبہ کا مطالبہ کرے گی اور توبہ نہ کریں تو گردن اڑا دے گی۔ غلط قسم کی تعلیمات کوڑے کرکٹ میں اگر قرآن و حدیث کے آب دار موتی چھپانہ دیئے گئے ہوتے توبہ و وقوف سے بے وقوف مسلمان بھی ایسے وظیفوں کے حکم میں نہیں آ سکتا تھا۔ مگر غلط قسم کی پیری مریدی اور بگڑے ہوئے تصوف کے سادہ دل اور خدا پرست مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھاپا مار کر ان کی عقل خراب کر دی۔ وہ بیچارے کیا کریں جب فلاں حضرت اور فلاں شاہ صاحب اور فلاں قطب الادبیار اور فلاں واعظ گل انسانی فرما رہے ہیں۔ قرآن کی آیات ناطقہ سے کچھ سرکدار نہیں۔ حضورؐ کے ثابت شدہ ارشادات سے کوئی دھجی نہیں لائیں گے دھونڈ دھونڈ کر وہ کمزور روایات جن کا حسب نسب یکسر متنبہ منطق وہ نہ اٹھائیں گے جن کا سر پر نہیں۔ دلائل سے نہ جھجھکے تو غضب ناک ہر کوئی نہیں

توجہ بھی دی ہے۔ کیا کسی تاریخ میں آئے دیکھا کہ نقد یا سازد سامان پیش کرتے ہوئے کسی معروف صحابی نے وتر کا پہلو ملحوظ رکھا ہو۔ کئی مثالیں ایسی موجود ہیں کہ سوادِ نط بطور ”چندہ“ پیش کئے گئے۔ ان میں ایک کم یا زیادہ کر کے ۹۹ یا ایک سو ایک کا عدد نہیں بنایا گیا حالانکہ صحابہؓ سے بڑھ کر اللہ اور رسولؐ کی پسند کا لحاظ رکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ہمارے جس جواب پر آپ معترض ہوئے ہیں وہ چند ہی سے متعلق تو ہے۔ ہم پھر دہراتے ہیں کہ اس معاملے میں طاق عدد کا خیال رکھنا بعض حضرات کا اپنا قیاس تو ہو سکتا ہے شریعت اس کے لئے کوئی بنیاد نہیں دیتی۔ جس حدیث کو آپ نے بنیاد بنایا ہے وہ دعاءِ تسبیح سے یا اللہ کے اساتذہؓ سے مخصوص ہے۔

یاد رکھیے۔ قرآن و حدیث کی صحیح تشریح و تفہیم جہاں بڑا کاروبار ہے وہیں غلط تفسیر بڑا کاروبار بھی ہے فقہاء کو اسی لئے قرآن اور حدیث میں بڑی نعمت کہا گیا ہے۔ احادیث کا صرف مطالعہ کر لینا ہر شخص کو فہم حدیث کا اہل نہیں بنادیتا۔ عطاری اور حکمت میں فرق ہے۔ عطاریوں کے پاس بے شک دواؤں کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے مگر اس ذخیرے کا صحیح استعمال حکماء ہی کر سکتے ہیں۔ کسی فقہی حکم کے بارے میں آپ جلد بازار نہ طور پر یہ فیصلہ ہرگز نہ دیں کہ اوہو یہ تو فلاں حدیث کے خلاف ہے۔ ایسا کرنا آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی بھٹکانے کے ہم معنی ہوگا۔

ماہین نہ مانیں آپ کو یہ اختیار ہے ہم نیک و بد حضورؐ کو سمجھانے جائیں گے

وہی پرانا راگ

سوال :- (نام ندارد) کیسے (کشمیر)

(۱) خبردار کریں کہ خلیفہ یا شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے جہاز نہ ہے یا نہیں؟ (مذہب حنفی) حکم فرمائیں۔ تاکید ہے۔ بھر بانی اس کا جواب مطابق قرآن و حدیث فرمائیں۔ (۲) اور یہ بھی فرمائیے کہ عورتوں کو زیارتِ قبور کرنا جائز

دیوبندی۔ بدعتیہ۔ منکر اولیاء وغیرہ وغیرہ۔

لئے کشمیری بھائیو! یاد رکھو قیامت کے دن جب حساب کتاب ہوگا تو ہمارے اور تمہارے سر کے عقائد اعمال بس قرآن اور احادیثِ قویہ ثابتہ کی کسوٹی پر جانچے پرکھے جائیں گے اور اسی اعتبار سے جنت و دوزخ کی تقسیم ہوگی۔ وہاں نہ بڑے پیر صاحب کام آئیں گے نہ چھوٹے۔ سیدنا حضرت شاہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ صاف کہہ دیں گے کہ اے اللہ میری کچھ خطا نہیں ہیں تو اپنی قبر میں پڑا تھا اور زندگی بھر میں نے توحید کی تعلیم دی۔ رب شیطان نے بہکا سکھا کہ سارا فساد پھیلا دیا ہے۔ اہم عقل اگر شیطان کے بھڑکے میں آکر مجھے دستگیر اور حاجت روا اور نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگے تو میرا اس میں کیا قصور۔ میری تو مغفرت فرمائیے ان کا آپ جو چاہیں بتائیں۔

اور یہ بھی یاد رکھو۔ اگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے کوئی قول یا فعل ایسا کیا ہوگا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو ان سے بھی باز پرس ہوگی۔ خدا کی عدالت میں سب بندے مسئول ہیں۔ انبیاء تک اس کے خوف سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

(۲) قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اللہ کے سچے رسولؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کیا گنجائش رہی بحمت کی۔

قبروں کی زیارت تو آج مردوں کیلئے بھی قننہ بن گئی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے قبروں پر حاضری کی ترغیب فقط اس مقصد سے دی تھی کہ موت کو یاد رکھو تاکہ زندگی میں خدا کی نافرمانی سے ڈر لگا رہے۔ حساب آخرت اور مراحلِ قبر فراموش نہ ہو جائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ اپنے مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کیا کرو۔ بس۔ اس کے علاوہ کسی بھی مقصد کے لئے قبروں پر حاضری کی تعلیم قرآن و حدیث میں نہیں ملتی۔ مگر تصوف کی نادر مسائل نے ایک پوری شریعت ایجاد کر لی ہے جس میں قبروں اور

مردوں سے بڑھ کر کوئی شے دلچسپی اور عقیدت کا مرکز بنے ہی نہیں۔ فلاں بزرگ کے مزار کی یہ برکات ہیں۔ فلاں بزرگ کی درگاہ میں دعا بہت جلد مقبول ہوتی ہے۔ فلاں بزرگ فوراً مرادیں بر لاتے ہیں۔ فلاں قبر شریف سے فیض و برکات کی نہریں جاری ہیں۔ اس طرح کے خوشنما دعویٰ ہر طرف گونج رہے ہیں۔ عرسوں کی ریل پیل ہے۔ توایساں چل رہی ہیں۔ مزاروں پر دست بستہ عرض معروض ہو رہی ہے۔ سیکڑوں کتابیں لکھ دی گئی ہیں جن میں مغالطہ دینے والا ظاہر فریب مواد خوب جمع کیا گیا ہے۔

شاید اسی لئے حرمین شریفین کی حکومت نے یہ شدت اختیار کی کہ قبروں کو چومنا یا تودڑے لگے گئے۔ ٹھیک کیا اس نے۔ جو جائز چیز ناجائز اور حرام کا کھلا دروازہ بن گئی ہو اسے پابندیوں میں جکڑنا ہی اچھا۔ پچھلے بزرگ اور اولیاء اپنا اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے جا چکے۔ ان کی عقیدت و محبت یہ ہے کہ ہم بھی ان کی طرح دین پر عمل کر سں نہ یہ کہ ان سے دل سے ان کے مطر طرح کی فوق الفطرت کرامتیں اور صلاحتیں گھڑیں۔ انکی روحیں دنیا میں نہیں بھٹکتی ہیں۔ وہ تو نہ جانے کہاں آرام و راحت کے بستر پر محو استراحت ہوں گی۔ شاعرانہ تخیلات اور وہم پرستانہ تصورات کے ذریعہ ان کی روحوں سے رابطہ قائم کرنا اور رمار دچاہنا اور مرادیں مانگنا اسلام نہیں اسلام سے دوری ہے۔ اس معاملے میں کسی بھی انسان کا کہنا ماننا چاہئے خواہ اس کا کمر تہ ٹخنوں تک ہو اور عمائے کسبچ پورا گنبد بنا رہے ہوں۔ کہنے ہی عابد زاهد لوگ ایسے گزرتے ہیں اور آج بھی ہیں جنہوں نے کم علمی یا کم عقلی کی ارد میں بہت غلط عقیدے پھیلائے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عورتیں سچا اب تو مردوں تک قبروں پر حاضری دینا دین و ایمان کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔

(۳) آمین آہستہ یا زور سے کہنا اختلافی مسئلہ ہے۔ دونوں شریعتی حق پر ہیں۔ احناف کو چاہئے اپنے مسلک پر عمل کرتے رہیں اور زور سے کہنے والوں کو کمرہ تصورات نہ کریں

یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ یا عبد القادر شمس اللہ جیسے نعرے اور وظیفے حقیقی، شافعی، مالکی، حنبلی کسی بھی مذہب میں جائز نہیں ہیں۔ یہ فقط تصوف کا ذاتی مذہب، جسکی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

چلتی نشان سنسز مقصود می دہد
اے سالکان راہ طلب آئین ہدیہ ہوں

یار رسول اللہ کا نعرہ

سوال:۔ از۔ ماسٹر۔ م۔ شیخ۔

دسمبر ۱۹۸۷ء کے ماہنامہ علی میں مولانا حقانی صاحب کی کتاب ”شریعت یا پھلت“ پر تبصرہ بغور پڑھا۔ بار بار پڑھنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ آپ جو سمجھ بھی اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے صحیح ہے۔

مگر ساتھ ہی اس کے میں مندرجہ ذیل دو باتوں پر واضح طور پر معلومات چاہتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان باتوں کا واضح جواب دینے میں کوئی پس و پیش نہ کریں گے اور نیاز آئیں گے کہ زیادہ دیر انتظار کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔

سوال نمبر (۱) یہ ٹھیک ہے کہ یار رسول اللہ کہنے والے غلطی پر نہیں کیونکہ ”یا“ صرف حاضر و ناظر کے لئے ہی آتا ہے اور حاضر و ناظر صرف خدا ہی ہے مگر متعدد کتابوں میں ”رسول اللہ“ کو ”حیۃ النبی“ کہا گیا ہے۔ یہ لفظ کہاں تک صحیح ہے۔ اگر ”حیات النبی“ صحیح ہے تو پھر ”یار رسول اللہ“ کہنا میرے خیال میں درست ہوگا۔ اور اگر ”یار رسول اللہ“ کہنا درست نہیں تو پھر ”حیۃ النبی“ بالکل غلط ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

سوال نمبر (۲) قرآن شریف میں متعدد جگہ رسول اللہ کو ”یا ایھا النبی“ ”یا ایھا المرسل“ وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں اور آپ حضرت بھی اُس وقت دنیا میں موجود تھے اس لئے اللہ تعالیٰ

اور شوائع وغیرہ کو چاہئے کہ اپنے مسلک پر عمل کرتے رہیں اور آہستہ سے کہنے والوں کو کاٹنے نہ دوڑیں۔ بس اس کے سوا کوئی راہ عافیت نہیں۔

(۴) حاضر و ناظر فقط اللہ ہے۔ ہر گاہ کہ دین کی روحیں نالتو نہیں ہیں کہ دنیا کے خاکدان میں چکر لاتی اور منڈلاتی پھریں۔ جن لوگوں نے بھی مسلمانوں کو روجوں کے چکر میں پھنسا یا ہے انھوں نے دراصل ایک ایسی بھول بھلیاں میں پھنسا دیا ہے کہ اس سے نکلنا ہی مشکل۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور اس عقیدے کے ثبوت میں انھوں نے کتابوں کا اتنا بڑا ڈھیر لگا دیا ہے کہ ہماری ”روحانی“ کتابوں کا ڈھیر اس سے آدھا تھائی بھی نہ ہوگا مگر دونوں کا علم کلام اور طریق استدلال بہت مشابہ ہے۔ مفروضات ہی مفروضات کا ڈھیر۔ پیاز جیسا کہ چھلکے پر چھلکا اتارے جلدیے مغز نہ ارد۔ جن مسلمانوں کو عجوبہ پرستی کا شوق ہے وہ تو اپنا شوق پورا کئے جائیں مگر جنھیں دین و ایمان عزیز ہے اور چاہتے ہیں کہ آخرت خطرے میں نہ پڑے ان کے لئے عافیت اور سلامتی کا واحد راستہ یہ ہے کہ صرف ان عقائد پر تمیز جو قرآن سے یا مضبوط ترین حدیثوں سے صاف صاف ثابت ہوں۔ کسی کتاب میں اگر انھیں روجوں وغیرہ کے چکر سے متعلق کچھ حدیثوں سے حوالے یا بزرگوں کے اقوال نظر آئیں تو ان پر بھی آنکھیں بند کر کے بھروسہ ہرگز مت کریں۔ بے شمار حدیثیں اور اقوال پھیلے زمانوں میں گڑھے گئے ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی کتب قدیمہ میں درج بھی ہو گئے ہیں۔ ان کا فقط درج ہو جانا ان کے صحیح ہونے کا ثبوت نہیں۔ تصدیق کے لئے کسی مستند عالم کا دروازہ کھٹکھٹائیے اور مستند عالم اسی کو سمجھے جو خدا کی کتاب اور بارے پیغمبر سے مستمداً ارشادات کو ہر دوسری چیز پر فوقیت دیتا ہو۔ دین کا علم ان دوسرے چیزوں کے سوا کہیں نہیں ہے۔ تمام بزرگ اولیاء قطاب اور شیوخ اللہ اور رسول ہی کے علم ہیں۔

نے ان سے حاضر و ناظر میں گفتگو کی ہے مگر بقول آپ کے
آج رسول اللہ دنیا میں موجود نہیں تو نعوذ باللہ قرآن
پڑھنے پر ہمیں بھی ”یا ایھا النبی اور یا ایھا المرسل“
وغیرہ کی بجائے اور کچھ پڑھنا چاہیے؟

جواب :-

”حیات النبی“ ایک علمی مسئلہ ہے۔ یہ بات تو قابل
اعتماد حدیثوں سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے
اجسام مبارکہ کو مٹی نہیں کھائی۔ لیکن ان مدفون جسموں کو
کمی طرح کی زندگی بھی میسر ہو یہ ثابت نہیں ہے۔ البتہ
صرف سیدالابرار خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے بارے میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم
ہوتا ہے کہ آپ کے جسم مبارک کو ایک طرح کی زندگی بھی
میسر ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مندرجہ ذیل تفصیلات کو
ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے :-

ایک یہ کہ حدیثوں ہی میں بہت سے ایسے بھی دلائل
موجود ہیں جن کی بنا پر بعض اہل علم ”حیات النبی“ سے انکار
کرتے ہیں اور جن حدیثوں سے ”حیات النبی“ ثابت کی جاتی
ہے ان کے کچھ اور معنی لیتے ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ ایسا مسئلہ
نہیں رہا ہے جس پر تمام امت کا اتفاق ہو۔

دوسرے یہ کہ حیات النبی کو ثابت کرنے والی
روایات کا علمی و فنی درجہ س اتنا ہی ہے کہ ان سے ایک
گمان غالب حاصل ہوتا ہے جسے ظن کہتے ہیں یقین کامل
حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی روایات پر بھروسہ تو کیا جائے گا
مگر اسی حد تک کہ وہ کسی یقینی عقیدے کے خلاف نہ پڑتی
ہوں۔

تیسرے یہ کہ جس قسم کی حدیثیں یقین کا فائدہ دیتی ہیں
ان سے اور قرآن سے جو عقیدہ اور نظریہ صاف طور پر
ثابت ہو رہا ہو اس کے خلاف نہ تو کوئی روایت قبول
ہو گی نہ عقلی دلیل۔

ان تینوں باتوں کو کئی بار پڑھ کر اچھی طرح ذہن میں

بٹھالیجے اور پھر ہماری معروضات سنئے۔
قرآن کی بہت سی آیات سے بالکل واضح اور قطعی طور
پر مندرجہ ذیل امور ثابت ہیں :-
ایک یہ کہ صرف خدا ہی وہ ہستی ہے جو ہر وقت ہر جگہ
موجود ہے اور نہ صرف پکار کو سنتا ہے بلکہ دل ہی دل میں
مانجی جانے والی دعاؤں کو بھی سنتا ہے اور قلب و ذہن کی
ہر ہر کیفیت سے باخبر ہے۔

دوسرے یہ کہ تمام انبیاء و اولیاء اس کے بندے ہیں اور
بشر ہیں۔ ان میں کوئی فوق البشر طاقت و صلاحیت نہیں۔
ان سے جن حجرات یا کمرات کا ظہور ہوتا ہے وہ اسی وقت
ہوتا ہے جب اللہ اسے مناسب سمجھے اور ارادہ فرمائے۔
تیسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور ہستی میں کوئی بھی ایسی
صلاحیت فرض کر لینا شرک ہے جو اللہ سے مخصوص ہو۔
اللہ اپنی ذات ہی میں یکتا نہیں صفات میں بھی یکتا ہے۔
ہر وقت ہر جگہ موجود ہونا اور ہر دعا، پکار، فریاد،
گزارش کو سن کر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا تنہا
اس کا کام ہے۔ یہ وصف کسی اور میں نہیں ہو سکتا اور
جو لوگ اس وصف کو کسی اور میں تسلیم کریں گے وہ منکر
ہوں گے۔

یہ تینوں باتیں جب قطعی اور اٹل ہو گئیں تو اب کسی
بھی دلیل سے ان کے خلاف عقیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ ہر
استدلال رد کیا جاسکتا ہے مگر قرآن کو رد نہیں کیا جاسکتا
جب یہ آپ سمجھ گئے تو اب حیات النبی کے مسئلے پر
غور کیجئے۔ بعض روایات سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ
ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ کو اپنی قبر شریف
میں ایک طرح کی زندگی حاصل ہے۔ یہ زندگی بعینہ دنیاوی
زندگی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ تب
کو معلوم ہو گا کہ تشرآن میں شہداء کو بھی زندہ جاوید
کہا گیا ہے لیکن اللہ کے رسولؐ نے شہید ہونے والے صحابہؓ
کا ترکہ ان کے وارثوں میں بتوایا اور ان کی بیواؤں کی
شادیاں کرانیں۔ صاف ظاہر ہے کہ شہداء کو اگر ٹھیک

عمر اکوڑ غلاتے ہیں اس لئے اس کا بھی جواب ہم دیتے ہیں۔

قرآن میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا کلام ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں انبیاءؑ سے بھی خطاب ہے، صحابہؓ سے بھی۔ کہیں شیطان کو بھی مخاطب بنایا گیا ہے۔ کہیں ائمہ متکلمین کلام میں کلام کر رہا ہے۔ کہیں کسی پیغمبر کی گفتگو بیان کی گئی ہے۔ بندوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کلام کو ایک بھی حرف بدلے بغیر پڑھا کریں۔ یاد رکھا کریں ہر مسلمان یہ بھی جانتا ہے کہ یہ کتب نازل ہوئیں۔ لہذا کوئی غلط عقیدہ یا تصور اس کی تلاوت سے پیدا نہیں ہوتا حضرت تو بہت بعد میں مبعوث ہوئے۔ حضرت عیسیٰ اور موسیٰ اور دیگر انبیاءؑ تو ان سے قبل گذر چکے۔ یہاں تک کہ حضرت آدمؑ سے مقدم ہیں۔ قرآن میں نقطہ یا پہا المزمحل ہی نہیں یا آدمؑ بھی ہے۔ یا عیسیٰ اور یا موسیٰ اور یا ابراہیمؑ بھی ہے۔ اگر کسی مرتکار نے آپ کو یہ کہا دیا ہے کہ یا تمہارا المزمحل اور یا تمہارا الحدیث اور یا تمہاری النبی کی تلاوت کے حکم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ زندہ اور حاضر و ناظر ہیں تو پھر یہ بھی ثابت ہو گا کہ سارے نبیؑ ہماری صحابہؓ زندہ ہیں۔ بلکہ قرآن میں تو فرعون اور کفار سے بھی کتنی ہی جگہ خطاب ہے۔ انھیں بھی حاضر و ناظر ماننا ہو گا۔

کلم عقلی کی کوئی حد ہوئی جا چکی۔ حاضرو ناظر کی منطق کو کلم عقلی کی حدود سے گذر کر مایہ نوا لیا کے دائرے میں جا چکی ہے۔ آپ خدا کے لئے واہیات کوگوں کی صحبت اور واہیات کتابوں کے مطالعے سے بچیں ورنہ سر میں جذبات مغرے شکل مٹ جائے گا اور آپ کو پتا بھی نہ چلے گا کہ یہ ہلالِ شریح اور گندے دلائل آپ کے دین و ایمان کو کس طرح اندر ہی اندر گھسنے کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے۔ کوئی پتھر یا سہلو تو اس پر گریں سے کندہ کر لیجئے کہ خدا کے سوا کوئی حاضرو ناظر نہیں اور یا رسول اللہ کا مغرہ اس عقیدے کے ساتھ لگانا کہ حضور

وہی نہ زندگی حاصل ہوتی جسے دنیاوی زندگی کہا جاتا ہے تو نہ ترکہ مبتلا نہ ان کی بیویاں بیوہ کہلاتی ہیں۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ یہ زندگی کسی اور نوعی ہے جسکی حقیقت کو ہم دنیاوی زندگی پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح حضورؐ کو ان کی قبر میں زندہ مان لینے کا مطلب نہیں کہ وہ دنیا والی زندگی سے متصف ہیں۔ یہ زندگی تو اسی دن ختم ہو گئی جب صحابہؓ نے آپؐ کو دفن کیا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ ان محمدیاً قدامات رہے شک فہم موت کے آغوش میں چلے گئے) اب جو زندگی ہے وہ اور طرح کی ہے جسکی حقیقت کو پوری طرح سمجھنا ہم انسانوں کے لئے ممکن نہیں اور دنیا والی زندگی پر اسے قیاس کیا ہی نہیں جاسکتا۔

یہ تو ہونی مسئلے کی عقلی نوعیت۔ اب ایک منٹ کو چلنے مان لیجئے کہ حضورؐ کو وہی زندگی حاصل ہے جسے ہم سب ”زندگی“ کہتے ہیں۔ یعنی فرض کر لیجئے کہ حضورؐ اسی طرح زندہ ہیں جیسے آپ اور ہم فی الحال زندہ ہیں۔ تو اس سے بھی حاضر و ناظر کا وہی اور مہر کا نہ عقیدہ جواز نہیں پاتا نہ ”یا رسول اللہؐ“ کی گنجائش نکلتی ہے۔ موتی ٹی بات ہے کہ آپ زندہ سلامت اپنے گھر بیٹھے ہیں۔ ہم بھی یہاں دیوبند میں زندہ ہیں۔ تو کیا ہم یہاں جلتی پھڑکتی آپ کو صدا دیں تو آپ سن لیتے؟ ظاہر ہے نہیں سن سکیں گے حالانکہ ہمارا آپ کا جسمانی فاصلہ سینکڑوں میل کے دائرے سے نہیں بڑھتا۔ پھر یہ کیسے تصور کر لیا کہ چار سو مل ہم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے وہ یہاں سے ہماری صدا سن لے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ "حیات النبی" کے عقیدے کو درست مان کر بھی ان خرافات کا جواز دیا نہیں جوتا جو تہتم پرستوں نے گھڑی ہیں۔ یہی آپ شیوہ منطقی جو آیات قرآنہ کے تعلق سے پیش فرمائی ہے تو اگرچہ یہ ان سچوں کی منطق ہے جن کے اچھی موبھی نہیں نہ نکلی ہوئی مگر بدعتی حضرات اسی طرح کی منطق بازی سے سادہ دل

مسن رہے ہیں شرک کی بدترین قسم ہے۔

بدعات و توہمات

سوال ۱۰ :- از :- علی محمد کشمیر۔

کشمیر میں بعض مقامات پر درود بصیغہ خطاب ہی پڑھتے ہیں یہ ہمارے گاؤں کی مسجد بتریف میں درود کے ساتھ مانگنا مانگی بہت ہوتی ہے۔ جب کوئی درود کے ساتھ مانگنا مانگی پر اعتراض کرتا ہے تو کچھ حضرات بغیر کسی علمی دلیل کے جواب دیتے ہیں کہ جائز ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر اور ادا درود درود ختم کر کے دل کھول کر مسجد میں غیر اللہ سے دعا مانگی جاتی ہے۔ تو یہ لوگ حضرت پیر رحمۃ اللہ علیہ کا فرمودہ پیش کرتے ہیں ”بلاد اللہ ملکی تحت حکمی۔ و وقتی قبل قلبی قبل صفائی“ (ترجمہ) اللہ کے سارے شہر اور ملک میرے حکم کے تحت ہیں۔ اس سے پہلے میرا دل نہ ادا درود کا مشعلہ تھا۔ اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کبریت شریف میں فرماتے ہیں کہ حضور خدا کے قریب اتنے ہوئے کہ دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا۔ کسی نامعلوم نعت میں۔ ”تحت گاہ کو قاب تو سینہ“ کہا گیا ہے۔ یہ بھی مان لیں کہ حضور خدا سے ابرو کے برابر نزدیک پہنچ گئے مگر تحت گاہ سمجھ میں نہ آیا۔ ہمارا ایمان خدا اور اس کے رسول پر ہے۔ لہذا ان ہی کی طرف رخ کر کے قرآن اور حدیث کے مطابق جواب چاہتے ہیں۔

جواب :-

درود بصیغہ خطاب پر ہم بارہا لکھ چکے۔ جو سب سے حل نکلتی ہیں۔ خواہ وہ عبادات کے شعبے کی ہوں یا سماجیات کے دائرے کی وہ دلیل کی مار سے بہ آسانی ختم نہیں ہوتیں۔ گوئی کہ وہ دلیل سے بے نیاز محض رسم و عادت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا رواج ایک طویل مدت کا رہا ہے منت ہوتا ہے لہذا طویل مدت تک ہی ان کے خلاف آواز اٹھائی

جاتی رہے تو شاید وہ رفتہ رفتہ ختم ہو سکیں۔

رہا وہ شعر جو آپ نے نقل کیا تو دراصل اس طرح کی بہت چیزیں یا ر لوگوں نے گھر گھر کر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دی ہیں اور سلا بعد سلا وہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اب بے چارے کم علم اور سادہ لوح مسلمان کیسے اس فریب کو سمجھیں۔ خصوصاً جب احمق قسم کے صوفیاء اور بے مغز قسم کے داعیوں اور مولویوں نے بھی ایسی لغویات کی بہت افزائی متعدد وجوہ سے کی تو عوام کیسے بہ آسانی ان کے چکر سے نکل سکتے تھے۔ متعدد وجوہ کی تفصیل یہ ہے کہ کہیں تو دنیا کا نام اس کا مقصود ہوتا ہے۔ سادہ لوح ایسی باتوں سے خوب بیوقوف بننے ہیں اور داعی یا مولوی یا پیر صاحب کے معتقد ہو کر نذرانہ فصلانہ گزرا رہے ہیں اور کہیں ازراہ کم عقلی یا اعظا و مولوی حضرات خود ہی ان داہی چیزوں کو درست سمجھتے ہوئے بڑے اخلاص سے عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو اصرار ہی ہو کہ واقعی حضرت شاہ صاحبؒ نے ایسا فرمایا تھا تو اس سے پوچھیں کہ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت نے پوری دنیا پر اسلام کا جھنڈا نہ لہرایا اور کافر حکومتیں کیوں موج اڑائی رہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جب جہاں جہاں دین خداوندی کو غالب کرنے کا موقع ملتا رہا انھوں نے اس سے غفلت نہیں برتی۔ ویسے بھی عام عقل کی بات ہے کہ نزدیک جتنے حصہ زمین پر بھی پوری قدرت حاصل ہوگی وہاں وہ وہی نظام قائم کرے گا جو اسے دل سے پسند ہے۔ شاہ صاحبؒ کو اگر واقعی سارے ممالک پر حکمرانی کا منصب حاصل تھا تو پھر یا تو یوں مننے کہ وہ دل سے اسلام کے شیدائی نہیں تھے بلکہ خدا نخواستہ کفر کا غلبہ انھیں مجبور تھا اسی لئے انھوں نے کافر سلطنتوں کو نہیں مٹایا یا پھر یوں ماننے کہ ان کے قول کا کچھ اور ہی مطلب ہے۔ ہمیں تو قرآن و حدیث میں کہیں یہ نہ بتایا گیا کہ اللہ کے سوا بھی کسی ہستی کو پوری دنیا پر حق حکمرانی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ

اب بھی ہمارے نزدیک مگر ای میں مبتلا ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ انھیں پورے عالم غلبہ و اقتدار حاصل ہے۔ مالک الملک تنہا خدا کی ذات ہے۔ وہ کائنات میں اپنے تمام احکام فرشتوں کے ذریعہ افذ کرتا رہتا ہے اور اولیاء و اولیاء انبیاء تک اس کے مطیع ہیں۔ بے اختیار۔ بے قدرت۔ سراسر اس کے ناج۔

اور یہ جو عمر کے بعد بنبرگوں کے تصرفات اور کرات غیرہ کے عقیدے رائج ہو گئے ہیں یہ اُس عجیب تصوف کے رنگ و بار ہیں جس نے اسلام کا حلیہ خراب کر کے رکھ دیا۔ "تخت گاہ" آپ کی سمجھ میں نہیں آیا مگر کیا یہ سمجھ میں آگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے اس قدر رعب پہنچ گئے ہوں کہ دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا ہو!

سورہ نجم میں دینی افتدانی قاب تو سین ادا دینی الفاظ آئے ہیں۔ ان پر گفت کر رہے ہوئے ہم شرح و بسط سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ حضور کا اور اللہ کا فاصلہ بیان میں ہو رہا ہے بلکہ حضور کا اور جبریل کا فاصلہ بیان ہو رہا ہے۔ مگر اس زبردستی کو کیا سمجھیں کہ کچھ حضرات نے پہلے بھی یہ بت کا غلط مطلب نکالا اور کچھ لوگ آج بھی اس پر سب سے دے رہے ہیں۔ حالانکہ ذرا عقل سے سوچئے اللہ کے بارے میں

ام مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ لا محدود ہے۔ اس کا ہم نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا وجود نہیں جس کی طرف اشارہ کر کے یہ کہہ دیا جائے کہ اللہ وہ نظر آ رہا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو کہ اس میں اور کسی اور وجود میں کمان دو کمان کا فاصلہ سو کر کیا جاسکے۔ جب بھی آپ کسی بھی دو چیزوں کا فاصلہ بیان کریں گے اس کا لازماً یہ مطلب ہو گا کہ ان دونوں میں چیز ایک ایسا جسم رکھتی ہے جو محدود ہے۔ خدا جب محدود ہے ہی نہیں تو نہ کوہ فاصلے کے کیا معنی۔ خدا تو کہتا ہے میں بندے کی رگ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوں۔ ایسی بے حجم و جہت بالاتر مہمتی کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ وہ فلاں جگہ تشریف فرما ہو گی اور کوئی انسان

اس سے کمان بھر کے فاصلے پہنچ جائے گا آخر کون سی عقل اور منطق سے مطابقت رکھتا ہے۔

خدا نے حضرت موسیٰ پر اپنی تجلی کا ایک پر تو ڈالا تھا۔ اسی کو خدا کے دیدار سے تغیر کر لیا جاتا ہے۔ اس معنی میں اگر یوں کہا جائے کہ شب معراج میں حضور اللہ کی بعض مخصوص تجلیات سے بہت قریب ہو گئے تھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن آیت قرآنیہ ہر حال اس سے بھی غیر متعلق ہی ہے۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ اگر آخرت کی فلاح و درکار ہو تو کسی ایسے عقیدے اور عمل سے واسطہ نہ رکھیے جو اللہ اور رسول کی مستند تعلیمات سے ثابت نہ ہو۔ درود شریف حالانکہ بے حد مفید و متبرک چیز ہے مگر قرآن و حدیث سے اس کی افادیت و فضیلت ثابت ہے لیکن اسے بھی اسی طریق اور اسی محل میں استعمال کرنا چاہیے جس کا ثبوت آثارِ صحابہ یا اقوالِ ائمہ سے ملتا ہو۔ مسجدوں میں بلند آوازوں سے درود کے دہن اور دعاؤں کا شور و بدعت کے قبیل سے ہے جب کہ دعا خدا ہی سے مانگی جا رہی ہو۔ لیکن دعا کسی اور سے مانگی جائے تو یہ شرکِ مبین ہے خدا کی پناہ۔

وہ جوابات

جن کے سوالات حذف کر دیئے گئے

اردو خطبہ جمعہ

اس موقع پر ہم بارہا لکھ چکے۔ ہماری سوچی سمجھی قطعی رائے آج بھی یہی ہے کہ خطبہ جمعہ صرف عربی میں ہونا چاہیئے۔ عربی خطبے سے قبل یا بعد اگر مقامی زبان میں خطبہ دینا ہے تو وقت ایسا رکھنا چاہیئے کہ نمازی اسے سننے پر مجبور نہ ہوں۔ حاضرین جمعہ جب شروع کی سنتیں پڑھ چکے ہیں اس کے بعد اردو خطبے کا مطلب یہ ہے کہ وہ

سماعت پر مجبور ہیں۔ ابھی جماعت تو ہوئی نہیں اس لئے جا نہیں سکتے۔ یہ ٹھیک نہیں۔

مقامی زبانوں میں خطبے کا جو مفاد ہے اسے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر نقصان کا پہلو یہ ہے کہ جتنا کچھ اللہ اور رسولؐ نے فرض و واجب قرار دیا ہے اس میں ایک اور واجب کا اضافہ ہو گیا۔ غیر عربی خطبہ جب ایسے وقت مقرر کیا گیا کہ نماز اس کی سماعت پر لامحالہ مجبور ہوں تو یہ عمل واجب ہی کے درجے میں آگیا۔ یہ نقصان بہت زیادہ ہے۔ عبادات کا دائرہ اللہ اور رسولؐ کے کھینچے ہوئے دائرے سے بڑھنا نہ چاہیے۔

دعخط اچھی چیز ہے۔ نماز جمعہ کے بعد اعلان کیجئے کہ بھائیو سنتوں سے فارغ ہو لو پھر دعخط ہو گا۔ اب کوئی مجبور تو نہیں۔ تمہیں سننا ہی کا رک جائیں گے۔ بادل ناخوستانہ سننے والوں سے کوئی ابھی توقع وابستہ کرے یہ نادانی کی بات ہے۔ اب جوڑ کے گکاوہ وہی ہو گا جو خوشی اور رضا سے سنے گا۔ یہ اثر بھی قبول کر سکتا ہے۔

بدعتی یا فاسق کے نیچے نماز

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ نماز ہر نیک بند کے نیچے ہو جاتی ہے لہذا کوئی شخص امام کے گرد اور عفت اندک کا حال جانے بغیر اس کے نیچے نماز پڑھ لیتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً مسجد میں کوئی شفق آدمی نماز پڑھانے والا نہ ہو۔ ہاں بدعتی یا فاسق موجود ہو تو مجبوری اس کے نیچے بھی نماز ہو جائے گی۔

البتہ جو لوگ جانے پہچانے بدعتی یا فاسق ہوں انہیں امام بنانا چونکہ ایک طرح پر فسق و بدعت کی جھلک انسانی اور تکبر ہے اس لئے ان کے نیچے نماز نہ کرنا صحیح ہے اگر کوئی غیر فاسق یا غیر بدعتی نماز پڑھنے کا اہل حاضر

سجد ہو۔
لڑکیوں کی تعلیم

اسلام کا اصول معاشرہ یہ ہے کہ مرد و زوری مکمل

اور عورتیں گھر سنبھالیں۔ احکام شریعت کی پابندی دونوں پر فرض ہے لہذا عورتوں کے لئے دو طرح کی تعلیم ضروری ہوئی۔ ایک وہ جس سے انہیں شریعت کا ضروری علم ہو۔ دوسرے وہ جس سے وہ گھر داری کو سلیقے سے چلا سکیں۔ بس۔ اس دونوں طرح کی تعلیم کو عورتوں کے لئے ضروری تو قرار دیا گیا لیکن یہ بھی شرط رکھ دی گئی کہ وہ اسلامی معیار حیا اور معیار اخلاق کے دائرے میں رہ کر لہی کچھ کر سکتی ہیں۔ اس سے باہر نہیں۔

اب یہ جو آج کل کلج اسکولوں میں مردوں کیساتھ عورتوں کو پڑھایا جا رہا ہے اس کا تو کوئی جواز اسلام میں ہے ہی نہیں۔ نہ اس کا جواز ہے کہ وہ ایسے اداروں میں ملازمت کریں جہاں ان کا واسطہ مردوں سے پڑتا ہو یا جہاں وہ اسلامی پردے کو نہ نبھاسکیں۔

زمانے کے تقاضوں کی جو بات بہت سے حضرات کہتے ہیں ان سے گزراش ہے کہ قومی بھی پھر آپ زمانے ہی سے نیچے مولویوں اور مفتیوں کو خواہ مخواہ کیوں زحمت دیتے ہیں۔ اسلام کا اپنا ایک مزاج اور معیار اور تصویر حیات اور نظام معاشرت ہے۔ وہ بہر حال زمانے کے غلط رجحانات کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔

دارٹھی کی بحث

جس مولوی نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ نے کبھی اپنی دارٹھی کا کچھ بھی حصہ نہیں کاٹا وہ جاہل ہے۔ حضورؐ نے دارٹھی پڑھنا کا حکم دیا ہے مگر یہ بھی ہدایت کی ہے کہ دارٹھی کی مناسب اصلاح کرتے رہو۔ یہ نہ ہو کہ وحشت زدوں کی سی صورت بنائے رہو۔ ایک ٹھنڈی دارٹھی بالکل کافی ہے۔ اس سے زیادہ ہو تو شوق سے کٹوا دیجئے۔

مولویوں کی بدعتی

اگر بعض مولوی اپنی اولاد کو غلط تعلیم دیتے ہیں اور غیر اسلامی لباس پہنتے ہیں تو بتائیے ہمارے پاس کونسا

فارموں کا ذخیرہ یا تو کچھ رشوت دے کر حاصل ہو سکتا ہے یا تعلقات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر۔ ناجائز فائدہ اس معنی میں کہ یہ نام حکومت تجارتی مقاصد سے نہیں چھاپتی اور ان کی قیمت بھی لاگت سے زیادہ نہیں رکھتی لہذا انھیں محکمہ کے کسی فرد سے تجارتی مقاصد کے لئے تجارتی سطح پر حاصل کرنا قانون سے فریب اور بددیانتی کہلانے کا۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ اس طرح کی تجارت کسی دیندار صالح مسلمان کے لئے مناسب نہیں اور نیت اگر سیک ہے کہ حاصل شدہ نفع کو تعمیر مسجد یا امام و مؤذن کے وظیفے پر خرچ کر دے گا تو یہ اور بھی برا ہے۔ مسجد میں تو خاص طور پر ایسا پیسہ لگانا چاہیے جس کی حالت ذرا بھی مشتبہ نہ ہو۔ اور امام و مؤذن جو نہ مسجد ہی کے خادم ہیں اس لئے انھیں بھی گندہ یا مشکوک پیسہ نہیں دینا چاہیے۔ لوگوں کا عجب حال ہے کہ جس آمدنی کو وہ خود بھی اشتباہ سے خالی نہیں سمجھتے اس کے لئے خرچ کی وہ یہ صورت نکالتے ہیں کہ تعمیر مسجد یا امام و مؤذن کی خواہ میں خرچ کر دو۔ گویا جس یا مشتبہ پیسے کے لئے سب سے زیادہ موزوں انھیں اللہ کا گھریا اس گھر کے خادم ہی نظر آئے۔ استغفر اللہ۔

ذبح کا ایک مسئلہ

گرفتار سہلائی کرنے کا کنٹرکٹ خواہ حکمت سے ہو یا کسی نجی ادارے سے۔ اگر کنٹرکٹ مسلمان سے تو اسے لازماً یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ذبح کرنے والا اسم اللہ کہہ کر ذبح کرے سائل کا یہ کہنا کہ روزانہ ہزاروں بکرے ذبح کرنے پڑتے ہیں اس لئے اسم اللہ اکبر طرہ کہہ کر ذبح کرنا شدید متواری ہے عجیب بات ہے۔ اگر ان کلمات کو زبان سے ادا کرنا کوئی ایسا کام ہوتا جس کے لئے ذبح کرنے والوں کو الگ سے وقت دینا پڑتا تب تو یہ غدر قابل فہم ہو سکتا تھا کہ سارا وقت تو ذبح کرنے میں گزر جاتا ہے مزید وقت اسم اللہ طرہ ہٹنے کے لئے کہاں سے لائیں۔ لیکن یہ کلمات تو چھری چلاتے

لہا ہے جس کے زور سے انھیں ٹھیک کر دس۔ آخرت میں غلط کاروبار یوں کو بڑے سخت حساب کتاب سے گندنا گا۔

آپ اگر ان کی دیکھا دیکھی یہی سب کریں تو آپ بھی اسے نہ بچ سکیں گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ برائی میں ان کی پیروی نہ کریں۔

لحانے کے فارموں کی خرید و فروخت

ڈاکھانے سے بنی آرڈر اور وی پی فارم پہلے مفت ملتا تھے لیکن اکٹھے ہزار پانسو لینے پر ان کی ایک قیمت رکھی۔ جس کا جی چلے پیسے دے اور بہ آسانی لے آئے۔ اب دوسری بہت سی چیزوں کی طرح ان کی بھی یا تو اسے یا خرابی انتظام کے باعث یہ بروقت اور بہ آسانی میں مل پاتے لہذا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ ضرورت مند حضرات نہ رابطہ طور پر انھیں حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ بے ضابطگی کسی نہ کسی درجے میں کہیں نہیں وقوع پذیر رہی ہے۔

اسے بے ضابطہ طریقے پر زیادہ کچھ فارم خریدتا ہے۔ یا نہ رابطہ نہیں بلکہ ذاتی رسوخ و تعلق کی بنا پر اسے ضابطہ میں صحیح قیمت پر فارم مل جاتے ہیں اور وہ انکی تجارت نامے مثلاً جو فارم اسے پانچ پیسے کا پڑا ہے اسے دس ند رہ پیسے میں بیچتا ہے تو یہ تجارت ایک پہلو سے حلال ایک پہلو سے حرام ہے۔ حلال تو اس لئے کہ جو چیز سب سے ضرورت مندوں کو حسب ضرورت ٹھیک قیمت پر نہیں آرہی تھی اس خرید و فروخت کے واسطے سے آگئی اور زید نے ایک خرید کر وہ چیز کو کچھ نفع لیکر فروخت۔ یہی تجارت ہے اور تجارتی نفع حلال ہو کر رہا ہے۔ اور حرام اس لئے کہ اس کاروبار میں قانون شکنی اور بے ضابطگی اور حکومت سے چوری کا عنصر بھی شامل ہے قانون شکنی کو اس وقت تک جائز نہیں سمجھتے جب تک ان ہمارے کسی دینی مفقہد یا جائز حق کی راہ نہ روکے۔

لیکن اگر حکومت کی طرف سے ایسی کوئی پابندی عائد کی جائے کہ جانوروں کی گزدیں اڑانی ہوں گی تو ایک مسلمان کے لئے یہ کنٹرلیٹ ہی سرے سے غیر جائز ہے۔ ہاں اگر معاملہ ملٹری کمانہ ہو تا جس میں مسلمان بھی ہیں بلکہ سارا گوسنت غیر مسلموں ہی کے استعمال میں آتا تب اس میں کوئی حرج نہ تھا کہ جانور بھی گزدیں کاٹی جائیں یا بجلی کے جھٹکے دیتے جائیں۔

ملک عینی جہیز کی رسم

اللہ کا شکر ہے کہ ملک کی زبان ابھی ہمارے آس پاس کے اضلاع میں نہیں پہنچی۔ اس وبا کے خلاف علمائے اسلام اور دردمند عوام اور مسلم و غیر مسلم ہر طرح کے شہری جہاں بھی کوئی اجتماع، جلسہ، منگ، سمینار منعقد کریں مبارک ہی مبارک ہے۔ لعنت ہے اس مرد پر اس کے سر پرستوں پر اور اس کے تمام ہم خیالوں پر جو ملک کی دلوں سے جہیز یا ملک یا جوڑا گھوڑا یا کسی بھی عنوان کی آٹھ میں نقد یا ساڑو سامان طلب کرتا ہے۔ ایسے تمام لوگ شریعت اسلامیہ کے باغی، ملت اسلامیہ کے دشمن اور قابلِ صدمہ ہزار مسلمان ہیں! نکاح سماجی بات رکھا گیا جائے اور دیہاتی محاورے میں حق پانی بن کر دیا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ بہت بڑے اجر آخرت کے مستحق ہوں گے وہ لوگ جو اس ملعون مرد و رسم کی بیخ کنی میں اپنی توانائی صرف کریں گے۔

ویسے دوسری بہت سی فضول رسمیں بھی شادی بیاہ کا جوڑ بنائی گئی ہیں۔ ان سب کو رفتہ رفتہ ختم کرنا چاہیے۔ باجاکا جا اور بے سبکی سجاوٹ تو خیر حرام ہیں ہی بہت سی وہ جزئیات بھی حرام ہیں جو فی ذاتہ جائز ہی جاسکتی ہیں۔ مثلاً بہت لمبی چوڑی اور مکلف دعوتیں۔ ان میں بی خفہ کوئی حرمت نہیں۔ آپ کسی خاص خوشی کے موقع پر شوق سے اپنے ارمان پورے کر سکتے ہیں لیکن شادی بیاہ، ختنہ اور ولادت وغیرہ ایسی خوشیاں ہیں جو خاص نہیں عام ہیں۔ ان میں جو روش اختیار کی جاتی ہے وہ بہت جلد سماج میں ذلت و عزت کا معیار بن جاتی ہے لہذا غریب

ہوئے اولاد کے جاتے ہیں اور ان پر کوئی فاضل وقت اسی طرح خرچ نہیں ہوتا جس طرح ذبح کرتے ہوئے سانس لیتے رہتے ہیں کوئی فاضل وقت خرچ نہیں ہوتا ذبح یا تھکا کا مکمل ہے اور الفاظ زبان کا۔ کیا ایک ہی وقت میں یہ دونوں اعضاء کام نہیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کسی بات کو اہم ہی نہ سمجھے تو وہ دس چیلے بہانے تراش سکتا ہے۔ بسم اللہ وغیرہ کی کوئی اہمیت تو دل میں رہی نہیں پھر اس کا التزام و شراہ کیسے نہ معلوم ہو۔ افسوس ہے کہ مسلمان خدا سے کتنی دور جا پہنچا ہے اور آخرت کی بھلائی کے لئے اسے زبان ہلانا بھی پہاڑ محسوس ہونے لگا ہے۔

یہ گفتگو حلال طریق ذبح کے تعلق سے تھی۔ اصولی حکم شرعی تو یہ ہے کہ ایک مسلمان اگر ذبح کرتے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر پڑھتا بھول جائے تب بھی ذبیحہ حلال ہو گا کیونکہ اس کے مسلمان ہونے کی بنا پر فرض کر لیا جائے گا کہ اس نے خدا کے سوا کسی نام پر یہ فعل انجام نہیں دیا ہے نیز اللہ اکبر کا اضافہ بھی ضروری نہیں۔ صرف لفظ "بسم اللہ" کافی تہنہ پاسکتا ہے۔ مگر یاد رکھیے۔ بھول جانا اور بات ہے لیکن جان بوجھ کر بسم اللہ ترک کرنا اور اس کے تلفظ کو ایک مصیبت سمجھ لینا بالکل دوسری بات ہے۔ دوسری بات بہت سخت ہے اور آخرت میں اس پر شدید کیڑ پڑ سکتی ہے۔

غیر جائز طریق ذبح کا معاملہ یہ ہے کہ جب کنٹرلیٹ ملٹری سے ہے اور یہ معلوم ہے کہ وہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں یہ گوشت استعمال کریں گے تو مسلمان کنٹرلیٹ کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرغیوں اور بکروں کی گزدیں اڑاتا رہے۔ یہ طریق ذبح غیر جائز ہے اور یہ کنٹرلیٹ گویا جان بوجھ کر بعض مسلمانوں کو حرام گوشت کھلا رہا ہے۔

اگر حکومت کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہیں کہ کس طرح ذبح کرو تب تو غیر جائز طریقے پر ذبح کرنا کنٹرلیٹ سے کالیا گناہ ہوا جسے وہ اپنی مرضی سے اختیار کئے ہوئے ہے

عصمت کے سلسلہ میں اسلام کا اپنا ایک معیار ہے جو کبھی بدلا نہیں جاسکتا۔ زمانے کے عام تقاضوں اور رد و اجوں سخت اگر عورت کو اسکول کالج کی تعلیم دلانا بھی ضروری خیال کیا جائے تو بہر حال اسلامی معیارِ شرف و عصمت کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوگا۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے آج کے وہ گئے جسے اسکول کالج بھی جو صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہیں ایسی فضا اور ماحول سے محروم ہیں جس میں یہ اُمید کی جائے کہ اسلامی معیار کا تحفظ ہو سکے گا۔ پھر ان اسکول کالجوں کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی نہیں جہاں مرد و زن کی مخلوط تعلیم رائج ہے۔ وہ تو سمجھیے کہ اسلامی معیار جیسا اور معیارِ شرف کی قتل گاہ ہیں۔

ڈاکٹر سی ڈاویہ گیری، سرسنگ، لوگری ان سب چیزوں کا شرعی حکم اسی بنیادی سوال سے بندھا ہوا ہے کہ آیا ایسا ماحول موجود ہے جس میں عورتیں یہ خدمات اسلامی معیارِ عصمت کا تحفظ کرتے ہوئے ادا کر سکیں یا نہیں ہاں اگر نہیں تو پھر یہ سب چیزیں ممنوع و مکروہ۔ اور اگر ہے تو ان میں فی ذاتہ کوئی حرمت نہیں۔

عورت کی کمائی مختلف نوعیتوں کی ہو سکتی ہے مثلاً ایسے گھریلو کام جو اسلامی پردے کے ساتھ انجام پاسکتے ہیں۔ اجرت پر سلائی کرنا۔ کاڑھنا۔ بچوں کو پڑھانا۔ اور کوئی محنت کرنا۔ عورتیں اگر اپنے شوہر کی غربت کی بنا پر اس طرح کے کام کریں تو یہ بالکل حلال ہیں اور ان سے کمائی ہوئی روزی حلال و طیب روزی ہے۔

اجاب کے تقاضے اور خواہشات

تجلی کے وسیع حلقے میں بہتر سے حضرات ہیں جو اپنی صواب دید کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر تجلی فلاں فلاں خدمت بھی انجام دے۔ مثلاً بعض کی خواہش ہے کہ عام فہم دس حدیث کا سلسلہ ہر ابرقائم رکھا جائے۔ بعض چاہتے ہیں کہ ہلکے ہلکے اصلاحی مضامین ضرور آئے جائیں بعض کا خیال ہے کہ ایڈیٹر تجلی عین بہت کر رہے ہیں اپنے

لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی عزت کی خاطر قرض لیں اور مرد معیار پر مضیقاتیں کریں۔ یہ بڑا فتنہ ہے اور فتنے کو اللہ نے قتل سے بھی زیادہ تہیج قرار دیا ہے۔ سادگی، توسط و اعتدال، نمود و نمائش سے پرہیز اور ایسے شعور و شعوب سے اجتناب جو ہسالیوں کی فینڈیں خراب کرے۔ یہ ہیں اسلامی بدایات کے پاکیزہ مظاہر۔ لوگ شادیوں میں لاٹو ڈاٹو سپیکر لگا لگا کر ریکارڈ بجاتے ہیں۔ فلمی ریکارڈ بجانا بچائے خود نگاہ ہے ہی بلکہ مزید قباحیت کا اضافہ یہ پہلو کر دیتا ہے کہ محلہ بھر کو گرج رہا ہے۔ دماغی کام کرنے والے پریشان ہیں۔ نیندیں اچٹ گئی ہیں۔ کان کے پردے پناہ مانگ رہے ہیں۔ لغت ہے وہ حشرِ مسرت جو پڑوسیوں کو خوشی دینے کے بجائے عذاب و تکلف دے۔

اس سے زیادہ ہم کیا کہیں۔ اصلاح کا کام کرنے والوں پر اللہ سلامتی اور استقامت نازل فرمائے۔

عورتوں کی ملازمت اور تعلیم وغیرہ

عورتوں کے لئے دو طرح کی تعلیم ضروری ہے۔ ایک شے جس سے انھیں اپنے مذہبی و اخلاقی نفسانیت سے آگاہی ہو دوسری وہ جس سے امورِ خانہ داری کے بہتر نظم و انتظام کا درس ملے۔ یہ دونوں طرح کی تعلیمیں انھیں گھر میں مل سکتی ہیں اگر والدین سلیقہ مند اور ذہنی فہم ہوں۔ رہی وہ تعلیم جسے آج کل ”تعلیم“ کہا جاتا ہے یعنی اسکولوں کالجوں کی سندیں حاصل کرنا، ڈاکٹری یا اور کوئی پیشہ سیکھنا یا سینے پر رونے کا ڈھنے کی ٹریننگ وغیرہ۔ تو یہ سب زوائد ہیں۔ ان کے سلسلہ میں اسلام کا بنیادی نقطہ نظر سمجھ لینا چاہیے۔

اسلامی نقطہ نظر سے عورت کے ذمہ روزی کا ناناؤ گھر سے باہر کی سرگرمیوں میں حصہ لینا نہیں ہے۔ یہ ذمہ داریاں مرد کی ہیں۔ عورت گھر سنبھالنے، بچوں کی پرورش کرنے اور بیوی کی حیثیت سے جو گھریلو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرنے کے لئے مامور ہے نیز عفت

قلم کو گھام دینی چاہیے۔ ازراہ کرم یہ مخلصین بعض سائل کا ہم بھی لیتے ہیں جن کی روش انھیں مرغوب ہے۔ ایسے تمام حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ کی خواہشات کا قلبی احترام کرنے کے باوجود ہم معذور ہیں کہ انھیں پورا کر سکیں۔ دراصل ہمارے دوست یہ بنیادی نکتہ نظر انداز کر رہے ہیں کہ ہر کارے ہر مردے۔ دنیا میں اللہ نے جہاں چاند سورج، سمندر، پہاڑ درخت ہوا بارش سب کا وظیفہ حیات جدا جدا رکھا ہے انسانوں میں بھی سب کے میدان کار اور فرائض الگ الگ ہی رکھے ہیں۔ صلاحیتوں کی تقسیم میں فرق کیا ہے۔ مزاج و مذاق رنگ برنگ بنائے ہیں۔ ڈاکٹری کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ایک شخص اگر انجینیری یا آرٹ میں ٹانگ اڑانے لگے تو وہ نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔ اسی طرح اگر شسترے ترکاری کاٹنے کا کام لیا جائے تو اسے شستر کا غلط استعمال کہیں گے۔

ہم سے اللہ جو کام لے رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے خود ستانی یا تعلیٰ کی ادنیٰ آمیزش کے بغیر ہم عرض کریں گے کہ ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک نظر ڈال کر بتائیے کیا اور بھی کوئی دینی وظی پر چھوے جو دین و ملت سے تعلق رکھنے والے متعدد موضوعات پر نقد و نظر اور حرج و تعدیل کا وہ بے لاگ فریضہ انجام دے رہا ہو جو تجلی دے رہا ہے۔ کیا فتوں کے آگے سینہ سپر ہو نا اور جلیل فاسد افکار کے سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش کرنا کوئی آسان اور بے قیمت عمل ہے؟ جو ہلکی پھلکی چیزیں آپ چاہتے ہیں وہ تو اور دس جگہ آپ کو مل جائیں گی۔ مگر تجلی اللہ کے فضل و کرم سے جو کچھ ہدیہ خدمت کر رہا ہے وہ اور کہیں نہ ملے گا یا ملے گا تو بہت کم اور شنہ اگر اپنے کام کی معنوی قدر و قیمت اور منفعت اور اثریت کا ہمیں احساس و شعور نہ ہو تا تو عام فہم درس حدیث یا درس قرآن یا بلکہ پچھلے اصلاحی مضامین بہت تھے۔ پھر پیش کرنے میں ہمیں اس بے شمار محنت، کٹھ کاوی، مغز

باشی اور مشقت سے نجات مل جاتی جو نقد و نظر کے شمار سخت کا لازمہ ہے جس کے بغیر تحریر و تحلیل اور علمی انتقاد کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی مقصد خدمت دین ملت ہے۔ ساری ہی خدمات تو ایک شخص انجام نہیں دے سکتا اپنی پسند کے سادہ، عام فہم اور فہم علی مضامین آپ نے سرسری جگہ پڑھیں۔ بہتیرے رسائل ایسی چیزوں سے معمور ہیں اس سطح کی کتابیں بھی کافی ہیں۔ ہم ہر حال ہم اپنی مخصوص راہ چلے جائیں گے اور اسی پر چلتے چلتے ایک دن آپ کو یہ تجربے ملے گی کہ:-

وہ جو بچتے تھے دولہے وہ دکاں اپنی بڑھائے کھینچ تان کر چسپاں کیا جاسکے تو غالب کا ایک شعر یہاں یاد آگیا ہے:-

آئے ہیں یکسی عشق پر رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میر بعد

ویسے اس بات سے شاید آپ انکار نہ کر سکیں کہ ”مسجد سے بچانے تک“ کا کالم آپ کو تجلی ہی نے دیا ہے۔ ہمارے اپنے نقطہ نظر سے ملائی کی بکواس خواہ کتنی ہی لغو ہو لیکن ہزاروں ہزار حضرات جس بُری طرح اس بکواس پر فریفتہ ہوئے ہیں کیا وہ ہماری خطا معاف کر دینے کے لئے کافی نہیں؟ ہم خشکی پھیلاتے ہیں مگر لا آپ کو ”تری“ دیتا ہے۔ ایں ہم غنیمت است۔

ایک بات اور ————— لکھا گیا کہ آپ زیادہ وقت بحث و مباحثہ میں خرچ کرتے ہیں حالانکہ قوم کی تعمیر کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعمیر و تخریب کا اگر صحیح تصور کسی کے ذہن میں ہو تو وہ ایسی سچی بات نہیں کہہ سکتا۔ طوفانِ امتداد آئے یا آگ لگ جائے یا گولہ باری ہونے لگے تو افکار و عقائد کی محبوب متاع کو بچانے کی کوشش کرنا عین تعمیر ہے نہ کہ کھیل کود۔ ہمارے ملک میں بہتری جماعتیں اور ادارے اور افراد اپنے اپنے انداز میں تعمیر و اصلاح کا کام انجام دے رہے ہیں۔ جماعت تبلیغی، جماعت اسلامی، مدارس

میلاد کا قیام

مروجہ میلاد بجائے خود بدعت ہے۔ اس میں قیام بدعت در بدعت۔ جو لوگ اصلاحی کام کر رہے ہیں ان کے لئے اصلاحی مقاصد سے بھی یہ طرز عمل جائز نہیں ہے کہ میلادوں میں شرکت کریں اور قیام کے وقت اس وجہ سے قیام میں شریک ہو جائیں کہ دوسروں کی دل شکنی نہ ہو۔ رواداری، نرمی، فراخ دلی اچھے اوصاف ہیں لیکن اصول و عقائد کے معاملہ میں استقامت، ثبات اور پختگی ضروری ہے

سیرت النبی کے جلے

جماعت تبلیغی والے ہوں یا کوئی اور سیرت کے سہلوں میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ میلاد والی تاریخوں کو ضروری قرار نہ دیا جائے۔ خاص طور پر جماعت تبلیغی کے بارے میں آپ کسی یہ شکایت کہ وہ بڑی مبالغہ آرائی کرتے ہیں سادہ لوحی ہے۔ بریلوی حضرت کچھ کم مبالغہ آرائی نہیں کرتے اور اب تو دیوبندیوں میں بھی یہ روگ پھیل چکا ہے خلاصہ یہ کہ حاکم میں تقریباً سبھی ننگے یا نیم برہنہ نظر آ رہے ہیں۔

جماعت تبلیغی یا علمائے بریلی سے جو شخص یہ توقع کرتا ہے کہ وہ کشف و کرامت اور علو اور افسانہ طرازی کے بغیر دین کے حقائق اور احکام بیان کر سکیں گے وہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ یہ دونوں مکتب فکر اپنے خیر میں علم ناما جہل کو شامل کئے ہوئے ہیں لہذا ان سے معیار علم و تقفہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

جن علمائے سیرت کے بارے میں آپ کو توقع سے معلوم ہو یا گمان غالب ہو کہ ان میں عقیدت رسول کی آڑ میں شریکانہ اور توہم پرستانہ خیالات نشر کئے جاتے ہیں ان کے لئے چندہ مت دیجئے۔ دیں گے تو شریک گناہ ہوں گے۔

یہ علماء و خطباء۔ یہ سب اپنی اپنی صواب دہی کے مطابق کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں لیکن اٹنا ہی ضروری کام بھی ہے کہ دینی افکار اور علمی حقائق کے خلاف کونے آتر سے جوقنے سر اُبھاریں، خرمین عقائد پر جو جگلیاں کر لیں، کشت و بولیت پر جو قلمی یا زبانی حملہ ہو اس کا بھرپور دفاع کیا جائے۔ آپ لو شاید معلوم نہیں ہمارے علماء سلف میں بے شمار حضرات "متکلم" کے لقب سے مشہور ہیں یعنی انھوں نے وقت کے باطل افکار سے زبان اور قلم کے ذریعہ طویل جنگ کی۔ بحث و مباحثہ سے لبریز ان کی تعظیم کتابیں لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور نہ جانے کتنی سی ٹیلیں کہ وہ دستبر دزمانہ کی نذر ہو گئیں۔ ایمان اسلام صلاً عقائد و افکار ہی کا تو نام ہے۔ ایمان کا محل اور مسکن قلب و ذہن ہیں۔ فکر و عقیدہ درست نہ ہو تو عبادتوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے زمین میں ناکارہ قسم کا بیج ڈال کر توقع کی جائے کہ عمدہ فصل ہاتھ آئے گی۔ آج قرآن و سنت کے افکار و عقائد پر اندر اور باہر دونوں طرف سے جس قدر مسلسل سنگباریاں ہو رہی ہیں اور جیسے جیسے نئے نئے ہتھیار تھے رہتے ہیں انھیں نظر انداز کر دینا معنی رکھنا ہے کہ ہم نے اپنی محبوب متاع دین کی بربادی، خوشتی منظور کر لی۔ یہ تو بڑی سخت بات ہے۔ ہم تنہا کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکیں یہ الگ بات ہے لیکن اپنی استطاعت پر مطابق تو ہمیں دفاع کرنا ہی چاہیے۔ نتائج اللہ کے تھے ہیں۔ دنیا کا ٹھیکہ دار کوئی نہیں۔ ہر شخص سے آخرت بن حساب اس کی طاقت و صلاحیت کے مطابق ہوگا۔ ہم خدا کی بارگاہ میں اس طرح حاضر ہونا چاہتے ہیں کہ جب ملک الملک دریافت فرمائے کہ اے بندے ادنیٰ میں کیسا رکے آیا ہے۔ تو ہم سجدے میں گر کر عرض کر سکیں کہ اے آقا! لا الہ الا انت تو یقیناً اور بے علیماں تو میرے علم ہی میں ہیں۔ ان کی سزا جو بھی دے برحق ہے لیکن یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تو قلم تو نے عطا فرمایا تھا اسے تیرا غلام تیرے ہی دین کی تعمیر و خدمت میں مجھس آیا ہے۔

را و وفا میں جان بازی کا دعویٰ کا آنہ آیا تنہا
 لا حاصل بے مصرف نکلا لفظوں کا سہا تنہا
 ہم نے ماضی کی تصویریں آنکھوں کے پردوں پر چھوڑیں
 آئینے کو آگے رکھ کر اکثر جی بہلایا تنہا
 اب یہ نیا شوق سے مجھ پر پتھر پھینکے تیر چلائے
 میں تو خود میں گونہ نشین ہوں پھر تیرا ہے اک یا تنہا
 ہنگاموں کی اس دنیا میں تنہائی نایاب ہے، لیکن
 جب بھی کوئی وقت پڑا ہے ہم نے خود کو پایا تنہا
 مشقِ ستم فرمانے والے کا ش بھی اتنا بھی سوجیں
 ضبط کا پیمانہ جب پھلکا، کیا میں ہوں گارو تنہا
 جب تلک چھلکے بادۂ عشرت جام کے حذر از ہارو
 لیکن پنی ہی پڑتی ہے غم کی مہمبا تنہا تنہا
 پہلے پہلے ہم سمجھے تھے دل ہی ان پر آیا تنہا
 یارو تم نے بستی بستی انسانوں کی بھیڑ تو دیکھی
 دیکھ سکو تو یہ بھی دیکھو ہر انسان ہے کتنا تنہا!
 بواہو سو! وہ پیکرِ عفت بام پہ کیا بے پردہ آتا
 آئینے نے اکثر جس کو پردہ کرتے دیکھا تنہا
 کیسے کیسے طعن سنے ہیں کم ظرفی کے بے صبری کے
 لرزا تھا میری پلکوں پر پانی کا اک قطر تنہا
 کس کا سوچ کیسے تارے، کافی ہے اربابِ نظر کو
 دریا کی اک بوند کیلی، صحرا کا اک ذرہ اتنا تنہا

دل نے کتنے شوق سے عامر یہ سودا منظور کیا ہے

ساری عمر وفا کی قیمت ان کا بس اک جلو اتنا تنہا

تفسیر ماجدی

— « ۸ » —

سلسلہ کیلئے دیکھیے
تجلی نقد و نظر نمبر

(۵) آیت ۲۲ کی تفسیر میں ”شمال و مغرب“ اور ”جنوب و شرق“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اگر وہ اوکاترب کا اضماف نہیں بلکہ محترم مفسر کے قلم سے نکلا ہے تو اس کی صحت میں ہمیں شک ہے۔ محاورہ بغیر واو کے ہے۔

(۶) آیت ۲۴ کے نوٹ میں ایک انگریزی کتاب کا نام دے کر صفحہ کی علامت (ص) دی گئی لیکن صفحہ کے ہند سے رہ گئے۔

(۷) آیت ۲۸ کی تفسیر میں ایک دلچسپ بحث ہے۔ آیت یہ ہے:-

”وَإِذْ نَرَيْنَا لَعْنَهُ الشَّيْطَانُ الْآيہ۔ اور جس وقت خوشنما کر دکھایا شیطان نے ان کی نظروں میں ان کے عملوں کو اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہو گا تم پر آج کے دن لوگوں میں سے اور میں تمہارا احسانتی ہوں۔ پھر جب سامنے ہوئیں دونوں ذمیں تودہ اٹھا پھر اپنی اٹریوں پر اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں۔ میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے۔ اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔“ (ترجمہ خلیفہ)

اس کا تعلق غزوہ بدر سے ہے جب اہل ایمان کی مدد کو فرشتے نازل ہوئے تھے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعہ شیطان کسی شکل میں مجسم ہو کر کفار کے سامنے آیا تھا اور ان سے مکالمہ کیا تھا یا محض قلوب میں دوسوہ اندازی کی تھی اور یہ سب اسی کی تمثیل و تعبیر ہے؟

ممدوح مفسر کا غالب رجحان یہ ہے کہ یہ تمثیل ہی ہے گفتگو زبان و الفاظ کی مدد سے نہیں ہوئی بلکہ جو دوسوہ شیطانی کفار کے قلوب میں گندہ اسی کو قول شیطانی کی حیثیت سے بیان کر دیا گیا ہے۔

اپنے اس رجحان کی تائید میں ممدوح نے دو نقلیں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”حسن بصری تابعی اور اسم تابعی اور دوسرے تحقیق سے بھی منقول ہے کہ شیطان مجسم ہو کر سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اس نے دوسوہ اندازی ہی کی تھی۔“

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی مشکل نہیں کہ یہ رائے بھی قابل اعتبار ہے اور کتنے ہی مفسرین اس کے قائل ہیں ہیں۔ خصوصاً قرآن کا یہ فقرہ کہ ”وَإِذْ نَرَيْنَا لَعْنَهُ الشَّيْطَانُ“ اعمال ہم اسی طرف رہنمائی کرتا نظر آتا ہے کہ

پر اللہ کی عظمت و قوت کا ہے اتنا تو انسان کو بھی نہیں ہو سکتا اور یہ خوف اسی علم سے پیدا ہوا اس لئے اس کا یہ کہنا محل اشکال نہیں اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ شیطان میں بھی خوفِ خدا کی بنا پر ایمان کی جھلک موجود ہے۔ مقصود و مطلوب جو کچھ ہے وہ خوفِ ایمانی ہے نہ خوفِ طبعی نہیں چاہے وہ کسی درجہ کا بھی ہو۔“

گزارش یہ ہے کہ آیت میں مذکور مکالمے کو جب ممدوح مجازاً اور تمثیل قرار دے رہے ہیں یعنی انہی الحقیقتِ اہلبیس نے کفار سے یہ باتیں نہیں کیں بلکہ جو شیطانی وساوس کفار کے اذہان و قلوب میں گزرے انھیں گفتگو کی شکل میں بیان کر دیا گیا ہے تو پھر اس اشکال کا کیا موقعہ رہا جسے انھوں نے حل فرمایا ہے۔ اشکال صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا تھا کہ شیطان نے واقعی اپنے منہ سے کہہ ڈالا ہو کہ میں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔ واقعی کہنا ممدوح اتنے ہی نہیں پھر اشکال کیسا اور کفر و ایمان کی بحث کیوں۔

حضرت حکیم الامتہ نے بھی اس اشکال کا ذکر کیا ہے اور اسے ان الفاظ میں حل فرمایا ہے کہ ”چونکہ نہ خوفِ بدوں یا کفر کے مقبول نہیں اسی لئے شیطان کا خدا سے ڈرنا اگر واقعی بھی ہو کچھ محل اشکال نہیں۔“

حکیم الامتہ کا اشکال رفع کرنا یہ محل اور با معنی ہے کیونکہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان نے بالمشافہہ (منہ در منہ) محل انسانی کی تھی۔ مگر ممدوح مفسر تو اسے تسلیم نہیں کرتے پھر اشکال کیسے پیدا ہو گا۔

مزید یہ سوال بھی ہے کہ شیطان کو اللہ کی عظمت و قوت کا جو علم ہے وہ تو بہت پہلے سے ہے۔ اس علم سے غرورِ بدر کے دن دفعتاً خوف پیدا ہو یہ تو عجیب ہی بات ہے۔ یہ خوف تو پہلے سے موجود ہونا چاہیے تھا۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ خوف اس علم کی بنا پر پیدا نہیں ہوا جس کی طرف ممدوح نے رہنمائی فرمائی بلکہ اس شخص میں صورتِ حال کے نظارے سے پیدا ہوا جو غرورِ بدر میں بکھوت اس کے سامنے آئی۔ اس نے

ذکر شیطان کی دوسرے اندازی کا ہے نہ کہ بالمشافہہ گفتگو کرینکا۔ لیکن پوری آیت پر نظر کی جائے تو زیادہ قوت کے ساتھ یہ خیال سرا بھارتا ہے کہ یہ فقط غائبانہ دوسرے اندازی کا معاملہ نہیں بلکہ منہ در منہ باتِ حقیقت کا معاملہ ہے۔ اور اس خیال کے لئے نقل بھی موجود ہے۔ جس روح المعانی سے ممدوح مفسر نے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں دوسرے کو مجازاً قول کہہ دیا گیا ہے اسی روح المعانی میں متعدد مفسرین کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ ابلیس سرادہ بن مالک الکنانی کی شکل میں متمثل ہو کر آیا تھا اور پھر منہ در منہ مکالمے کی تفصیل نقل کرنے کے بعد یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ روایت حضرت ابن عباسؓ اور کلبیؓ اور سدیؓ سے منقول ہے۔

سچ سمجھتے ہیں انسان کے بس سے باہر ہے کہ اس بحث میں کوئی قطعی بات کہہ سکے۔ دونوں امکان برابر کے درجے میں ہیں۔ نہ مشکل کہ ابلیس انسانی شکل میں آکر چرب زبانی ہو جائے نہ مشکل کہ اس کی دوسرے اندازی کو مجازاً مکالمے کی صورت دیدی جائے۔ ممدوح مفسر نے تعلیم نہیں کیوں شکلِ اول کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر شکلِ ثانی ہی کو نفاذ فی قصہ قطعیت دیدی ہے۔ حالانکہ ان کے مرشد اور ہمارے ممدوح مولانا اشرف علیؒ اپنی بیان القرآن میں حرفِ تہذیب دے دے فقرے کو دوسرے اندازی پر محمول نہ کر کے باقی مکالمے کو منہ در منہ والا مکالمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں۔

”اور دوسرے سے بڑھ کر یہ کیا کہ بالمشافہہ ان سے

کہا کہ۔۔۔۔۔“

اور علامہ شمسیر احمد عثمانیؒ بھی حضرت ابن عباسؓ والی ہی روایت پر مطمئن ہیں کہ ابلیس آدمی کے روپ میں آیا تھا۔ شاہ عبدالقادرؒ کا بھی یہی خیال ہے کہ بدر کے دن شیطان انسانی روپ میں جلوہ گر ہوا تھا۔

خیر۔ ممدوح مفسر نے جو پسند کیا۔ کیا۔ لیکن بحث کا ایک اور پہلو بھی ابھی ہے۔ شیطان کے اس قول پر کہ ”میں تو خدا سے ڈرتا ہوں“ انھوں نے یہ نوٹ دیا۔

”جتنا علم شیطان کو اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدے کا بنا

دیکھا کہ یہ تو فرشتے مسلمانوں کی مدد کو آگئے ہیں اور مسخ و
تفکر کے جو خواب بد نصیب نے دیکھے اور دکھائے تھے یلانیٹ
ہوئے جا رہے ہیں۔ تب وہ ڈر اور بھاگا۔

پھر یہ ڈر اپنی ذات کے لئے بھی نہیں تھا۔ اپنے بارے
میں تو وہ جانتا ہی ہے کہ اللہ نے قیامت تک کی جھوٹ
دے رکھی ہے۔ کس کی مجال ہے اس پر ہاتھ ڈال سکے۔ ڈر
کفار کے بارے میں تھا کہ نزول ملائکہ کے باعث ان کی
کم بختی صاف نظر آگئی تھی۔

اور کیا واقعی ڈر تھا بھی؟

ہم تو کہتے ہیں کہ یہ بھی ملعون نے جھوٹ بولا۔ جھوٹ اور
فریب تو اس کا اور صفت اچھوتا ہے۔ قرآنی بیان کے مطابق
وہ پہلے تو انسان کو کفر پر ابھارتا ہے اور جب وہ اس کے
بھڑے میں آکر ماقبت تباہ کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ بھائی
صاحب میں تو تم سے بری ہوں مجھے تو اللہ کا ڈر ہے (کَمَثَلِ
الشَّيْطَانِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ الْكُفْرَ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ
بِرَبِّیْ عَزِیْمٌ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ)۔

کیا یہ صریح دروغ بانی اور چال بازی نہیں۔ اللہ سے
وہ ڈرتا تو اس وقت ڈرتا جب حکم سیدہ دیا گیا تھا مردود
اس وقت ہی نہیں ڈر بلکہ دیدہ دلیری اور طرح صافی کی
حد کر دی تو اب کسی موقع پر کیوں ڈرنے لگا۔ جھوٹا اور
مکار ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ خوف ایمانی تو کیا اس میں
خوف طبعی بھی نہیں۔ وہ آتش کا پرکانہ ہے۔ اس میں اللہ
نے اپنی حکمت تکوینی کے تحت ڈرنے کا جذبہ پیدا ہی
نہیں کیا۔ سبحانہ تعالیٰ یخلق ما یشاء وکلف ما یشاء
بہر حال آیت کو مجاز پر محمول کرنے کی صورت

میں تو شیطان کے ایمان و کفر کی بحث پیدا ہی نہیں
ہوتی اور حقیقت پر محمول کیجئے تو اشکال کا صحیح حل یہ
نہیں ہے کہ اس کا خوف طبعی تھا ایمانی نہیں تھا۔ بلکہ
یہ ہے کہ اس نے جھوٹ بولا۔ جیسے منافقین حضورؐ
سے کہتے تھے کہ ہم کو ابی دیتے ہیں آپ اللہ کے رسول
میں۔ بات اگرچہ فی غصہ سچی تھی مگر وہ اسے سچ نہیں

ماتے تھے بلکہ دکھاوے کے لئے کہتے تھے اس لئے اللہ نے
فرمایا کہ یہ بد بخت جھوٹے ہیں۔ تم لوں کی آڑ لے کر لوگوں
کو راہ راست سے روکتے ہیں۔ اسی طرح شیطان کا یہ کہنا
سراسر جھوٹ ہی تھا اور اگر بعض اقوال کے مطابق آخرت
میں وہ ایسا کہے گا تب بھی جھوٹ ہی ہوگا کہ میں تو اللہ
سے ڈرتا ہوں۔ جھوٹی بکواس میں ایمان کی جھلک کہاں۔
ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ متعدد حدیثوں میں
شیطان کے ڈرنے کا ذکر ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ ہی کے بارے
میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ شیطان ان سے ڈرتا اور جان مچراتا
ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ایسے تمام مقامات پر ڈر
اندیشے کے مفہوم میں ہے۔ اپنی انیسویں کے فیصل ہونے کا
اندیشہ۔ اپنی چالوں کے بیکار جانے کا اندیشہ۔ پریشانی۔
مالوسی۔ ذہنی اذیت۔ جھلاہٹ۔ غصہ۔ طرارہ وغیرہ۔
یہ سارے جذبہ جذبہ خوف سے الگ ہیں۔ خوف تو اس
مردود کے خمیر ہی میں نہیں۔ ممدوح کا یہ فرمانا کہ۔
"ہو سکتا ہے کہ شیطان اسی سے ڈرا ہو کہ کہیں
یہیں اور ابھی میری خبر نہ لے لی جائے۔"

بس زیب داستان قسم کی چیز ہے ورنہ شیطان کو بھلائیہ
ڈر کیوں ہونے لگا جب کہ یوم ازل میں خود باری تعالیٰ نے
اس کی درخواست کے جواب میں فرمادیا تھا کہ جاؤ قیامت
تک مرنے کرو۔

یہیں کتابت کی ایک موٹی غلطی بھی ہے
"اللہ تعالیٰ سے محض طبعی خوف کا ہونا ممکن نہیں۔"
ممکن کے بجائے "مطلوب" لکھا گیا ہوگا۔ مولانا دریا
بادی ایسا لکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑا فلاطون کا تب بھی
شاید ہی ان کی چار سطریں ٹھیک کتابت کر سکے۔ حکیم
عبدالقوی صاحب (شیخ صدق جدید) پہلے ان کے مسودے
نقل کرتے ہیں پھر کتابت کو دیتے ہیں۔ ہم اگر مولانا کے
دورِ شباب میں بولنا سیکھ گئے ہوتے تو ضرور انھیں
مشورہ دیتے کہ فلم سے انصاف کیجئے۔ تحریر اللہ کی نعمت
ہے اور اس نعمت کی درگت بن جاتی ہے اگر حرف کیوں

قمران میں پچاسوں جگہ یا ایھا الذین آمنوا آیا ہے۔ ایک بھی ثقہ مفسر یہ رائے نہیں رکھتا کہ اس کے مخاطب صرف وہی اہل ایمان ہیں جو نہ ہر تقویٰ کے بلند درجے پر فائز ہوں جنہیں اولیاء کہا جاسکے اور جن کا اسوہ مکمل طور پر دین و شریعت کی تصویر ہو بلکہ تمام ایسی ان لوگوں کو مخاطب مانا جاتا ہے جو اسلام قبول کر چکے ہوں خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ دلی ہوں یا فاسق یعنی اصطلاح شرعی میں جو بھی آدمی مسلمان ہے وہ اس خطاب میں داخل ہے۔ یہاں مؤئید سے مراد نقطہ وہ لوگ نہیں ہیں جن کی زندگیوں میں ایمان مع اپنے لوازم و تقضیات کے رچ چکا ہے۔

قرآن سامنے ہے۔ اس میں دسیوں جگہ لفظ مسلم بول کر مومن اور لفظ مومن بول کر مسلم مراد لیا گیا ہے۔ اللہ جب فرمانا ہے کہ ولکن کان حنیفاً مسلماً اور ابراہیم تو تمام چھوٹے خدا ہیں بیزار تھا اور مسلم تھا تو مسلم کا مطلب ہوتا ہے پکا مومن نہ کہ نقطہ شہادت پڑھ کر مسلمان کہلانے والا حضرت پوسف جب دعا کرتے ہیں کہ توفی مسلماً تو وہاں بھی مسلم کا مفہوم وہی ہوتا ہے جو اصطلاحاً مومن کہتا ہے۔ اسی طرح دسیوں مثالیں قرآن میں موجود ہیں اور مومن بول کر تمام مومن و مسلم مراد لینا تو اور زیادہ معلوم و مسلم ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا کہہ کر جتنے بھی احکام دیئے گئے ہر سرزدارت کو دیئے گئے خواہ وہ مگناہگار مسلم ہو یا صالح مومن۔

جب یہ صورت حال ہے تو کسی بھی آیت میں لفظ مسلم یا لفظ مومن کو مخصوص و محدود معنی میں لے بیٹھا اور دوسرے کو اس کے اطلاق سے خارج کر کے نکتہ سنجی کرنا آخر کیسے معقول ہو سکتا ہے۔ محدود نے جو نکتہ افہام کیا وہ اسی مفروضے پر تو مبنی ہے کہ اللہ نے لفظ مومن استعمال کیا تو مسلم اس کے خارج ہو گئے۔ یہ مفروضہ غلط ہے لہذا اس پر مبنی نکتے کا غلط ہونا بھی ظاہر و باہر ہے۔

اس استدلال سے بہت کم خود نکتے کے مالک و مالک علیہ پر غور کیجئے۔ کیا اللہ کی سیراد تھی کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں ان میں سے نبی صرف ان افراد کو تلاش کرے جو سراپا

ملکوں کی شکل اختیار کر جائیں۔ اب کسی مشورے اور گزارش کا موقع نہیں کہ مولانا عمر کی اس منزل میں پہنچ چکے ہیں جب زبان حال یہ مرد ہرانی رہتی ہے۔

اجاب مجھ سے قطع تعلق کریں جگہ اب آفتاب زیست لب بام آگیا اللہ تعالیٰ ابھی اس آفتاب کو بہت دنوں ضیا پاشی کا موقع دے اور ان کا غنیمت سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔

(۸) آیت ۲۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

”اے نبی مومنین کو قتال پر ابھاریے۔“

یہاں مدوح مفسر نے اس پر تو کوئی لب کشائی نہیں کی کہ اللہ نے یہاں اے رسول کیوں نہ کہا اے نبی کیوں کہا۔ مگر مومنین پر یہ نوٹ دیا ہے۔

”آیت میں مومنین کا لفظ بھی قابل غور ہے۔

مسلمین نہیں آیا ہے۔ یعنی قتال کے لئے قتال فی سبیل اللہ کے لئے دعوت حضرات بان سے کلمہ شہادت پڑھ لینے والوں کو نہیں دی جا رہی ہے بلکہ ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جنکی زندگیوں میں ایمان مع اپنے لوازم و تقضیات کے رچ چکا ہے۔ اسلامی جہاد کا نام لینے والوں کے لئے پہلے خود مومن ہونا شرط ہے۔“

ہم اس نوٹ کے بارے میں ادب کے ساتھ یہ کہیں گے کہ فکر صحیح اور اصول شرعی سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ صرف جذباتی انسانیت ہے۔

ائمہ فہم کے یہاں یہ بات مسلم ہے کہ جس مقام پر لفظ مسلم اور مومن دونوں مذکور ہوں وہاں تو انھیں اپنے الگ الگ مفہام پر محمول کرنا ضروری ہے لیکن جہاں ان میں سے صرف ایک مذکور ہوا ہے بالکل ضروری نہیں کہ اس کے وضعی معنی مراد لئے جائیں بلکہ وہ مومن و مسلم دونوں پر صادق آ سکتا ہے۔

صرف مالی غنیمت یا صرف ناموری یا صرف قومی عصیت نہ ہو۔

حسین نیت رکھنے والے اہل حضرات جب مطمئن ہو جائیں کہ جہاد کا وقت آپہنچا ہے تو پھر دعوت جہاد جملہ مسلمانوں کو دی جائے گی صرف اولیاء و اقیاء کو نہیں۔ ایک چور بازارانی یا تارک مصلوۃ مسلمان بھی اسی طرح مدعو ہو گا جس طرح نیکو کار انسداد۔ اسے بھی ثواب جہاد ملے گا اگر حسین نیت سے اس نے دعوت قبول کر لی ہے بعد نہیں کہ یہ ثواب اس کی ساری بد اعمالیوں کا تدارک کرے۔ حدیثیں اس پر گواہ ہیں۔

نحوذ باللہ یہودی اپنے ناپاک عزائم کے مطابق مدینے یا مکے پر حملہ آور ہو جائیں تو ایسے وقت میں یہ شرط طاعت نہیں کی جاسکتی کہ جہاد کا نام دہی مسلمان لیں جو اصطلاحاً ہر مومن کا مل کہے جاسکتیں۔ یہ وقت تو وہ ہے کہ فساق و فجار کو بھی نعرہ جہاد لگاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہو نا چاہیے۔ اور رب دگمان کی ادنیٰ آمیزش کے بغیر پورے و فوجی یقین کے ساتھ مان لینا چاہیے کہ نعرہ جہاد بچ چکی۔ حرمین کی حرمت لہو کی بھینٹ مانگ رہی ہے۔ میدان دعا میں کوہ اور مٹھاؤ یا حملہ آور کو مٹا دے۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ ہائی کمانڈ مومنین کا ملین اور صلحاء و اقیاء پر مشتمل ہے یا عام دنیا دار مسلمانوں پر۔ اس وقت تو ایک فاسق کی قیادت بھی واجب القبول ہوگی اگر قسراً ان حالات یہ طینان دلار ہے ہوں کہ اس جنگ کی حد تک یہ فاسق تخلص ہے اور حرمین کا احترام اور دین کی کچھ غیرت اس میں بھی پائی جاتی ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ حمد و مفسر نے یہاں جہاد اور دعوت اقامت دین کو ایک ہی مفہوم میں لے کر اظہار خیال فرما دیا۔ دعوت اقامت دین تو بے شک ایسے ہی لوگوں کو زیبا ہے جو حتی الوسع اسلامی کردار کا نمونہ ہوں اور خود را نصیحت و دیگران را نصیحت کی کہادت ان پر صادق نہ آئے۔ لیکن دعوت جہاد الگ چیز ہے۔

اسلام بن چکے ہوں اور مخصوص طور پر ان ہی کو جہاد کے لئے اُبھارے۔ ایسا تو عقل و نقل کے کسی بھی قرینے سے ثابت نہیں آیت کا مقصود تمام مسلمانوں کو جہاد کی تلقین ہے۔ جہاد طبعی بھر لوگوں کا تو کام نہیں ہے۔ اس میں لشکر حصہ لیتے ہیں اور کوئی بھی لشکر روایتی صاحبین اور مشائی اولیاء کا مجموعہ نہیں ہو کر تا۔ اس میں ہر معیار کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ تصور کرتا ہے کہ صحابہؓ نے جو جہاد کئے ہیں ان میں فوج مومن کا فرد ذرا سی معیار کا تھا جس معیار کو مدوح نے شرکت جہاد کی شرط قرار دیا ہے تو وہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ مجاہدین میں ایسے بے شمار انسداد ہو کر تھے جو ابھی ابھی ایمان لائے تھے اور دور جاہلیت کے نہ جانے کتنے تصورات لاشعوری طور پر ان سے چپکے ہوئے تھے۔ نیران میں سے ہر ایک مثالی قسم کا عابد و زاہد بھی نہیں تھا۔

اور جہاد کا دروازہ بند تو نہیں ہو گیا۔ مگر مدوح کی عائد کردہ شرط اسے بند ہی کر رہی ہے۔ کیا وہ جنگیں جو ملیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں اور طویل زمانے تک لڑی گئی ہیں مسلمانوں کے حق میں جہاد نہیں تھیں کیا آج اگر عرب مسجد اقصیٰ کی حرمت پر کٹ مریں اور صیہونی تحریک کی کھلی اسلام دشمنی کا استیصال کرنے کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دیں تو اسے جہاد نہ کہہ سکیں گے۔ حالانکہ اسوۃ و کردار کا وہ معیار تو اب خواب ہو جس کا عنوان تقویٰ ہے :

صحیح بات یہ ہے کہ جہاد کا مدار دوسروں پر ہے۔ حسین نیت اور بنیادی احکام دین سے واقفیت۔ حسین نیت کی شرط تو ہمہ گیر ہے۔ یعنی ہر ہر لشکری پر لازم چاہے وہ کمانڈر ہو چاہے معمولی سپاہی۔ جہاد پورا ہوا اور بعض شرکار کی نیت درست نہ ہو تو ان کے حق میں یہ جہاد نہ ہوگا۔ دوسری شرط صرف سربراہوں کے لئے ہے۔ جو افراد نیادت و سیاست کا منصب سنبھالے ہوئے ہوں انھیں اس شرط سے تصف ہو نا چاہئے۔

حسین نیت میں بھی آگیا کہ مجاہدین دانت کے ساتھ اپنے موقف کو برحق تصور کرتے ہوں۔ یہ بھی آگیا کہ ان کا مقصد

مناسب موقعہ پر اس کی توفیق اگر کسی دنیا دار کو بھی مل جائے تو خوش نصیب۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیت میں یونین سے مراد تمام اہل اسلام ہیں جو داخل اسلام ہو چکے تھے۔ محض وہ افراد نہیں جو طاعت و دعویٰ کے معیار کامل پر پورے اترتے تھے۔

(۹) آیت ۳۸ کے تحت ایک نوٹ ہے:-

”مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ خطائے اجتہادی جب نبی معصومؐ تک لے جاتے ہیں تو شیوخ غیر معصوم کے متعلق اختلاف خطا کا اعتقاد کس درجہ غلو سے قبیح ہے۔“

بات بالکل برحق۔ خطائے اجتہادی انبیاء سے بار بار صادر ہوئی ہے۔ قرآن اس کے نظام سے خالی نہیں ہے لیکن خیال آتا ہے کہ بے چارے مولانا مودودی نے تو اتنی صراحت کے ساتھ شاید کہیں بھی انبیاء سے خطا اجتہادی کے صدور کی بات سپرد قلم نہیں کی اور کچھ زیادہ ہی محتاط اور مرموز الفاظ سے کام چلایا۔ مگر اس کے خلاف دیگر الزامات کے ساتھ عصمت انبیاء کے انکار کا الزام بھی زور شور سے اچھالا گیا۔ حلقہ دیوبند تک اس جرم سے بری نہیں۔ جسے دیکھو ایک بانس کا جھنڈا اٹھائے لے چلا آ رہا ہے کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ ہمیں اس سلسلے میں ایک مفصل مضمون بھی لکھنا پڑا انبیاء و صحابہؓ بنیادی عقائد کی روشنی میں اور بعض اور دردمندوں نے بھی اس رکیک اور مغالطہ انگیز الزام کے رد میں اپنا بہت سا وقت خرچ کیا۔

حالانکہ دوسرے علماء و شیوخ کے یہاں اس طرح کی باتیں پہلے سے موجود تھیں جن کا نمونہ حکیم الامتہؒ کا مذکورہ اقتباس ہے۔ ہونی بھی چاہئیں تھیں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کی ذات و صفات شاعری کا موضوع نہیں ہیں کہ بے پرکی اڑائے جاؤ۔ واقعہ واقعہ ہے اور سچائی سچائی۔ انبیاءؐ بشر ہی تھے اور بشر کے خمیر میں سہو و خطا ہے۔

حدود و قیود بے ننگ برحق۔ انبیاء دوسرے انسانوں کی طرح غلطیاں نہیں کر سکتے اور اجتہادی جو خطا ان سے صادر ہوتی ہے اس پر اللہ ٹوک بھی دیتا ہے۔ لیکن انبیاء کو اس معنی میں معصوم کہنا کہ وہ نادانستہ خطاؤں اور اجتہاد رائے کی لغزشوں سے بھی بالا تر تھے از قسم شاعری ہے، حقائق کی ترجمانی نہیں۔

خوش نصیب ہے مودودی کہ اسے ایک ایک صدی وقت بیانی پر ہزار ہزار گالیاں ملی ہیں۔ ہمارے بس میں ہو تو ان گالیوں کو اس سے ہم چھین لیں کیونکہ ناقص طور پر دی ہوئی ہر گالی مظلوم کے حق میں بہ لحاظ آخرت سونے سے بھی بڑھ کر قیمتی ہے۔

شکریہ سورۃ انفال کا تبصرہ ختم ہوا۔ اب بس سورۃ توبہ باقی ہے۔ اللہ نے توفیق دی تو اس پر بھی تبصرہ آ ہی رہا ہے۔

مکتوبات مجدد الف ثانیؒ حضرت شیخ احمد

تمام اہل علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا مخزن سمجھے گئے ہیں سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے۔ مجلد اول پندرہ روپے۔ جلد دوم۔ اٹھارہ روپے۔ جلد سوم۔ پندرہ روپے۔

فضائل نماز اس مشہور کتاب علمی طباعت کے ساتھ۔ قیمت۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

حدیث دفاع (جنرل اکبر خاں) مجلد۔ ۱۲/-

مکتوبات حضرت علیؑ (مع اردو ترجمہ)۔ ۱۰/-

تصوف کی حقیقت (شاہ ولی اللہؒ)۔ ۵/-

مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد۔ ۷/-

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (دیوبند)۔

تین طلاقوں کے بار میں آیات اور احادیث اور صحابہ کے فتوے

قرآن

سورہ البقرہ میں ارشاد کیا گیا ہے۔

أَنظِلَّ فِي مَوْتَانِ فَإِذَا مَسَّالَهُ مَبْعُوثٌ
أَوْ تَسْتَوِي بِمُحْسِنَاتٍ طَلَّاقٌ تُولَسْ دَوِي بَا

ہے۔ اس کے بعد یا تو میاں بیوی کو رجوع کئے کے
رد کیا جائے یا بھلے طریقے سے یا بھلی طرح چھوڑ دیا
جائے،

تمام مستند مفسرین آیت کی شان نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام
قبل اہل عرب میں دستور تھا کہ جتنی بار چلے بیوی کو طلاق دو اور اگر
رجوع نہ کرے طلاق کا کوئی عدد ایسا نہ تھا جس کے بعد رجوع نہ ہو سکتا
تھے قانون بیان فرمایا کہ رجوع صرف دو طلاقوں تک ہو سکتا ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ خَتْنُ شَرْكَهُنَّ فَوَجَا

غَلِيظًا۔ (دو کے بعد اگر تیسری بھی دیدی تو اب

یہ عورت طلاق دینے پر حلال ہوئی نہیں سکتی جب

تک کہ کسی اور سے نکاح نہ کرے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ مکرر (ایک مرتبہ، اور مرتبہ) (دو مرتبہ)
کا استعمال عرب میں ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جب کوئی فعل
لگ لگ کر کیا جائے اور ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جب اوقات
مختلف نہ ہوں۔ اس کی مثالیں بھی ہم قرآن سے دے آئے ہیں
ایک اور مثال ذہن میں آئی۔ معجزہ شق القمر کے بارے میں بخاری
میں تین مختلف صحابیوں سے روایت منقول ہے۔ پہلی عبداللہ بن
مسعود کی روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

قَالَ اشْتَقِ الْقَمَرَ عَلَيْهِ السَّلَامُ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئَيْنِ۔

ابن مسعود نے فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانے میں

چاند دو برابر کے ٹکڑوں میں شق ہو گیا تھا۔

دو برابر کے ٹکڑے ہو جانے کے ایک روایت میں فرق بین
آتا ہے۔ ایک میں فلقین مکر مسلم کی ایک روایت میں مرتب
ہے۔ اب اس سے بعض اناڑیوں نے یہ سمجھ لیا کہ ریشم قر کا مجبڑہ
دو بار صادر ہوا ہے جیسے کہ قرآن کی مذکورہ آیت میں ہمارے
دوست یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ دو الگ الگ طلاق کا حکم بیان ہو رہا
ہے۔ مگر مستند اور معروف محدثین اور ائمہ مجتہدین میں کوئی ایسا نہیں
جس نے یہ یقین کیا ہو کہ ریشم قر دو بار ہوا بلکہ مرتبہ سے مراد شفتین
ہی لیتے ہیں یعنی دو ٹکڑے۔ اب دیکھ لیجئے ریشم قر کا فعل اور واقعہ
ایک ہی ہے گویا مکرر واحدہ۔ مگر اثر فعل کی مشابہاتی کیفیت کے
اعتبار سے بعض اہل زبان نے اس کے لئے عربین کا لفظ استعمال
کر لیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ مرتبہ کے واحد معنی ہی سمجھ ہوئے
ہیں کہ فعل دو مرتبہ الگ الگ واقع ہو رہا ہو غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

ایک اور استدلال یہاں ابن قیم وغیرہ سے منقول ہے اسے
بھی دیکھ لینا چاہیے۔ استدلال یہ ہے کہ اگر لے فرمایا الطلاق
مترتان یعنی طلاق دو بار ہے مکرر بعد مکرر (ایک کے بعد ایک)
پھر ضرر پایا گیا کہ فَإِنْ طَلَّقَهَا یعنی ایک کے بعد ایک طلاق دینے
کے بعد اگر تیسری بار طلاق دی تو یہ عورت حلال نہ ہوگی جب تک
کسی اور سے نکاح نہ کرے۔ اس ترتیب اور نظم کلام سے ظاہر ہوا کہ
عورت کو حرام کرنے والی دہ تیسری طلاق ہو سکتی ہے جو اس وقت
دی جائے جب پہلے ایک کے بعد ایک طلاق دی جا چکی ہو۔ گویا تیسری
طلاق کو اس وقت آنا چاہیے جب دو طلاقیں الگ الگ واقع ہو چکی
ہوں۔

یہ استدلال بڑا ظاہر فریب ہے اور ظلم ہوگا اگر اس کے
پیش کرنے والوں کی ذہانت کو داد کا تحفہ نہ دیا جائے لیکن محفہ
پیش کرنے کے بعد ہم ادب کے ساتھ گزارش کریں گے کہ بزرگوار
اگر یہ بات ہے تو پھر یہ بھی تو ثابت ہوا کہ طلاق سے رجوع ایک طلاق
کے بعد نہیں ہو سکتی بلکہ دو طلاقوں کے بعد ہو سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا

ہی طلاق پڑی واضح کرتا ہے کہ آپ کا استدلال محض ایک مخافت ہے جسے آپ فریق ثانی کے خلاف بطور حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ وہ اور دو چار اگر حساب کا صحیح فارمولہ تو اپنے اندر بیگانہ دونوں کے لئے صحیح مانے ایسا کیجئے کہ جب وصول کریں تو چار وصول کریں اور جب ادا کریں تو کہیں کہ دو اور دو تین ہوتے ہیں۔

اے بزرگان کرام اور مقالہ نگاران عظام! واحد سچائی یہ ہے کہ قرآن طلاقوں کی ترتیب نہیں تعداد میان کر رہا ہے۔ وہ یہ بیان کر رہا ہے کہ کتنی طلاقوں تک مرد کو حق رجوع رہتا ہے اور کتنی طلاقوں کے بعد نہیں رہتا طلاق تو مرد کا حق ہے جسے وہ نکاح کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ اسے وہ الگ الگ استعمال کرے یا دفعتاً کر ڈالے اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ اپنے تین روپوں کو تین مختلف وقتوں میں خرچ کریں یا ایک ہی وقت میں ایک ہی سودا خریدا لیں۔ دونوں صورتوں میں یہ روپے آپ کی ملک سے خارج ہوجائیں گے۔ فرض کیجئے آپ اپنے جائزہ طور پر ملکے ہوئے ہزار روپے گناہ کے کاموں میں صرف کر دیتے ہیں یا ان کے انار پچانے خرید کر گھر بھر بک تاشا کر گزرتے ہیں تو حلال کام نہیں ہوا۔ امثالہ رسول نے اس سے روکا ہے لیکن ممنوع ہونے کی وجہ سے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ نافذ شدہ قسم یا اس کا کوئی حصہ اب بھی آپ کی ملک رہا۔ رقم تو گئی۔ اس پر آپ کا حق تصرف بھی ختم ہو بس اسی طرح تین طلاقیں دفعتاً دے ڈالنے کے شک کا ممنوع ہے۔ گناہ ہے۔ لیکن جب دے ڈالیں تو آپ کا حق ختم ہو گیا۔ یہ بات امثالہ کے رسول نے آپ ہی کی فلاح کے لئے بتائی تھی کہ طلاق میں جلد بازی مت کرو۔ سوچ سمجھ کر دو اور ایک سے زائد دینی ہیں تو ایک ایک ماہ بعد دو تاکہ انہیں سوچنے سمجھنے کا اور رجوع کا موقعہ رہے۔ یہ ایسی ہی بات تھی جیسے امثالہ رسول نے یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ فضول بھی مت کرو۔ پیسہ غلط کاموں میں مت اڑاؤ۔ اب اگر آپ ہدایت کو نظر انداز فرما کر کھانا پینے تین طلاقیں بھونک دیتے ہیں تو اس کا کیا مطلب کہ رجوع یا غیر کسی طلاق کا حق آپ کے پاس پھر بھی باقی رہے فیصلوں سچی کی راہ میں جو پیسہ آپ نے اڑا دیا وہ تو اٹ گیا۔ اب اس پر آپ کا حق کہاں دونوں معاملات یکساں ہیں اور ان میں فرق کرنا سوائے خطا پر اصرار کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ایک دوبار ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جو بھی حکم آ رہا ہے وہ سی وقت مؤثر اور قابل عمل ہو سکتا ہے جب ایک کے بعد ایک کے دو طلاقیں واقع کر دی جائیں تو اس کے بعد جس طرح تیسری طلاق کا حکم بیان ہوا ہے اسی طرح خامساہ بعد عرف بھی بیان ہوا ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایک طلاق کے بعد بھی رجوع کر سکتے ہیں بلکہ یہ فرمایا گیا کہ طلاق دوبار ہے اس کے بعد یا تو رجوع ہے یا چھوڑ دینا ہے۔ لہذا جس دلیل سے آپ یہ واجب کر رہے ہیں کہ تیسری طلاق اسی وقت واقع ہو سکتی ہے جب دو طلاقیں اس سے قبل دو مرتبہ دی جا چکیں۔ اسی دلیل سے یہ بھی واجب ہوتا ہے کہ رجوع اس وقت کیا جائے جب ایک کے بعد ایک کر کے دو طلاقیں دی جا چکیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ یہ قول نہیں کرتے بلکہ تمام عللے امت کی طرح یہ مانتے ہیں کہ رجوع ایک طلاق کے بعد بھی اسی طرح درست ہے جس طرح دو طلاقوں کے بعد۔ اگر اپنا استدلال کی صحت پر آپ کو بعد دوسرے تو پھر اس استدلال سے جو کچھ نتائج برآمد ہوں ان سب کو صدق دل سے قبول فرمائیے۔ یہ کیا کہ طلاق کے معاملہ میں تو قبول ہیں پیش پیش ہیں لیکن رجوع کے معاملہ میں قبول سے صاف انکار۔

ثابت ہوا کہ یہ استدلال ہی درست نہیں۔ اگر درست ہوتا تو اس سے یہ غلط نتیجہ کیسے برآمد ہو سکتا تھا کہ فقط ایک طلاق کے بعد رجوع ممکن نہیں دہی کے بعد اجازت ہوگی۔

ہمارے بزرگ اگر یہ کہیں کہ ایک طلاق کے بعد رجوع کا جواز ہم کسی اور خارج از قرآن دلیل سے مثلاً حدیث یا آثار صحابہ یا قیاس سے نکالتے ہیں تو ہم بھی عرض کریں گے کہ یہ حضور کو ہم نیاز مندوں کے اس طریق عمل پر حتمی کیوں ہے کہ تین اکٹھی طلاقوں کے وقوع کا ثبوت ہم حدیث آثار اور قیاس سے فراہم کرتے ہیں۔

علاوہ اس کے آپ کے استدلال اور آپ کے دعوے میں ایک تضاد اور ہے۔ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ مجلس واحد میں تین طلاقیں پڑتی ہی نہیں لیکن آپ کا استدلال تقاضا کرتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہے کہ ”تجھ پر طلاق“ ”تجھ پر طلاق“ تو تینوں کو پڑ جانا چاہیے کیونکہ تیسری طلاق اسی وقت واقع کی گئی ہے جب دو طلاقیں ایک کے بعد ایک کر کے دلائی گئیں۔ عین وہی ترتیب ہے جو آپ نے قرآن سے اخذ کیا۔ اس ترتیب کے ماننے جلنے پر بھی آپ کا یہ کہنا کہ ایک

اب آئیے قرآن کے دوسرے مقام کی طرف متوجہ کیے
۶۵ ویں سورت الطلاق ہے اس کا آغاز ہی اس طرح ہوا ہے کہ
”اے نبی اگر تم بیویوں کو طلاق دو تو اس طرح پر دو“ ظاہر ہے
کہ نبی کو خطاب کر کے تمام ہی مسلمانوں کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ ارشاد
ہوا کہ طلاق اس طرح دو جس سے عدت شمار میں خرابی واقع نہ ہو مفسرین
نے اس کی تفسیر بتائی کہ نہ تو حالت حیض میں دو نہ اس طہ میں جس
میں تم نے بیوی سے صحبت کی نہ ہو۔ پھر زمانہ عدت میں انھیں گھر دینے
مست نکالو وغیرہ نک۔ ان آیات کو جس کا جی چاہے کسی مترجم قرآن
میں دیکھ لے۔ ہدایات دینے کے بعد اثر فرماتا ہے۔ جو شخص امشہر کی
مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا اپنے ہی اور ظلم کرے گا پھر فرماتا
ہے۔ لَا تَدْرِي لَعْنَةُ اللَّهِ لِيُحْصِرْتُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا شاید
اس کے بعد امشہر (موافقت) کی کوئی صورت پیدا کرے،
اب یہاں ہم مولانا مودودی کے الفاظ مستعار لیں گے وہ
ارشاد فرماتے ہیں ا۔

”یہ دونوں فقرے ان لوگوں کے خیال کی بھی تردید
کرتے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ حیض کی حالت میں
طلاق دینے یا ایک وقت میں طلاق دیدینے سے کوئی
طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی اور ان لوگوں کی
رائے کو بھی غلط ثابت کر دیتے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ
بیک وقت تین طلاق ایک ہی طلاق کے حکم میں ہیں رسول
یہ ہے کہ اگر بعد طلاق واقع ہی نہیں ہوتی یا تین طلاق
ایک ہی طلاق رجعی کے حکم میں ہیں تو یہ کہنے کی آخر ضرورت
ہی کیا رہ جاتی ہے کہ جو امشہر کی حدود یعنی مسنت
کے بتائے ہوئے طریقے کی خلاف ورزی کرے گا
وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا، اور تم نہیں
جانتے شاید اس کے بعد امشہر موافقت کی صورت
پیدا کر دے؟ یہ دونوں باتیں اسی صورت میں بھٹی
ہوتی ہیں جبکہ مسنت کے خلاف طلاق دیدینے سے
واقعی کوئی نقصان ہوتا ہو جس پر آدمی کو چھٹانا
پڑے اور تین طلاق بیک وقت دے بیٹھنے سے رجوع
کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے

کہ جو طلاق واقع ہی نہ ہو اس سے حدود امشہر پر
کوئی تعدی نہیں ہوتی جو اپنے نفس پر ظلم قرار پائے
اور جو طلاق بہر حال رجعی ہی ہو اس کے بعد تولا
موافقت کی صورت باقی رہتی ہے پھر یہ کہنے کی
کوئی حاجت نہیں ہے کہ شاید اس کے بعد امشہر موافقت
کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۷۷)

یہ تقریر کلام شریعہ و تبصرہ سے بے نیاز ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ ہمارے
بعض کم تعلیم یافتہ قارئین اس کے بعض الفاظ کا مطلب نہ سمجھیں اس
لئے ہم کچھ وضاحت بھی کئے دیتے ہیں۔

امشہر تعالیٰ بہ ہدایت فرما رہا ہے کہ ادل تو تمہارا ہے لے یہ
مناسب ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی طلاق دو نہ کہ رجوع اور مضا
کا امکان باقی رہے دوسرے ایسے اوقات میں طلاق دو کہ عدت کا
کا شمار ٹھیک ٹھیک ہو سکے۔ مثلاً حیض میں دو گے تو اس کا مطلب
یہ ہو گا کہ عورت کی مدت عدت بڑھ جائے اور طہ میں جماع کے بعد
دو گے تو یہ بات شہر ہو جائے گی کہ مدت کا شمار طہ میں یا حیضوں کے
اعتبار سے ہو یا حمل کے اعتبار سے کیونکہ ممکن ہے اس جماع سے عورت
حامل ہو جائے اور حاملہ کی مدت معلوم ہی ہے کہ وضع حمل ہے۔

بہر حال اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن حالتوں میں طلاق دینے
سے امشہر منع کر رہا ہے ان حالتوں میں اگر طلاق دی جائے تو وہ پڑ جائی
نہ بڑے تو ان نقصانات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن سے بچانے
لئے امشہر ہدایات دے رہا ہے۔ کسی برائی سے روکنے کا مطلب ہی یہ
ہوا کرتا ہے کہ اگر اس کا ارتکاب کیا گیا تو وہ اثرات پیدا کرے کہ مٹائی
قتل ناحق کو منع کیا گیا۔ نہ منع کیا جاتا اگر قانون فطرت یہ ہو تا کہ تلوار
یا بندوق مسٹر ایسے ہی لوگوں کو قتل کر سکے گی جو واقعی قتل نہیں
اور جن لوگوں کو ناحق قتل کیا جا رہا ہے وہ قتل ہو ہی نہیں سکے۔ امشہر تعالیٰ
کا ہدایات دینا ہی اپنی جگہ دلیل ناطق ہے اس بات کی کہ خلاف ہدایات
طریقوں سے طلاق دینا غلط نتائج پیدا کرے گا۔ یعنی طلاق واقع ہو جائی
یہ الگ بات ہے کہ حکم الہی کا نافرمانی کا گناہ سر پر ہے۔ امشہر تعالیٰ
نے فرمایا۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ۔ جس نے امشہر
کی حدوں سے تجاوز کیا اس نے اپنے ہی نفس پر ظلم کیا یہاں کہ طلاق کے مسئلہ میں یہ کلی
فرمان ہے کہ میں اور امشہر جو صاب قائم کی بھی وہی تو ہیں کہ عورت بچہ کی برائے وقت

نہ بڑے کے عدت کا صحیح شمار نہ ہو سکے اور ایسے انہی میں بھی نہ بڑے کے رجوع
ماحت کا امکان قائم ہو جائے۔ کوئی شخص سمدہ بقرہ کا حوالہ دے کر زیادہ سے
زیادہ تو کہہ سکتا ہے کہ اگر اٹھ الگ تلاق دینے کی ہدایت قرآن اور حدیث کے ذریعہ
الگ الگ کی یہی شکل بھی معین کی جاسکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان ہدایات
تلاق طلاق دینے سے خود بیان قرآنی کے مطابق امر کی حدود سے
غیر ہو جائے یعنی طلاق پڑ جاتی ہے۔ اسی بات کو صاحب فقہ ہم نے
الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اگر خلاف ہدایت طریقے سے طلاق واقع ہو
تو اس سے حدود و اشترک کوئی تعدی نہیں ہوتی۔ طلاق اگر نہ بڑے
ہو ہی کہاں ظلم تو ایک ایجا جی شے نہ بڑے کی صورت میں
ہی عدم اور سلب ہی سلب ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ "فَقَدْ ظَلَمَ غَضَبُ" کا تعلق متعدد
سے نہ صرف طلاق لغیر العدة سے اور صحیح مفہوم یہی ہے کہ حد
لی خلاف درزی کرے والا گنہگار اور عذاب الہی کا مستحق ہو گا ظلم
کا لفظ قرآن مجید میں بالعموم امر کی نافرمانی کر کے اپنے نفس کی
حق کمسنے اور اسے ملاکت میں ڈالنے کے مفہوم میں آیا ہے اور یہی مفہوم
ان کی ہے۔ اس سے کسی قانونی حکم کا استخراج صحیح نہیں۔

دیر مولانا حامد علی کے الفاظ میں، ان حضرات کی چار وجوہ غلطی
ہے کہ صرف تین طلاقوں کے پڑنے نہ بڑے میں بحث کرتے ہیں لیکن یہ
کہتے ہیں کہ حالت حیض میں یا اس میں جس میں صحبت کرنی گئی ہو ایک
پڑ جاتی ہے۔ حالانکہ اگر تین اٹھی خلاف سنت ہونے کی وجہ سے
پڑیں تو مذکورہ دونوں حالتوں میں طلاق دینے کی مخالفت تو معین
سے اجمالاً اور قبول رسول سے صریحاً ملے پا چکی ہے پھر یہ حضرات
جو کہ فرقہ امامیہ کا مسلک کیوں قبول نہیں کر لیتے کہ کوئی طلاق
پڑے گی۔ ایسا کر لیں تو ہمیں ان سے بحث ہی نہ رہے۔ مگر یہ حضرات
خویر مانتے ہیں۔ اور اسے بظہر چارہ بھی نہیں ہے کہ باوجود
سنت محمد کے طلاق پڑ جائے گی۔ اور تین طلاقوں کے وقوع
استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خلاف سنت ہیں اس لئے نہیں پڑیں
پس قسم کی مشمولیت ہے!

دوسری بات یہ ہے کہ فَقَدْ ظَلَمَ غَضَبُ کا تعلق متعدد
سے ہی ہو سکتا ہے پہلے اور ظلم نفسوض ہو رہا اس امر سے ہر حال
مہارت کے مطابق طلاق دو در زیادہ ناقصان کر دے۔ اس

جسگ مردوں کے لئے بطور ہدایت صرف تین امور بیان ہوئے ہیں اور مولانا
کو ان کی عدت کے لئے طلاق دو در ۲۵ عدت کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو۔
(۳) مطلقہ کو گھر سے نہ نکالو الا یہ کہ وہ عیش کی مرتکب ہو۔

ہم کب کہتے ہیں کہ آیت کا مذکورہ فقرہ ان تینوں
ہی سے متعلق نہیں ہے لیکن تینوں سے متعلق ہونے کی بنا پر مطلب
آخر کیلئے نکل آیا کہ نافرمانی کر دے تو میں تباہ کار تو بڑے کے عمل موثر نہ ہو گا۔
کیا کوئی بد بخت عدت میں بے قصور عورت کو گھر سے نکال دے تو آپ یوں
کہیں گے کہ چونکہ یہ حرکت ظلم و گناہ ہے اس لئے ہم عورت کو گھر سے نکال دیا
نہیں مانتے! اخراج کا عمل بہر حال متحقق ہوا اسی طرح تین طلاقیں متحقق
ہو جاتی ہیں۔

اور آیت کا جو مفہوم یہ حضرات بیان کر رہے ہیں وہ سراسر اکھوں
پر۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تین اٹھی طلاقیں دینا گناہ ہے۔ لیکن یہ اگر واقع
نہ ہوں تو حق تلفی کسی کی ہوئی اور حدود الہی سے تجاوز کہاں ہوا۔ یہ بڑی
عجیب بات ہے کہ تین اٹھی طلاقیں واقع کرنے کو اشتر اور رسول منع کریں
حالانکہ ان حضرات کے دعوے کے مطابق یہ واقع ہی نہ ہو سکتی ہوں تو کیا
اشتر اور رسول عیب اور لاعلمی ہدایات بھی جاری کر سکتے ہیں انھوں
یا مشر میں ذلک!

خلاصہ یہ کہ صاحب فقہ نے شتران سے بالکل صحیح استدلال کیا
اور یہی استدلال صحابہ کرام سے چلا کر آیا ہے۔

یہاں ہمیں ہمنما ایک اور بات مفہم القرآن کے تعلق سے کہنی ہے۔
مولانا مودودی نے مفسرین سلف کی طرح مروج اور اختلافی اقوال
بھی ذکر کئے ہیں۔ ان ہی میں ایک یہ بھی ہے کہ سعید بن المسیب رحمہ اللہ بعض روایات
"تابعین کہتے ہیں کہ جو شخص سنت کے خلاف حیض کی حالت میں طلاق دیدے
اس کی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی۔ یہی رائے امامیہ کی ہے۔"
اس کے لئے صاحب فقہ نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ہمارے تحقیق یہ ہے

کہ سعید بن المسیب کی طرف اس رائے کی نسبت مشکوک ہے۔ مصنف
عبدالرزاق میں ان کا مسلک یہ بیان ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص قبل از صحبت
منکوحہ کو تین طلاق دے تو تین ہی پڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر تجدید تعلق
ممکن نہ ہوگی۔ اس ہدایت کی سند تو یہ ہے۔ رعن معمر عن قتادہ
عن سعید بن المسیب، بے شک بات غیر بخود کے تعلق سے کہی گئی
ہے لیکن ایک وقت کی تین طلاقوں کے وقوع پڑنے ان کا اتفاق و اشتراف

کا حکم جاری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ مجمع احادیث میں واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے علیؓ سے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دیدی تو حضورؐ نے اسے جاری کر دیا۔ اللہ ایک طلاق جو جو حرجی ہوتی ہے اس لئے رجوع کا بھی حکم دیدیا۔ اسی لئے تمام اہل سنت بھی اس پر متفق ہیں کہ چاہے حیض میں طلاق دو جاوے اس طہر میں جس میں صحبت کر لی ہو طلاق پڑ جائے گی۔ بھلا جب کوئی شخص ایک وقت میں تین طلاقیں دے دے بیٹھے تو ان کے نہ پڑنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ حضورؐ جس حکم کو جاری کر دیں وہ تو عین شریعت ہے۔ تین طلاقیں اکٹھی دینا بدعت ہے اور حضورؐ انھیں جاری کر رہے ہیں پھر کیسے ہماری یہ مجال ہے کہ اس اجراء اور نفاذ کو رد کر سکیں۔ ہمارے فتوے اور رائے سے رسول اللہؐ کا حکم تو مسترد نہیں ہو سکتا۔

حضورؐ پر نو رکعات کا فیصلہ نمبر (۲۱)

صحابی رسولؐ حضرت رکانہ بیان کرتے ہیں:-
انھوں نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق بتہ دی
پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کر کے
کہ میں نے طلاق بتہ دی ہے انشک قسم کھاتی کہ میری
نیت ایک ہی طلاق کی تھی۔ حضورؐ نے جواباً ارشاد
فرمایا کہ کیا واقعی تم انشک قسم کھا کر کہتے ہو؟
رکانہ نے عرض کیا ہے شک یا رسول اللہؐ میں انشک کی
قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ہی کا ارادہ تھا اب رسول اللہؐ
رجوع کی اجازت مرحمت فرمادیتے ہیں۔

یہ حدیث ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، حاکم، ابن حبان
اور دارقطنی سب نے روایت کی ہے ہم نے اس کے الفاظ مشکوٰۃ شریف
میں نقل کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو باب الخلع والطلاق فصل ثانی،
تفصیلی گفتگو اس حدیث پر ہو چکی جو اس گفتگو کو نہ دیکھو وہ
بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت رکانہ نے تین طلاقیں نہیں دی
تھیں بلکہ طلاق مبتہ دی تھی۔ یعنی یا تو یوں کہا تھا کہ تجھ پر طلاق مبتہ
یا لغو طلاق جو شہ میں تین بار زبان سے نکال گئے تھے تین کا عدد
نہیں بولا تھا۔ اب انھیں پھتوا دیا ہوتا ہے غم ہوتا ہے کیونکہ انھیں
معلوم ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں بھی شرعاً تین ہی ہوتی ہیں لہذا کیا کریں

مانے آگیا۔ اگر کسی بھی صورت میں اکٹھی تین پڑ سکتی ہیں تو کیسے مان لیں
ان کے نزدیک منقولہ پر ایک بھی نہیں پڑے گی۔ کاشح حوالہ مل جاتا
زدیکھتے کہ سند کیسی ہے۔

رسول اللہؐ کے فتوے

سید الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات
بارکہ کو اصطلاحاً فتویٰ نہیں کہا جاتا، ان کی تعلیمات دین کا نام
امی تو "شریعت" ہے۔ لیکن یہاں ہم جو کچھ صحابہ وغیرہ کے فتاویٰ
بیش کر رہے ہیں اس لئے اسی عنوان کے تحت احادیث کو بھی لے لیتے
ہیں۔ حدیثوں اور فتوؤں کا کافی تذکرہ دوران بحث میں تو آ ہی چکا
ہے لیکن ضروری معلوم ہوا کہ یہ عمل دیگر دھیسے انگ کر کے ترتیب
کے دھاگے میں پرو دیئے جائیں تاکہ جو لوگ پوری بحث نہ پڑھ سکیں
وہ بھی ایک نظر میں دیکھ لیں کہ اکٹھی تین طلاقیں کو ایک قرار دینے
سے نہ صرف صحابہ بلکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بھی مخالفت
میں درجے میں ہوتی ہے۔ اختصار کے خیال سے ہم صرف اردو ترجمہ
براکتف کریں گے اور اصل کا حوالہ ساتھ ساتھ دیدیں گے تاکہ
تین کا جی چاہے اصل اور ترجمہ ملائے۔

حضور رسالتؐ کا فیصلہ نمبر (۱)

صحابی رسولؐ معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ رسول
اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی شخص بدعت کے طریقے
سے ایک یا دو یا تین طلاقیں دے گا اس کی بدعت
ہم اس پر لازم کر دیں گے۔ دائرہ قطفی ص ۲۲۵
طلاق کا سنون طریقہ حضورؐ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس
طہر کے زمانے میں دو میں صحبت نہ کی ہو۔ اگر تین دینی ہوں تو ایسے
ہی تین طہروں میں دو۔ حالت حیض میں طلاق دینا بدعت ہے اور طہر میں
صحبت کے بعد طلاق دینا بھی بدعت ہے۔ ایک وقت میں دو یا
تین طلاقیں دینا بھی بدعت ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جو شخص
ہماری صحبت کو نظر انداز کرے ہوئے طلاق دینے میں بدعت کا طریقہ
اختیار کرے گا۔ اس پر ہم اس کی بدعت لازم کر دیں گے یعنی طلاق

ہوتی تو حضورؐ یوں کہتے کہ یہ طریقہ خدا کی نافرمانی اور گناہ کا موجب ہوتا۔ جو حضرات اس ثابت شدہ حدیث کے بارے میں قبل وقت ال کرتے ہیں وہ سوائے اپنی بے خبری یا کج فکری ظاہر کرنے کے اور کوئی خدمت انجام نہیں دیتے۔ مولانا حامد علی صاحب نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی حیثیت ہم دلائل سے واضح کر آئے ہیں۔

رسول اللہؐ کا فیصلہ نمبر (۲۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ مطلقہ نے کسی اور شخص سے نکاح کر لیا۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ صرف نکاح سے یہ پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی، جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے اسی طرح ہم لبتر نہ ہوئے۔ حبلہ طرح پہلا شوہر ہو چکا ہے۔

بخاری شریف۔ کتاب الاطلاق۔ باب من ارجعنا لطلاق التلث مسلم شریف کتاب النکاح۔ باب لا تطلق المطلقة ثلاثاً لمطلقہا آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ جب کوئی شخص ایک ساتھ تین طلاقیں دے ڈالتا تھا تو اسے ان ہی الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا کہ ”فلان طهر لے تین طلاقیں دیں“ ایسا کوئی لفظ اولت ضروری نہیں سمجھتے تھے جس سے واضح ہو کہ تین الگ الگ دی گئیں یا ایک ساتھ۔ ہاں الگ الگ اوقات کی طلاق بیان ہوتا تو الفاظ سے اس کی طرف اشارہ کرتے۔ اسی طرح بلا سبب بیان بھی واقعہ ہی بیان ہو رہا ہے کہ کسی شخص نے بیوی کو اٹھنی تین طلاقیں دی تھیں اور حضورؐ نے انھیں واقع مانا بخاری و مسلم کی روایات کا پایہ تو سب کو معلوم ہی ہے۔ جس روایت پر یہ دونوں استاد فنی متفق ہوں وہ حجت کے درجہ اعلیٰ میں سمجھی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری ہیں اور عینی عمدة القاری ہیں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے قتلا بھی دیتے ہیں کہ تین طلاقوں سے مراد بیان ایک ہی وقت کی تین طلاقیں ہیں۔ اس احتمال کے لئے کوئی قرینہ نہیں کہ ممکن ہے یہ تینوں الگ الگ وقتوں میں دی گئی ہوں اس طرح بات بالکل مضبوط ہو گئی کہ حضورؐ کا فیصلہ اٹھنی تین طلاقوں کے تین ہی ہونے کا تھا نہ کہ ایک ہونے کا۔

سمجھ میں آیا کہ میں نے تین کا لفظ تو بولا نہیں کیونکہ میری نیت تین کی تھی ہی نہیں۔ چلو رسول اللہؐ سے عرض حال کریں شاید کوئی گنجائش نکلتے۔ یہی سوچ کر دوڑے آتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! میری نیت ایک ہی کی تھی حضورؐ کے علم میں ہے کہ میرے صحابی کم سے کم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر یہ حال انسان ہیں۔ دوتا تو قسم کھلاؤ۔ آپ پھر قسم کھلاوتے ہیں۔ گنجائش اس لئے ہے کہ طلاق بتہ کے الفاظ طلاق مطلقہ کے لئے صریح نہیں۔ اگر صریحاً تین طلاقیں دی گئیں ہوتیں تو نہ تو رکنا نہ دوڑے آتے اور قسم کھاتے نہ حضورؐ نیت پر قسم لیتے۔ ثابت ہو کہ رجوع کی اجازت تین طلاقوں پر نہیں ملتی ایک پر ہی اور نیت اگر تین کی ہوتی تو تین ہی پر حجاب تین رجوع کی اجازت نہ ملتی اگر یہ نہ مانا جائے تو تعویذ یا شرع ماننا ہو گا کہ صحابی کا قسم کھانا اور رسول اللہؐ کا دوبارہ قسم لینا فضول ہی تھا۔ کارآمد تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب نیت پر فیصلہ کا مدار ہو۔

رسول اللہؐ کا فیصلہ نمبر (۳۱)

حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہ ابنی بیوی کو غلطی سے حالت حیض میں ایک طلاق دے بیٹھے ہیں۔ حضورؐ اس پر ناراض ہو کر رجوع کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں عبداللہ ابن عمر حضورؐ سے دریافت کرتے ہیں۔

یا رسول اللہ! اگر میں نے تین طلاقیں دی ہوں تو فرمائیے کہ کیا رجوع کرنا میرے لئے جائز ہو تا؟ حضورؐ نے جواب دیا نہیں۔ اس صورت میں بیوی تجھ سے جدا ہو جاتی اور تیرا فعل (تین طلاقیں ایک دم دافع کرنا، گناہ ہوتا) دوافعنی یہ بھی، طرانی مصنف ابوبکر ابن ابی شیبہ مصنف عبدالرزاق۔ فتح الباری، تفسیر القرآن۔ الگ الگ جلد اور صفحات کا حوالہ اس لئے ضروری نہیں کہ سبھی محلول کتابوں میں طلاق کی بحث ہر شخص محال سمجھ لے،

بالکل واضح ہے کہ ایک ہی وقت کی تین طلاقوں کے بارے میں سوال نہ جواب ہوا ہے۔ اگر طریق سنت سے دی ہوئی طلاقوں کی با

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۵)

عامر اشجعی کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیس سے گزاریش کی کہ اپنی طلاق کا واقعہ مجھ سے بیان کیجئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میرے شوہر نے یمن جاتے وقت مجھے تین طلاقیں دی تھیں اور رسول اللہ نے انھیں تین ہی قرار دیا تھا۔

(ابن ماجہ :- باب من طلق ثلاثا فی مجلس واحد)

یہ حدیث مسلم شریف میں ۲۴۲۲ سندوں سے بے الفاظ مختلف روایت ہوئی ہے۔ حاصل سب کا یہی ہے کہ فاطمہ بنت قیس کو اکٹھی تین طلاقیں دی گئیں اور حضورؐ نے انھیں تین ہی مانا۔ ۲۴ میں دو روایتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر بنیوں اور کم علموں کو دھوکا لگتا ہے کہ تینوں طلاقیں اکٹھی نہیں دی گئیں تھیں لیکن ہم تفصیل سے بتا آئے ہیں کہ یہ غلط فہمی ہے مسند احمد میں لفظ بھی یہ وضاحت ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دی گئیں تھیں۔ دارقطنی کی روایت میں بھی یہی وضاحت ہے۔ مفصل گفتگو ہم اس پر پیچھے کر آئے۔ نہ مانوں کی گردان کا تو کوئی علاج نہیں

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۶)

صحابی رسول حضرت عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے اپنی زوجہ کو ہزار طلاقیں دے دیں پھر حضورؐ کی خدمت میں آکر مسئلہ پوچھا تو حضورؐ نے جواب دیا کہ تین تو عورت پر پڑ گئیں تھیں، ۹۹ ظلم کے خاتمے میں رکھی گئیں۔ اللہ چاہے تو اس ظلم کو معاف کر دے چاہے تو عذاب دے۔

(مصنف عبد الرزاق - دارقطنی، دارقطنی میں ہے طلق

بعض آباء۔ ابن تیمیہ مصنف سے طلق جعدی... فاطمہ بنت قیس نقل کیا ہے اور ابن اہمام نے مصنف ہی سے ان ابلا طلق فاطمہ عبادہ نقل کیا ہے۔ مولانا مودودی بھی ایسا ہی نقل کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ واقعہ عبادہ بن صامت کے والد کا ہوگا۔ بہر حال معاندان لکل ظاہر ہے کہ اکدم ہزار طلاقیں دی گئیں تو حضورؐ نے تین کو واقع مان لیا اور فاضل کو مخیر قرار دیا جو گناہ ہے۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۷)

حضرت علیؑ کے صاحبزادے حضرت حسنؑ نے اپنی بیوی عائشہ خضعیہ کو ان لفظوں میں طلاق دی اذھی فانت طالق ثلاثا دجلی جاتجہ پرتین طلاقیں ہیں، عائشہ علیؑ گئیں بعد میں حضرت حسنؑ کے علم میں آیا کہ عائشہ کو ان سے چھٹ جانے کا براہم ہے تو آپ شہادت ائمہ سے روپڑے اور ہجرت سے کہا۔

اگر اپنے والد ماجد علیؑ کے ذریعہ اپنے جد امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ مجھ تک نہ پہنچا ہوتا کہ جو بھی آدمی اپنی زوجہ کو اکٹھی یا الگ الگ تین طلاقیں دے وہ بغیر حلالہ کے اسے بیہرحال میں نہیں لایا کرتا تو یقیناً میں خضعیہ کو ٹوٹا لیتا۔ (دارقطنی ص ۳۴)

اندازہ کر لیجئے حضرت علیؑ اور حسنؑ سے زیادہ قابل اعتماد راوی کہاں ملیں گے۔ نواسہ اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ و فتویٰ نقل کر رہا ہے۔ اگر بعض حضرات کے اس دعوے میں ذرا بھی صداقت ہوتی کہ زبان رسالت میں تین اکٹھی طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں تو یہ حدیث ہی آپ کے سامنے کب آتی۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۸)

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا جب کسی شخص نے اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دے دیں تو اب وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ طلاق کسی اور سے نکاح کر کے ہمبستر نہ ہوئے (دارقطنی)

یہ گویا راگاہ رسالت سے ایک عام ضابطہ شرعی کا اعلان ہو گیا۔ تین طلاقیں کسی بھی شکل میں ہوں ایک ساتھ یا الگ الگ حضورؐ نے کوئی قید نہیں لگائی۔ قید لگانے والے سوجھیں کہ انھیں کلام وحی میں اصل نے کائن کہاں سے حاصل ہو گیا۔ اس طرح کی روایات کی صداقت میں جس طرح کی باتیں کی جاتی ہیں ان پر ہم گفتگو کر آئے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ ایک دو مبہم روایات کی بات ہوتی تو گمان کیا جاسکتا تھا کہ شک کی گنجائش موجود ہے لیکن اتنی روایات اور یہ صحابہ کے فتوے اور جو معروف محدثین و فقہاء اور مجتہدین و اساتذہ کا اتفاق ایسی گنجائش

اس بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا کہ وہ دیکھتے ہیں کہ تمہاری بیوی تمہارے ہاتھ سے گئی! ابن مسعود بولے لوگوں نے صحیح کہا۔ بات اسی طرح ہے۔“

(موطا امام مالک، امام مالک نے حرب عادت یہاں کوئی سند بیان نہیں کی لیکن ابوبکر ابن ابی شعیبہ اور ترمذی اور عبد الرزاق نے اسے حضرت علقمہ کے واسطے بیان کیا ہے۔ امام مالک کی روایت میں ابن مسعود نے فتوے کا ایک اصول بھی بیان کیا ہے کہ کوئی شخص اگر غلط طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو محض اور شہادت کی دلدل میں پھنسائے تو اس کے نتائج خود اسی کو چھلکتے ہوں گے مفتی کا منصب نہیں کہ خود کو ان میں پھنسائے اسے تو ظاہر کے مطابق فتویٰ دینا چاہیے وہ من لبس علیٰ نفسا صلبا جعلنا لبسة به لا قلبسوا علیٰ انفسکم و نتحمل صلتکم۔

ابن مسعود کے جواب سے یہی نشانہ ہی ہو رہی ہے کہ اس وقت کے دیگر اہل افتاء بھی تین کے وقوع ہی کا فتویٰ دیتے تھے۔

فتویٰ عبد اللہ ابن عمر (۲)

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ ابن عمر سے جب کسی ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جاتا جس نے بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہوں تو وہ جواب دیا کرتے کہ اگر تم ایک یا دو طلاقیں دے تو یہ معاملہ تمہیں رسول اللہ نے تجھے رجوع کا حکم دیا تھا لیکن اگر تین دو تو عورت حرام ہو جائے گی اور وصال کے بغیر حلال نہ ہوگی۔

(بخاری شریف، کتاب الطلاق، باب من قال لامرأتی علیٰ حرام)

مسلم شریف میں مزید اضافہ یہ ہیں۔

”تین طلاقیں سے عورت حرام ہو جائے گی اور تم گنہگار ہو گے کیونکہ تم نے اس طریقہ سے فرار کیا جسکی ہدایت امت نے عورتوں کو طلاق دینے کے معاملہ میں دی تھی۔“

ابن ابی شعیبہ اور دارقطنی بھی اس ٹکڑے کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں (فتح القدیر، ج ۲، ح ۲۸۷۸، دارقطنی میں یہ روایت چار مختلف سندوں سے موجود ہے۔

اگر مسلم اور دیگر کتب مذکور کے اس زائد ٹکڑے کو ملحوظ رکھا جائے

کی نفی کر تلے۔ مقابلہ میں فریق ثانی جو مواد پیش کر رہا ہے اس کا حال آپ نے دیکھ ہی لیا حدیث کی حد تک تو اس کے پاس بس نہیں ایک ابن عباس والی روایت ہے جسکے مضمون میں صریحاً اضطراب اور محمور ہے۔ پھر حضرت عباسؓ کا اس کے خلاف فتویٰ دینا تو گویا عام کہاوت کے اعتبار سے مدعی سست گواہ حجت والا مضمون ہے یعنی خود ابن عباسؓ تین کو بھیجے مان رہے ہیں۔ فتوے دے رہے ہیں مگر فریق ثانی ان کی روایت کو دانتوں سے بچڑے بیٹھا ہے حالانکہ ابن عباسؓ کے تمام شاگرد ان کا یہی مسلک بیان کرتے ہیں کہ تین تین ہوتی ہیں ایک نہیں۔ فقط ایک شاگرد بعض مواقع پر اس کے خلاف حکایت کر گزرتے ہیں۔ پھر ان ہی کی دوسری حکایت و روایت سے یہ اندازہ ہو تلے کہ پہلی حکایت کا تعلق عیویوں سے نہیں بلکہ ان ہوں سے تھا جنھیں محبت سے قبل طلاق دیدی تھی۔ لہذا انھیں غلط گو کہنے کے بجائے کھلی گنجائش مل آتی ہے کہ فریق مذکور کو کم بھی یا غلط بھی کا مرتکب سمجھا جائے۔ اس طرح اجماع امت کی بنیاد دینے والی متعدد احادیث کے بالمقابل اس فریق کے پاس ایک بھی حدیث ایسی نہیں رہتی جو اس کے دعوے اور مسلک کی تائید کرتی ہو۔ اسی لئے اس کا دعویٰ التفات کا مستحق نہیں اور اجماع میں اس دعوے سے کوئی رخنہ نہیں پڑا۔ واضح رہے کہ ہم سب کے شیخ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی از انہ انھما میں مذکورہ ابن عباسؓ والی روایت کو طوائف والی سند سے اشکال قوی کا مورد گردانتے ہیں اور اس کے سلسلہ میں دو اہم تجربین کی ایسی تاویلیں نقل کرتے ہیں جو مسلک جمہور سے مطابقت اور فریق ثانی کے مسلک سے منازعت و مخالفت رکھتی ہیں (اوجز الممالک ط ۳)

صحابہ رضہ کے فتوے

فتویٰ عبد اللہ ابن مسعود (۱)

”ایک شخص حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو آٹھ طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ ابن مسعود نے دریافت کیا کہ دیگر حضرات

دی“ گویا حکم رسول کا تعلق تین الگ الگ وقتوں میں دی ہوئی
طلاقوں سے ہو گیا ایک وقت کی طلاقوں سے نہیں۔
چنانچہ مولانا حامد علی صاحب دو سروسوں کی نقل میں یہی بات
کہی بھی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ ”طلقتھا ثلاثاً کا مفہوم تین بار
طلاق بھی ہو سکتا ہے۔“

لیکن ہم افسوس کے ساتھ کہیں گے کہ اصلاً جس نے بھی یہ احتمال
آفرینی کی وہ یا تو عربی زبان جانتا ہی نہیں یا جان بوجھ کر معاملہ
دے رہا ہے۔ حدیث کا لفظ ہے ثلاثہ نہ کہ ثلاث حضرت ابن عمر
کا مفہوم یہی ہوتا کہ دو وقتوں میں دو طلاقیں دینے کے بعد تیسرے
وقت میں تیسری طلاق دو گے تو ان کے الفاظ یوں ہوتے ہوتے فان
طلقتھا ثلاثاً دو کے بعد چھٹا تیسری دو کے لیکن وہ ”تیسری“ نہیں بلکہ تین
ثلاث، کہہ رہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اوقات کا وہ فرق
ان کے پیش نظر نہیں جسے زبردستی ان کے منہ میں ڈالا جا رہا ہے۔

اور ملحوظ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تو یہ ایک بالکل سلفی بات
بن جاتی ہے کہ حضرت ابن عمر کے بیان کے مطابق رسول اللہ ان
تین طلاقوں کا بیان فرما رہے ہیں جو غیر مسنون طریقہ پر وقت واحد
میں دیدی جائیں۔ اگر مسنون طریقہ پر دی گئیں تو خدا کی نافرمانی
درگناہ کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔

لیکن غور کیجئے تو خود بخاری والا متن بھی اسی صورت واقعہ
پر صاف دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ الفاظ ہیں لو طلقت صۃ
او مرتین (اگر تم نے ایک یا دو طلاقیں دی ہیں تو یہ وہ معاملہ ہے
جس میں رسول اللہ نے مجھے جمعہ کا حکم دیا تھا) بہت سے بہت اس
ماترجمیوں کی جاسکتا ہے کہ ”اگر تم نے ایک بار یا دو بار طلاق دی ہے
وہ ترجمہ کر کے کہا جاسکتا ہے کہ یہ فقہ مختلف وقتوں کی طلاق کے لئے
ہے لہذا جب اس کے بعد ابن عمر یہ کہتے ہیں کہ ”اگر تیسری طلاق دی
زان کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ”اگر تیسرے وقت میں تیسری طلاق

اللہ کے لئے آزادی

حضرت بلال رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں کا سر کے افضل عمل اللہ کے راستے میں جہاد ہے حضرت
ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے بلال! تم چاہتے کیا ہو؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں
جہاد کروں یہاں تک کہ شہید ہو جاؤں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہاں اذان کون دے گا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے
کہا کہ (ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے) میں رسول اللہ کے بعد اب اذان نہیں دوں گا۔ حضرت
ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ نہیں تم یہیں رہو اور اذان دیا کرو۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر آئے اسی لئے مجھے آزاد کیا
ہے کہ میں آپ کا ہو جاؤں تو ایسا ہی ہو گا۔ اور اگر آپ نے اللہ کے لئے آزاد کیا ہے تو مجھے اللہ کیلئے چھوڑ
دیجئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے تم کو اللہ کے لئے آزاد کیا اے بلال!

اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ شام کی جانب کوچ کر گئے اور ان کی آخری اذانیں ان ایام میں ہوئیں جب
حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام گئے تھے۔ تو ان سے اذان کی درخواست کی گئی تو انھوں نے اذان دی۔ اس پر صحابہ کرام
اس طرح روئے کہ ایسا کبھی نہیں روئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ روئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ شام میں انتقال فرما گئے اور دمشق کی سرزمین میں دفن ہوئے۔

متعدد روایات سے حضرت علیؑ کا مسک فتویٰ معلوم ہونے کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ اگر سندوں میں کسی طرح کا ضعف بھی ہو تو انھیں رد کر دیا جائے۔ متعدد ضعیف روایات ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اور جب ہی مضمون قوی روایات اور قرآن اور دلائل عقلیہ سے ثابت ہو رہا ہو تو اصول فقہ کے مطابق ان تقویت یافتہ روایات سے شہادت اور حکم کا کام لیا جاسکتا ہے۔

فتویٰ حضرت عثمانؓ (۴)

معاویہ بن ابی سفیان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عثمانؓ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیدی ہیں آپ نے جواب دیا بابت منہلا بثلثات (تیری بیوی تین طلاقیں کے ذریعہ تجھ سے جدا ہو گئی)۔

(۱۰) فتح القدیر مع برایہ جلد ۸ صفحہ ۲۱۰ تبہم القرآن جلد ۳۳۵ بحوالہ سنن، دیلم بن الجراح،

مستشف عبد الرزاق میں ہی واقعہ دوسری سند سے موجود ہے (قال ابراہیم واخبرنی ابو الوحریت عن عثمان بن عفان ابن حزم نے اعلیٰ ایک اور سند سے (وکیعہ عن جعفر بن برقان عن معاویہ بن ابی سفیان) اسی واقعہ کو بیان کیا (جلد ۱، صفحہ ۱۸۱)۔

مصنف عبد الرزاق میں ایک اور واقعہ دو ایسی سندوں سے بیان کیا گیا ہے جن میں ایک سند تو اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اس واقعے سے بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ بلا کسی ریب و تامل کے ہی یقین رکھتے تھے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے کہ حتیٰ بھی طلاقیں شوہر کے قبضہ میں وہ اگر ایک ساتھ دیدی جائیں تو واقع ہو جاتی ہیں۔ اعلیٰ ترین سند یہ ہے عبد الرزاق عن معمر بن الزہری عن ابن اہلبیث قال: قصص

عثمانؓ کہ کسی نصف مزاج ماہر فن میں جرات ہے کہ ان میں سے ایک بھی راوی برا گشت نہ مانی کہ سکے یہ سب صحاح ستہ کے راوی ہیں جن لوگوں کی عادت یہ نہ تھی کہ اپنے خلاف پڑنے والی حدیث کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے راویوں کے خلاف ایک آدھ عمل طرح اٹھالائے ہیں اور تعذر کی کو باجائے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ شوشہ پھیلواتے ہیں کہ عبد الرزاق میں تشیع تھا۔ بلکہ یہی بعید نہیں کہ وہ یہ کہہ بیٹھیں کہ عبد الرزاق شیعہ تھے۔ ہم نے بار بار دیکھا ہے کہ اگر

تین اور تیسری کا فرق واضح ہے۔ اس سے بھی پہلے کیا کہ مرقہ اور مرتبین کہنے سے ان کی مراد الگ الگ اوقات نہیں بلکہ محاورے کے مطابق یہ الفاظ واحد اور اشہیں (ایک اور دو) کے مفہوم میں بدل گئے ہیں۔

فتویٰ حضرت علیؑ (۳)

دیکھ اعلیٰ سے اور اعلیٰ حبیب سے (اور حبیب ابو ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دی ہیں۔ حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ یہ بیوی تین طلاقیں کے ذریعہ تجھ سے جدا ہو گئی اور بغیر کو اپنی دوسری بیویوں میں بانٹ دے (۱۰) فتح القدیر مع حدایہ جلد ۲۔ کتاب الطلاق (۲) تبہم القرآن جلد ۵ صفحہ ۲۵۵ بحوالہ سنن، دیکھ بن الجراح (۳) سنن کبریٰ جلد ۲ صفحہ ۳۳۵ (۴) شرح معانی الآثار جلد ۱ صفحہ ۱۸۱)۔

ابراہیم محمد بن شریک بن ابی نمر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت علیؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں کے درختوں کے برابر طلاقیں دے دی ہیں حضرت علیؑ نے فرمایا ان میں سے تین لے لو باقی کو تھوڑو۔ (مستشف عبد الرزاق)۔

مصنف عبد الرزاق ہی میں تین ممتاز صحابہ علیؑ ابن مسعود اور زبیر بن ثابت کا یہ فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ اگر صحبت سے قبل منکوحہ کو تین طلاقیں عروہ کی صراحت کے ساتھ بیک لفظ دے دیں (یعنی تھوڑے تین طلاقیں) تو تین ہی بڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر یہ عورت دوبارہ زوجیت میں نہ آسکے گی۔ اور اگر الگ الگ فقرہ میں تین ہی ہیں تو پہلی ہی طلاق سے وہ جدا ہو جائے گی اور تیسری دیکھا جائے گی اب گویا حلالہ کے بغیر بھی دوبارہ اس سے نکاح ممکن ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ غیر مدخلہ حسن سے صحبت نہ ہوئی ہو چونکہ حکم شریعت ایک ہی طلاق سے جدا ہو جاتی ہے حق رجوع مرد کو نہیں رہتا اس لئے تین طلاقیں اب اس پر پڑیں گی کیسے۔ طلاق تو بیوی پر پڑتی ہے۔ ایک ہی طلاق نے اسے زوجیت سے نکال دیا۔ اعلیٰ اعلیٰ تین دیں تو دیکھ لیجئے تین جلیل القدر صحابی ہیں حضرت علیؑ بھی شامل ہیں یہی کہہ رہے ہیں کہ تینوں بڑ جائیں گی۔ اس صرح

صحبت سے پہلے اپنی منکوحہ کو تین طلاقیں دے ڈالے تو اس کا حکم شرعی کیلئے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک طلاق دینے سے تو منکوحہ بائید ہو جائے گی یعنی ایسی جدا کہ رجوع نہیں کر سکتے البتہ دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں بشرطیکہ عورت راضی ہو اور تین طلاقیں سے ایسی حرام ہو جائے گی کہ حلال کے بغیر حلال نہ ہوگی۔

(موطا امام مالک، طحاوی، سباحت طلاق)

حسن ابو داؤد بھی اور سنن سعید بن منصور بھی حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ غیر مدخولہ پڑائی مکین تین طلاقیں کو وہ مغلطہ قرار دیتے تھے کہ حلال کے بغیر حلال ہی نہ ہو۔

سعید بن منصور کا نام چونکہ عام طور پر شہرت یافتہ نہیں اس لئے چند تعارفی الفاظ حوالہ رقم ہیں۔

یہ پہلی صدی ہجری کے علماء میں ہیں ۲۹۰ھ میں مکہ میں انتقال فرمایا۔ پورا نام ہے سعید بن منصور بن شعیبہ بن کنینہ ہے ابو عثمان۔ بعض دیگر محدثین کے علاوہ امام مالک سے استفادہ کیا۔ امام مسلم امام ابو داؤد اور امام احمد جیسے اکابر سے کافی روایت کرتے ہیں۔ ان پر جرح یقیناً کی گئی ہیں لیکن تبدیل بھی کی گئی ہے۔ امام احمد اور ابوجامع جیسے اساتذہ ان کی توثیق کرتے ہیں ان کی بے شمار روایات "ثلاثیہ" ہیں یعنی محض تین واسطے۔ ایسی سند میں محدثین کے بیان بڑی قدر قیمت رکھتی ہیں۔

اس تفصیل کا منشاء یہ نہیں کہ مروی پر کلام نہیں کیا جاسکتا مگر یہ فشا ضرور ہے کہ جب دیگر قویٰ شواہد موجود ہیں تو ان کی روایات نظر انداز بھی نہیں کی جاسکتیں۔ امام مالک سے بڑھ کر شاذ اور مؤید اور کون چاہیے۔

فتویٰ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

(۱) ابو داؤد و شریف میں تطبیقات ثلاثہ کے زیر عنوان حضرت ابن عباسؓ کا ایک تفصیلی ارشاد نقل کیا گیا ہے۔ انھوں نے آیت قرآنی والمطلقات يتزويجن الايت في شان نزول بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے یہ تھا کہ کوئی شخص چاہے تین ہی طلاق دے چکا ہو مگر وہ رجعت کا حق رکھتا تھا۔

کتب فن میں کسی راوی کے بارے میں کسی بزرگ نے یہ کہہ کر فلاں آدمی میں فی الجملہ شیعہ تھا۔ یا شیعہ کی بوباس تھی تو بعض فنکاروں نے بالکل غلط طور پر اس کا ترجمہ پیش فرمادیا کہ فلاں راوی شیعہ تھا حالانکہ اس اندہ فن نے بار بار جتلا یا ہے کہ غیر دار اس کا یہ مطالبہ نہ کر لینا شیعہ ہونا اور بات ہے اور فی الجملہ شیعہ ہونا اور بات ہے چنانچہ بعض حضرات نے امام ابوحنیفہؒ تک میں شیعہ کا قول کر دیا ہے۔

عبد الرزاق حضرت عمرؓ کے اتیانہی شان رکھنے والے جلیل القدر شاعر ہیں۔ عمر کی روایات ان سے زیادہ شاید کسی کو یاد ہوں۔ امام ادراعی امام ابن حجرؒ کا درامام ثوری سے انھوں نے کافی استفادہ کیا ہے۔ ان کے شیعہ کا حد درجہ ان کے اس قول سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مجھ میں یہ جرات نہیں کہ حضرت علیؓ کو حضرت صدیقؓ و حضرت عمرؓ پر ترجیح دوں۔

وہ عمرؓ زہری اور ابن المہزیبؒ قویہ تو بخاری و مسلم سب کے یہاں اعلیٰ درجہ ثقاہت پر فائز ہیں۔ اس طرح حضرت عثمانؓ کا فتویٰ اور مسلک ثبوت کے رخ سے قطعاً بے غبار ہو جاتا ہے۔

فتویٰ حضرت عمرؓ (۵)

اگرچہ سیدنا حضرت عمرؓ کے فتوے کی نقل ضروری نہیں تھی کیونکہ ان کے بارے میں فریق ثانی بھی تسلیم کرتا ہے کہ انھوں نے تین طلاقیں کے نفاذ کا آرڈر جاری فرمایا لیکن اس غلط فہمی کی اصلاح کے لئے یہ آرڈر سیاسی و دوسری تھا فتویٰ تھا طحاوی میں ان کا یہ فتویٰ موجود ہے کہ صحبت سے قبل منکوحہ کو تین طلاقیں دیری جائیں تو تینوں پڑ جائی ہیں۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ تین پڑنے کی بات "سرکاری" نہیں شرعی ہے مجہدؓ اقطانی نے جو مدایت نقل کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ صحبت کی پہونہ کی بہودوں صورتوں میں حضرت عمرؓ کے وقوع کا فتویٰ دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو جو خط تحریر فرمادیا تھا اس میں یہ الفاظ ہیں جس نے تین بار انت طالق کہہا تو تین طلاقیں ہیں دیکھا اخرجہ ابو نعیمہ سعید بن منصور،

فتویٰ حضرت عمرؓ و ابن عباس رضی اللہ عنہما (۶)

کسی شخص نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی آدمی

اس آیت نے قانون شرعی کی اطلاع دی کہ طلاقیں تو بس دو ہی ہیں جن سے رجوع ہو سکتا ہے۔ تین سے رجوع نہیں ہو سکتا۔
فائدہ غور یہ ہے کہ آیات طلاق نازل ہونے سے قبل تو اس کی بحث ہی نہ تھی کہ طلاق سنت کیا ہے اور طلاق بڑی کیل ہے۔ یہ سب تو بعد میں سنے آیا کہ تین الگ الگ حکموں میں طلاقیں دینی چاہئیں۔ لہذا ابن عباس میں زمانے کا حال بیان کر رہے ہیں اس وقت دو تین چار حتیٰ بھی طلاقیں دی جاتی ہیں کی الگ الگ دقتوں میں بھی دی جاتی ہوں گی اور ہیک وقت بھی۔ ایسی کوئی وجہ موجود نہ تھی کہ ایک ہی وقت میں متعدد طلاقیں دے ڈالنے کو آدمی گناہ سمجھے اب اگر ابن عباس یہ کہتے ہیں کہ آیت نے اس طریقے کو منسوخ کر کے حق رجوعت دو طلاقیں میں محدود کر دیا اور تین طلاقیں مغلط بن گئیں تو گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تین طلاقیں خواہ الگ الگ دقتوں میں دی گئی ہوں یا ایک ہی وقت میں قرآن نے حق رجوعت منسوخ کر دیا۔ یہ مطلب کسی طرح نہیں نکالا جاسکتا کہ نسخ صرف اس صورت میں ہے جب الگ الگ دقتوں میں دی گئی ہوں۔

(۲) ابو داؤد میں واقع بیان ہو رہا ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ بیوی کو اکدم تین طلاقیں دے آیا ہے۔ ابن عباس چپ رہے۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ابن عباس ناخوش وارہجے میں پوسے تم میں سے ایک شخص حماقت کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور پیچھتا ہے کہ اے ابن عباس اے ابن عباس! حالانکہ اللہ نے پہلے ہی فرما دیا ہے کہ جو شخص انتر سے ڈرے گا کوئی نہ کوئی راکھسل جائے گی۔ تو انتر سے نہیں ڈرا اب میرے پاس تیرے لئے کوئی گنجائش کہاں دھری ہے۔ تو نے خدا کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی۔ (تفسیر ابن جریر میں یہ روایت موجود ہے)

(۳) کسی نے بیوی کو سو طلاقیں بھونک دیں اور ابن عباس سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ تین طلاقیں سے تو عورت جدا ہو گئی اور باقی موجب عذاب نہیں کہ ان کے ذریعہ انتر سے تسخیر کیا گیا۔

(موطا امام مالک - دار فطنی - طحاوی - بحث طلاق -)

اسے ابن عباس کے کچھ شاگرد نقل کرتے ہیں۔

(۴) طحاوی ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک بھتیجی

صاحب نے چچا کے بارے میں ابن عباس کو بتایا کہ وہ دفعۃً تین طلاقیں دے بیٹھے ہیں۔ ابن عباس نے جواب دیا کہ تیرے چچا نے خدا کی حکم عدولی کی اور شیطان کا پیر و بنا لہذا اللہ نے اس کے لئے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔

(۵) کسی صاحب نے صحبت سے قبل ہی منکوحہ کو تین طلاقیں بھانڈیں پھر جی چاہا کہ دوبارہ نکاح کر لیں۔ اب فتویٰ پوچھنے نکلتے ہیں۔ واقعہ کے راوی ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس کے پاس گیا۔ دونوں صحابیوں کا جواب ایک ہی تھا۔

”اے شخص تو نے خود ہی اس گنجائش کو ختم کر دیا ہے جو تجھے حاصل تھی۔“

یعنی بجلے ایک کے تین دے بیٹھا۔ اب کیا پوچھتا پھرتا ہے۔
(موطا امام مالک - سنن ابی داؤد -)

فتویٰ حضرت ابو ہریرہ رضی

ادھر کی روایت خبر ہے اور ابن عمر میں العاص کے فتوے کے ہم رشتہ ابو ہریرہ کا فتویٰ علم میں آچکا۔ مزید توثیق موطا اور طحاوی میں بیان شدہ روایت سے ہوتی ہے جو اسی کے مثل ہے۔

فتویٰ حضرت انس رضی

ایک وقت میں دی گئی تین طلاقیں کے سلسلہ میں حضرت انس بھی یہی فتویٰ دیتے تھے کہ اب جلالہ کے بغیر کوئی صورت تجدید حلق کی نہیں (طحاوی)

فتویٰ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی

امام بیہقی اپنی سنن میں سند کے ساتھ قیس بن ابی عامر کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ میرے سامنے ایک شخص نے مغیرہ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جس نے فرط غضب میں بیوی کو اکدم سو طلاقیں دے ڈالی ہوں۔ مغیرہ نے جواب دیا کہ میں سے تو بیوی حرام ہو گئی اور ۹۰ خانہ تو رہیں۔

حافظ ابن قیم نے بھی اغاثۃ اللہ لعافان میں یہ روایت نقل کی

ہے اور سکوت اختیار فرمایا ہے کوئی رد و قبح نہیں کی۔

فتویٰ حضرت عمران بن حصینؓ (۱۱۱)

ابو بکر ابن ابی شیبہ سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ صحابی رسولؐ عمران بن حصینؓ سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے ایک ہی مجلس میں بیوی کو تین طلاقیں دیدی تھیں انھوں نے جواب دیا کہ یہ شخص گناہگار بھی ہوا اور اس کی بیوی بھی اس پر حرام ہو گئی۔

اس اثر کو علامہ ترکمانی نے بھی الجھڑا سنتی میں روایت کیا ہے اور ابن قیمؒ سے بھی کے حوالے سے اعانہ میں بھی نقل کرتے ہیں انھوں نے مستند نقل نہیں کی مگر رد و قبح بھی مطلق نہیں کی جس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ سندان کے نزدیک صحیح فقہی اور روایت انھوں نے قبول نہ فرمائی۔

فتویٰ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ (۱۱۲)

اور دارقطنی نے صحابی رسولؐ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے صاحبزادے ابوسلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کی ماں نماضر بنت الاصبغ کو حضرت ابن عوفؓ نے تین طلاقیں ایک مجلس میں دیں یعنی ”تجہرتین طلاق“ لہذا اپنے سے جدا کیا (لاحظہ ہو دارقطنی جلد دوم صفحہ ۱۷) یہ اگرچہ حضرت ابن عوفؓ کا عمل ہے اصطلاحاً اسے فتویٰ نہیں کہتے مگر یہی ظاہر ہے کہ یہ فتوے سے بھی زیادہ قوی گواہی ہے اس بات کی کہ وہ ائمہ تین طلاقیں کے سلسلہ میں دیے گئے تھے جو باقی صحابہ کی تھی۔ رائے کیا یوں کہے مسلم یہ تو دراصل قطعی فتاویٰ شرعی تھے کہ تین اکٹھے دو گے تو تین ہی پڑیں گی۔ اسی کے مطابق صحابہ کے فتوے بھی تھے اور ان کا تعلق اچھا ہے نہیں علوم و مسلمت از ن سے تھا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا فتویٰ (۱۱۳)

حضرت عائشہؓ سے مروی حدیثوں میں سے صحیح الطبع اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کا فتویٰ کیا ہوگا۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ اکٹھے تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں۔ اسے جصاص نے احکام القرآن میں ابو دینار باہجی

مالکی نے المنقذ میں ابن مہام نے فتح القدر میں، ابن عبد البرؒ نے استذکار میں اور نہ جانے کتنے اہل علم نے اپنی اپنی کتابوں میں بیان کیلئے یہاں تک کہ شیعہ فقہ کی کتاب الووض المضایر میں بھی بحر کے حوالہ سے جن صحابہ کا نام لیا گیا ہے ان میں حضرت عائشہؓ کا نام موجود ہے۔

نواسہ رسولؐ حضرت حسن بن علیؓ کا فتویٰ (۱۱۴)

اس فتوے کا اندراج ہم ”رسول اللہ کے فتاویٰ“ میں کر چکے لیکن کیا اسے خود حضرت حسن کے مذہب کا آئینہ دار نہیں کہیں گے؟ جو حاصل فتوے کا ہے وہی اس کا ہے۔ وہاں ہم نے دارقطنی کے حوالہ سے نقل کیا تھا یہاں بھی دارقطنی کے حوالہ سے پیش خدمت ہے۔ اس کی سند کو حافظ ابن رجب صمیم قرار دیتے ہیں اور دارقطنی والی سند کو خود دارقطنی نے حسن قرار دیا ہے۔

حرف آخر

محدود وقت میں تحقیق کا جو حق ادا کرنا تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ بعینہ نہیں کہ ہم سے بھی نادانستہ کچھ لغزشیں ہوئی ہوں۔ ہماری کسی بھی لغزش کی شہادت ہی کوئی صاحب فرامین تو سر اور آنکھوں پر لیکن ہماری لغزشوں کا حاصل یہ بہر حال نہیں ہو سکتا کہ اجماعی مسئلہ غیر اجماعی بن جائے اور حدیث دُعا کا سارا ذخیرہ مباد ہو جائے۔

مولانا کر آبادی، مولانا محفوظ الرحمن اور مولانا سید احمد مدیر زندگی تینوں کو سوچنا چاہئے کہ اجماع سے ان کا انکار کیا اب بھی اپنی جگہ قائم ہے یا اس کا بے بنیاد ہونا یا ثبوت کو پہنچ گیا ہے۔ سوچنے کے آغاز میں یہ دعا ضرور پڑھ لینی چاہئے اللھم ابرنا الحق حقاً و ابرنا الباطل باطلاً۔

طالب حق کبھی ضعیف نہیں ہوتا

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب

میں مولانا اشرف علی ۷۷ نے معاملات

کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ بڑے کام کا

رسالہ ہے۔ قیمت صف ۶۰ پیسے

معجزہ کیلے؟ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

کی ایک فکر انگیز تصنیف۔ معجزے کے

تمام پہلوؤں پر علم و تحقیق کی روشنی میں۔ جلد ڈھائی روپے ۲/۵۰

شہدائے بدر کے محقر حالات و کوائف

شہدائے بدر قیمت ۱/-

فن اسماء الرجال اسرار: مولانا تقی الدین

مطہری۔ علم الحدیث

کا مدار راہیوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فن

اسماء الرجال پر منحصر ہے۔ اہل حدیث رسولؐ سے نیچپی رکھنے

والے تمام ہی مسلمانوں کے لئے یہ کتاب بنیادی فوائد کا حامل

ہے۔ قیمت — ایک روپیہ پچتر پیسے ۱/۴۵

فتاویٰ عبدالحی مولانا عبدالحی کا مشہور مجموعہ فتاویٰ

ایک جلد میں۔ مکمل نظر ثانی کے بعد

قیمت — بیس روپے ۲۰/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ مولانا منظور نعمانی کی مقبول

کتاب۔ اس میں وہ عام مہم

زبان میں شرکی مطالب بیان کرتے ہیں۔

قیمت — پچھرو روپے ۶/-

آداب زیارت قبور شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا محمد سلطانؒ

کے فرمودات۔ قیمت ۶۵ پیسے

معارف سلیمان نمبر مولانا سیّد سلیمان ندوی کے احوال و

کوائف اور تذکرہ و تعارف پر یہ نمبر

بہت شاندار ہے۔ قیمت — پانچ روپے ۵/-

الحج مولانا اشرف علی ۷۷ کے تالیف شاہ سیّد امین

کی نادر تصنیف۔ موضوع نام سے ظاہر ہے

قیمت — ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

مکتبہ تجلی دیوبند (دیکھی)

پھول کی طرح تروتازہ

اگر جلدی امراض یا فساد خون کی شکایت ہو تو چہرہ پر مرقہ نظر آتا ہے

خون صفا

پھول سے پھنسی خارش اور داسے نجات دے

مرکبہم اوچھڑے کو پھول کی طرح تروتازہ دکھاتا ہے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کامیاب نکاح

تو نیا گھر سونا اور سسرال آجائے تو پرانے گھر کے لوگ دیرانی محسوس کریں۔ اچھا گھر سناروہ ہے جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی کام میں مصروف ہو۔ یا پھر سناڑ میں مشغول کوئی تلاوت کر رہا ہو، کوئی اچھی کتابیں پڑھ رہا ہو۔ یہ سب کام میاں بیوی اور گھر کے سارے لوگ ایک دوسرے کے تعاون سے جاری رکھے ہوئے ہوں۔

نیا گھر بنا کر دوسرے رشتہ داروں سے نبھاؤ اور بناؤ کو ذبیحہ بنانے پر قائم کر دیا گیا ہو خیرات اجزا آخرت اور رضائے الہی کی نیت سے جاری ہوں۔ مساکین کو کھانے پکھانے جائیں گو غربت ہو تنگ دستی ہو تو سالن میں کچھ زیادہ پانی ڈال لیں مگر راہ خدا میں کچھ نہ کچھ اس کے غریب اور بے سہارا بندوں کو دینے جائیں تو بے استغفار انسان الی اللہ۔ یہ سب کام ہوں تو جتنی غیبت کا موقع ہی نہ آئے گھر کو شمع نبوت سے ایسا روشن کر دیا جائے کہ اندھیرے کا نشان باقی نہ رہے۔ یہ تمام باتیں نکاح کی کامیابی کا ثبوت ہیں۔ ایک اچھے خاندان کی بہترین خوبی یہ ہے کہ انسراد کا باہمی ربط و ضبط ہو گھر کے افراد کے درمیان محبت و چاہت ہو، ایک دوسرے کے دم ساند ہوں کوئی بھی سنگدلی کا مظاہرہ نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔

دین حنیف اپنے ماننے والوں کو بنیاد پر موقوف رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی میرے پلائی ہوئی دیوار۔ اس مضبوط دیوار کا سنگ بنیاد وہ خاندان ہے جو عورت مرد باہم مل کر وجود میں لے آئے ہیں۔ خاندان کی اساس عورت مرد کے تعلقات خراب ہونے سے درہم برہم ہو جاتی ہے البتہ تعین کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی کہ

کامیاب نکاح وہ ہے جس میں حدود و منہجیت کو پامال نہ کیا گیا ہو، خوشی خوشی سب کام پوری سادگی سے انجام پائے۔ دھن گھرائی اس کے ماں باپ پر جہیز تلک سے متعلق کوئی اعتراض نہ ہوا، ہنسی خوشی ہر چھوٹے بڑے نے نئی دھن کا استقبال کیا۔ آنے والی نے اپنی ساس اور خسر کو ماں باپ کی جگہ سمجھا۔ شوہر کو اپنا سرتاج مانا۔ ادھر دولہا نے اس دولہن کو پاکر اپنا بقیہ آدھا ایمان پورا کر لیا رشتہ حیات میں منسلک اس نئی ترکیب حیات کا فیض اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگ گیا۔ دھن نے نند اور دیور کو اپنا بھائی بہن مانا، گھر کے کام کاج کو اپنے سر لیا۔ دھوئی، درزی کے گھر جانے والی رقم کو حتی الامکان روک لیا۔ گھر کی اخراجات میں اصلاح اور کفایت شعاری سے بچت بھی اچھی خاصی کر لی۔ پھر ایک مسلم عورت اپنے فرائض کی ادائیگی میں نماز و تلاوت سے خدا کی برکت کے نذر دل کا سبب بنی۔

دلہن نے آتے ہی گھر میں نہایت ہی سلیقے سے رکھ رکھاؤ قائم کر دیا۔ میاں جب گھر میں آئے ہنس کر مسکرا کر اس کا استقبال کیا، ہر طرح کی زینت و آرائش صرف اپنے شوہر کے لئے کہ دولہا کو دنیا میں صرف اپنی دلہن ہی خوبصورت اور خوب سیرت معلوم ہوئی۔ اولاد کی پرورش و تعلیم و تربیت میں وہ سلیقہ کہ حملہ پردوں میں اس گھر کے بچے مثالی بچے کہے جانے لگیں۔ شوہر کے گھر آنے پر کوئی شکوہ شکایت مطلق نہیں۔ حملہ پردوں میں کسی سے بھی لڑائی جھگڑا مول نہیں لیا۔ نئے ماں باپ اور نئے بھائی بہن اس دلہن پر ایسے فدا کہ میکہ علی جانے

میاں بیوی میں رنجش پیدا کر دے اور اس باتی تمام کام رفتہ رفتہ میاں بیوی خود ہی کر ڈالتے ہیں لیکن کامیاب نکاح خالے گھر کے افراد ابلیس کو اس محاذ پر دفن کر کے رہتے ہیں۔ آپکی کامیاب گھریلو زندگی کا نسخہ خود قرآن پاک میں رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ **وَاللَّهُ أَتَمُّ مَعَ مَا كُنْتُمْ بِهَا عَلَىٰ عَمَالِكُمُ** اللہ کی نافرمانی سے جو جس کے نام پر سوال کرتے ہو اور قربت کے تعلقات کو جگاڑنے سے بچتے رہا کرو۔

آدمی کے لئے پورا آدمی بن جانے کے بعد اسکی بیوی بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ ہر طرح اپنی زوجہ کی دین اور دنیا کی مسرتوں کا پورا خیال رکھے۔ حدیث شریف میں اچھا آدمی اسی کو کہا گیا ہے جو اپنے اہل و عیال کے لئے خیر و برکت دے۔

شوہر کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی زینت آرائش کا زیور خود ہی بن کر دکھائے، اس کی دلچسپی میں تعاون کرے۔ گھر بلو کام کاج میں جتنا ہو سکے ہاتھ بٹائے۔ بیوی کو نوکر چاکر کی طرح نہیں بلکہ گھر کی ملکہ اور خود اپنا آدھا وجود تسلیم کرے۔ گھر میں رہتے وقت خود بھی اپنے آپ کو اچھے لباس میں بیوی کی توجہ کا مرکز بنائے۔ جو لوگ باہر تو بہت ہی سنور کر جاتے ہیں اور گھر پر بھی ٹنگیاں اور میلی بنائیں یہیں کر رہتے ہیں انھیں کامیاب ازدواجی زندگی کیلئے اپنے لباس کا خیال ضرور رکھنا چاہئے یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ بیوی جب باہر جائے تو بہترین لباس میں جائے اور گھر میں سر جھاڑ اور منہ پہاڑ بیٹھی ہو، ایسی بہن کامیاب نکاح کا لطف حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جو بھائی اپنے دوست احباب میں خوب بن سنور کر جائے اور گھر میں اپنی زوجہ کی کشش سے لاپرواہ ہو وہ بھی اس مسرت سے محروم رہے گا۔

بازار سینما اور ناٹک میں نظر آنے والے مرد عورت اپنی زینت و کشش میں بازاری حد تک آرائش کرتے ہیں۔ گھریلو زندگی والے جب ان دائروں میں اپنے جوتے کا لٹو کہتے ہیں تو انھیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ ہم گھریلو فضا کو نہایت ہی صاف ستھری اور پاکیزہ رکھیں

بھر دیکھتے باز ار کی زینت اور گھر کی زینت کا مقابلہ ہو تو سکون قلبی انشاء اللہ ہر مومن کو گھر میں میسر ہو گا۔

حقیقی شش طہارت پاکیزگی ستھرائی اور سلیقہ مندی میں پائی جاتی ہے۔ ملت کے بھائی بہنوں کا خیال اس طرف آئے تو انشاء اللہ گھر کو جنت بناتے دیر نہ لگے گی۔ **اَللّٰہُ یُطَهِّرُکُمْ وَیُزَکِّیْکُمْ** اللہ تعالیٰ کا ایک مصداق یہ بھی ہے کہ ہم اگر ہر قدم پر اللہ کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھیں گے اور اسلام کے بتائے ہوئے پاکیزہ طور طریق اپنائیں گے تو ہمارے دلوں کو سکون و اطمینان میسر ہو گا۔ ذکر اللہ صرف اللہ ہی کی ضرورتوں یا تسبیحوں اور مناجاتوں یا صرف نماز روزے کو نہیں کہتے بلکہ ہر شعبہ زندگی میں، تجارت میں، ملازمت میں، تعلقات میں، رہن سہن میں، تنگی میں، فراخی میں، اللہ کی فرماں برداری کرنا اصلی ذکر اللہ ہے۔ خدا کو یاد رکھو انشاء اللہ دل کو اطمینان، ذہن کو سکون اور روح کو آسودگی حاصل ہوگی۔ میاں بیوی کے درمیان گہری محبت، رفاقت، وابستگی اور غنجواری اللہ کو بے حد پسند ہے۔ آپ بھی اس سے غافل نہ ہوں۔

زلزلہ در زلزلہ

از فہم الدین احیائی۔ فاضل دیوبند

مشہور بریلوی مناظر مولانا ارشد القادری کی کتاب زلزلہ کا دندان شکن جواب۔ اس کی پھیلائی بیوی بھی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کر دینے والی قبوری شریعت کے رہنماؤں کی تحریروں کے حیران کن انکشافات سے لبریز کتاب پر اس میں جانے کے لئے بالکل تیار ہے۔ کم از کم متوکالی کے خریدار خصوصاً مسلمانوں کے لئے فوراً خط و کتابت کریں۔

قیمت اندازاً چھ روپے

نیچر۔ ہلال بکڈ پور۔ مبارک پور۔ اعظم گڑھ

مدیر زندگی کا مراسلہ و اس کا جواب

(تاہم بخ ندارد)

محترمی و مکرمی اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
بیک مجلس بایک کلمہ تین طلاؤں کے مسئلے پر راسخو
میں آپ نے جو گفتگو کی تھی میں برابر اس پر غور کرتا رہا اور
اب طلاق نمبر کے مطالعہ کے بعد بھی اس پر غور کیا۔ آپ نے
میرے دونوں مقالوں پر اجمالاً جو کچھ لکھا ہے اس کو بغور
پڑھنے کے بعد بھی مجھے اپنے موقف میں کسی تبدیلی کی
ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں اس خط میں جو کچھ
عرض کر رہا ہوں اس پر آپ غور فرمائیں اور میرا یہ خط
تجلی میں شائع کر دیں تاکہ قارئین تجلی بھی میری توضیح سے
واقف ہو سکیں۔

(۱) میں نے سمینار والے مقالے میں جو کچھ لکھا ہے اسکی
دو باتوں پر آپ کے اعتراض کیا ہے۔ ایک یہ کہ جب میں
کہتا ہوں کہ احادیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ نے پوری
طرح واضح کر دیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی
ہوتی ہیں تو پھر کس بنیاد پر میں یہ بھی کہتا ہوں کہ:-

”اگر طلاق دینے والے نے اس خیال کے تحت تین

کی صراحت کے ساتھ طلاق دی ہے کہ اس کے
بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی تو ایسی تین طلاقیں کو

ایک شمار کیا جانا چاہیے۔“

اس پر آپ نے جو اعتراض کیا ہے اس کا حال یہ ہے کہ
قانون سے ناواقفیت دین و دنیا کے کسی قانون میں عذر
معتبر نہیں اور اگر اس طرح کی مفروضہ جہالت جس کا ذکر
میں نے اوپر کیا ہے تسلیم بھی کر لی جائے تو لوگوں کا جہل کسی

فعل کی تاثیر میں آخر کا وط کیسے بن سکتا ہے۔ اس بات
کو سمجھانے کے لئے آپ نے مثال دی ہے کہ اگر کوئی شخص بھولے
سے بھری ہوئی صندوق داغ دے اور کوئی کسی انسان کے
سینے میں لگ جائے تو وہ زخمی ہو ہی جائے گا۔ بھولے سے
داغی ہوئی کوئی بے اثر نہیں رہے گی۔

میں پہلے یاد دہانی کرنا چاہتا ہوں کہ احادیث نبویؐ
اور آثار صحابہؓ کے حوالے سے جو بات میں نے لکھی ہے اس کا
تعلق علم و فہم کے ساتھ طلاق دینے سے ہے۔ میں نے اپنے
مقالے کے آخر میں صراحت کے ساتھ یہ لکھا ہے:-

”میں اوپر مقالے میں واضح کر چکا کہ اگر کوئی شخص
جان بوجھ کر ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں
دے ڈالے تو تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔“

میں نے مزید صراحت ان الفاظ میں کی ہے:-

”جو لوگ یہ جان کر اور سمجھ کر کہ بیک ندر بیک
کلمہ تین طلاقیں دے ڈالنے سے تین طلاقیں واقع
ہو جاتی ہیں تین طلاقیں دے ڈالیں۔ ایسے لوگوں
کی دی ہوئی تین طلاقیں کو ایک قرار دینا میرے
نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص تین
طلاقیں دینے کی نیت سے میں نے طلاق دی۔

میں نے طلاق دی۔ میں نے طلاق دی ہے تو تین
طلاقیں ہوں گی، ان کو ایک قرار دینا میرے نزدیک
صحیح نہیں ہے۔“ (ایضاً ص ۲۸)

ان صراحتوں سے معلوم ہوا کہ میری وہ دونوں عبارتیں

جنہیں آپ نے اپنے تبصرے میں نقل کیا ہے، دو صورتوں سے متعلق ہیں اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس یاد دہانی کے بعد اب میں آپ کے اعتراض کے سلسلے میں عرض کرتا ہوں۔

میں نے احادیث اور فقہ کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ طلاق، بندوق کی گولی نہیں ہے۔ بلکہ فقہ میں طلاق دینے والے جاہل مطلق کی طلاقوں کو بندوق کی گولی سے تشبیہ دے کر معارضہ کرتا صحیح نہیں ہے۔ بندوق کی گولی کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی پاگل بھی کسی شخص کے سینے پر تین گولیاں داغ دے تو تینوں اس کے سینے میں پیوست ہو جائیں گی۔ لیکن اگر وہ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالے تو ایک بھی واقع نہیں ہوگی اور اس پاگل کے الفاظ طلاق ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔

دوسری مثال :- زید سویا ہوا ہے اور بھری ہوئی بندوق اس کی بغل میں رکھی ہوئی ہے نیند میں اس کا ہاتھ بلبلی پر پڑ جاتا ہے۔ گولی نکلتی ہے اور اس کی بیوی کو زخمی کر دیتی ہے اور یہی زید نیند میں اپنی بیوی کو ایک، دو، تین طلاقیں دے ڈالتا ہے۔ کیا یہ تین طلاقیں اس کی بیوی پر واقع ہو جائیں گی؟ نہیں! ایک بھی واقع نہ ہوگی۔

تیسری مثال :- زید نے نادانیت میں گتے کا ایسا رس پی لیا جس میں نشہ پرا ہو گیا تھا اور اس نشے میں اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

چوتھی مثال :- زید نے جان بوجھ کر شراب پی لیکن اس سے اس کے سر میں شدید درد پیدا ہوا اور اس نے درد کی شدت میں اپنی بیوی کو طلاق دی، یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

پانچویں مثال :- کسی نے زید کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق دے کر اس کو مجبور کیا کہ بھر بھر گولی چلا دے اس نے حالت اکراہ میں گولی داغ دی، بھر زخمی ہو گیا۔ گولی اپنا کام کر گئی۔ اس زید کو کسی نے مجبور کیا کہ اپنی بیوی کو

طلاق دیدے، اس نے حالت اکراہ میں طلاق کی نیت اور قصد کے بغیر محض مجبوراً اپنی بیوی کو لفظ طلاق دیدی تو کیا یہ الفاظ طلاق اپنا کام کریں گے؟ مالک وشافعی و احمد رحمہم اللہ کا جواب یہ ہے کہ الفاظ طلاق بے اثر رہیں گے اور طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر حالت اکراہ میں کما ینہ اس نے طلاق دی ہے یعنی منہ سے الفاظ طلاق نہیں نکالے ہیں بلکہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں تو فقہ حنفی کا جواب یہ ہے کہ طلاق واقع نہ ہوگی۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ طلاق بندوق کی گولی نہیں ہے۔ بندوق سے گولی نکل کر اپنا کام کرتی ہے خواہ بندوق چلانے والا کسی حال میں ہو لیکن لفظ طلاق ہر حال میں اپنا کام نہیں کرتا۔ جب صورت حال یہ ہے تو یہ مسلمہ فقہیاً قابل غور ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جان کر تین طلاقیں دے ڈالے کہ جب تک وہ تین کا لفظ استعمال نہ کرے گا طلاق واقع ہی نہ ہوگی اور وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ اس کی نیت تین طلاق دینے کی نہ تھی تو کیا اس کے لفظ کو بندوق کی گولی مان کر اس کو نافذ کر دیا جائے یا یہ مان کر کہ وہ صرف طلاق دینا چاہتا تھا تین کے لفظ کو بے اثر مان کر اس کی نیت کے مطابق ایک طلاق واقع ہونے کا فیصلہ کیا جائے؟ میں نے بھی غور کیا تھا اور آپ کا معارضہ سن کر اور پھر تجلی میں پڑھ کر بھی غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تین کی صراحت کو غلط فہمی اور دھوکے پر مبنی سمجھ کر طلاق دینے والے کی نیت کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ فریب خوردہ کے ساتھ رعایت دین و دنیا کے ہر قانون میں موجود ہے۔

حضرت عمرؓ کے فیصلے کی نظر

میں کتب فقہ میں یہ واقعہ ملتے ہے کہ ایک چالاک عورت نے اپنے بھولے بھالے شوہر کو دھوکہ دیکر اس سے طلاق کے الفاظ کہلوائے اور حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دیدی ہے اور اب انکار کر رہا ہے۔ اس کے شوہر نے وہاں پہنچ کر

اصل واقعہ سنایا تو انھوں نے عورت کو سزا دی اور وقوع طلاق کا فیصلہ نہیں کیا۔ ہدایہ کی تشریح فتح القدیر میں یہ واقعہ بایں الفاظ منقول ہے:-

”ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا میرا کوئی نام رکھو اس نے اس کا نام طلیہ رکھا عورت نے کہا یہ تو تم نے کچھ بھی نہ کہا شوہر نے کہا تو اب تمہیں اپنا کوئی نام بتاؤ اس نے کہا ”میرا نام خلیہ طاتی“ رکھو شوہر نے کہا ”تو خلیہ طاتی ہے“ اس کے بعد وہ عورت حضرت عمرؓ کے پاس گئی اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دیدی ہے۔ اس کے سمجھے اس کا شوہر پہنچا اور اس نے پورا واقعہ سنایا۔ اس کی بات سن کر حضرت عمرؓ نے عورت کے سر پر ضرب لگائی (دُرہ مارا) اور شوہر سے کہا اس کا ہاتھ پکڑ لے اور عورت کے سر پر ضرب لگائی۔“

(فتح القدیر - جلد ۳ - مطبوعہ مصر ص ۳۸۸)

شوہر نے بیوی سے مخاطب ہو کر اس کو ”خلیہ طاتی“ کہا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے طلاق بائن پڑ جاتی ہے اور یہی اس عورت کا مقصد تھا۔ حضرت عمرؓ نے دھوکہ دے کر کہلوائے ہوئے الفاظ طلاق کو طلاق تسلیم نہیں کیا۔ شوہر نے نادانی میں دھوکہ کا کھا کر وہ الفاظ کہہ دیے تھے۔ اس کی نیت طلاق دینے کی نہ تھی۔ شاید عورت کو نیچوٹ اُسی تھی کہ خواہ جس طرح بھی شوہر کے منہ سے وہ اپنے لئے طلاق کا لفظ نکلے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ حضرت عمرؓ کے دُرے نے اس کو بتا دیا ہو گا کہ اس کا خیال غلط تھا۔ لفظ طلاق بندہ کی گواہی نہیں ہے۔ نادانی کی وجہ سے دھوکے میں الفاظ طلاق منہ سے نکلنے کی ایک مثال امام ابن الہمام نے خلاصہ کے حوالے سے لکھی ہے:-

”عورت نے شوہر سے کہا تم مجھے یہ الفاظ سناؤ
”عدت گذار تجھے من طلاق“ شوہر نے ایسا ہی

کہا تو اگر شوہر الفاظ کا مطلب نہیں جانتا تھا اور اس کی نیت بھی طلاق دینے کی نہ تھی تو قضاءً اس عورت پر تین طلاق پڑ جائے گی، لیکن اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔ (ایضاً - ص ۴۷)

جہالت کی وجہ سے دھوکہ کا کھا کر شوہر نے جو الفاظ طلاق منہ سے نکالے اس کی وجہ سے قاضی کی عدالت میں تین طلاق واقع ہو جائے گی لیکن دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی یعنی فی الحقیقت واقع نہ ہوگی لیکن قاضی وقوع طلاق کا فیصلہ دے گا۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا جس کا ذکر ابھی ادھر گزرا اور انھوں نے وقوع طلاق کا فیصلہ نہیں کیا اور اسی کے ثبوت میں ابن الہمام نے یہ واقعہ نقل کیا ہے تو پھر فریب ہی کے اس واقعہ میں جس کا ذکر خلاصہ کے حوالہ سے کیا گیا ہے قاضی یہ فیصلہ کیوں نہیں کرے گا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی؟ اب اگر ہم یہ فیصلہ کریں کہ ایسی طلاق قضاءً بھی واقع نہ ہوگی تو حضرت عمرؓ سے فیصلے کے پیش نظر اس کو بالکل بے اساس اور بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ قاضی ظاہر الفاظ پر فیصلہ کرتا ہے کیونکہ دل کا حال اسے معلوم نہیں لیکن اگر قرینہ موجود ہو تو شوہر کے بیان پر فیصلہ کرنے میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں ہے۔

اسی طرح کی ایک اور مثال کتب فقہ میں موجود ہے، قتادی عالمگیر یہ میں ”ذخیرہ“ کے حوالے سے لکھا گیا ہے:-

”اور جب کسی نے اپنی بیوی سے کہا ”انت طاتی“

لیکن اسے معلوم نہیں کہ یہ قول قول طلاق ہے

تو اس کی بیوی پر قضاءً طلاق پڑ جائے گی اور اس کے

اور اللہ تعالیٰ کے درمیان طلاق واقع نہ ہوگی۔“

(جلد ۱، مطبوعہ مصر، ص ۳۵۳)

اس صورت میں بھی کہنے والے کا عدم علم حقیقتہً اور دیانۃً وقوع طلاق سے مانع بن گیا ہے۔ وہ طلاق کے صریح الفاظ ”انت طاتی“ بولتا ہے اور اس کے معنی بھی جانتا ہے

لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اصلاً حی طور پر انہیں الفاظ سے بیوی کو طلاق دی جاتی ہے۔ اس جہل کی وجہ سے اس کی بیوی پر دیانۃ طلاق واقع نہ ہوگی۔

کتب فقہ ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن صورتوں میں دیانۃ طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ان میں مفتی تو عدم وقوع کا فتویٰ دے گا امتداداً قاضی کے پاس مقدمہ دائر ہو جائے تو وہ وقوع طلاق کا فیصلہ کرے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو انت طالق کہے اور پھر بیوی سے یہ بیان کرے کہ میری نیت اس جملے سے یہ تھی کہ تو اس قید یا باندی سے آزاد ہے جو میں نے تجھ پر لگا رکھی تھی تو فقہاء کہتے ہیں کہ اس صورت میں صرف تضاء طلاق واقع ہوگی دیانۃ نہ ہوگی اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامی نے لکھا ہے:-

”یعنی اس کی نیت خود اس کے اور اس کے بلند برتر رب کے درمیان صحیح ہے کیونکہ اس نے اس چیز کی نیت کی جس کا احتمال لفظ طلاق میں موجود ہے پس مفتی اس کو یہ فتویٰ دیتا ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی لیکن قاضی اس کی تصدیق نہیں کرے گا اور اس کے خلاف وقوع طلاق کا فیصلہ کر دیا کیونکہ طلاق دینے والے کا بیان ظاہر لفظ کے خلاف ہے اور کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔“

(شامی، جلد ۲، مطبوعہ مصر ص ۶۶۶)

علامہ شامی کی یہ عبارت اس لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے کہ اگر کوئی قرینہ موجود ہو تو قاضی بھی طلاق واقع نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

اب میں ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس میں نادانی و جہل کی وجہ سے دی ہوئی طلاق کے بارے میں فقہاء احناف کے ایک گروہ کا فیصلہ یہ ہے کہ طلاق تضاء بھی واقع نہ ہوگی وہ مثال یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے شوہر سے اپنے لئے طلاق کے الفاظ کہلوائے اور شوہر کو ان الفاظ کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ اس صورت میں مشائخ اور جند کا فیصلہ یہ ہے کہ طلاق

بالکل واقع نہ ہوگی نہ دیانۃ اور نہ تضاء (دکھرائی ج ۲، مطبوعہ مصر ۲۵۴) بحوالہ شامی نے جو حاشیہ لکھا ہے اس میں تثار خانہ کے حوالہ سے یہ صراحت کی ہے کہ اور جند میں یہ واقعہ پیش آیا اور قاضی امام محمود اور جندی نے شہر کے دوسرے فقہاء احناف سے اس مسئلے میں مشورہ کیا اور سب کے بالاتفاق یہ طے کیا کہ اس صورت میں طلاق بالکل واقع نہ ہوگی یعنی اگر مقدمہ قاضی کے پاس جائے تو وہ بھی وقوع طلاق کا فیصلہ نہ کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مشائخ اور جند نے شوہر کی جہالت اور فریب خوردگی کو تضاء بھی ”عند معتبر“ تسلیم کیا نہ تفصیل اس بات کی وضاحت کے لئے پیش کی گئی ہے کہ جہل ”فقہ حنفی میں دیانۃ تو عذر معتبر ہے ہی بعض حالات میں تضاء بھی اس کو عذر معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں مسئلہ زیر بحث میں جس نتیجے تک پہنچا ہوں وہ فقہی نقطہ نظر سے بالکل بے اساس و بے بنیاد نہیں ہے۔“

تجلی

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جناب کے مراسلے میں دو شکیں تھیں۔ میں نے انھیں الگ الگ کر دیا ہے تاکہ ہر شے کا جواب بلا فصل پڑھا جاسکے پہلی شے کا جواب درج ذیل ہے دوسری اس کے بعد نقل ہوگی۔

جو عربی عبارتیں آپ نے بعض کتب سے نقل کی تھیں ان میں نے حذف کر کے صرف ترجمہ باقی رہنے دیا ہے۔ کیا کرتا۔ آپ نے ان کی نقل میں ایک تو اردو رسم الخط اختیار فرمایا دوسرے قلم کو شکستگی کی طرف مائل کر دیا۔ مراسلہ اشاعت کے لئے نہ ہوتا تب تو مضائقہ نہ تھا لیکن شاعت کا حکم دیتے ہوئے بھی آپ نے خوش خطی کا اہتمام نہیں کیا تو میرے لئے مشکل پیدا ہو گئی۔ ہو سکتا ہے آپ کو قلم فاضل کا تب میر ہوں۔ میرے کا تب محض حرف شناس ہیں وہ آپ کی عربی تحریر کی ایک سطر بھی صحیح نہیں لکھ

سے خفا ہے اس لئے آپ کا ذہن مبارک میری ناچیز معروضات کو پوری طرح سمجھنے کے بجائے شوشے نکالنے اور نکتے پیرا کرنے کی طرف میلان فرما رہا۔

بہر حال جواب سنئے تشبیہ و تمثیل جب دی جاتی ہے تو بعض مضمرات اور قیدیں اس میں آپ سے آپ ایسی موجود ہوتی ہیں جن کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ مثلاً آپ یوں کہیں کہ زید شیر کی طرح جست کرتا ہے تو یہ بات خود بخود طے ہے کہ شیر سے آپ کی مراد زندہ اور آزاد شیر ہے۔ وہ شیر نہیں جو مردہ پٹا ہے یا بچھے میں قید ہے۔ اسی طرح جب آپ یوں کہتے ہیں کہ فلاں کا چہرہ چاند جیسا حسین ہے تو آپ کا اشارہ اس چاند کی طرف ہوتا ہے جو آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہو۔ نہ کہ اس چاند کی طرح ابتدائی یا آخری تارخوں میں کتابتِ زرد اور مدقوق سا نظر آ رہا ہو۔

یا مثلاً جب آپ یوں کہتے ہیں کہ گولی آدمی کو مار ڈالتی ہے تو بغیر کسی تشریح کے متعدد فیو داس قول میں مسلم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گولی مٹی یا ریت یا پٹھانی کا نہ ہو بلکہ سیسے اور لوہے کی ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے پستول یا بندوق وغیرہ ہی کے لئے بنایا گیا ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ پستول میں رکھ کر چلائی گئی ہو چوڑھے یہ کہ پستول کے گھوڑے کا دباؤ شدید ہو یا سچوں یہ کہ جس شخص کے یہ گولی لگے وہ بلف پر وف پہنچے ہوئے نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح میری تشبیہ و تمثیل پر غور فرمائیے۔ بہت معمولی قابلیت کا آدمی بھی طلاق نمبر کو توجہ سے پڑھ کر بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ میں نے طلاق کو اُس صورت میں گولی سے تشبیہ دی ہے جب اس کے ساتھ نیت بھی جمع ہو۔

زید اگر یوں کہتا ہے کہ فلاں نے فلاں کے گولی ماری تو آپ ایک منٹ کو بھی یہ گمان نہیں کرتے کہ گولی انگلیوں میں پکڑ کر گزری کی طرح ماری گئی ہوگی بلکہ خود بخود یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اسے پستول یا بندوق وغیرہ میں بھر کر چلایا گیا ہوگا۔ حالانکہ کہنے والے نے اس کی طرف کوئی محمل سا اشارہ بھی نہیں کیا۔

اسی طرح میں اگر اپنی طویل بحث میں نیت کی طرف کوئی اشارہ بھی نہ کرنا تب بھی یہ طے تھا کہ تمہیں اُس طلاق کی بیش

سکتے۔ کیا فائدہ کہ وہ مستحق کو چھینی اور عینک لکھ مارے اور میں اپنی اور آپ کی قسمت پر ٹوہ کرنا۔ حصر ج متن کے حذف سے کچھ ہوا نہیں۔ آپ کی صحت نقل اور صحت ترجمہ پر مجھے کوئی کلام نہیں کرنا ہذا صرف ترجمہ بھی پورا کا ادھکا

جواب یہ ہے کہ آنحضرتؐ اپنے ذہن عالی کو متعدد مثالیں وضع کرنے کی تکلیف اور اپنے دستِ گرامی کو فحش القہر وغیرہ کے درق اُلٹنے کی زحمت دے کر دی۔ خود ”طلاق نمبر“ میں ایسی متعدد چیزیں موجود تھیں جنہیں پیش کر کے آپ دہری اعتراض فرما سکتے تھے جو مثالوں کے ذریعہ فرمایا ہے مثلاً آپ فرما سکتے تھے کہ دیکھو میاں عامر تم خود حدیث بیان کر رہے ہو کہ ”رکانہ“ نے اپنی زوجہ کو طلاق بتے دی۔ یعنی تین طلاقیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آجے قسم کھائی کہ میری نیت ایک ہی طلاق کی تھی۔ رسول اللہؐ نے رجوع کی اجازت مرحمت فرمادی تو اس سے معلوم ہوا کہ طلاق گولی کے مانند نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو تین طلاقیں نکاح کو قتل کر چکی ہوتیں اور رجوع کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

یا مثلاً آپ کہہ سکتے تھے کہ تم نے طلاق نمبر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے اور پہلے بھی کہ چکے ہو کہ کوئی شخص لفظ طلاق کو تین بار دہرائے اور پھر قسم کھائے کہ تکرار سے میری نیت میں کمی نہیں تھی بلکہ جوش اور روانی میں لفظ طلاق متعدد بار نوک زبان پر آ گیا تھا تو یہ فتویٰ دینا ممکن ہو گا کہ ایک ہی طلاق پڑی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق اور گولی میں فرق ہے۔ اگر طلاق گولی جیسی ہوتی تو جتنی بار بھی لفظ طلاق زبا پر آتا حتیٰ کہ گولیاں نکاح کے جسم میں پیوست ہو گئی ہوتیں، ایک کا فتویٰ کیسے دیا جاسکتا۔

فرمائیے کیا یہ مقررہ اعتراض ٹھیک دی ہیں نہیں جس کی خاطر آپ نے مثالیں وضع کئے اور کتابیں لٹنے کی کلفت اٹھائی ہے؟

مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ کہوں کہ طلاق نمبر کو آپ غور سے نہیں پڑھا یا پھر دورانِ مطالعہ آپ مجھ لائق

ہے کہ سوتے میں آدمی کی زبان پر یہ آواز بلند وہ باتیں آ جاتی ہیں جنھیں وہ بیداری میں راز بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سوتے آدمی کے قول و فعل کا تعلق نیت سے نہیں ہوتا۔

تیسری مثال حالت نشہ کی ہے۔ شاید آپ بھول گئے نشہ کہتے ہی شرعاً اس حالت کو ہیں جب منطقی شعور اور عقل سلیم مفقوج و مختل ہو کر رہ جائیں۔ نشہ کی حالت میں آدمی کچھ میں لوٹتا ہے۔ نالی کا کپڑا بن جاتا ہے۔ اول قول بگتا ہے کیا آخواب کا لفظ یہ فیصلہ دے گا کہ یہ سب وہ قصد و نیت کے تحت کرتا ہے؟

چوتھی مثال بھی نشہ ہی سے متعلق ہے مگر آئیے اسے پیش کرنے میں احتیاط نہیں برتی بشرط اب پی کر اگر کسی کو نشہ نہ ہو مگر میں درد ہو جائے تو بالکل غلط ہے کہ اس کی پی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کسی بھی درد و کرب کا صرف وہ اسٹیج وقوع طلاق میں مانع ہو سکتا ہے جب آدمی کا منطقی شعور اور قوت فیصلہ جامد ہو کر رہ جائے۔ طلاق نہ مٹنے کا فیصلہ صرف ایسی ہی حالتوں میں دیا جاسکتا ہے جب تمس بھی وجہ سے یہ یاد کرنا ممکن ہو کہ اس کے پچھ نیت نہیں پائی جا رہی ہے۔

پانچویں مثال جبر کی ہے۔ بیوقوف سے بیوقوف لوگ بھی جانتے ہیں کہ جان کے خوف یا عذاب و ایذا کی شدت میں جو افعال کئے جائیں وہ قصد و نیت کا ثمرہ نہیں ہوا کرتے۔ قرآن ہی میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جان کے خوف سے جو شخص کلمہ کفر زبان پر لے آئے وہ قابل معافی ہے بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جبر خوف کی بنا پر زبان سے ادا کئے جانے والے الفاظ قلب کے ارادے اور نیت سے مربوط نہیں ہوتے۔ اگر کوئی اپنے ارادے اور نیت سے ایک فعل کر سکتا ہو تو کسی کو جبر یا دھکی کی ضرورت ہی کیا پڑے گی۔ یہ چیزیں استعمال ہی ایسے مواقع پر کی جاتی ہیں جب کسی آدمی سے اس کی نیت اور مرضی کے خلاف کچھ کرانا ہو۔

کی جا رہی ہے جس کے پہلو میں نیت بھی موجود ہو۔ لیکن میں نے تو نہ صرف اشارے کئے ہیں بلکہ صریح بھی مثال دیا ہے کہ طلاق کی تاثیر نیت پر منحصر ہے۔ طلاق نمبر کے صفحہ ۷۵ پر یہ الفاظ پڑھئے۔

”عمل اور نیت دونوں جمع ہیں۔ اب تیر کو نسا

عنصر ہے جس کا انتظار کیا جائے گا۔ کہیں قرآن یا

حدیث میں کیا کوئی تیسرا عنصر بھی بیان ہوا

ہے جس کی شمولیت کے بغیر طلاق کی دھار

رشتہ نکاح کو کاٹ ڈالنے میں کن رہ جاتی

ہو؟“

کیا یہ عبارت صاف طور پر نہیں بتا رہی ہے کہ طلاق کی تاثیر میں نیت میرے نزدیک شرط لازم ہے اور گولی سے جس طلاق کو میں نے تشبیہ دی ہے وہ وہی ہے جو نیت سے مربوط ہو۔

نیز حجب خود میں حیثیت رکاتہ میں یہ دکھلا رہا ہوں کہ ایک کی نیت مٹنے کی بنا پر طلاق بترہ کو حضور نے بین قرار نہیں دیا بلکہ ایک مان لیا تو اس سے بھی بلاہتمام ثابت ہو کہ میں تاثیر طلاق کے لئے نیت کو لازمی سمجھتا ہوں۔

جب یہ بات صاف ہو گئی تو اب آپ انہی دی ہوئی مثالوں پر نظر ڈالیے اور فیصلہ فرمائیے کہ کیا ان میں ایک بھی مثال ایسی ہے جس میں فعل کے ساتھ نیت جمع ہو۔

پہلی مثال پاگل کی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پاگل مرفوع القلم ہوتا ہے۔ اس کی عقل، شعور، ادراک،

احساس، قوت ارادی سب مفل ہو چکے۔ اس کے کسی بھی

فعل و قول کو ایک باشعور اور صاحب ارادہ آدمی کا

فعل و قول نہیں مانا جاتا۔ اس کی دی ہوئی طلاق اس گولی

کے مانند ہے جو کسی نے مٹھی میں بھر کر پھینک ماری ہو۔ اس

سے تو چڑیا بھی نہیں مرنی۔

دوسری مثال سوئے ہوئے آدمی کی ہے۔ سو یا ہوا

آدمی ٹرٹرا تا ہے یا ہاتھ پر چلاتا ہے تو کوئی ہوشمند ان

افعال کو قصد و نیت سے مربوط نہیں کر سکتا۔ بار بار ایسا ہوتا

والے کی نیت بھی جمع ہو۔

ضرورت نہیں تھی کہ اس توضیح کے بعد میں آپ کی پیش فرمودہ باقی نظائر پر کلام کروں لیکن بعض مغالطوں کا ازالہ کہنے کے لئے ان پر بھی کچھ عرض کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کے ایک فیصلے کی جو نظیر آپ نے دی ہے ہر شخص بغیر خور و درہم کے بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس میں نیت طلاق کی ہر چھائیں تک نہیں۔ احمق شوہر نے میاں ٹھکڑ کی طرح کچھ الفاظ دہرا دیئے ہیں۔ نیت تو کیا اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں کہ طلاق پڑ جائے گی۔ لہذا اس نظیر کو پیش کرنا سراسر بے محل ہوا۔ البتہ یہاں میں اس کی نشاندہی ضرور کروں گا کہ آپ فقہاء پر بے سوچے سمجھے معترض ہو جاتے ہیں۔ خود سے سنئے۔

ابن ہام نے خلاصہ سے جو جزئیہ نقل کیا ہے اس پر آپ نے استفہامی انداز میں اعتراض فرمادیا یعنی عورت نے شوہر سے کہا تم مجھے یہ الفاظ سناؤ۔ ”عدت گزار تھے میں طلاق“۔ شوہر نے ایسا ہی کہا تو اب چاہے شوہر ان الفاظ کا مطلب نہ جانتا ہو اور اس کی نیت بھی طلاق کی نہ ہو مگر قاضی یہ ہی فیصلہ دے گا کہ تین طلاقیں پڑ گئیں۔

اس فقہانہ رائے کو پوری طرح سمجھنے بغیر آپ کھٹ سے حضرت عمرؓ والا وہ فیصلہ اٹھالائے جو انھوں نے دھوکے باز عورت کے سلسلے میں کیا تھا اور اس فرق کی نہ دیکھ سکے جو اس فیصلے پر پہلے معاملے کو قیاس کرنے سے روکتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے جس فیصلے کو آپ نظیر بنا رہے ہیں وہ انھوں نے قاضی کی حیثیت سے نہیں صرف امیر المؤمنین کی حیثیت سے دیا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں اور نہ جانتے ہوں تو اب جان لیں کہ یہ دونوں حیثیتیں الگ الگ ہیں اور خلفائے راشدین نے کبھی انھیں خلط ملط نہیں کیا۔ وہ خود اپنا مقدمہ لے کر قاضی کی عدالت میں جایا کرتے تھے۔ اگر امیر المؤمنین ہونے کی بنا پر وہ لازماً قاضی بھی ہوتے تو کہیں اور مقدمہ کیوں لے جاتے۔ حضرت عمرؓ نے مذکورہ معاملہ میں جو بھی فیصلہ نافذ کیا وہ اس امیر المؤمنین کی حیثیت سے

انصاف کیجئے۔ آپ کی پانچوں مثالیں کیا ایسی ہی حالتوں سے متعلق نہیں جن میں فعل طلاق نیت کی پشت پناہی سے محروم ہے۔ اور مجھ گناہگار نے جس طلاق کو گولی سے تشبیہ کر آپ کو دکھ پہنچایا ہے وہ صرف وہی طلاق ہے جو نیت کے ہم رکاب ہو۔

میرے بہت ہی محترم دوست! میں داد دوں گا کہ آپ اپنی کسی رائے سے اختلاف کرنے والوں کی صریح و جلی باتوں کو بھی نظر انداز کر دینے میں کافی جہارت رکھتے ہیں۔ جو بیچ آپ کے تعریض کا اختیار نہ پایا ہے وہ اگر میں نالائق بھی اختیار کروں تو آپ دو قدم بھی نہ چل سکیں گے۔ مثلاً آپ نے فرمایا: ”بندوق سے گولی نکل کر اپنا کام کرتی ہے خواہ

بندوق چلنے والا کسی حال میں ہو۔“

میں اس پر کہہ سکتا ہوں کہ آپ غلط فرماتے ہیں۔ وہ آدمی جس کی طرف گولی گئی ہے اگر بکتر بند ہو یعنی بلط بیرون پہنے ہوئے ہو تو گولی محض جھک مارے گی۔ یا بندوق کی لمبائی کا اسپرنگ خراب ہو تو گولی گزیر جا کر ٹھیس ہو جائے گی اور آپ ہرگز نہ کہہ سکیں گے کہ وہ اپنا کام کر گئی۔

یہ یقیناً عجیبی ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کا علم کلام اس سے مختلف کوئی چیز نہیں ہے۔ بندے نے شیر کی تشبیہ پیش کی آنجناب بجائے زندہ کے مردہ شیر اٹھا کر لے آئے اور مثالیں پر مثالیں پیش فرما رہے ہیں کہ دیکھئے شیر تو بلی سے بھی گیا گذر رہا ہے۔ طلاق جس کے پیچھے نیت نہ ہو مردہ شیر کے ماننے سے۔ میں طلاق کو گولی کہتے ہوں مگر یہ گولی نیت کے پستوں سے چلتی ہوئی ہے۔ آپ نے مذکورہ پانچ مثالوں کے علاوہ اور جو نظائر کتب فقہ سے پیش کئے ان میں بھی کوئی ایسی نظیر نہیں ہے جس میں فعل طلاق کے ساتھ نیت بھی موجود ہو اور طلاق نہ پڑی ہو۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں پورے دفتر فقہ سے زیادہ نہیں صرف ایک نظیر ایسی لا کر دکھلائیں جس میں ابن تیم اور ابن تیمیہ کے علاوہ کسی معروف و مستند فقہ نے ایسی کسی طلاق کو بے اثر مانا ہو جس کے ساتھ طلاق دینے

لہذا قاضی یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہے کہ شوہر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے علم و تربیت کے ساتھ الفاظ و برائیاں۔ تیسری بات یہ کہ اسے جھوٹ نہ سمجھتے ہوئے بھی اجتماعی مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ تین طلاق کا فیصلہ دیا جائے۔ آخر یہ حضوٹے تنبیہ نہیں فرمائی کہ نکاح و طلاق اور رجوع میں چیزیں ایسی ہیں جن سے ٹھٹھول اور مذاق بھی سنجیدگی ہی کے ہم معنی ہے۔ شوہر جب اگر الفاظ کا مفہوم سمجھے بغیر بیوی کے آگے طوطا بنے ہوئے ہیں تو اس ٹھٹھول کو انگیزہ کرتے ہوئے قاضی کا یہ فیصلہ دنیا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ الفاظ پر کیا ہو گئے اور طلاقیں نہیں پڑیں۔ یہ تو حقوق کی حوصلہ افزائی اور ٹھٹھول کی نیت پناہی ہو گی۔ حکمت کا کھلا تقاضا یہی ہے کہ تین طلاقیں کا فیصلہ دے کر لوگوں کو سبق دیا جائے کہ طلاق کھلو نا نہیں۔ مذاق کا موضوع نہیں۔ ہاں عند اللہ اس لئے تین طلاقیں نہیں پڑیں گی کہ اللہ کا علم ظاہری قیاس و استدلال سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ تو عالم ذات المقصد اور ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میرا فلاں بندہ اس قدر کڑھ مغربہ کہ واقعہ اسے عدت اور طلاق کا مفہوم نہیں معلوم تھا اور بیوی کی احمقانہ ناز برداری نے اسے آٹو بنا کر زبان سے الفاظ نکلا دیئے۔ نیت اس کی طلاق دینے کی نہیں تھی لہذا وہ رجوع بھی کر لے تو نافرمان اور باغی نہیں ہے۔

ان تین باتوں کو نظر میں رکھتے اور پھر حضرت عمرؓ کے فیصلے پر توجہ فرمائیے۔ آپ نے شخص ردا روی میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ ”حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔“ حضرت عمرؓ کبھی مسند قضا پر فائز نہیں ہوئے۔ انھوں نے کسی عدالت میں بطور قاضی اجلاس نہیں کیا۔ الفاظ کے غلط استعمال کی کوئی حد ہوئی چلائیے۔ گفتگو ایک دقیق آئینی مسئلہ میں ہو رہی ہے۔ آپ شاعری فرمائیے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا حضرت عمرؓ حاکم وقت تھے نہ کی قاضی۔ ان کے آگے اسی حیثیت میں قضیہ لایا بھی گیا تھا۔ ان پر کسی قاضی کی طرح یہ قانونی پابندی

نافذ کیا جس کی ذمہ داریاں اور فرائض بعینہ وہ نہیں ہوتے جو قاضی کے ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جب فقہاریوں کہتے ہیں کہ قضاۃ تین طلاق واقع ہو جائیں گی تو گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ عند اللہ تین واقع نہ ہوں گی۔ ”قضاۃ“ کی تخصیص کا مطلب یہی یہ ہوتا ہے کہ فلاں فیصلہ معاشری نظام کو اختلال سے بچانے کے لئے ضروری ہے ورنہ ضروری لحاظ سے بات کچھ اور ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نام و نمود یا خاص کار و باری مفاد کی خاطر حج کرے تو قاضی کا فیصلہ بہر حال یہی ہو گا کہ فریضہ حج اس کے ذمے سے ساقط ہو گیا لیکن عند اللہ اس حج کی کچھ بھی قدر و قیمت نہ ہو گی۔ اب دیکھئے کہ ابن ہمام خلاصہ کے حوالے سے یہی تو فرما رہے ہیں کہ تین طلاقیں مذکورہ صورت میں حقیقتہً واقع نہ ہوں گی لیکن قاضی کو یہی فیصلہ دینا پڑے گا کہ وہ واقع ہو گئیں۔ کیوں دینا پڑے گا یہ بھی سمجھ لیجئے۔ ایک تو یوں کہ قانون افعال سے بحث کرتا ہے نیتوں سے نہیں۔ دوسرے یوں کہ اس معاملے میں ایسے قرائن پائے جا رہے ہیں جن کی موجودگی میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ شوہر کی نیت تین طلاقوں کی نہ ہو گی یہ یقین معاملات کی تمام مفروضہ اور ممکنہ اشکال کے قوانین وضع کرتے ہیں۔ ممکن بہر حال یہ بھی ہے کہ ایک شخص اس قدر احمق ہو کہ نہ تو عدت کے معنی سمجھے نہ طلاق کے اور بیوی اسے لٹو کی طرح نچائے۔ اسی لئے فقہاء نے ایسی شکل بھی فرض کر ہی لی لیکن کسی چیز کا ممکن ہونا ہی تو معنی نہیں رکھتا کہ اسے امر واقعہ مان لیا جائے۔ ایک لاکھ مسلمانوں میں ۹۹ ہزار بوسو آدمی تو یقیناً عدت و طلاق کا مفہوم جانتے ہیں لہذا قاضی کیوں نہ سمجھے کہ شوہر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے علم و تربیت کے ساتھ تین طلاق کے الفاظ دہرائے ہیں۔ اگر یہ اتنا ہی گدھا تھا کہ عدت و طلاق کا مفہوم نہیں جانتا تھا تب بھی قدرتنا اسے اتنا بوسو چناری چاہئے تھا کہ بیوی کیا بکواس کر رہی ہے۔ یہ خواہ ممکن ہو مگر قسب بن قاس نہیں ہے کہ اس نے الفاظ کو سمجھا بھی نہیں اور بیوی کا ایسا غلام ہو کہ انھیں دہرا بھی دیا۔

آپ فقہاء یعنی مفتیین سے مجتہدانہ اختلاف کرنے سے پہلے منصب امارت اور منصب قضا کے باریک فرق کو سمجھیں۔ پھر ان پر معرض ہوں۔ اگر انھوں نے یہ کہا ہو تا کہ مذکورہ جزیئے میں عند اللہ بھی تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں تب یقیناً آپ حضرت عمرؓ والے فیصلے کا حوالہ دے کر فقہاء کو غلط قرار دے سکتے تھے کیونکہ فریب خوردہ اہم شوہر کی طلاق کو حضرت عمرؓ کا طلاق نہ ماننا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک عند اللہ یہ واقع نہ ہوئی ہوگی۔ اگر واقع ہو جاتی تو محال تھا کہ وہ ایک ایسی چیز کو خارج قرار دیتے جو خود ان کے نزدیک عند اللہ واقع ہو چکی ہو۔

یہ گفتگو میں نے آپ کے اس مفروضے کو صحیح مان کر کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے واقعہ مذکورہ میں طلاق تسلیم نہیں کی لیکن اگر میں یہ عرض کروں کہ آپ کا مفروضہ ہی غلط ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ آپ کیا جواب دیں گے۔ جتنا کچھ آپ نے فتح القدیر سے نقل کیا اس میں تو یہ نہیں بھی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے طلاق کو واقع نہیں مانا۔ خلیۃ اور طلاق تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں اور طلاق تو قطعاً صریح ہے لہذا ان الفاظ سے ایک طلاق رجعی واقع ہو سکتی ہے خلیۃ اور طلاق کے درمیان عطف نہیں اس لئے ہر لفظ سے الگ الگ طلاق نہ فرض نہیں کی جاسکتی۔ تاہم بحث سے بچنے کے لئے یہ ان بھی لیجئے کہ ہر لفظ ایک طلاق کا موجب بن رہا ہے تو زیادہ سے زیادہ وہ طلاقیں واقع ہوئیں۔ دو بھی ایک طلاق کی طرح رجعی ہوتی ہیں لہذا حضرت عمرؓ کے متذکرہ طرز عمل اور فیصلے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے رجوع کر دیا۔ رجوع کے متعلق معلوم ہے کہ مذہبان ہی پر اس کا انحصار نہیں بلکہ مرد کو کو بھی فعل ایسا کرے جو زن و شوہر کے مابین مخصوص ہو اس سے رجعت ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ اس کا یہ مطلب تو یقیناً ہے کہ یہ مکارہ تیری زوجیت سے بچ کر کھانے کی حق دار نہیں مگر یہ مطلب یقینی نہیں ہے کہ انھوں نے طلاق کا وقوع نہیں مانا۔ طلاق رجعی کی صورت میں عودت کے لئے

عائدہ تھی کہ نیتوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ انھوں نے بیوی اور شوہر کا بیان سنا۔ شوہر ساری کہانی سنا تا ہے اور عورت اس کی تردید نہیں کرتی۔ یعنی وہ نہیں کہتی کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ میرا نام "خلیۃ طلاق" رکھو بلکہ اس نے خود اپنی مرضی سے یہ الفاظ کھجے۔ جب عورت تردید نہیں کرتی تو ثابت ہو جاتا ہے کہ مرد کی نیت طلاق کی نہیں تھی۔ یہاں نیت کا معاملہ واضح ہو گیا جب کہ خلاصہ والے جزیئے میں اس کے برعکس نتائج پائے جا رہے ہیں۔ فقہاء جب وہاں بھی یہ مانتے ہیں کہ عند اللہ تین طلاقیں نہیں پڑیں تو یہاں تو اور بھی زیادہ یقینی ہے کہ عند اللہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ پھر کیا ایک حاکم وقت اور سربراہ مملکت اور صلح معاشرہ کے ذمہ دار کی حیثیت میں حضرت عمرؓ کو عقل و نظر انصاف، اخلاق، سیاست ہر لحاظ سے وہی فیصلہ نہ کرنا چاہیے تھا جو انھوں نے کیا؟ انھوں نے بالکل ٹھیک کیا کہ عند اللہ جو بات درست تھی اسے ہی درست مانا اور ظالم عورت کو ظلم کی سزا دی۔ وہ کسی قاضی کی طرح اس کے پابند نہیں تھے کہ ذاتی علم اور مشاہدے کو فیصلہ کی بنیاد نہ بنا سکیں۔ ان کا فیصلہ کسی عدالت میں بطور نظیر بھی پیش نہیں ہونا تھا کیونکہ عدالت میں عدالتی نظام کام کرتے ہیں حکام کے انتظامی یا سیاسی یا اصلاحی اقدامات اور فیصلے کام نہیں آتے۔ امیر المؤمنین وقت کے سرے پڑے حاکم سہی لیکن منصب قضا اپنے حیطہ عمل میں خود سب سے بڑا منصب ہے جس کے آگے امیر المؤمنین بھی بے بس ہو سکتے ہیں اور ہرے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ایک یہودی کے مقابلے میں حضرت علیؓ زور کا مقدمہ مار گئے تھے اور حسن جیسے بیٹے کی شہادت رد کر دی گئی تھی۔ حالانکہ عدالت کے دائرے سے باہر کون تھا جو یوں کہہ سکے کہ حسن کی بات ناقابل اعتبار ہے۔ وہ حدیث رسولؐ بیان کرتے ہیں تو مجال نہیں کہ شک کیا جاسکے لیکن عدالت کے قانون نے ان کی گواہی قبول نہیں کی۔

ممکن نہیں ہوتا کہ رجعت کی راہ روک سکے۔ مرد کو مکمل اختیار ہوتا ہے کہ رجوع کرے خواہ عورت چاہے یا نہ چاہے۔

ماضی پیکر آپ کے ایک ایسا دعویٰ کیا جس کا کوئی ثبوت آپ کو نہیں تھا۔ پھر بھی اندر اچھڑا ہوا اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہوئے بھی میں نے تجربہ پیش کر دیا کہ ابن ہمام کے پیش کردہ جزئیہ سے آپ کا اختلاف غلط ہی یا کم نہیں پڑتی ہے۔

آج جو نظریہ آپ نے عالمگیری اور شامی سے پیش کیا ان کے لئے بھی میری اور میری تقریر کلام کافی ہے۔ عالمگیری والی مثال میں نہ علم ہے نہ نیت اور شامی والی مثال میں علم ہے مگر نیت نہیں۔ گویا "نیت" کا نہ پایا جانا دونوں مثالوں میں مشترک ہے لہذا میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ آپ کے طلاق نمبر کو سمجھ کر نہیں پڑھا۔ میں نے صرف اس طلاق کو کوئی سے تشبیہ دی ہے جس کی نیت پر نیت کا فرما ہو۔ اور نیت نہ پائے جانے کی صورت میں میں نے بھی برابر یہ تسلیم کیا ہے اور حدیث سے اس کی مثالیں دی ہیں کہ طلاق نہ واقع ہونے کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

شامی کی نظیر پیش کرنے کے بعد آپ نے اس کی وجہت کے ذیل میں ایک اور جزئیہ نقل کیا جو آپ کی ولایت میں میرے اس دعوے کو رد کرتا ہے کہ قانون میں جہالت کا عذر معتبر نہیں۔

اس کے جواب میں پہلی بات تو یہ عرض ہے کہ نادر و نایاب قسم کی جزئیات فقط مستثنیات کا درجہ رکھتی ہیں قانونی اصول و کلیات ان سے مسترد نہیں ہوا کرتے۔ طلاق نمبر میں طلاق کی عام قانونی حیثیات زیر بحث ہیں۔ کسی خاص واقعے اور مقدمے پر گفتگو نہیں۔ لہذا وہاں جو کچھ کہا جائے گا کلیات و اصول ہی کے تحت پر کہا جائے گا۔ دین اور دنیا دونوں کے قوانین میں ماہرین قانون نے یہ بات ضروری سمجھی کہ لوگوں کا جہل معجزہ نہ مانا جائے۔ اگر عذر جہل کا اعتبار ایک ضابطہ مان لیا جاتا ہے تو نظام عدالت و دہم پر ہم پڑ جاتا ہے۔ لہذا کوئی معقولیت نہیں کہ کسی خاص زمانے اور خاص شہر میں پیش

آنے والے ایک نادر قسم کے مقدمے کا جو فیصلہ کچھ فقہانے کر دیا تھا اسے ایک مسلم ضابطے اور اصول کے امتداد میں استعمال کیا جائے۔ کوئی بھی نظریہ اسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب وہ صریح طور پر کسی بنیادی اصول کے خلاف نہ ہو۔ آپ نے ڈھونڈ کر جو نظریہ پیش کیا وہ بنیادی اصول کے خلاف ہے لہذا اس کا حوالہ ایسی بحث میں بالکل فضول ہے جو فروغ کے لئے نہیں اصول و کلیات اور اساسی ضوابط کے گرد گھوم رہی ہے۔

دوسری بات یہ عرض ہے کہ آپ کے پیش کردہ جزئیہ میں ایک عنصر "فریب" کا بھی بڑھا ہوا ہے۔ یعنی بات ہے کہ یہی عنصر فقہاء کے اس خاص فیصلے کا محرک اور داعی بنا جسے آپ مستدل بنا رہے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ عالمگیری سے جو مثال آپ نے پیش کی اس میں یہ طے کر دینے کے باوجود کہ شوہر "نیت" طلاق کے مفہوم و صداق سے ناواقف ہے فقہاء نے فیصلہ یہی دیا ہے کہ قضاء طلاق پڑ جائے گی۔ گویا فقط جہالت کو قاضی عذر تسلیم نہیں کرے گا۔ پھر مشائخ اور جندے کے فیصلے کا اس سے مختلف ہونا کیا واضح ترین اس بات کا نہیں ہے کہ "فریب" والا عنصر اس کی بنیاد بنا ہے۔ انھوں نے اسی لئے طلاق کو قضاء پر بھی واقع نہیں مانا کہ سارا قضیہ دھوکا بازی کی بنیاد پر کھڑا ہے اور حرم صریحاً عورت ہے نہ کہ شوہر۔

طلاق نمبر میں قضیہ بھی شکلیں زیر بحث آتی ہیں آپ ایک بھی ان میں ایسی نہیں دکھلا سکتے جس میں الفاظ طلاق کہلوانے میں بیوی کے کسی ملکہ و دغا کا شمول ہو۔ وہاں صرف اور صرف ان صورتوں سے بحث ہے جن میں شوہر اپنے ہی کسی صحیح یا غلط جذبے اور جوش میں طلاق دیتا ہے۔ لہذا آپ کا ایسے واقعات ڈھونڈ کر لانا جو صریحاً عورت کے ملکہ اور دھوکے کا شاخسانہ ہوں قلم درازی تو کہلائے گا اتفاقاً نہیں۔

اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ اس نظریہ سے کم سے کم یہ تو ثابت ہو گیا کہ طلاق کی کوئی نہیں ہے تو میں کہوں گا کہ یہ محض طوطے والی گردان ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہاں بھی فعل کے

ساتھ نیت کا وجود نہیں ہے جب کہ گولی کے مشابہ میں اسی طلاق کو کہتا ہوں جو نیت سے مربوط ہو۔

آپ سمجھنا چاہیں یا نہ سمجھنا چاہیں۔ میں تفہیم کیلئے ایک مثال اور دوں گا۔

شراب میں کھٹائی کا بہت سا محلول آمیز کر دیجئے، اس کی صلاحیت نشہ آور ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کے باوجود یہ کلیہ پھر بھی اپنی جگہ اٹل رہے گا کہ ”شراب نشہ لاتی ہے“ علاوہ اس کے بعض بلا نوش ایسے ہوتے ہیں جنہیں پوتل کی پوتل چڑھا جانے کے بعد بھی وہ نشہ نہیں ہوتا جو ہوش و خرد کو پوری طرح معطل کر دے۔ پھر بھی اس کلیہ پر حریف نہیں آتا کہ ”شراب نشہ آور ہے۔“

گویا کوئی کلیہ کسی خارجی سبب کی بنا پر کچھ دیر کو معطل تو ہو سکتا ہے مگر مردہ نہیں ہو سکتا اور جب بھی یہ سبب زائل ہو گا کلیہ بحال ہو جائے گا۔ ”قانون سے بے خبری قانون کے نفاذ و اثر میں مانع نہیں ہو سکتی“ یہ ایک کلیہ ہے جسے ماہرین نے ایک اہم ترین اساس کے طور پر قبول کیا ہے۔ حضرت عمرؓ والے واقعے یا اوزر جند والے واقعے میں فریر کا عنصر سبب بن گیا ہے اس کلیہ کے تعطل کا۔ یہ گویا کھٹائی ہے جو شراب میں لٹی گئی ہے۔ اس وقت اگر حضرت عمرؓ یا ماشا اللہ اوزر جند یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ طلاق نہیں پڑی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بنیادی کلیہ ہی مسترد ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس خارجی سبب نے اسے وقتی طور پر معطل کر دیا۔ جہاں جہاں یہ سبب پایا جائے گا تعطل بھی پیدا ہو گا۔ جہاں نہیں پایا جائے گا کلیہ اپنا کام کرے گا۔

فقہاء کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اپنی فسر وئی آراء و کلیات کی روشنی میں مرتب کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ جب جو جی میں آئے کہہ گزریں اور یہ نہ سوچیں کہ فلاں رائے ہمیں اصول اور ضابطے کی بنیاد پر قائم کر رہے ہیں۔

مگر انتخاب کے جو رائے قائم کی ہے اس کے پیچھے

کوئی صحیح یا غلط کلیہ اور اصول ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال ایک ایسی کہنی کی ہے جو کسی بھی شجر سے وابستہ نہ ہو۔ اسی لئے خطا معاف میں اسے بے سرو پا کھٹتا ہوں۔ آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں چاہے اس سے بھی بڑھ کر کتنی آزمائش قائم کرتے رہیں لیکن یہ شخص خوش فہمی ہے کہ آپ کی زیر بحث رائے کی کوئی نہ کوئی بنیاد فقہاء کے یہاں موجود ہے۔ جتنی امثلہ آپ نے پیش فرمائیں ان میں ایک بھی نہیں جس میں مجربے خبری کو قانون کی تاثیر کا حاجب اور مانع تسلیم کر لیا گیا ہو۔

یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ آپ اس شوہر کو جو ازراہ جہالت تین طلاق کو تین نہ سمجھتا ہوا ایسا ہی فریب خوردہ تصور فرما رہے ہیں جیسا وہ شوہر جسے بیوی نے دھوکا دیکر الفاظ طلاق سمجھ سے نکلوائے ہوں۔

اے پیارے دوست! فقہ کی سطح اتنی نہ گر آئے۔ رعایت اور کرم کا سختی قانون شرعی میں وہ شخص تو یقیناً ہو سکتا ہے جسے بیوی یا کوئی بھی دوسرا فرد دھوکا دے کر نقصان پہنچا دے۔ اسے بلاشبہ فریب خوردہ ”کہیں گے مگر جو شخص ذرا علم موجود ہونے کے باوجود جاہل رہ گیا ہو وہ اگر کسی اور کے ہنکائے بغیر اپنی مرضی اور ارادے سے جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے تو حقیقتاً وہ فریب خوردہ نہیں جہالت زدہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی نے دھوکا دے کر اس سے یہ کام کر لیا۔ ایسے مواقع کے لئے اہل علم و ادب کی زبان میں غلط فہمی یا نادانستگی یا بے خبری جیسے الفاظ مستعمل ہیں اور آپ ایک ہزار بار بھی اسے ”فریب خوردہ“ کہہ کر اسی رعایت کا سختی ٹھیلنا چاہیں جو پہلی قسم کے فریب خوردہ کے لئے موزوں ہے تو کون ہوشمند اسے قبول کرے گا۔ دوسرا مسئلہ کی دوسری شق اور اس کا جواب انشاء اللہ اعلیٰ صحبت میں ملاحظہ فرمائیے۔

قرآن اور تعمیر تہذیب تعلیمات قرآنی کا مندرجہ تصوف اور ادب صالح کا دلکش مجموعہ

ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ قیمت — چھ روپے۔
جائزہ ترجمہ قرآنی دنیا میں کب اور کس زبان اس کی تحقیق و تفصیل مترجمین اور تارحین کے نام۔

بہت عمدہ اور معلومات افزا کتاب ہے۔

قیمت — چھ روپے

غنیۃ الطالبین مصنفہ: شیخ عبدالقادر جیلانی۔ قیمت: — تین روپے۔

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لحاظ قاہرہ کے ایک فاضل سیرٹر عبد اللہ

عنان کی تالیف نئے اسلوب میں۔ تاریخ اسلام کے بعض وقائع پر علم و تحقیق کی روشنی۔ قیمت — ساڑھے ساڑھے

اسلام اور ترقی مولانا اشرف علی کے افادیت سے لبریز ارشادات۔ قیمت — ۶۰ پیمے

تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانی ایک ممتاز شخصیت

مولانا عبد اللطیف نعمانی شیخ الحدیث مفتاح العلوم متوفی ۱۳۹۲ھ کی دینی، علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندہ

جادید کار نامے اور اہل علم و رہنمایان ملک و ملت کے خراجہ عقیدت۔ قیمت — پانچ روپے۔

تاریخ الفخری تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اردو، فارسی

اور پنج زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت — چھ روپے۔

سفر مصروعجاز امیر شریعت مولانا مانت اللہ شاہی کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افزا سفرنامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے۔

سنگھوں کی ٹھنڈک اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر

نہیں جو مسلمان اس غلط خیال کا فتنہ کار ہیں کہ رسول اللہ بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل۔ فقہاء و مجتہدین کے مستند حوالے۔ قیمت مجلد — آٹھ روپے۔

مولانا اشرف علی **مناجات مقبول (دکھنی)** عکسی مقبول عام اور مفید

تربیتی کتاب پڑانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔

قیمت — چھ روپے (مجلد — سات روپے)

مولانا محمد عبد اللہ ہلوی کے رشحات **رمضان کیسے؟** قلم۔ رمضان کے موضوع پر بہتر

کتاب۔ قیمت مجلد — تین روپے۔

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں

نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے، بازار کہیں بھی مسلمان

بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا۔ انسا۔ قاضی اظہر مبارک پوری۔ ڈیڑھ روپیہ

التشرف احادیث تصوف کی معرفت مولانا اشرف علی کی معروف کتاب۔ قیمت — سولہ روپے۔

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندی معارف و اسرار ہدایت

لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت — چھ روپے۔

امت مسلم کی رہنمائی مولانا تقی عثمانی کی ایک نازک تصنیف

حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات، دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت — دو روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (پن)

از:- حافظ ابو محمد امام الدین رام نگر

حجت اسلامی کے خلاف

جمیۃ العلماء کی فتنہ پر داری کا دور جدید

اسلامی بھی دینیت کی دیوار نہ تھی کہ قلمی اور کاغذی گولی بارشوں سے طعیر ہو جاتی۔ دعوت میں گاہ گاہ اور ماہنامہ تجلی دیوبند میں دارالعلوم دیوبند کے اکابر و شیوخ کے دامن کی دھجیاں اترتی اور بکھرتی رہیں۔ انجام کار جماعت اسلامی کے خلاف چلائی ہوئی مہم ناکامی پر ختم ہو گئی، جدید گاہ میں نے اوپر کہا ہے، جمیۃ میرے پاس نہیں آتا۔ ماہنامہ دارالعلوم برسوں سے خائش ہے اور اس کے مقام و وقار کا یہی مقتضی بھی ہے۔ لیکن الجمیۃ کے دو شمارے سامنے آگئے تو دیکھا جمیۃ العلماء نے فتنہ خواہیہ کو بیدار کر دیا ہے۔ گڑھے مردوں کو اکھیر کر کھن کے بجائے جبہ و دستار سے آراستہ کر کے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بعض بوکھلا چکے ختم ہو گئے تھے ان کو الجمیۃ بکھڑا کرنے دوبارہ شائع کر دیا ہے۔ اور اس شان سے گویا ان کے رد و جواب میں کسی نے کبھی قلم ہی نہیں اٹھایا۔ کتابیں اور کتابچے یہ ہیں۔ ایمان و عمل۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی نور اللہ قادری اس کا رد و اقام الحروف کے قلم سے تجلی میں شائع ہو چکا ہے۔ مکتوبات بدایت۔ یہ مکتوبات مولانا ابوالکلیث کے خطوط کے جواب میں شیخ الاسلام کے تحریر کردہ ہیں مولانا ابوالکلیث امیر جماعت کی حیثیت سے چاہتے تھے کہ باہمی گفتگو کے ذریعہ مفاہمت ہو جائے لیکن مروجہ نے اختلاف ہی میں دین و ملت کی فلاح بھی اور ملاقات سے انکار کر دیا۔ جماعت اسلامی پر بصرہ جہتہ اول و دوم۔ مولانا عبد اللہ رحمانی علیہ الرحمۃ رکن مجلس شوروی دارالعلوم دیوبند

اخبار الجمیۃ دہلی جو جمیۃ العلماء کا ترجمان ہے، میرے پاس نہیں آتا۔ کبھی کبھی کوئی پرچہ مل جاتا ہے۔ جمیۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند نے ایک بار جماعت اسلامی کے خلاف فتویٰ، رسائل اور مضامین کی ہمس جاری کی تھی جو دارالعلوم اور جمیۃ العلماء کی ذلت و رسوائی پر ختم ہوئی۔ اس دور کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ دیوبند کے دارالافتاء کا قلم جماعت اسلامی کے خلاف فتویٰ نویسی کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ کسی کو مذاق سوچھا اس نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کی ایک کتاب کی کچھ عبارتوں کے متعلق استفاء مرتب کر کے دیوبند بھیجی رہا۔ اس میں کتاب کا نام درج نہ تھا۔ مفتی صاحب نے مولانا کی کتاب کی عبارتوں کو جماعت اسلامی کی کتاب کی عبارت سمجھا اور فتویٰ میں مصنف کو بد مذہب و بد اعتقاد اور سب کچھ بنا کر رکھ دیا۔ شرعی زبان میں:-

لو آپ اپنے دم میں صیاد آگیا
مستفتی نے استفاء فتویٰ اور کتاب کا نام سب کچھ
اخبار دعوت دہلی میں شائع کر دیا۔ کیا گذری ہوئی حضرت
مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم اور مفتی صاحب پر
کچھ بھی نہیں۔ یہ تو ہم اور آپ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت
حال کچھ اور ہے یہ بزرگان کرام اتنے عالی مقام ہیں کہ ان
کے خلاف بڑی سے بڑی بات ان کے قدم بھی چھو نہیں
سکتی۔ پھر ان کے دامن تقدس کا کیا کہنا، بایں ہمہ جماعت

و نائب امیر شریعت بہار و اتر پردیش۔ اس کے حصہ اول کا رد
راشم الحروف کتابی صورت میں شائع کر چکا ہے۔ چند کامیاں
اب بھی مکتبے میں کہیں دبی پڑی ہیں۔ تجلی میں نہیں آیا ہے
میں جا ہوں گا کہ مولانا غلام غسانی چند سطحوں میں سہی اسے
شائع کر دیں۔ اس کتابچہ سے مقدمہ میں ملت کی حق پرستی
کی حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔ "جماعت اسلامی کا دینی
ریخ" مولانا عبدالصمد رحمانی، حصہ اول و دوم اس کے حصہ
اول کا رد و جواب بھی راشم الحروف تجلی میں لکھ چکا ہے۔
قابل ذکر بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے خلاف کتابی
صورت میں مفتی محمد رفیع حسن کا لکھا ہوا فتویٰ دارالعلوم کے
۲۴ علماء و مشائخ کی تصویب و توثیق کے ساتھ شائع ہوا
تھا۔ راشم الحروف نے اس کا رد و جواب تقریباً ڈیڑھ سو
صفحات پر "فتویٰ دیوبند کا تحقیقی جائزہ" کے نام سے
شائع کیا تھا۔ اس وقت تک پاکستان دی بی جاتے آتے
تھے۔ چھ مہینے کے اندر ایک ہزار کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔
ایک ہزار دوبارہ چھپا۔ مدت ہوئی اس کو ختم ہوئے۔ یہ
جماعت کا ایک المیہ ہے کہ جماعت کے خلاف پروگنڈہ ہوتا
رہتا ہے، غلط فہمی پھیلتی رہتی ہے۔ تحریک و دعوت کو نقصان
پہنچتا رہتا ہے لیکن ذمہ داران جماعت اس نقصان کو
محسوس ہی نہیں کرتے اگر جوابی لٹریچر شائع ہوتا رہتا تو
جمیعتہ العلماء کو ان پٹی ہوئی کتابوں کو از سر نو شائع کرنے کا
حوصلہ نہ ہوتا۔ حد یہ ہے کہ ٹونک اور ندوۃ العلماء کے مفتیوں
نے جماعت کے لٹریچر کے حق میں جو فتوے دیئے ہیں وہ بھی
کتابی صورت میں جماعت اسلامی کے یہاں سے شائع
نہیں ہوئے۔ میں جمیعتہ العلماء کو دعوت دوں گا کہ وہ ۲۴
اکابر دیوبند کے دستخطی فتوے کو شائع کر دے اور ایڈیٹر
تجلی سے درخواست کروں گا کہ وہ میرا جائزہ باسقاط شائع
کر دیں، اختصار کے ساتھ یہی تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے
کہ حق کی مخالفت کرنے والوں کا رشتہ علم و فضل، فہم و ذہانت
اور تقویٰ و حق پرستی سے کس طرح منقطع ہو جاتا ہے۔ فتویٰ
مذکورہ اتنا ذلیل ہے کہ اس نے دارالعلوم کے کنگرہ و قاری کو زمین

پوس کر دیا ہے۔ بہار کے سیرت کے جلسے میں میں مدعو تھا حضرت
مولانا عبدالشکور لکھنوی علیہ الرحمۃ کے مدرسے کے استاد مولانا
..... بھی مدعو تھے انھوں نے کہا۔ میں نے مدرسہ اس کے سفر
میں تمہارا جائزہ دیکھا شرم سے میرا سر جھک گیا کہ دارالعلوم
دیوبند کا ایسا فتویٰ! میں اعلان کرتا ہوں کہ الجمعیت بکڈ ہو کر
اس فتویٰ کی اشاعت کا ہرگز حوصلہ نہ ہو گا۔

صاحب زادے عزیز احمد قاسمی بی۔ اے بھی بڑوں
کے ساتھ پچھڑوں کی طرح اچھل کود کر رہے تھے۔ شاید دور جاہل
کی ہم کے وہی سربراہ بنائے گئے ہیں اس لئے حضرت فتح
الاسلام کے رسالے "ایمان و عمل" کی کسی بنیاد پر نہیں صاحب
زادے نے اپنے مقدمے سے مزین و مشرف فرمایا ہے جو
پروگنڈے کے اقتراح کے طور پر ادارہ الجمعیت کے پیش
لفظ کے ساتھ ۲۱ جون کے الجمعیت میں شائع ہوا ہے اور
اعلان کیا گیا ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو مودودیت سے
محفوظ رکھنے کے لئے "ایمان و عمل" باسقاط الجمعیت میں
شائع ہو گا۔ مقدمہ نگار نے مولانا مودودی کی تحقیق و
تذیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ علیہ الرحمۃ
کے فتوے کو سند بنایا گیا ہے جس میں ممدوح نے تحریر فرمایا
ہے کہ "مولانا مولوی سید ابوالاعلیٰ مودودی کسی بھی امام
کے قائل نہیں ہیں۔ آزاد خیال آدمی ہیں اس لئے ان کا
اتباع شرعاً ناجائز ہے۔" مولانا مودودی کی آزاد خیالی کے
ثبوت میں مقدمہ نگار نے حدیث کی یہ عبارت نقل کی ہے
"جس مسئلے میں مجھے تحقیق کا موقع ملتا ہے، چاروں اماموں
کے مذہب پر نظر ڈالتا ہوں اور جس کی تحقیق کو قرآن و حدیث
کی منشاء سے زیادہ قریب پاتا ہوں اس کی پیروی کرتا
ہوں۔" اس عبارت کو نقل کر کے مقدمہ نویس نے لکھا ہے
"یہ اجماع کے خلاف ہے اس کو اتباع نفس کہا گیا ہے۔"
یہ ہیں دارالعلوم دیوبند کے نو نہال، نہ جلنے والے
کی بنا پر مولانا مودودی کے طریقہ کار پر یہ رائے داعی ہے
یا ازراہ تبلیغ فریب۔ قرآن و حدیث مطابق چاروں ائمہ

ب سے کسی کے اتباع کو اتباع نفس کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اتباع نفس اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے ذاتی غرض کے لئے کبھی کسی امام کی پیروی کرے اور کبھی کسی امام کی۔ اس کے پیش نظر نفائی آسانیاں ہوں۔

مولانا مودودی کے طریقہ کار کو مقدمہ بنکارنے کے بعد اتباع نفس قرار دیا ہے اسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے لکھنے کی روشنی میں دیکھے۔ فقہیات میں تحریر فرماتے ہیں: ”میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی انھیں دونوں سے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انھیں امام ہیں۔ لیکن زیادہ ہیں، فقہاء، مفسرین، متکلمین اور صوفیہ یا شافعی سب سے ہیں اور حکومتیں اور عوام نہ زیادہ تر حنفی مذہب کے پیرو ہیں۔ اس وقت جو امر حق ملا علیؒ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ کہ دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں مذاہب کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے نام لکیر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہوا اسے باقی رکھا جائے اور جس کی کوئی اصل نہ ملے اسے ساقط کر دیا جائے۔ مروجہ چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اگر وہ دونوں میں ہیں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس قابل ہیں کہ انھیں دائروں سے لے لیا جائے اور اگر ان دونوں میں اختلاف ہو تو دونوں قول سلیم لے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔“

دیکھئے مولانا مودودی کا طریقہ شاہ صاحب کے الہام سے س قدر مطابق ہے۔ مولانا کے معترضین شاہ صاحب کے الہام پر غور و فکر کرنا چاہیں حضرت شاہ صاحب کا الہام مظهر ہے حنفی اور شافعی مذاہب میں احادیث کے خلاف بے اصل چیزیں بھی ہیں جو ساقط کرنے کے لائق ہیں پھر رد و قبول یا یہ ہدایت شاہ صاحب علمائے وقت ہی کو دیتے ہیں۔ تہد کی شرط نہیں لگاتے شاہ صاحب کی ہدایت پر عمل ہو سکا اور مولانا مودودی شاہ صاحب کی ہدایت کی مطابق

کام کرتے ہیں اور چاروں مذاہب پر نگاہ ڈال لیتے ہیں تو یہ طریقہ بجائے خود صحیح کیوں نہیں ہے۔ آپ مولانا مودودی کو اس لائق نہیں سمجھتے تو اپنی لیاقت اپنے پاس کہیں عالم اسلام تو ان کو اسلام کا جلیل القدر عالم اور شامح مانتا ہے یہی مولانا کی اتباع کی بات تو سرے سے استغناء اور فتویٰ ہی ہے اصل ہے۔ جماعت اسلامی کی تشکیل کے اجتماع میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مدبر الفرقان اور رکن مجلس شوروی دارالعلوم دیوبند بھی موجود تھے، مولانا مودودی کو امیر جماعت منتخب کیا گیا۔ اور انھوں نے محبت امیر تقریر کی تو انھوں نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ فقہی مسائل کی تحقیق کے سلسلے میں مجھ پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے اور فقہی مسائل میں ارکان کے لئے میری پیروی ضروری نہیں۔“ (ملخصاً) مولانا کی یہ تقریر جماعت اسلامی کی روداد حصہ اول میں دیکھی جاسکتی ہے جب مولانا نے ارکان مجلس کو فقہی مسائل میں اپنے اتباع سے آزاد کر دیا ہے تو عام مسلمانوں کا کیا ذکر؟ مولانا نے تو ایک بار عام اعلان کر دیا تھا کہ جماعت سے متعلق امور میں مجھ سے استفسار کیا جائے فقہی مسائل علماء سے دریافت کر لئے جائیں۔ دیوبندی اکابر و اصاغر کو جان لیسا چاہئے کہ جماعت اسلامی والے تفسیر و حدیث اور فقہ کسی میں اپنے کو مولانا مودودی کا مبع نہیں مانتے۔

فقہی امور میں مولانا مودودی کی رائے غلط ہو سکتی ہے۔ مثلاً مقدمہ بنکارنے لکھا ہے کہ مولانا مودودی بندوق کے شکار کو تیر کے شکار پر قیاس کر کے جائز قرار دیتے ہیں جو تمام فقہاء کے نزدیک ناجائز ہے۔ یہ مولانا کی اپنی رائے ہے وہ کسی کے لئے اپنی رائے کا ماننا ضروری قرار نہیں دیتے۔ کوئی نہ مانے ان کی رائے! لیکار اختلاف تو مانے ہوئے مجتہدین و مفسرین و محدثین سے کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علماء نے تو انکو بدعتیہ اور خارجہ جی بنا کر رکھ دیا ہے۔ جماعت اسلامی والے مولانا مودودی کے مخالفین و معترضین کے حلوں کا

خاصا پھیلا۔ تقریباً چھ ہزار کامپاں تو پاکستان ہی گئی ہوئی
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا مودودی پر کئے گئے اعتراضات
کی غلطی واضح ہو گئی اور کسی کو جواب کی جرأت نہ ہوئی۔ تجلی
کے اس نمبر کا خلاصہ بھی کسی صاحب نے پاکستان میں "حقیقت"
کے نام سے چھاپ دیا تھا۔ اب اہا سال بعد جمعیت علماء
ہند والے اگر پھر سے اس نکتے کو کھڑا کر رہے ہیں تو اس کی
وجہ یہ ہے کہ اپنی زوال آمادہ نیکنامی اور بڑھتی ہوئی نامعززیت
نے انھیں پریشانی میں ڈال رکھا ہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ
رہا ہے کہ کیا کریں۔

دیے انگریز کا طریقہ تھا کہ جب مسلمانوں میں فروعی مسائل
کے اختلافات کا بازار کھلے سر ہوتا دیکھتا تھا کسی نہ کسی فریق
کو ابھار دیتا کہ کیوں ٹھنڈے پڑے ہو۔ خرچہ ہم سے لو اور گرہ
محرمی شرع کر دو۔ کیا عید ہے کہ مسلمانوں کے افتراق و
انتشار کے خواہاں کسی ہب جن نے یہی ٹنگ آج بھی استعمال
کی ہو اور گٹے مُردے اٹھاڑنے کی مزدوری جمعیت کو چھٹی خاصی
مل جائے۔

ہمیں ہر حال ان لغویات سے اب دلچسپی نہیں۔ ہمارا
کام علم و تحقیق کی خدمت ہے نہ کہ پروپیگنڈوں کی جواب دہی
میں وقت ضائع کرنا۔ جو ضرورت سمجھے تجلی کے خاتونوں سے
جب چاہے ہر جمعیتی اعتراض کا نشانی کافی جواب نکال کر
پمفلٹ وغیرہ کی شکل میں شائع کر سکتا ہے۔

ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی
کی پگڑی اُچھالنے والی اس جماعت صحابہ میں سے سب سے پہلے
یہ دریافت کرنا چاہیے کہ ایک سے زائد بارانگریزی اخبار
کے نام پر جو ہزاروں ہزار دہلاکھ سے اوپر (روپیہ وہ
جمع کر چکی ہے وہ کن مقدس حضرات کے کھاتے میں درج
ہے۔ دوسروں کے ایمان و عمل پر لکھنوی نراکتوں کا نشر
آزمانے والے پہلے اپنی دیانت کا حساب تو قوم کے آگے
رکھیں۔

دفاع اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ان کے مقلد اور تبع
ہیں۔ دفاع اس لئے کرتے ہیں کہ اعتراض اعتراض
نہیں معاندانہ افتراء و بہتان ہوتے ہیں مقصود مسلمانوں
کو ان سے بظن کرنا ہو تا ہے اور ان کو ملٹی کی آڑ بنا کر
اقامتِ دین کی تحریک و دعوت کو سبوتاژ کرنا اور ہر
ہو یا یہ ہے کہ ملک کے میں جماعت اسلامی نے جنگدار لائٹ
کے قیام اور ہفت روزہ اخبار کے اجرا کا پروگرام بنایا
تو جمعیت العلماء کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی کہ جو
ناکام ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد کیرالہ میں جماعت اسلامی
کے اجتماع کو ناکام بنانے کے لئے جمعیت العلماء نے ایڑی
سے چوٹی تک کا زور لگادیا وہاں سے بھی ناکامی کا منہ
دیکھنا پڑا۔ اور ایسے ہی دوسرے ناپاک محرمات ہوں
جسے جو جماعت اسلامی کے خلاف نئی ہم چلائی گئی ہے۔
ہمارے نزدیک یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ جماعت
اسلامی والے اکابر دیوبند کا احترام کرتے ہیں اور جمعیت
العلماء نے شیخ الہند مولانا عبد الصمد رحمانی حضرت مفتی
کفایت اللہ مرحومین کو قبروں سے باہر لاکھڑا کیا ہے تاکہ
جمعیت العلماء کے موجودہ سربراہوں کے مجرم و دستار
محفوظ رہیں۔ دھجیاں اڑیں تو مرچیں کے کفن کی اڑیں
یہ ان بزرگوں پر کتنا بڑا ظلم ہے۔ شیخ الاسلام کے
صاحب زادے مولانا اسعد اور ان جیسے دوسرے حضرات
کیوں میدان میں نہیں آتے۔ ان کے علم و قلم کی داد دینے
کے لئے ایڈیٹر تجلی ہی موجود ہیں۔

تجلی

اخبار جمعیت کے کچھ تازہ تراشے بعض حضرات نے
ہمیں بھی بھیجے تھے اور لکھا تھا کہ ان کا نوٹس لیں۔ ان تراشوں
کا تعلق اسی "ایمان و عمل" سے تھا جس کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔
ہم نے سب کو جواب لکھ دیا تھا کہ بھائی مولانا حسین احمد رحمۃ
اللہ علیہ کی اس کتاب پر تجلی نے اسی زمانے میں جب یہ
شائع ہوئی تھی تنقیدی نمبر نکالا تھا۔ یہ نمبر ہندو پاک میں

اسلام اور نظام اسلام

ایک ہندو دوست کا مکتوب اس کا جواب

تمام حشر سامانیان امن و امان اور عدل و مساوات میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

ایک نظریہ کی حیثیت سے میں ان تمام خصوصیات کا قائل اور معترف ہوں۔ لیکن کیا اعلیٰ حیثیت سے بھی اسلام کی اعلیٰ اقدار انسانی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکتی ہیں؟

تقریباً چودہ سو سالہ اسلامی دور میں صرف قرن اول میں یہ اسلامی نظام قائم رہ سکا۔ بعد میں عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے سہ سالہ دور حکومت میں اس کو نشاۃ ثانیہ دینی چاہی تو پھر طبائع انسانی نے اسے قبول نہیں کیا اور بالآخر انہیں سب مٹ کر دیا گیا۔

رسول اللہؐ نے بعثت کے بعد تیرہ سال مکہ میں بسر کئے وہاں کوئی نظام شریعت وجود میں نہیں آیا تھا۔ پھر دس سال کی مدت قیام مدینہ کی ہے یہ بھی شکش کا دور ہے۔ اسلامی ریاست میں قرار واقعی امن و سکون اور جمعیت کا حسب دل خواہ سامان نہیں تھا اور ابھی احکام خدا بھی بہ صورت قرآن نازل ہو رہے تھے۔ غرض کہ دور نبویؐ میں صرف اس اساس اسلام قائم ہو سکی۔

رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ پہلا خلیفہ ایک عالی دماغ، مدبر اور بہترین صلاحیتوں کا مالک انہیں میرا گیا ورنہ اسلام کی منزلوں بنیادوں پر کسی عمارت کا قیام ممکن ہی نہ تھا۔ دیکھ ایک علیحدہ بحث ہے کہ اہل بیت رسولؐ حضرت صدیقؓ سے راضی اور مطمئن کیوں نہیں ہوئے؟ حضرت صدیقؓ نے اپنی جانشینی

میرے محترم جناب مولانا صاحب مدبر تجلی آداب نیاز میں خاندانی ہندو ہوں مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ میرا مذہب کیا ہے۔ میں نے تاریخ اسلام اور کچھ مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی بعض کتب عقیدت اور لگن سے مطالعہ کی ہیں۔ بلاشبہ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں عظیم الشان اور جلیل القدر انسان سمجھتا ہوں۔ کاش ان کی حیات مبارکہ کا عرصہ کچھ اور طویل ہو جاتا۔ تو اخلاقِ رد خانیت اور معیشت و معاشرت کی دنیا میں ایسا انقلاب عظیم رونما ہو سکتا تھا جس کے دور میں اثرات اقصائے عالم میں ہمہ گیر حیثیت سے قائم رہتے۔

میرے محترم اندھب اسلام کے اعلیٰ نظریات مجھے تسلیم ہیں لیکن میرے ذہن ناقص میں کچھ شکوک بھی ہیں۔ چونکہ میں آپ کی ذہانت، معاملہ بھی، جودِ طبع، قابلیت اور معلومات کی وسعت کا معترف ہوں اور آپ کے رسالہ تجلی کو بالامتیعاب اور تواتر کے ساتھ پڑھتا ہوں اسلئے اس معاملہ کو آپ سے رجوع کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری خاطر سے اپنے وقت کا کچھ حصہ اور تجلی کے دو تین کالم صرف فرمائیں گے۔

بلاشبہ مذہب اسلام ایک مکمل، مرتب اور منظم نظام فکر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ ایک قابل عمل نظام بھی ہے؟ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور دین فطرت ہے اس میں انسانیت کے تمام مسائل کا حل موجود ہے وہ ایک ایسا صالح قانون راجح کہ نہ ناجائز ہے جس سے حیات، مکروہات دنیوی، اخلاقی دماغ اور تصادم و تقابل کی

کے لئے ایک بہترین ہستی کو نامزد کیا کہ چونکہ مسلمانوں کے یہاں غالباً خلافت اور امارت کے تعین کا کوئی واضح تصور نہیں

ہے، حضرت عمرؓ کے تدبیر اور ڈرے کے طفیل ایک عظیم سلطنت اسلامیہ قائم ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی دولت و ثروت اور تمول میں بھی غیر معمولی اور غیر مناسب اضافہ ہو گیا اور بہت سا "مواد خا" بھی مسلمانوں کے زمرہ میں شامل ہو گیا۔ میرا مطلب اُن بوسلوں سے ہے جن کے معتقدات کے اجمال میں روح اسلامی جذب نہیں ہو سکی تھی۔ بہر طور شہادتِ عمرؓ ایک حادثہ فاجعہ اور ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ اس کے بعد محسوس طور پر مادیت کو فروغ اور روحانیت و تقویٰ میں انحطاط رونما ہونے لگا۔ حضرت علیؓ کی بارٹی تو خلافتِ اول کے وقت ہی سے اپنی حق تلفی محسوس کر کے عملی طور پر کاروبارِ حکومت سے الگ تھلگ رہتی تھی، عہدِ عثمانی میں وہ مسلمان جن کو میں نے "مواد خا" کہا ہے، خصوصیت سے مادیت کی افراط اور روحانی اقدار کی تفریط کا شکار ہونے لگے اور وہ فتنہ عظیم رونما ہوا جس نے اسلامی نظامِ فکر کو بھی تہ و بالا کمر دیا یعنی حضرت عثمانؓ معصوم اور مظلوم شہید کر دیئے گئے۔

حضرت علیؓ برائے نام خلیفہ ہوئے انھوں نے پھر زبرد خشک، کامل تقویٰ، مادیت کی تفریط اور روحانیت کی انحراف کے عملی دیزس دینا شروع کئے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اُن کی صدائے حق پر معرودے چند مخلصین اور بلو ایدیں (منافقین) کے علاوہ بیک کہنے والے کتنے تھے؟ خود اُن کے بھائی بند بھی علیؓ کے اعتبار کی شدت سے دل برداشتہ ہو کر امیر معاویہ سے مل گئے تھے۔

معاف فرمائیے گا مسلمانوں نے غالباً قرابتِ رسولؐ اور علیؓ کی ذاتی عظمت و رفعت کا لحاظ کر کے انھیں بطور تبرک چوتھا خلیفہ تسلیم کر لیا ہے لیکن ایک مورخ کا داغ تو اُن کی خلافت کے تسلیم کرنے میں متاثریہ ہے۔ جے گا۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور امام حسنؓ کی امیر معاویہ

کے حق میں دست برداری اور مفاہمت کے بعد جس کے معاوضہ میں معتد بہ وظیفہ اور جاگیر حاصل کی گئی۔ حالانکہ خلافت کا معاملہ اُن کی میراث یا ذاتی ملکیت کا مسئلہ نہیں تھا، تو جو کچھ بھی ہوا اُس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے جہاں وہ درست ہے۔ واقعہ گمراہ۔ بنو امیہ کا زوال اور بربادی اور دوشیعہ مسلمانوں (ضمیر الدین) تحقیق طوسی ہلاک خواں کے ایڈی کانگ اور ابن علقمی آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا وزیر اعظم کی سازش سے نام نہاد خلافت کے ڈھانچہ کی شکست و رنجت وغیرہ یہ طویل تاریخی بحثیں اور جدال و قتال اور باہمی آذیتوں کی المناک اور عبرت خیز داستانیں ہیں۔

اس پس منظر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً اسلامی نظامِ عمل اور ضابطہٴ حیات میں کچھ ایسی کمی جس کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی، ضرور موجود رہی ہے جس کے باعث ہر دور میں اندرونی خلفشار اور بے اطمینانی قائم رہی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مختصر مدت کے علاوہ حکومتِ الہیہ یا اسلامی نظامِ فکر و عمل مسلمان حکومتوں کے لئے کیوں قابلِ عمل اور کشش کا باعث نہیں ہو سکا؟

آج بھی بہت سی اسلامی حکومتیں ہیں مگر نظامِ اسلامی کہاں کہاں رائج ہے؟ سعودی عرب اور لیبیا کے علاوہ کہیں بھی تو نہیں۔ اور پھر لیبیا کے نظامِ اسلامی کی عمر ہی کیا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ معمر قذافی کے بعد کیا حالات رونما ہوں۔ اب رہا سعودیہ حکومت کا معاملہ تو تاریخ کے لحاظ سے اس پر ابھی تین سلیں بھی نہیں گزری ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حکم اکثریت ہی پر لگایا جاتا ہے۔

آج کل ہندوستان کے بعض مخلص اور بہادر انسان ملک کے موجودہ انتشار اور اضطراب اور آنا را انقلاب کو محسوس کرتے ہوئے بنی نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے نظامِ اسلامی اور اُس کی خصوصیات و غمہ پیش کر کے اہل ملک کو دعوتِ فکر دینا چاہتے ہیں لیکن گذشتہ تاریخ اور حقیقت پر مبنی مثالوں کے ہوتے ہوئے اور کوئی

واضح لائحہ عمل نہ ہونے کی صورت میں ان کی سیاسی کیے
بار آور ہو سکتی ہیں۔ یہ سلطانی جمہور کا زمانہ ہے اور اسلام
میں حکومت کے لئے ایک ہی امیر المؤمنین کا ہونا لازمی
شرط ہے اور پھر امیر کے تعین و تقرر کے لئے بھی واضح
احکام نہیں ہیں۔ حدیہ کہ خلافت راشدہ کو بھی نہ تو ریشی
حکومت کہہ سکتے ہیں نہ جمہوری اور نہ آمریت۔ "مسلمانی در
کتاب" تسلیم مگر مدبر اور مضمر تو گزشتہ تاریخی تجربات
اور حال کے واقعات پر تنقیدی نگاہ ڈال کر ہی کسی مستقبل
کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس وقت ممالک عرب سیاسی طور پر متحد ہو رہے
ہیں۔ رابطہ اسلامی۔ اسلامی کانفرنس اور اسلامی کمیٹی
وغیرہ کا قیام ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے مگر
بات یہیں آجاتی ہے کہ کیا ان ممالک میں اسلامی نظام اور
شرعی قوانین بھی نافذ ہوں گے؟ یا عہد جدید سے باعزت
سمجھوتا کر کے کوئی ایسا خاکہ بنایا جائے گا یا بنایا جا سکتا ہے
جو زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور عصر جدید کے تقاضوں
سے ہم آہنگ ہو سکے؟

بطور دفع دخل مقدمہ یہ بھی عرض کر دوں کہ میں پرنسپل
وغیرہ میں ترمیم جیسی خرافات کا قائل نہیں ہوں بلکہ میں
تو ہر مذہب کے لئے اس کا پرنسپل ضروری سمجھتا ہوں۔ ہر
معیاری مذہب انسانیت کی صلاح کے لئے ہی توجہ دہا
ہے۔ میں وحدت ادیان کے نقطہ نظر کو بھی فتنہ سمجھتا ہوں
مذہب کے مملو بہ کا تصور بھی میرے لئے ناقابل قبول ہے۔
میری تحریری استعداد بھی دین انسانیت اور شرافت کا
ناسطہ دے کر آپ کو یقین دلانا ہوں کہ (خالصاً لوجه اللہ
ہے اور اس میں تلبیس و تلوین کا شائبہ تک نہیں ہے۔
آپ کے جواب کے نہ صرف میرے بلکہ دوسرے ہندو اور مسلمان
بھائیوں کے بھی اس قسم کے شکوک دور ہو سکتے ہیں۔ مجھے
امید بلکہ یقین ہے کہ آپ کے جواب سے ضرور معزز فرمائیں گے۔
میں غیر مسلم بھی ہوں اور مجھے اپنی کم لگائی بے بضاعتی، عدم
معلومات، انشائیہ کامیوں اور استدلال کی کمزوریوں کا

بھی اعتراف ہے۔ مجھے یہ بھی آرزو نہیں ہے کہ میرا یہ
ثولیدہ مضمون تجلی میں شائع ہو۔ البتہ جواب کے لئے جو حوالہ
ضروری ہو گا اس کی طرف جناب خود اشارت فرمادیں
سپریم جو مشکل خویش را تو دانی حساب کم و بیش را
جواب کے لئے ٹکڑ اس لئے ارسال ہیں کہ میرے سوالات
جہل اور ناقابل توجہ ہوں تو ان جناب مجھے مطلع فرمادیں۔
اور اگر تجلی کے ذریعے جواب ملنے کی سعادت مجھے حاصل نہ
ہو سکے تو آنجناب میری تسکین کے لئے کچھ اشارات ہی
تحریر فرمادیں۔ یا پھر درجہ جمہوری کسی ایسی معیاری کتاب
کا حوالہ تحریر فرمادیں جس کے مطالعہ سے یہ اچھنیں دور
ہو سکیں۔ اگر آنجناب تجلی کے ذریعے جواب دینے کا فیصلہ
فرمائیں تو پھر ذاتی طور پر مجھے جواب دینے کی زحمت فرمائیں
میں اس خاموشی کو رضامندی سمجھ کر مطمئن ہو جاؤں گا۔
اس صورت میں مرسلہ ٹکڑ تجلی کے لئے کسی کام میں لے
آئیں۔ والسلام۔

زحمت دینے کا معذرت خواہ

منوہن لال سکینہ (درآمد)

تجلی

جناب محترم آداب و نیاز

مختصر جواب خط سے دے چکا ہوں۔ دعا ہے اللہ تع
آپ کو اس میں علانید اخل ہو جانے کی توفیق اور جرات
عطا فرمائے جسے آپ دوسرے تمام دنیوں کے مقابلہ میں
برحق اور بہتر تصور فرما چکے ہیں۔

آپ کے مراسلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنجناب کو فی
نفسہ اسلام کے دین حق ہونے میں کوئی شک باقی نہیں
رہا ہے بلکہ اچھن صرف اس بارے میں ہے کہ یہ دین کیا
ایک سیاسی و اجتماعی نظام کی حیثیت سے بھی قیام کی
اہلیت و استعداد اپنے اندر رکھتا ہے یا یہ صلیحیت اس
میں نہیں پائی جاتی۔

تو اس اچھن کے سلسلہ میں ناچیز کی گزارش یہ ہے کہ

اگر اس کا کوئی جواب آپ کو کہیں سے نہ ملے۔ یا اگر ملے تو یہ مسئلہ ایک سیاسی و اجتماعی نظام کی حیثیت سے یہ دین زیادہ عرصہ تک قیام و ثبات کی اہلیت نہیں رکھتا تب بھی آپ کے لئے معقولیت اور عافیت کی واحد راہ یہی ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری رسول برحق مان کر خود کو اسلام کا حلقہ بگوش بنالیں کیونکہ مرنے کے بعد جب تمام انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور میدانِ آخر میں حساب کا دفتر کھلے گا اس وقت ہر شخص سے اس کی ذاتی اور شخصی حیثیت میں حساب لیا جائے گا اور ایسے سوالات نہیں پوچھے جائیں گے جو اس کے فکر و شعور کی دسترس سے باہر رہے ہوں۔ مثلاً آپ سے یہ دریافت نہیں کیا جائے گا کہ آپ کے نزدیک اسلام سیاسی و اجتماعی اعتبار سے ایک قابل عمل نظام تھا یا نہیں تھا۔ نہ یہ پوچھا جائے گا کہ تاریخ اسلام کی منطقی و سیاسی توجہ و تعبیر آپ کی کیا تھی بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ مطالعے اور غور و فکر کے بعد آپ جب محمد عربی کی عظمت و جلالت اور صدق و دیانت پر مطمئن ہو گئے تھے تو پھر کون آپ نے صاف صاف ان کی وہ حیثیت تسلیم کی جسے تسلیم کرنا ہی ان کی رسالت کا اہم تھا۔ آنجناب بفضلہ تعالیٰ ذی علم بھی ہیں اور ذی فہم بھی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ محمد عربی نے اپنی پوری حیات رسالت میں جو دعوت مخلوق خدا کو دی وہ یہی تھی کہ اے لوگو! خدا ایک ہے اور میں اس کا آخری رسول ہوں۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ محمد کو آخری رسول مان لینے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ جو بھی تعلیمات و ہدایات آپ نے دی ہیں انھیں برحق مان کر حتیٰ الوسع ان پر عمل کیا جائے۔ عمل میں کوتاہی قابل معافی ہو سکتی ہے لیکن عقیدہ بہر حال اس حد تک بنیادی ہے کہ اگر وہی نہ ہو تو کسی مفید عمر کی امید کی ہی نہیں جاسکتی۔ ”محمد ایک عظیم انسان تھے“۔ ”ان کی جلالت شان میں شبہ نہیں“۔ ”ان کی سیرت بے داغ اور کردار اعلیٰ درجہ کا تھا“۔ اس طرح کے فقرے جو لوگ

استعمال کرتے ہیں انھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ محمد کی پوری تعریف نہیں ہے بلکہ یہ سب سے کوئی تعریف ہی نہیں ہے اگر ان فقرہوں کو استعمال کرنے والا محمد کی رسالت پر ایمان نہیں لایا یا آخر اس کا کیا منطقی اور نفسیاتی جواز ہو سکتا ہے کہ محمد نے پہلے یوم رسالت سے آخری سال تک جو دعوت دی اسے تو کھلے دل سے قبول نہ کیا جائے اور نہ بان سے یہ کہا جائے کہ محمد عظیم تھے، جلیل تھے، صاحبِ کردار تھے وغیرہ۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ یا بعض دیگر غیر مسلم حضرات اگر وقت فوقتاً محمد عربی کے کردار و سیرت وغیرہ کی خوب خوب تعریف کرتے ہیں تو انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تعریف انھیں کچھ فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ آخرت میں اس سے نقصان ہی پہنچے۔ نقصان اس لئے کہ اگر اس طرح کی مدح سرائی اور ثنا خوانی محض ناشائستہ ہو جائے بلکہ سچے دل سے ہے تو پھر اس سوال کا کوئی جواب ہی آخرت میں بن نہیں پڑے گا کہ تم نے انھیں خدا کا آخری رسول کون نہیں مانا؟ تم نے انھیں اس دعوے میں سچا کیوں نہیں سمجھا کہ ”میں خدا کا رسول ہوں“؟ اگر تمھارا خیال یہ تھا کہ اپنی تمام تر صفات حمیدہ کے باوجود محمد اس دعوے کی حد تک ”جھوٹے“ ہیں تب تو تمھاری ساری ثنا خوانی ہی محض تسخیرِ کمرہ جاتی ہے کیونکہ محمد کی تو ساری حیات رسالت ہی نقطہ اسی دعوے کے گرد گھومی ہے۔ یہی دعویٰ اس کا محور و مرکز رہا ہے۔ اسی کی بنیاد پر ان کے کردار و سیرت کی پوری عبارت اٹھی ہے۔ اگر اس دعوے میں وہ سچے نہیں تھے تو حاصل اس کے سوا آخر کیا نکلا کہ ان کی ساری حیات رسالت نعوذ باللہ مکہ و کذب کا دارمِ فریب تھی اور حسن کردار کے سارے پردے ان کا چھوٹے کے چہرے پر نقابِ خوش رنگ بنا کر ڈالے گئے تھے۔

اور اگر تم اس دعوے کے معاملہ میں انھیں سچا تصور کرتے تھے تو پھر کیا عذر تھا کہ تم نے ان کی رسالت کا انکار نہیں کیا اور اقرار کے بعد وہ کردار اختیار نہیں کر سکے جو ایک سچے اقرار کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہونا چاہیے تھا؟

خطا معاف! میں نے آپ کی اصل الجھن پر براہ راست گفتگو کرنے کے بجائے ایک ناصح مشفق کا پارٹ ادا کر ڈالا ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آپ کی الجھن تو بس ایک اکیڈمک قسم کا علمی و فکری موضوع ہے جس سے آخرت کی نجات و مغفرت کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ کی یہ الجھن سلجھ جائے تب اور نہ سلجھ تب، دونوں حالتیں اخروی عمرے کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ ایسی صورت میں اسے بنیادی اہمیت دینے کی کوئی وجہ نہیں اور اہمیت دیئے جانے کے قابل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اور آپ اب جس دوسری دنیا کے کنارے کھڑے ہیں اور چارہ ناچار ہمیں بہت جلد جس میں داخل ہو جانا ہے وہاں ہماری عافیت اور تحفظ اور آرام و راحت کا کیا سامان ہونا چاہیے۔ آپ نے اپنے مراسلے میں جن گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ بات بہر حال آپ مانتے ہیں گئے کسبت کے بعد ایک بار پھر زندہ ہونا ہے اور خالق کائنات کی عدالت خاص میں حاضر ہو کر اپنے زندگی بھر کے اعمال و افکار کا حساب دینا ہے۔ اگر اس پر آپ کو یقین ہے تو پھر آپ سوچ لیجئے کہ موجودہ زندگی کے چند غنیمت کچھ میں کوئی سطر پر عمل ہے جسے فوراً اختیار کرنا آپ کے لئے مفید ہو گا۔ یہ بات سن کر آپ کو شاید خوشی ہو کہ وہی محمد عربیؐ جن کی عظمت و جلالت پر آپ مطمئن ہو چکے ہیں یہ فرما گئے ہیں کہ جب کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کی پچھلی تمام خطائیں اور لغزشیں کا تعدیم ہو جاتی ہیں۔ یعنی زمانہ کفر میں اس نے جو بھی بڑے کام کئے تھے ان کی معافی اور آگے کو جو بھلے کام کرے گا انکی قبولیت کا وعدہ۔ گویا پچھلے غیر مسلم انسان کے اندروں سے ایک

نیا انسان جنم لیتا ہے جو سادہ و رقی کی طرح داغ دھبوں سے پاک ہے اور اس کا پچھلا جسم حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا ہے اندازہ کیجئے کتنا بڑا اور زبردیں موقع ہے جو اللہ نے اپنے ان بندوں کے لئے مہیا فرمایا ہے جو ابھی یا غفلت کی بنا پر راہ ہدایت سے دور رہ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مذہب و ملت بدلنے کی راہ میں اکثر کس طرح کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ لیکن جو آدمی ذہن و قلب کی پوری آمادگی کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہو گا کہ دنیا کے سارے علائق، سارے رشتے، سارے چمکائے چند ہی روز بعد اس کا ساتھ چھوڑ دینے والے ہیں اور ایک نئی اور نرالی دنیا میں اسے دائمی زندگی گزارنی ہے وہ یقیناً پوری توجہ اس نکتہ کی طرف مبذول کر دے گا کہ اس لئے دلی دنیا میں چین سے رہنے اور کرب و اندوہ سے بچنے کا کیا ذریعہ ہے۔ یہ ذریعہ اختیار کرنے کے سلسلے میں اسے چاہئے کہ کتنی ہی فوری اندیشوں اور صدموں کا سامنا کرنا پڑے وہ ان سے ڈر کر یہ کھلا خطرہ مول نہیں لے گا کہ دوسری دنیا میں عذاب و آفت کا شکار رہے۔

نصیح و تذکر کا فریضہ ادا کرنے کے بعد اب میں آپ کی الجھن کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں گا۔ اسلام ایک مرتب، مکمل اور منظم نظام فکر ہے جس کے ساتھ ساتھ ایک قابل عمل نظام بھی ہے؟ اس سوال کا جواب خود آپ کے مراسلے میں موجود ہے۔ آپ نے تسلیم کیا ہے۔ اور تسلیم کئے بغیر چارہ بھی نہیں ہے کہ یہ نظام قرن اول میں اپنی پوری شوکت اور آں بان اور خصوصیات کے ساتھ قائم ہوا تھا۔ مدت قیام خواہ مختصر ہی رہی ہو لیکن کیا نفس قیام ہی اس حقیقت کا بین اور اصل ثبوت نہیں کہ یہ ایک قابل عمل نظام ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھئے جیسے آدمی اگر ایک بار بھی چاند پر جاتا تو اب چاہے وہ ہزار سال بھی چاند پر نہ جائے لیکن یہ بحث کھڑی نہیں ہو سکتی کہ آدمی کا چاند پر جانا ممکن ہے یا نہیں ہے۔ امکان کا حتمی فیصلہ

یہ نتیجہ ہو گا اس حادثے کا کہ جو صحت مند اور قوی فرد مکمل توجہ اور کنٹرول کے ساتھ ایک درویش کو قائم رکھے ہوئے تھا وہ کارکردگی اور گرفت کی وجہی قوت و صلاحیت سے محروم ہو گیا مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مریض یا زخمی ہو جانا مریضی کے مرادف ہے۔

اسی طرح قرن اول میں قائم شدہ معیاری نظام اسلام پر جو ردال آیا اس کے معنی موت اور فنا کے نہیں۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کر کے دیکھیں یقیناً آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ مسلمان بادشاہوں نے اسلامی نظام سے مکمل انحراف اور دامن کشی کی راہ صدیوں تک بھی نہیں اختیار کی اور اس نظام کے مکمل خاتمے اور انہدام کا آغاز اگر ہوا ہے تو خلافت عثمانیہ کے مکمل خاتمے سے ہوا ہے جو ابھی زیادہ دنوں کا واقعہ نہیں۔ کم و بیش تیرہ سو سالوں تک جہاں جہاں بھی مسلمان بادشاہ حکمران رہے ہیں انھوں نے اپنی بادشاہت کے استحکام اور اپنے نفس کی پیروی میں خواہ کیسا ہی برا کردار اختیار کیا ہو لیکن اسلامی نظام کے پورے تانے بانے کو انھوں نے توڑ کر نہیں پھینکا اور دیوانی و فوجداری دونوں طرح کی عدالتوں میں اسلامی قوانین ہی کو غالب حد تک سربراہی کا منصب ملا رہا۔

اس تجربہ کا حال یہ نکلتا ہے کہ مکمل طور پر معیاری نظام اسلام تو بے شک تیس ہی سالوں کے دائرے میں محدود رہا مگر معیار سے کچھ ذریعہ نظام اسلام اتنا قلیل المیعاد نہیں۔ اس کے بے شمار اثرات و ثمرات تو ہمارے اپنے ملک کی ان مرحوم مسلمان بادشاہتوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں جنہیں ختم ہوئے مہز تین صدیاں بھی نہیں گزریں اور جو اصلاً اسلامی حکومتیں تھیں ہی نہیں بلکہ فقط مسلمان حکومتیں تھیں۔ اب اس کے بالمقابل اگر آپ دنیا کے کسی بھی اور منضبط نظام فکر یا نظریہ سیاست و اجتماعیت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کا حال یہ ہو کہ وہ تیس سال تو درکنار سترہ سال بھی اپنے معیار مطلب پر قائم رہ کر فکر و عمل کی مکمل ہم آہنگی کا

تو ہو چکا۔ ایک بار آدمی کا چاند پر جا کر لوٹ آنا قطعی طور پر یہ اطمینان دلا دیتا ہے کہ دوبارہ جب بھی یہی تکنیک استعمال کی جائے گی اور درمیان کی تمام رکاوٹوں کو صحیح طور پر دور کرتے ہوئے عزم سفر کیا جائے گا دوبارہ اور سہ بارہ بھی آدمی چاند پر جا کر لوٹ آئے گا۔

اگر کم و بیش تیس سالوں تک نظام اسلام کے کامیاب قیام کی نظیر ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی تب بھی علمی یا نظری اعتبار سے یہ کہنے کا جواز نہیں تھا کہ اسلامی نظام کا قیام خارج از امکان ہے کیونکہ اسلامی نظام جن اجزاء و عناصر اور اعضاء و اجزائے مجموعے کا نام ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس کا عملی دنیا میں ظہور و وقوع ناممکن ہے۔ لیکن جب کہ نظیر بھی سامنے موجود ہے تو بحث امکان اور عدم امکان کی نہیں اٹھتی بلکہ صرف اس کی اٹھتی ہے کہ یہ نظام آخر اتنے کم عرصے تک کیوں قائم رہا۔ اس کی عمر طویل کیوں نہ ہوئی۔ اسے دوبارہ لوٹنے کی کوشش کونامی کا سامنا کیوں ہوا۔؟

اس بحث کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگرچہ قرن اول میں قائم شدہ اسلامی نظام تیس ہی سالوں میں محدود رہا لیکن اس کے خاتمے کا مطلب یہ ہو کر نہیں ہے کہ نظام کی پوری عمارت ہی زمیں بوس ہو گئی بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو معیار اسلام کے مطلب تھا یہ اس سے کچھ نیچے آ کر آیا۔ اس میں کچھ ایسے تغیرات آ گئے جنہوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک صحت مند انسان دفعتاً مریض یا زخمی ہو جائے۔ ظاہر ہے مرض یا جراثیم اس کی توانائی کم کر دیں گے۔ اس کے جسم کی طاقت اور آہٹ تاب زوال پذیر ہو جائے گی۔ اور اس کا یہ انحطاط تمام ان افراد کو کھل پھیلنے کا موقعہ دے گا جو اس کی نگرانی اور نگہداشت میں پروردش پارہے تھے۔ اس طرح حالات تیزی سے دگرگوں ہوں گے، ماحول کے جغرافیے اور چہرے ہرے میں تبدیلی ہوگی اور نظم و ضبط کے نفع میں انتشار و پرکٹ رگی کے فتنے شگاف ڈال دیں گے۔

ثبوت دے چکا ہو۔ مثلاً، نازی ازم، کمیونزم یا کسی بھی ازم کو آپ لے لیں۔ ان کے نظریاتی و اصولی اجزاء اول تو اتنے واضح، قطعی اور بے غبار نہیں کہ ان کی تشریح و تعبیر پر ان کے ائمہ نے ایسا اتفاق کیا ہو جیسا اتفاق اسلام کے ائمہ نے اسلامی نظام کے بنیادی اصول و عقائد پر کیا ہے۔ دوسرے ان کی حیثیت ٹھنڈی اضافی ہے یعنی جب چاہے انھیں موم کی ناک کی طرح کسی بھی رخ پر موڑ دیا جائے۔ علاوہ اس کے ان کی پشت پر کوئی ایسا حجت نہیں جسے حریف آخر قرار دے یا جان سکے اور انسانی فطرت پوری آمادگی کے ساتھ اس کی بارگاہ میں تسلیم و تحم کر دے لہذا یہ سب نظام جہاں جہاں قائم ہوئے ہیں یا فی الحال قائم ہیں وہ ہیں انسانی فکر کے تغیر پذیر ثابت اور نفس و خواہش کے مرغوبات کی ترجمانی اور ناساندگی کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے سے کھینچے ہوئے کسی مخصوص اور متعین نقشے کے مطابق انھیں بنایا گیا ہو اور ان کے بعض اصول و مبانی ہر حال میں ناقابل تغیر ہوں۔

میرا مقصد اس این و آں سے یہ بتانا ہے کہ دوسرے جو بھی نظام دنیا میں رائج رہے ہیں یا آج بھی رائج ہیں وہ اس لئے کامیاب نہیں ہیں کہ اصولی و فکری اعتبار سے وہ فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہیں اور مخلوق خدا کے مابین عدل کا فریضہ زیادہ بہتر طور پر ادا کر رہے ہیں بلکہ اس لئے کامیاب ہیں کہ انھوں نے انسان کو ایک ایسا جانور تصور کر لیا ہے جس کے لئے حلال و حرام کی کوئی قید نہیں۔ جسکے اندر روحانی و اخلاقی تقاضوں کی کوئی پیاس نہیں۔ جسے سوچا سوچا سال سانس لینے کے بعد ہنسی کے لئے فنا ہو جانا ہے اور کسی ایسی عدالت میں کبھی حاضری نہیں دینی ہے جہاں اس سے زندگی بھر کے اعمال و انکار کا محاسبہ ہوا اور محاسبہ کے بعد سزا و جزا کے مراحل پیش آئیں۔ جب انسان کو اس طرح کا جانور فرض کر لیا گیا تو اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ انسان کے اندر حرص و ہوس اور طغیانِ شہوت کے جو قوی میلانات موجود ہیں ان کے آگے مناسب تدابیر کھڑی کی جائیں اور اجتماعی نظام ایک فولادی قسَمِ اخلاقی

قلعے میں محفوظ رہے۔ اس کے بجائے لوگوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دل سے کچھ اخلاقی قدردان گھڑیں، کچھ منسل ضابطے تیار کیے اور جب جب ضرورت دیکھی ان میں من مانی تبدیلیاں بھی کیں۔ ان کو کسی ایسی دشواری کا سامنا نہیں تھا جس سے اسلامی نظام کو سابقہ پیش آتا ہے۔ اسلام اخلاق و حرمانیت کی جس اقدار و اصول کو ایک بار حرف آخر قرار دے چکا انھیں اب کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔ ان سے بغاوت و انحراف ممکن ہے مگر ان میں اصلاح اور تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا لہذا انسان کے اندر کا دیوبہوس جب اسلامی نظام کی پابندیوں سے گھبرا کر سرکشی پر آمادہ ہوتا ہے تو اسلام اس کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکتا، اس کی خاطر اپنے بنیادی تفکر اور اصول و افکار کو نہیں بدلتا بلکہ جنگ کرتا ہے اور جنگ کے نتیجے میں دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔ ہار یا جیت۔ اگر اسلام ہار گیا تو اب جو نظام اس کی جگہ لے گا اسے اسلامی نظام نہیں کہیں گے۔ اس کے برخلاف دوسرے ازموں کا حال یہ ہے کہ مثلاً سرمایہ دارانہ نظام والے کسی ملک میں دفعتاً کمیونزم غالب آجائے تو اصطلاحی عنوان کے اعتبار سے اگرچہ پہلے نظام کی جگہ دوسرے نظام نے لی لی مگر بنیاداً کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوتی۔ بنیاد سرمایہ داری کی بھی اسی بے لگام اور فاسد مادہ پرستی پر ہے جس پر کمیونزم کی بے لگام مادہ پرستانہ نظام جوں کا توں قائم رہا۔ دنیا میں جتنے بھی ازم چل رہے ہیں ان میں وہ بنیادی اور جوہری تضاد نہیں ہے جو اسلام اور غیر اسلام میں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی متضاد اور ضد ہیں۔ ان میں جوڑ سے پھٹکل تک کوئی توافق اور ہم جنسی نہیں۔ مگر دوسرے تمام نظام آدمی کو محض ایک مادی وجود سمجھنے، حیات بعد الممات کے فکر سے بے نیاز ہونے اور مستقل اخلاقی و روحانی اقدار سے بے تعلق ہونے کی بنا پر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان پر اسلامی نظام کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

پہلے شخصی حاکمیتوں کا دور تھا۔ اب حاکمیت جمہور کا

محمد کو جس وقت دنیاوی کار خدمت سے فارغ کر کے زیر زمین پہنچا دیا گیا وہی وقت اس کام کے لئے بہترین تھا۔ یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ دنیا کو خالق کائنات نے امتحان گاہ بنایا ہے آرام گاہ نہیں۔ دنیا کو چھوڑ کر باقی تمام کائنات اللہ نے ایسی بنائی جس کے نظم و نسق اور درودست میں دخل انداز ہونا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ چاند سورج ستارے ایک طے شدہ نظم کے ساتھ اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ اور فرشتہ ناک کی جو مخلوق پیدا کی وہ بھی ایسی پیدا کی جو انسان کی طرح خود مختار و آزاد نہیں ہے۔ جسے یہ استعداد نہیں دی گئی کہ اللہ کے کسی فرمان کو جی چاہے مانے جی چاہے نہ کرے۔ اس کے برخلاف انسان کو یہی استعداد عطا کی گئی اور دنیا کو اس کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ جیسا چاہے نظام یہاں قائم کرے۔ اچھی یا بری جیسی چاہے زندگی گزارے اور اللہ کی نازل کردہ ہدایات پر عمل پیرا ہو یا نہ ہو۔ یہ بات قرآن میں بایں انداز کی گئی کہ اگر اللہ چاہتا تو صفحہ ہستی پر ایک بھی کافر نہ ہوتا۔ سارے بندے ایمان قبول کر لیتے اور ہر طرف زہاد عبادت ہی کی بھرپور نظر آتی لیکن دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے اختیار سے بھلائی کی راہ اختیار کرے اور کون نعمتوں کا حق دار بنتا ہے اور کون برائی کی راہ اختیار کر کے اپنے اختیار سے عذاب قبول لیتا ہے۔

جب یہ صورت حال ہے تو نہ تو اس پر حیرت کرنی چاہئے کہ اللہ کا پسندیدہ نظام دنیا میں اس قدر کم مدت کیوں قائم رہا نہ بیشبہ کرنے کی گنجائش ہے کہ اس نظام میں قیام و ثبات کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ کا جتنا گہرا مطالعہ آپ کریں گے یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ خامیاں اور نارسائیاں خود انسانی عمل اور فکر میں ہیں نہ کہ اسلامی نظام کے اجزاء نے ترکیبی میں۔ ناچیز کا مشورہ ہے کہ اس موضوع پر آپ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تخریجیں پڑھیں۔ وہ اس دور میں نظام اسلامی کے سب سے بڑے داعی ہیں اور اسی دعوت کی بنیادوں پر ایک جماعت قائم کرنے کے علاوہ علمی و فکری سطح پر بھی انھوں نے اس سلسلہ میں (باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

دور ہے۔ یہ دونوں ہی دور اسلام کے نزدیک یکساں طور پر مکمل ہیں کیونکہ وہ فقط اور فقط حاکمیت اللہ کا علمبردار ہے۔ حکومت کے سربراہ کو امیر المؤمنین کہنا چاہئے یا صبر و مملکت یا وزیر اعظم اور ظاہری اختیار کسی ایک شخصیت میں مرکوز ہو جائیں یا ایک پارٹی اور گروہ کے افراد میں تقسیم رہیں یہ سب ثانوی درجے کی چیزیں ہیں۔ اصل اور اولین اہمیت اس بات کی ہے کہ حاکمیت کا حق خدا کے لئے تسلیم کیا جائے اور اسی کے نازل کردہ قوانین پر سلطنت کا کاروبار چلے حکومت کا کام قوانین انہیہ کا نفاذ و اجرا ہو۔ اور تعین پذیر حالات کی مطابقت سے وہ جو بھی نئے قاعدے اور ضابطے بنائے وہ لازماً قانون خداوندی ہی سے مطابقت رکھتے ہوں اور ان کا سرچشمہ اور ماخذ حاکمیت اللہ کے تصور کے علاوہ کوئی تصور نہ ہو۔ اسلام نے۔ یاد دہانہ الفاظ میں خالق کائنات نے اپنے آخری رسول کے ذریعے ایک نظام کا ڈھانچا کھڑا کر کے دکھا دیا جس میں حاکمیت اللہ کا تصور پوری طرح کارفرما تھا پھر مشیت نے یہ ڈھانچہ پورے ہم بسج کر دیا تاکہ وہ دیکھے کہ خدا اور رسول پر ایمان لانے والے اسی نوع کا نظام پھر سے قائم کرنے کے لئے کیا کچھ تر بنائیاں دیتے اور کیا کچھ حدود و جہد کرتے ہیں۔ آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ محمد عربیؐ اگر کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو دنیا کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا۔ یا اسلام نسبتاً زیادہ قوت اور وسعت کے ساتھ دنیا پر چھا جاتا۔ اللہ نے اور خود محمد عربیؐ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ نیکوینی امور میں اللہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ دوسرے تمام فیصلوں سے بہتر اور زیادہ مصالح کا حامل ہوتا ہے۔ محمدؐ جس کار خدمت کے لئے مبعوث کئے گئے تھے وہ اُس آخری حد تک تکمیل کو پہنچ گیا جس حد تک اس کا پہنچنا دنیا کے لئے باعث خیر ہو سکتا تھا۔ اللہ کی نیکوینی مصالح کے تحت اب انھیں مزید زندہ رہنا نہیں تھا لہذا اللہ اور تقدیر الہی پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کو لازماً یہ مان لینا چاہئے کہ

انس۔ ملا ابن العربی مکی

مسجد حسین آباد

”آپ اگر چلوں سے گھبرانے لگے تو بہت چلتی تھو
کی گاڑی۔ لوگ اب اتنے چالاک ہو گئے ہیں کہ چکر دیئے
بغیر ان کی اصلاح مشکل ہے۔“

”چلو میں تم بھی سقراط کے دادا ٹھہرے۔“

پھر یوں ہی ہوا۔ اگلے روز دلی سے میرے نام تارا گیا
میں نے زوجہ کو دکھلایا۔ میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”بڑے عمدہ آدمی ہیں مولوی فخر حسن۔ میرے تو بہت
ہی شفیق ہیں۔“

میں نے ایسے دلگداز لہجے میں کہا جیسے موصوف کی بیواری
کی اطلاع پا کر دل کے ایک ہزار ٹکڑے ہوتے جا رہے ہوں۔
زوجہ ایک منٹ تار کو ٹھوڑتی رہی پھر مجھے گھوڑنے لگی۔

”آپ کی زبان سے پہلی بار یہ نام سن رہی ہوں۔ کون
ہیں یہ فخر حسن؟“

”مولوی ہیں۔ خلیل خاندان سے ہیں۔ ان کے دادے
تلوار سے شیر کا شکار کھیلا کرتے تھے۔“

”اور پردادے خلیل سے ہاتھی کا شکار کھیلتے ہوں گے۔“
اس نے گرہ لگائی۔ آنکھوں میں پھر ہونٹوں پر تیرہ تھی آیا۔

”اب زیادہ تو میرے علم میں نہیں۔ بہر حال عیادت
کے لئے مجھے ضرور جانا چاہیئے۔ حالت کچھ نازک ہی ہوگی
ورنہ عزیزی بدگمن تار نہ دیتے۔“

”بہت دنوں آپ کا اعتبار کر کر کے بیوقوف بن
چکی ہوں۔ ایسے تار تو لائے میں دس دیاؤں۔ میری بلا سے
دلی جانے بمبئی چلیے۔ بھینا رات صاف کہہ گئے ہیں کہ
پچھلے ہینے کی سخاوت نہیں ملے گی۔“

دو دن ہوتے ہی کیا ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا رہا
اور وہ جا۔ بجلی کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ موسم بھی اتنا
واہیات رہا کہ دلی دماغ سب تو بہ بول گئے۔ اب میرے
ہی دن سے صوفی شعبان سر پر سوار ہیں کہ چلو دلی۔

”نہیں جا سکوں گا۔ ایک حرف نہیں لکھا گیا۔“

کم سے کم تین دن اور ٹھہریئے۔“ میں نے بہت لجاجت
سے عرض کیا تھا مگر انھوں نے اور بھی لجاجت سے کہا۔

”دیکھو یار۔ زندگی کا آج کل کچھ بھی اعتبار نہیں
ہے۔ ہم یا تم کسی بھی وقت دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف
سدھار سکتے ہیں۔ بس چلے ہی چلو۔ لکھنا تو زندہ گی بھر کا ہے
لکھتے رہنا۔“

ان کا ارشاد اگر امی اصولاً حرف بہ حرف درست
تھا مگر اب تک میری کھڑی کوئی ایسا بہانہ نہیں تراش سکی
تھی جو زوجہ کو مطمئن کر دے کہ دلی کا فوری سفر مرجع ہے۔
وہ یوں ہی جل تلخ رہی تھی کہ دو دن میں میں نے دو صفحے بھی
نہیں لکھے حالانکہ اس نے منکھا بھی جھلا تھا۔ سر میں تیل بھی
ڈالا تھا۔ قلمی اسم بھی منگوا کر کھلائے تھے۔ بیٹھی بیٹھی باتیں بھی
کی تھیں۔

”آفت یہ ہے صوفی صاحب۔۔۔۔۔۔ اودھ اچھا ذرا ٹھہریئے۔“

ذہناً میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ ”آپ ایسا کریں پہلی
گاڑی سے دلی تشریف لے جائیں اور وہاں سے تار دیں کہ

مولوی فخر حسن سخت بیمار ہیں فوراً پہنچو۔ تار دینے والے
کی جگہ بدر الحسن لکھے گا۔ یہ صاحب زادے ہیں۔“

”لاحول دلاقوۃ۔ یہ اب ایک اور چکر پھیلے گا۔“

”اللہ رازق ہے۔ تمہارے بھیا کی خاطر میں اپنے لائق فرائض سے تو دستبردار نہیں ہو سکتا۔ انھیں بتانا بسا پرہی کس قدر ثواب کا کام ہے۔ یہ تار بھی دکھا بنا۔“

”تو آپ ان سے کہہ بغیر ہی چلے جائیں گے؟“
”مجبوری ہے۔ وہ سنا ہے جیب میں بیڑیاں لے پھر ہے ہیں مجھ کیسے دنا مراد کے لئے۔“
اس کی مسکراہٹ تو غائب ہو گئی مگر غصہ نہیں ابھرا۔
”میں سے انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔“
”سچ بتائیے دلی کیوں جارہے ہیں؟“
”سچ تو نہ بتاؤں گا۔ پر یا راز ہے مگر تعزیراً ہیں جارہا۔ بہت ضروری کام ہے۔ بس گیا اور آیا۔“
”پھر آخر یہ تار کا ٹانگہ رچانے کی کیا ضرورت تھی؟“
”مختصر کے در سے۔ آخر تم کب یقین کر دو گی کہ ہادی خاطر تار تو کیا چیز ہے آسمان کے تارے بھی ڈر کر کھلا سکتا ہوں۔ مانی دیری دیری مہی مون ارنگ۔“

اس نے تضحیک کے طور پر بخلا ہونٹ آگے کو بڑھایا۔
”ساتھ ساتھ میری ہلا۔ پھر دلی کے سے انداز میں بولی۔“
”آپ جانیں آپ کا خدا جانے۔ بھلا کونسی گاڑی سے جائیں گے؟“

”یہی گیارہ والی سے۔ ابھی ساڑھے نو بجے ہیں۔“
”کھانا کھا کر جائیں گے یا ساتھ لے جائیں گے؟“
”مٹاؤ بھی۔ راستے میں چائے پانی کر لیا جائے گا۔ بھی تو بھوک نہیں ہے۔“

”جب میں مر جاؤں تو یہ بھی کر لیجئے گا۔ بڑی چائے بھی ہے اسٹیشن پر۔ سپر بیٹے اور بیٹی کا کھولیں۔“
”یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی اور پھر دلی کا سفر میں نے ناشتہ دان ہی کے ساتھ کیا تھا۔ چائے سے بھرنا تھرا میں بھی عطا ہوا تھا۔“

”میرے دلی والے سٹنٹ بزرگ کا اصلی نام جو کچھ بھی ہو آپ نعیم فرض کر لیجئے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر میں نے حاضری کا مقصد بیان کیا تو فرمایا:-
”کھڑکپور کے ارجنٹ میں میں ہزار خرچ آئے تھے۔ اب اسی کام پر ستر ہزار سے کم صرف نہ ہوں گے۔“
”خرچ کی پروا مت کیجئے۔ سیٹ اپ ایسا ہونا چاہیے کہ دنیا رنگ رہ جائے۔“

”اگر سرمایہ وافر ہے تو جو چاہو ہو جائے گا۔ دو تین معتقدین کے لئے محدود پیمانے پر ایک جنت بھی بن سکتی ہے۔“
”پھر تو مر آجائے گا۔ صوفی شعبان بھی چاہتے ہیں کہ ان کی درگاہ مرجع غلائق بن جائے۔ ڈیڑھ دو لاکھ تک خرچ کرنے کو تیار ہیں۔“

”کیا نام ہے درگاہ کا؟“ انھوں نے سوال کیا۔
”درگاہ پلپی شاہ۔ دراصل نام تو مرحوم شاہ صاحب کا معشوق علی تھا مگر عالم جذب میں بھی کبھی شاعری کرتے تو تخلص پلپی لگاتے۔ بس یہی تخلص شہرت پایا۔ نام تو کم ہی لوگوں کو یاد ہے۔“

”کتنی پرانی ہے؟“
”مغلیہ دور سے چلی آرہی ہے۔ آپ دیکھ ہی جائیں گے فرمائیے کب چل رہے ہیں؟“
”ختم بھولے نہ ہو گئے کہ اٹھواں کے بغیر ہم کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔“

”یقیناً نہ ڈالنا چاہیے۔ میں پہلے ہی طے کر چکا ہوں صوفی شعبان مجھ سے قبل دلی آچکے ہیں انھیں جلد آپ کی خدمت میں لاؤں گا۔“

پھر میں صوفی صاحب کی تلاش میں نکلا۔ انھوں نے شاہ نظام الدین کا بتادیا تھا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ چلی قبر کی طرف کہیں قوالی میں گئے ہوئے ہیں۔ میں پرچہ لکھ کر چھوڑ آیا کہ عشاء کی نماز جامع مسجد میں پڑھئے۔ ابھی رات دور تھی۔ میں نے سوچا میں ان چھٹن سے مل آؤں۔ یہ مولوی رکاب الدین مرحوم کے بڑے لڑکے ہیں بمشکل بس پکڑی

”دہاں بھلا کیا کرنا ہے؟“
 ”تم کیا سمجھتے ہو وہ کوئی معمولی ہستی تھے؟“
 ”میری معلومات ان کے بارے میں ناقص ہیں
 سکتا ہے وہ قطب العالم رہے ہوں مگر ہمارے مسائل
 و پیچیدہ ان کے بس میں کیسے آجائیں گے۔“

”خیر یہ تو نہ کہو۔ خواجہ طوفان کے بڑے صاحب
 میاں ارمان نے میونسپلٹی کا پانچ ہزار روپے خرچ کر لیا تھا
 چلا۔ ثبوت سارے خلاف تھے۔ ایک مجذوب نے اٹھ
 تلقین کی کہ درگاہ ہرے بھرے شاہ میں جاؤ وہیں تم
 دلی مراد ملے گی۔ بس وہ بھاگے آئے تھے۔ پھر مقد
 حیرت گئے۔ کوئی ان کا بال بھی ہیکانہ نہ کر سکا۔“

”باشا اللہ۔ بلکہ عاشا کلا۔ گمرائی ڈیرہ صوفی
 یا آئیے نہ فہن کیا نہ ڈاکہ ڈالانہ ہمیں چاند سا بیٹھا جا۔
 بھلا درگاہ ہرے بھرے شاہ میں کیا مانگیں گے۔“

”تم تو منطقیں چھٹھتے ہو۔ دراصل ہمارے ہم
 بدر الدجی صاحب کی ایک بیوہ چھپی ہیں وہ ایک
 معاملہ میں آج کل پریشان ہیں۔ انھوں نے بڑے ام
 سے ہم سے کہا تھا کہ دہلی جا رہے ہیں تو ہرے بھرے شا
 ہن کا اسلام عرض کر کے مدد کی درخواست پیش کر دیجئے
 ہم نے وعدہ کر لیا تھا۔“

”تب تو مجبوری ہے۔ چلیے۔“
 ہم نے رکشا کی۔ چند منٹ بعد ایک سینما کے آگ
 گذر رہے تھے کہ صوفی صاحب نے میرا شانہ دبایا اور
 آواز میں بولے:-

”میاں وہ تو دیکھو۔“

میں نے پہلے ان کی طرف دیکھا پھر ان کی نفل
 تعاقب کرتے ہوئے سینما ہاؤس کے بورڈ پر نظر ڈالی
 جلی حروف میں لکھا تھا۔

”قوالی باز حسینہ“

نیچے ایک مصرعہ بھی دیا تھا۔

”ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا“

اور بارہ ٹوٹی کے بس اسٹینڈ پر اترا۔ اسٹینڈ سے ایک لنگ
 پیدل چلنا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں سامنے کچھ ہاؤس تے ہجوم
 برآمد ہو رہا ہے۔ یقیناً شو ختم ہوا ہو گا۔ ہجوم میں صوفی
 شعبان بھی نظر آئے۔ مجھے حیرت ہوئی مگر فلم کے بورڈوں
 پر نظر پڑی تو حیرت دور ہو گئی۔ ”قوالی کی رات“ نامی فلم
 چل رہی تھی۔

جب ان کے پہلو میں پہنچ کر میں نے دفعتاً سلام کیا تو
 اچھل پڑے۔ چہرے پر کچھ حقیقت کے سے آثار بھی ابھرنے
 لگے خیر یہ منٹ کے تبادلہ خیال کے بعد یہ عارضی کیفیات
 ختم ہو گئیں۔ قریبی ہوٹل میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔

”سچی بات ہے نام دیکھ کر ہم سے نہیں رہا گیا ورنہ
 تم جانتے ہی ہو سینما پر ہم لعنت بھیجتے ہیں۔“ انھوں نے
 چہلے ہوئے لہجے میں معذرت فرمائی تھی۔

”کیسی رہی فلم؟“ میں نے پوچھا۔
 ”فلم دلہنم کچھ نہیں جانتے۔ قوالیوں میں مزا آگیا۔
 سبحان اللہ یہ فلم دالے بھی کیسے کیسے طرز نکالتے ہیں بس
 سنے جاؤ سر دھننے جاؤ۔“

”ہیر وین کیسی تھی؟“
 ”چھوڑو میاں۔ اجنبی عورتوں کی طرف ہم توجہ نہیں
 کرتے۔ کئی عورتیں کام کر رہی تھیں پتا نہیں کونسی ہیر وین
 ہو گی۔“

”خیر نعيم صاحب سے میں بات کر لی ہے۔ وہی جنگی
 خدمات حاصل کر لی ہیں۔“

”جنگ جگ جیو۔ کیا بات رہی؟“
 بس کا بانا بایا سمجھے۔ البتہ آخر اجات اندازے
 سے کچھ زیادہ بھی ہو سکے ہیں۔“

”دیکھا جائے گا۔ کب ملو اورے ہو نعيم صاحب؟“
 ”عشاء بعد آدھری چلیں گے۔ اب کچھ دیر گھوم پھر
 لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔“

”کیوں خواہ خواہ وقت خراب کرتے ہو۔ اس سے
 تو اچھا ہے ہرے بھرے شاہ کے مزار پر ہو آئیں۔“

ملتی ہے۔ تم نہیں سمجھتے عبادات کا مقصد روح کو نازہ کرنا ہے۔ تم خود ایک بار کہہ رہے تھے کہ — بھلا وہ کیا نام لیا تھا جس کی قوالی سنکر تمہیں ایک جہینے تک پہنچے خواب آتے رہے تھے؟“

”میں قمر جاں۔ مگر وہ تو شاہ چین علی کی مرید تھی کہاں وہ کہاں یہ فلموں کی دیادار عورتیں۔“

”خیر یہ تو نہ کہو۔ ہم نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ایکٹر سبیں اولیاء کو بہت مانتی ہیں۔ مزاروں پر حادریں بھی چڑھاتی ہیں۔ یہ تو خدہ کی دین ہے میاں آگ کو ٹکڑا بنا دے۔ اب دیر نہ کرو فلم شروع ہونے والی ہو گئی۔ انھوں نے مجھے سنیا کی طرف گھسیٹا۔“

”کم سے کم یہ تو دیکھنے صرف بالوں کے لئے! — میں نے قدم جما لئے۔ غنیمت ہے ہم فٹ پاتھ کے قریب ہی تھے ورنہ کچلے گئے ہوتے۔ ایک اسکوٹر کان کے پردے پھاڑتا بال برابر فاصلے سے گذر اٹھا۔“

”وہ تو دیکھ لیا۔ ہم کم کیا نابالغ ہیں۔ کیوں دیر کر رہے ہو۔“

”مجھے تو بالکل موڈ نہیں ہے۔ اتنا ہی ضروری ہے تو کل دیکھ لیجئے گا۔“

”کیا خبر کل کون جیہ کون مرے۔ آج کل تم دیکھ ہی رہے ہو ہارٹ فیل چٹا پٹ ہو رہے ہیں۔“

”اور ہم لوگ اگر قوالی باز حسینہ دیکھے بغیر مر گئے تو شاید ہمیشہ جنم میں جلنا پڑے گا۔“ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوالیہ انداز میں کہا۔

”اب یہ وقت مسئلے بگھانے کا تو ہے نہیں“ وہ اونٹ گئے ”ٹکٹ تو ہم ہی خریدیں گے تم کون مرے جاتے ہو۔“

”مجھے ننگی عورتیں بالکل پسند نہیں۔ انہیں دیکھ کر کچے گوشت کا تصور آتا ہے۔ اُبکائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔“

”لاواں ولا قوۃ۔ اب ننگی عورتیں گھسیٹ لائے۔“

مصرعہ کے نیچے یہ الفاظ تھے۔

”سچا سواں ہفتہ۔ صرف بالوں کے لئے۔“

”کیا خیال ہے۔“ صوفی صاحب بولے ”آؤ دیکھ

دلیں۔“

”کمال کرتے ہیں۔ کیا ہرے بھرے شاہ نہیں جانا۔“

”پھر دیکھی جائے گی۔“

”جی نہیں۔ رات کو نعیم صاحب سے معاملات طے کر کے صبح گھر لوٹ جانا ہے۔“

”ارے وہ بھی سوچ لیں گے۔ اے رکشا والے

بابو۔ ٹھیرالو۔“

رکشا کو کہہ کر یہ ادا کر کے رخصت کیا گیا۔

”آپ تنہا دیکھ آئیے۔ میں دس بجے جامع مسجد کے

مشرقی دروازے پر مل جاؤں گا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے“ وہ میرا بازو دوپچے ہوئے

تھے فضول کی باتیں نہ کیا کرو۔“

”نہیں صوفی صاحب۔ طہنجی باز حسینہ۔ مکہ باز

حسینہ۔ چال باز حسینہ۔ یہ سب دیکھی جاسکتی ہیں مگر قوالی

باز حسینہ میرے بس کا روگ نہیں۔“

”یاد رہا بیت مت پھیلاؤ۔ یہ پھیل ہماری طرف

تو آیا نہیں۔“

”نہ آیا ہو گا۔ میں سوچ رہا ہوں نماز عصر آپ نے

شاید قوالی کی رات میں پڑھی ہو۔ اب مغرب قریب ہے۔“

ان کی بھوسیں تن گئیں۔ جھلا کر بولے ”ہاں ہاں تم تو

مفتیوں کے با آدام ہو۔ عقل سے کام لیا کرو۔ یہ سفر

ہے عصر اور مغرب غبار کے ساتھ پڑھ لیں گے۔“

”اس کی بھی کیا کارنٹی ہے۔ فرض کیجئے قوالی باز

حسینہ سے تاریخ ہو کر کسی اور سنیا پر قوالی باز عاشق کا

پورہ نظر آگیا تو آپ کہیں گے کہ آؤ اسے بھی لگے ہاتھوں

دیکھتے ہیں۔“

”مگر کہ نہیں ہیں گے تھارے مہر کی قسم۔ مار

خوب مرے دیکھنا یہ کہ قوالی سے طرح تو پڑی تارنی

کون مردود ان کا ذکر کر رہا ہے۔“

”یہ فقرہ مردود۔ صرف بالغوں کے لئے۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی تھیٹر تو ہے نہیں کہ سچ جج کے مرد عورت دیکھنے پڑیں گے۔ فلم میں تو پرچھائیاں ہوتی ہیں۔ کسی بھی مفتی سے پوچھ لو پرچھائیوں کا اور اصل کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایسا تو نہیں کہ تم دیوبند والے اشرف علی یا جماعت اسلامی والے مودودی کے حکم میں آگے ہو۔ ایسا ہوا تو کبڑا ہو جائے گا۔ منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں پھینکا جاتا ہے۔“

”میں سو فی صدی آپ کا ہم شرب ہوں مگر میرا خیال ہے ہمیں دن کا بارہ سے تین والا شو دیکھنا چاہیے۔ کوئی نماز تو قضا نہیں ہوگی۔“

”چلو کل وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ایک اخبار میں نظر پڑا تھا کہیں خواجہ بندہ نواز بھی چل رہی ہے۔“

”وہ بھی نہیں صرف وہی دیکھیں گے۔ کل لازماً گھر لوٹ چلنا ہے۔“

”بڑے گھر پر لڈو بیٹ رہے ہیں“ وہ رہ رہ کر جھپٹا رہے تھے۔ روز روز کہیں دلی آنا ہوتا ہے۔ آدمی کو وقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

”آپ آدمی ہیں اس لئے ضرور اٹھائیں۔ میں ڈارون کے نظریہ تخلیق کا قائل ہوں لہذا آدمی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اب بکو اس ہی کرے جاوے۔ اتنا وقت گزرا۔ کھیل یقیناً شروع ہو گیا ہو گا۔“

”بس تو ادھر اور کیا دیکھنا۔ آپ یقین کریں میری بھی ایک پھوپھی زاد خالہ ہیں ان کے اولاد نہیں ہوتی۔ چلتے چلتے انھوں نے قسم دلائی تھی شاہ نظام الدین میں ضرور جانا اور عرض کرنا کہ اولاد کے لئے حق تعالیٰ سے سفارش فرمائیں میں ادھر ہواؤں آپ ہرے بھرے شاہ ہواؤں۔“

”شاہ نظام الدین میں اب کچھ نہیں رکھا۔ جب سے رہا تبلیغی جماعت والوں نے دیرہ جمایا ہے شاہ صاحب نے

مسکن ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”اوہو۔۔۔ کھلا کہاں چلے گئے ہوں گے۔“

”یہ اہل اللہ کے راز ہیں۔ ناجحرم کے آگے بیان کئے جائیں تو زبان جل جائے گی۔ حلق میں پھلے پڑ جائیں گے۔ باتوں میں سات بج گئے۔ اب دوبارہ کرنا کی گئی۔“

نعیم صاحب فی الحال دھنرارا یادو انس پر راضی ہو گئے تھے۔ معاملہ یہ طے پایا کہ تین دن بعد وہ درجہ پلسی کا تفصیلی جائزہ لینے نہیں گئے۔ ان کے قیام کا انتظام کسی اچھے ہوٹل میں کر دیا جائے۔

اگلی صبح ان سے رخصت ہو کر ہم نے متعدد مزارات پر حاضری دی۔ میری حیثیت تو تابع مہل کی تھی قیادت کا فریضہ صوفی صاحب ہی انجام دے رہے تھے۔ مزارات سے مجھ کو نصیب کو تو کیا فیض ملتا البتہ موصوف نے بتایا کہ انھیں بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ میں نے بہت کچھ کی وضاحت چاہی تو ارشاد فرمایا۔

”تم کیا سمجھ سکو گے۔ دراصل ہم نقش بندی نسبت کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمیںوں سے غضب یہ ہو رہا تھا کہ سہروردی اور حنپتی سلاسل کے کچھ لطائف بیچ میں حاصل ہو رہے تھے۔ ہمیں بڑی پریشانی تھی۔“

”ایسا کیوں ہو رہا تھا؟“ میں نے اپنی معلومات میں اضافہ چاہا۔

”ہمارے پڑوس میں ایک مودودیہ آ رہا ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی جاتے ہیں طریقت کے سلاسل میں گڑ بڑیں شروع ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کے سروں پر شیطان کا سایہ ہوتا ہے۔“

”بڑے مردود لوگ ہیں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے پڑوس میں جو ڈاکٹر منورہ رہے ہیں وہ بھی نفہیم القدر آن پڑھتے پڑھتے مودودیہ سے ہو گئے ہیں۔ شاید اسی لئے میرا دل قوالی سے اُچاٹ ہو گیا ہے۔ خواب بھی ڈھنگ کے نہیں آتے۔ ابھی پچھلے ہفتے بڑا شاندار خواب

دیکھ رہا تھا کہ ہوا میں اڑا جا رہا ہوں۔ کئی بہشتی عورتیں بھی ساتھ ساتھ اڑ رہی ہیں۔ بس دفعتاً ایک جال سا کسی نے پھینکا اور میں اس میں الجھ کر زمین پر آ رہا۔ کیا دیکھتا ہوں جال کی رستی ڈاکٹر تنویر کے ہاتھ میں اور وہ اپنے صاحب زادے کو آواز نہیں دے رہے ہیں کہ جلدی سے پھری لاؤ ایک مرغابی ہاتھ آئی ہے۔“

”بڑا فقہان پہنچا ہے ان کم بختوں نے۔ بہر حال ہمارے کل تو حل ہو گئی۔ سبحان اللہ کیسا اولیاء پڑا ہے دلی میں۔ فیوض و برکات کے چشمے جاری ہیں۔ تم نے کچھ محسوس کیا؟“

”جی ہاں کیوں نہیں۔ سبھی مزارات سے نور ہی نور پھوٹا نظر آیا تھا۔ بس یوں جی چاہا ہاتھ کا فرمان ہو جاؤ۔“

”مگر تم کسی بھی مزار کے قریب تو پہنچے نہیں۔ دور ہی دور سے کیا خاک محسوس کیا ہو گا۔“

”کمال کہتے ہیں آپ۔ قریب جاتا تو فروغ تجلی سے جل نہ جاتا۔ مجھے تو تعجب آتا ہے آپ پر کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔“

”مرشد رضی اللہ عنہ کا فیضان ہے۔ وہ تو تجلی کا تار پکڑ لیا کرتے تھے۔ لوگ کی راہ میں سب سے مشکل مرحلہ تجلیات ذات کا ہوتا ہے۔ بس یوں سمجھو جیسے آگ کے دریا سے گزرنا۔ مگر مرشد رضی اللہ عنہ اس سے نہ جانے کتنی باہمت گذر گئے۔ بدن پر جھالا تک نہیں پڑا۔“

”کیا آپ بھی گذرے ہیں؟“

”کیوں نہیں دو مرتبہ گذرے۔ ایک مرتبہ تو بدن پر پت اچھل آیا تھا۔ دوسری مرتبہ بال بھی بیٹکا نہیں ہوا۔ اب تو اصلی بھی نہیں ملتا۔ کجخت کو کو جم نے باطنی صلاحیتوں پر بہت بڑا اثر ڈال دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب گاؤں کا ماضی بھی ہمارے یہاں بہ افراط آیا کرتا تھا۔ دل روشن۔ دماغ روشن۔ وظائف میں بڑا اثر تھا۔ اب تو کو کو جم بھی نہیں مل رہا۔“

”یار ہاں وہ ڈیو والے محمد حسن سے تو تمھاری صاحب سلامت ہے۔ ایک دو تین ڈال ڈال کے دو آؤ نا۔“

”آپ ٹین کہہ رہے ہیں۔ میں نے فقط ایک کلو کے لئے کہا تھا جواب ملا کہ ڈال ڈالو ہے نہیں جھاڑو مار کر بناسنی مل سکے گا۔ ایک کلو کے لئے پندرہ روپے بھجوادو میں نے بھجوادیتے تھے۔ دو دن بعد بالکل گھر میں صیسی ایک چیز آئی جس سے مدبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کیا تھا کہ بھائی محمد حسن یہ بھی ہے یا چربی اور گھر کا ملفوفہ۔ جواب ملا تھا کہ چھوٹے بھائی۔ اسے بھی غنیمت ہی سمجھو۔ آگے کو یہ بھی شاید ہی ملے۔“

”بے حد خطرناک زمانہ آگیا ہے۔ ہم نے تو کئی سال پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہابیوں کی روش سے اولیاء اللہ بہت ناراض ہونے جا رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ ہر طرف تباہی نازل ہو گی۔ دیکھ لو کیسا ہے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ آٹا غائب۔ سمٹ غائب۔ گھی غائب۔ صابن غائب۔ حد ہے میاں زعفران غائب۔ تعویذ با داجی رنگ سے لکھے پڑ رہے ہیں۔ پچھلے پہلے ایک آصیب کے علاج میں گول مرچوں کی ضرورت تھی۔ بجائے گول مرچوں کے نہ جانے کس خب کے بیج ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آصیب الٹا ہم پر چڑھ بیٹھا۔ وہ تو ہم مرشد رضی اللہ عنہ کی توجہ سے کام نکال لے گئے ورنہ ہو گیا تھا فقہہ تمام۔“

”آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے پیر صاحب بعد مردن بھی آپ کے کام آ رہے ہیں۔ میرے مرشد علیہ الرحمۃ تو ایسے دنیا سے گئے کہ بقول شاعر خط بھی نہ بھیجی اسباب کا۔ خواب تک میں نظر نہیں آتے۔“

”ایک سو ایک بار دعا سے سچ العرش پڑھ کر مراقبہ کرو۔ سوارو پے کے تباہی زکوٰۃ میں بانٹ دینا۔ یقین ہے کہ مرشد کی روح میر فتوح سے رابطہ قائم ہو گا۔“

کافی دیر ہم مسائلِ فقہیہ پر اسی طرح ایمان افروز باتیں کرتے رہے۔ اب واپسی کا پیر و گرام بننا تھا کہ صوفی صاحب نے کہا:-

”آج ہی یوں لوٹیں۔ کل تم نے تو لی باز حسینہ

نہیں دیکھنے دی۔ آج تو کوئی غدر حال نہیں۔ دواور بھی

دیکھنے کے قابل چل رہے ہیں۔“

”یہ دلی ہے۔ یہاں سیکڑوں سینما ہال ہوں گے۔ چکر آئے چلایا تو پہنچے بھر بھی واپسی نہ ہو سکے گی۔“
 ”نعت ہے اور کھیلوں پر تم تو جانتے ہی ہو نیما کا شوق نہیں البتہ روحانی کھیلوں کی بات ہے۔ یا تم نے کچھ حاصل بھی کیا ہے اپنے مرشد رضی نہ سے یا بس پونہ ہی طرفیت کا نام بڑا نام کر رہے ہو۔“
 ”میرے مرشد خدا بخشے سینما نہیں دیکھتے تھے۔ ذل تھا کہ جب گوشت پوست کے پیکر سے بہتر ہیں تو برجھائیاں کیوں دیکھی جائیں۔ وہ کبھی کبھی بر قوالی اور تلاوت قرآن سن لیا کرتے تھے بس۔“
 ”وہ تو خیر ہم بھی سن لیتے ہیں مگر ہمارے مرشد شیعہ کا قول تھا کہ اہل سنت والجماعت کو خداوں کے معاملہ میں تنگ دل نہیں ہونا چاہیئے۔ درحسن اور زعفر سب خدا کی نعمتیں ہیں۔ یا رفصول ہ جلاؤ۔ ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔ کریم ہوٹل میں لٹائے لیتے ہیں۔ بارہ سے تین تک قوالی باز حسینہ ہجے۔ ساڑھے تین سے ساڑھے چھ تک خواجہ نیاز۔ پھر کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر حبت کی کلی میں ہیں گے۔“

”حبت کی کلی۔ یہ نام میں نے آج تک نہیں سنا۔“

”اخبار دیکھ لو۔ ریگل میں چل رہی ہے۔ اور سنو ماہیرون مس فرد سید کو ہم نے عیشیم خود پیران کلیر میں دیکھا تھا۔ بہت خوش عقیدہ ہے۔ درگاہ کے باد ہزار دیتے تھے۔“

”بھروسہ تو فلم کا نام لنگر باز حسینہ پر ناچا ہے۔ یا صبا اگر ہم اسی طرح وقت ضائع کرتے پھرتے تو جئے آپ کی درگاہ کا بیڑا غرق ہو جائیگا۔ نعیم ب کی ہدایات کے مطابق ہمیں وہاں ان کے پہنچنے پر بہت کچھ کرنا ہے۔“

”وہ سب ہم پر چھوڑ دو۔ کل صبح پہلی گاڑی سے

نکل جائیں گے۔“

میں نے عاجز آکر ایک طویل سانس لیا۔
 ”اچھا۔ آپ نے تہیہ ہی کر لیا ہے تو پھر پروگرام یوں رکھئے۔ پہلے قوالی باز حسینہ۔ پھر دو جاسوسی فلمیں۔“
 ”استغفر اللہ۔ تمھاری آوارہ مزاجی تو جوں کی توں ہے سوچو ذرا غلط سلط فلمیں دیکھنے سے قلب ناریک ہو جاتا ہے۔“

”روشن ہی رہ کر کیا تیرا رہے گا۔ دیکھ لیجئے آپ کا تو روشن ہے مگر درگاہ میں آؤ تو لٹنے لگاتے۔“
 ”آزمائیں تو قدرت کی طرف سے پیش آتی ہی ہیں خواہ مخواہ کی بحثیں نہ نکالو۔ اچھایوں یہی۔ ایک جاسوسی دور و حالی۔“

”یوں کیوں نہ کیجئے۔ آپ روحانی دیکھ آئیں میں ذرا قطب کی لاٹ وغیرہ دیکھ آؤں۔ مدت ہو گئی ان تاریخی یادگاروں کی زیارت کئے۔“

”ہرگز نہیں۔ پردیس کا معاملہ ہے ساتھ جنیں گے ساتھ میں گے۔ بس اٹھو پونے گیارہ ہو گئے۔“

کریم ہوٹل میں بیس روپے کچاس پیسے کا کھانا کھا کر ہم اسکوٹر اسٹینڈ کی طرف چلے۔ دفعتاً کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے صوفی شعبان کے بھانجے میاں ادریس چلے آ رہے ہیں۔

”ہائیں یہ کہاں“ صوفی صاحب کے منہ سے نکلا۔ میاں ادریس ہماری طرف جھپٹے اور سلام کے بعد کہنے لگے۔
 ”مامیوں جان میں تو آپ ہی کو بلانے دلی آیا ہوں۔“
 ”خیریت تو ہے۔“ صوفی صاحب کے ہمیں ہونی سی

آواز میں پوچھا۔
 ”نکل شام مشتری آیا آگئی ہیں۔ وہ سر ہو گئیں کہ دلی سے آپ کو ڈھونڈ کے لاؤں وہ زیادہ نہیں ٹھیر گئی۔“
 میں نے محسوس کیا صوفی صاحب دفعتاً کھل اٹھے۔

سہم کی جگہ طمانیت نے لے لی۔
 ”اچھا کیا تم نے آگئے ورنہ آج ہماری واپسی ہوتی۔“

”کیا معاملہ ہے سال میں ایک دو بار ضرور آتی ہیں، حالانکہ براہ راست رشتہ داری آپ کی الطاف صاحب سے ہے نہ کہ ان سے۔“

”ارے کیا پوچھتے ہو۔ قدرت نے مجبور کر دیا ہے۔ دراصل چار سال ہوئے ان کے دال صاحب پر اسٹینٹنگ اور رشوت ستانی وغیرہ کے کئی مقدمات چل رہے تھے۔ کسی صاحب باطن کے مشورے پر وہ ہماری درگاہ میں آئیں اور مرزا شریف پر ایک منت مانی۔ چند ہی مہینوں میں سارے مقدمے ختم ہو گئے۔ اسی منت کے سلسلہ میں سال میں دو بار وہ حاضری پر مجبور ہیں۔“

”بھلا کیا منت تھی؟“

”پڑھتے ہیں درگاہ کے لنگر سے بریانی کی تین بیگیاں اور دانا۔ قل کی برجی میں صلوٰۃ غوثیہ پڑھ کر تہذیب البھوک ہزار تسبیحیں۔ مبارک بیج درے میں رات بھر کی توالی۔“

”کمال ہے۔ اس طرح کی منت کا شعور بھلا میٹرک پاس سنہ الطاف کو کیسے ہوا؟“

”ارے ہم مر گئے تھے کیا۔ ہم نے ہی انھیں یہ سب تعلیم دی تھی۔ واقعہ یہ ہے ملا بھائی یہ تینوں چیزیں بڑی مجرب ہیں۔ اب تک تو کسی کو بھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا انہیں پڑا۔ جو مانگو سو ملے۔“

”لیکن قل کی برجی میں صلوٰۃ غوثیہ اور تسبیحیں وغیرہ وہ کیسے پڑھتی ہوں گی۔“

”انھیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی جگہ ہم نے حافظ نذر حسین اور قاری شمشیر وغیرہ کا انتظام کر دیا ہے معمولی معاوضے پر۔ توالی کا انتظام بھی ہم سب کر رہے ہیں۔ ان کے لئے یہ بھی پابندی نہیں کہ رات بھر تھیں۔ بس بارہ بجے تک سے کام چل جاتا ہے۔“

”تو ان کی آمد کا وقت پہلے سے آپ کے علم میں ہوتا ہو گا۔“

”ہاں وہ تو ڈائری میں نوٹ ہے۔ اب کی قصہ یہ ہوا کہ عین وقت پر انھیں کوئی مجبوری پیش آگئی۔ ہم لکھا کہ

ایسا کر تم ڈھائی بجے اسٹیشن پہنچ جانا۔ تین دالی سے چلیں گے۔ ہم بھی وہیں پہنچ رہے ہیں۔“

چند منٹ بعد ہم پھر ایک ہوٹل میں بیٹھ جائے پی رہے تھے۔ صوفی صاحب کی باقیہیں انگریزی کلاب کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔

”اوہ۔ ہم سے غلطی ہو گئی، وہ اچانک بولے بس بھی تو جاتی رہتی ہیں۔ ریل کے چکر میں خواہ خواہ اسے ٹھٹھے صنایع ہوں گے۔“

”ابھی تو کچھ نہیں بگڑا۔ چلیے بس اسٹیشن چلیں۔“

”اب کیسے چلیں۔ ادریس دیاں ریل پر سارا انتظار کر رہے نہ پہنچے تو پھر دلی بھر میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔“

جائے کے دوران میں نے اندازہ کیا کہ وہ کسی خاص خیال کی دنیا میں گم ہیں۔ غالباً مشتری آ پا کا سہرا یا چشم تصور کے سامنے جلوے دکھارہا ہو گا۔ ”آ یا“ وہ یقیناً تھیر مگر ادریس میاں کی نسبت سے در نہ عمر بچپن سے زیادہ رہی ہو گی۔ میں خود ان کی خیالی تصویر کو اپنے حافظے کی لوح پر ابھرتا محسوس کر رہا تھا۔ کیا شاندار باڈی ہے۔ کیا تروتازہ چہرہ ہے۔ مسکرائیں تو جیسے کلی کھلے۔ بولیں تو جیسے غنچہ چٹکے۔ ان کے شوہر الطاف حسین لطیف آباد میں ملازم ہیں۔ صوفی شعبان سے کچھ سسرالی رشتہ ہے۔ کئی بار میاں بیوی دونوں ساتھ آئے۔ پردہ ان کے یہاں ہے نہیں۔ میری سلام دعا صوفی شعبان ہی کے گھر ہوئی۔ ایک دو بار سنہ الطاف یعنی ”مشتری آ پا“ بغیر شوہر کے بھی آتی ہیں۔ چھوٹا بھائی ساتھ ہوتا تھا۔ اولاد کوئی نہیں۔ تعلیم میٹرک تک ہے۔ بڑی حیاط چٹاخ قسم کی عورت ہیں۔ ”یہ سنہ الطاف اچانک کیسے وارد ہو گئیں؟“ میں نے پوچھی۔

”یہ سبیل تذکرہ پوچھا۔“

”اچانک نہیں۔ آنا تو انھیں تھا ہی۔ البتہ وقت مقرر نہیں کیا تھا۔“ صوفی صاحب کھوٹے کھوٹے سے انداز میں بولے۔

کیا کیا جائے بروقت حاضری کی کوئی صورت نہیں ہے۔
 سم نے جواب دیا کہ منت کا معاملہ ہے تو بہت سخت لیکن
 آپ کے لئے اتنی رعایت نکال لی گئی ہے کہ معذوری رفع
 ہونے ہی فوراً آجائے گا۔ جتنے دن کی تاخیر ہوگی فی دن
 سو روپیہ کے حساب سے فاتحہ کی زکوٰۃ درگاہ کے ہیٹ
 المال میں جمع کرادیجئے گا۔ انھوں نے جو ابدیہ ٹھیک ہے۔
 ایسا ہی ہوگا۔ یہ بیس دن کی بات ہے۔ اب مجبوری رفع
 ہوئی ہوگی تو فوراً آگئیں۔
 ”غالبا اطفاء حسب ساقہ نہ آئے ہوں۔ ادیس

میاں نے ان کا حوالہ نہیں دیا۔
 ”یہی معلوم ہوتا ہے۔ بڑے دل گردے کی عورت
 ہیں۔ میاں کو بھی خاطر میں نہیں لائیں۔“
 ”مگر آپ کو خاطر میں ضرور لانی ہیں۔ میرا مطلب ہے
 فوراً ادیس میاں کو یہاں دوڑایا۔“
 ”ہم نہ ہوں تو منت کی تکمیل کیسے ہو۔ مگر۔ لائیکائی
 ایک بڑی مصیبت ہے۔ ہم ہی کچھ علاج کرو۔“
 ”فرمائیے۔ ناچنکی تو جان بھی آپ کے لئے حاضر ہے۔“
 ”جب بھی مشتری بیگم آتی ہیں ہماری زوجہ بدبخت
 جان کا وبال بن جاتی ہے۔ حالانکہ کچھ لواطت حسین اسی
 کے رشتہ دار ہیں اور اس لحاظ سے مشتری بیگم بھی اسی کی
 رشتہ دار ہوئیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھی اور
 ہمیں بھی بدبخت بھاڑ کھائے گی۔“
 ”اوہو۔ مگر مشتری بیگم ان کی بد مزاجیاں آخر کیسے
 برداشت کر لیتی ہوں گی۔“

”ان کے منہ پر تھوڑی کچھ کہتی ہے۔ انھیں تو ہم نجلی
 منزل میں ٹھہرا دیتے ہیں۔ وہ اوپر اوپر اونٹنی رہتی ہے۔
 پھر جب ہم اوپر پہنچتے ہیں تو لال پلائی انھیں کر کے چڑھ دوڑتی
 ہے۔“

”کیا شکایت ہے اسے آپ سے؟“

”اپنا سر۔ میاں شکایت کیا ہوتی۔ عورتوں والی جلس
 اور کیا۔ نامراد یہ سمجھتی ہے کہ مشتری بیگم سے ہمارا عشق چل

رہا ہے۔ غضب خدا کا تم خود سوچو۔“
 ”جی ہاں۔ میں نے سوچ لیا۔ میاں اس معاملہ
 میں بہت بہودہ ہوتی ہیں۔ مگر خادم اس سلسلہ میں کس
 طرح کام آسکتا ہے۔“
 ”ہماری زوجہ تمھاری زوجہ کو بہت مانتی ہے۔ اپنی
 زوجہ کو سمجھاؤ کہ وہ ہماری زوجہ کو سمجھائے۔“
 ”ایسا ہی ہوگا۔ مشتری بیگم کو کس قیمت پر ہاتھ سے
 نہیں دینا چاہیے۔ میرا خیال ہے وہ ہمارے منصوبے میں
 اہم پارٹ ادا کر سکیں گی۔“
 ”وہ کیسے؟“ صدنی حسب کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اسکیم میں یہ بھی ہے کہ سرمایہ دار قسم کے اراد مندوں
 کے لئے ایک طسائی قسم کی جنت بنائی جائے۔ جنت میں بہال
 حوریں چاہئیں اور حوریں بیڑوں پر نہیں اگتیں مشتری بیگم
 کا ٹائپ جہاں تک میں سمجھا ہوں ایسا ہی ہے کہ انھیں آپ کے
 ہم مل کر شیشے میں اتار لیں گے۔ کیا خیال ہے؟“
 اللہ اکبر۔ بار کہاں کہاں کی سوچ لیتے ہو۔ قسم ہے
 خداوندو الجلال کی اگر ایسا ہو گیا تو مزاجی آجائے گا۔ مگر
 یا تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔“
 ”آپ کے سر کی قسم مذاق سے کیا مطلب۔ صاف بات
 ہے بندہ تو اس کا قائل ہے کہ آدمی کو کھائے تو ہاتھی کا کھانے۔
 نعیم صاحب سے اس کے متعلق بات ہو چکی ہے۔“
 ”لیکن یہ سمجھ لو مشتری بیگم بھوتی بھالی نہیں ہیں۔
 اڑتی چڑیائے پر گنتی ہیں۔“

”وہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ آپ جیسا شریف آدمی
 انھیں منت کی راہ پر لگائے گا۔“
 ”جانت کی باتیں مت کرو۔ تمھارا گویا یہ مطلب
 ہے کہ۔“

”میرے مطلب کی آپ مطلق پر دامت سمجھتے ہیں
 اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ سمجھوں گا اگر کوئی عورت تو بصورت
 بھی ہوا اور عقل مند بھی۔“
 ”یہ تو تمھاری بکواس ہے مشتری بیگم کو ہم نے ہر اعتبار

چوڑی جگہ بھی آخسر کہیں سے آئے گی۔
 ”جگہ پر لعنت بھیجئے۔ ایک خواہناک اور طلسماتی فضا
 میں جب خوروں کے حسین سپرک طلوع ہوں گے تو دیکھنے والوں کو
 اس کی پڑا ہی کب ہوگی کہ جنت کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔ وہ
 ایک مختصر کر کے کو بھی جنت مان سکتے ہیں اگر عورت کو ان کے
 اعصاب پر سوار کر دیا جائے۔“

”خیر بھئی۔ فلسفے سمجھی سمجھو۔ ہمیں تو بہر حال تم پر اعتماد
 ہے۔ اسکیم خدا کے فضل سے کامیاب ہوگئی تو ہماری درگاہ کا
 نام ساری دنیا میں روشن ہو جائے گا۔ درگاہ ممنونہ میں
 خاک اُڑنے لگی تو سمجھو سب کچھ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے ملا
 بھائی ممنونہ کا سجادہ بڑا فضیلت ہے۔ اصلی معرفت کی تو
 اسے ہوا بھی نہیں لگی۔“

”کیا نام ہے بھلا؟“

”خواجہ محمد رشید۔ خدیث نے اپنے مقدس نام کا بھی
 خانہ خراب کر دیا۔ چھپ چھپ کر شراب پیتا ہے۔ عقیدت
 مندوں کو بہر کار کھا ہے کہ یہ آپ کو تو ہے جسے پی کر روح
 آٹھویں آسمان کی سیر کرتی ہے۔“
 ”آٹھویں؟! میں چونکا۔“

”ارے ہاں یہی توفیق طنت پھیلا رکھی ہے ابلیس نے۔
 کہتا ہے سات آسمان عایموں کے لئے ہیں۔ عارفوں کیلئے
 مولائے آٹھواں آسمان تیار کیا ہے۔“

”آپ پروا نہ کیجئے۔ ہم نواں اور دسواں تیار کر نے
 کی کوشش کریں گے۔ بس رحم کے معاملہ میں دل تنگ نہ کیجئے گا۔“
 ”بالکل نہیں کریں گے۔ ہمارے حلقے میں ایسے ایسے سید ہیں
 کہ ضرورت پڑنے پر تھیلوں کے کچھ کھول سکتے ہیں۔ بمبئی کے ایک
 سید ہیں پیارے بھائی دلا کے بھائی صندوق والا۔ عورتوں کے
 بڑے شائق ہیں۔ دو سال ہوئے اپنے یہاں عرس میں گیندا
 توڑ کی پارٹی کے ساتھ ایک نئی خوش ادا لگی تھی۔ نفیستہ سیکم
 سید بھی آئے ہوئے تھے۔ بس کیا پوچھتے ہو۔ کم سے کم پانچرا
 اڑا کر گئے۔ درگاہ کے حصے میں تو مشکل سے ڈیڑھ ہزار آئے
 ہوں گے باقی سب وہی لے گئی۔ ملا کی حسین تھی۔ اسے

سے عقل زندہ پایا ہے۔“

”آپ ہی نے تو پایا ہے۔ یہ دنیا داری کے چکر تو
 آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ عقل کی ایک ہزار قسمیں ہیں۔ اب
 اُٹھئے بازار سے ایک دو چیزیں لیتے ہوئے اکٹیشن پہنچ
 جائیں گے۔“

پھر اکٹیشن پہنچ کر اور بس میاں سے تصدیق ہوگئی کہ
 ”مشتی آ یا“ اپنے برابر خورد ہی کے ساتھ آئی ہیں الطاف
 صاحب نہیں آئے۔

ریل فراٹے بھر رہی تھی۔ اندر بس میاں ہم دونوں
 سے اتنی دُور تھے کہ ہماری باتیں سننے کا سوال ہی پیدا
 نہیں ہوتا تھا ہند امیں اور صوفی صاحب بلا تکلف راز
 نیاز میں مصروف تھے۔

”ایسا کرنا سیدھے ہمارے ہی یہاں چلے چلنا اس
 میں دُور فائدہ ہوں گے۔“

”یعنی؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک تو میاں ہی کہ تھاری موجودگی میں زوجہ
 بد بخت زیادہ نہیں بھڑکے گی۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ
 بھڑکی بھی ہوگی۔ خدا خیر کرے ڈر لگتا ہے کہ وہ بد زبان
 کسی دن مشتري سیکم ہی سے نہ بھڑ جائے۔“
 ”اور دوسرا؟“ میں نے فائدہ ادا کو مبہم کرتے ہوئے
 پوچھا۔

”وہ جو تم کہہ رہے تھے کہ جنت کے لئے انھیں شیشے
 میں اتارنا ہے تو اس کی بھی شروعات آج ہی سے کر دینا۔
 تمھاری سلام دعا تو پہلے ہی سے ہے۔“

”حق نہر مایا لیکن مانی ڈیرھو فی صاب۔ میری بیوی کو
 جب پتا چلا کہ سفر سے واپسی پر سیدھا گھر پہنچنے کے بجائے
 مشتري سیکم سے اٹھکیلیاں کرنے جا پہنچا ہوں تو کیا اہد ہے
 کہ وہ فرط محبت میں طلاق ہی دے ڈالے۔“

”کیوں خواہ خواہ مذاق کرتے ہو۔ ہمیں تو یقین سا
 نہیں آ رہا ہے کیا داعی مصنوعی جنت بن سکتی ہے۔ اتنی ہی

ہے نا۔“

ابھی اور نہ جانے کیا کہا جاتا کہ صوفی صاحب آخری سیر بھی پر قدم رکھتے ہوئے کھکارے اور فرمایا۔

”خاموش رہو نیک بخت! ملا میاں بھی ساتھ ہیں۔ آؤ بھی آجاؤ۔“ انھوں نے گردن موڑ کر مجھ سے کہا۔ مسر شعبان مجھ سے برائے نام ساٹھ گنٹ کرتی تھیں۔ عمر ساٹھ کے قریب ہوگی۔ صورت تو جوانی میں بھی پورے ہوں ہی جیسی تھی۔ یہ صوفی شعبان کا بیان ہے۔

”آؤ بیٹا۔ اچھا ہوا تم آگے۔ آج فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔“

”ارے آہستہ بولو۔“ صوفی صاحب نے دانت کچلائے۔
”کیوں بولوں آہستہ۔ سنتی ہے تو سنے کلو سی۔ لے بیٹا۔ ذرا کھٹی نصفی کر۔ یہ ان کی عمر ہے کیا ان باتوں کی۔ فرستے بھی جنم میں تھوکتے ہوں گے۔“

”خدا کے لئے چپ بھی ہو جاؤ۔“ صوفی صاحب تقریباً رو دیئے ”جانے تمھارے خیالات اتنے گندے کیوں ہیں۔ ملا میاں تم ہی بناؤ کیا ہم کوئی ایسے ویسے آدمی ہیں“ یہ کہتے ہوئے انھوں نے صوفیائوں سے نظریں بچا کر مجھے بائیں آنکھ ماری تھی۔

”یہ تو واقعہ ہے تائی جان۔ مشتری میگم انھیں باپ کی طرح مانتی ہیں۔ بڑی شریف عورت ہیں۔“

”اے بیٹا شریف عورتیں کہیں اکیلے دیں پر ہوس پھرتی ہیں۔ پندرہ سال کا لوطہ اساتھ ہے کیا خبر بھائی ہے یا کیا بلا ہے۔“

”ایسا مت سوچیے۔ میں خوب واقف ہوں وہ بھائی ہی ہے۔ دراصل ان کے شوہر صاحب بے حد مصروف آدمی ہیں۔ سرکاری ملازمت کا معاملہ ہے۔“ میں بولا۔

”تو ایسی آفت ہی کیا پڑ رہی ہے کہ آندھی جاوے بارش جاوے چلی آرہی ہیں۔ ایسی منت نوح کسی نے سنی ہو۔“ آپ بدگمانی نہ سمجھیے۔ منت کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر پوری نہ کی جائے تو مزار والے بزدل اٹھا لگا

دیکھ کر میری قدرت کا سا شاف نظر آتا تھا۔

”کیا مشتری میگم سے بھی زیادہ حسین تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

”اب یہ بتانا تو مشکل ہے۔ یوں سمجھ لو ہر چلے رازنگ بونے دیگر است۔“ صوفی صاحب کے ہونٹوں پر ہنس اور آنکھوں میں جذبہ افتخار کے آثار جھلکے۔

”خیر تم کی توفی الحال آپ کے پاس بھی ایسی کی نہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اس کے بھروسے پر آپ کام کر رہے ہیں تو سمجھتے بیڑا پار ہے۔“

معارف و لطائف کے ایسے ہی درہائے شہوار لگاتے اور عرفان و اسرار کے موتی رولتے راستہ کھتا چلا جا رہا تھا۔

صوفی صاحب کے مکان کے گرد آؤٹہ فلور میں دو کمرے ہیں۔ ایک میں ہاتھ روم وغیرہ ہے۔ دوسرا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پہلے اس میں مونڈھے بچھے رہتے تھے۔ اب ایک شاندار صوفہ سیٹ اور جدید ڈرائنگ کی گول میز جلوہ طرز ہے۔ یہ تبدیلی مشتری میگم ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

وہ بالکے جامنی سوٹ میں نظر آئیں۔ ہاتھ میں کوئی ناول تھا۔ صوفے پر نیم دراز بڑے انہماک سے مطالعہ نشہ ماری تھیں۔ ہماری آہٹ پا کر چونکیں اور پھر ہسی سلام دعا ہوئی۔

”تم بیٹھو۔ ہم لوگ ذرا اوپر ہو کر آتے ہیں۔“ صوفی صاحب نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے مجھے زینے کی طرف کھینچا۔

امید کے مطابق مسر شعبان یعنی زوجہ آف صوفی دی گریٹ بھری بیٹھی تھیں۔ صوفی صاحب کے قدموں کی آہٹ ہی سے انھوں نے پہچان لیا تھا کہ سیڑھیاں کون چڑھ رہا ہے۔

”ہاں ہاں آتے کیوں نا۔ ریل جری بیٹھی غارت ہو جاتی تب بھی پیدل ہی دوڑے آتے۔ وہ لگی سگی آئی ہوئی

دیتے ہیں۔ اخبار میں تو روزانہ ایسے واقعات آتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں آدمی درخت میں اُلٹے لٹکے دیکھے گئے۔ آنتیں منہ کے راستے باہر آگئیں تھیں۔

”تیرا تو خیر مجھے اعتبار ہے تو جھوٹ نہیں بولتا مگر یہ تیرے تائے دنیا جہان کا جھوٹ بولتے ہیں۔ ذرا بوجھ ان سے باپ دادوں کے اطوار جھوٹ کے ٹوٹھوں کی جگہ ذہنی کرسیاں کیوں لائے۔ عجیب سے بتا دیا کہ سوئے کی آئی ہیں۔ صفحہ کے چما سے پتا چلا کہ چار سو ٹکے گئے ہیں۔ غضب خارا کا۔“

”آپ صفحہ کے چما کا اعتبار نہ کیا کریں۔ وہ صوفی صاحب سے جلتے ہیں گھر میں فساد ڈلوانا چاہا ہے۔ یہ کرسیاں تو اب بھی سو سو روپے کی ملتی ہیں۔

نصف گھنٹے کی سعی بلیغ کے بعد میں نے تائی جان کو یقین دلایا کہ دیکھنا میری سیم اور صوفی صاحب کا ربط باہم خطرے کی حد سے باہر ہے۔ پھر بھی انھوں نے یہ ضرور کہا۔

”خیر جب تک وہ یہاں ہے تم ساتھ لگے رہو۔ یہ تھکائے نہ ہر کی پڑیاہیں میں ان می رگ رگ جانتی ہوں۔ صوفی صاحب کو اوپر ہی چھوڑ کر میں نیچے اتر آیا۔ ان میں ایسی جرات نہیں تھی کہ مجھے میرے ساتھ آئے۔ مشتری سیم نے مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر کتاب کے وزن کا کو نہ موڑا اور میز پر رکھتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھیں۔ ادریس میاں موجود نہیں تھے۔

”اوہو۔ بر خوردار کو کہاں بھیج دیا۔“ میں نے دروازے پر ٹھٹک کر کہا۔

”آئیے تشریف رکھیے۔ وہ شاید باز آگیا ہے۔“

”کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں؟“ دیکھ سکتا ہوں؟

”اے بس یونہی۔ کیا دیکھیں گے آپ ٹھیرے مولوی آدمی۔ میں تو خالی اوقات میں رومانی ناولوں سے دل بہلا لیتی ہوں۔“ ان کے ہونٹوں پر معذرت آمیز ہنس تھا۔ میں نے کتاب اٹھا کر نام دیکھا۔ ”اے عشق کہیں

لے چل۔“ مصنفہ جن سر دھنوی۔

”مصنف تو بڑا نہیں“ میں نے کہا ”اس کے دو چار ناول میں نے بھی پڑھے ہیں۔“

”آپ نے بھی پڑھے ہیں۔“ وہ تھیر آمیز لہجے میں بولیں۔ ”کیوں آپ کو حیرت کیوں ہوتی؟“

”ارے بھلا۔ یعنی“

”جھوٹے۔ زندگی بہر حال کچھ تفریحات جاتی ہے۔ مولوی کا مطلب یہ تو نہیں کہ آدمی نئے کامیڈنگ بن کر رہ جائے۔ کیا خیال ہے؟“

آخری فقرہ ان کے لئے شاید غیر متوقع تھا۔ چونک سی گئیں۔ میں اب بھی ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”میرے شوہر مولوی نہیں ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ سب سے بڑی تفریح پیسہ جمع کرنا ہے۔ ہٹائیے۔ آپ کی رومان نگاروں میں سب سے زیادہ کونسا مصنف پسند ہے؟“

”اب تو کوئی بھی نہیں۔ دراصل میں نے شادی کے بعد سے ناول پڑھنے چھوڑ دیئے۔ میرا خیال ہے رومانی ناول شادی کے بعد نہیں پڑھے جاسکتے۔“

”اوہو۔ بھلا کیوں؟“

”یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔“

”کیا بات ہوئی۔“ وہ ہنس پڑیں۔ میں نے خفت کی ایکٹنگ کی۔

”خیر۔ آپ کبھی لطیف آباد بھی گئے ہیں؟“ انھوں نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”آئیے کبھی۔ بڑی پرفضا جگہ ہے۔ میرا مکان دیکھ کر آپ خوش ہوں گے۔“

”مشکل ہے۔“

”کیا مشکل ہے؟“

”آپ یہاں آکر بھی میرے غریب خانے کو شرف

نہ بخشیں۔ معاف کیجئے گا۔“

”ادھر۔ اس کا موقع ہی کب ہوا۔ جب کہنے چلوں۔ آپ کی بیگم سے مل کر مجھے یقیناً خوشی ہوگی۔ البتہ یہ امید کم ہی ہے کہ انھیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہو۔“
”وہ بڑی گریٹ عورت ہے۔ آپ تانی جہان پر قیاس نہ کریں۔“

”تانی جہان؟“

”محررہ صفویاں صاحبہ کو میں تانی جہان کہتا ہوں۔“
”بڑی دقیانوسی عورت ہیں۔ میرا تو ان کے سامنے نمکے جی گھبرا تا ہے۔“

اسی وقت ادریس میاں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ولس فلیک سگریٹ کے تین پکیٹ تھے۔ مجھے سلام کر کے انھوں نے پکیٹ بہن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”لیجئے بڑی مشکل سے تین ملے ہیں۔ اس پاس کوئی بڑی دکان نہیں۔“

بہن کا حال دیدنی تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔

”مجھے تو کبھی عقل آئے گی ہی نہیں۔“ وہ ادریس پر اُٹ پڑیں۔ ”کوڑ مغز۔ یہ وہ۔“ لہجے بے حد جارحانہ تھا۔ ادریس سہم گیا۔ شاید وہ سمجھا ہی نہیں تھا کہ ”آپاجان“ کیوں آگ بجولا ہوئی ہیں۔ پکیٹ اس نے میز پر رکھ دیئے۔

”بچہ ہے۔ چھوڑ دیجئے۔“ میں نے واضح مشفق کے انداز میں کہا۔

”یہ ڈھینگ کا ڈھینگ بچہ ہے۔ اب مجھ کیا تک رہے ہو جلد بیٹھو۔“

”الحمد للہ میرا ایک بڑا نکر دور ہوا۔“ میں بولا۔
”جی؟“

”میں ڈر رہا تھا کہ آپ میرے یہاں جائیں گی تو میری بیوی کو سگریٹ پیتا دیکھ کر کیا سوچیں گی۔ وہ تو کبھی کبھی حقہ بھی پی لیتی ہے۔“

”کیا نمبر امضہ کا اڈا ہے ہیں۔“ اس نے ناخوشگوار

لہجے میں کہا۔

”استغفر اللہ۔ آپ میری مولویت کا غلط اندازہ نہ لگائیں۔ میں روایتی قدامت پرستی کا قائل نہیں سگریٹ میں پیوں تو میری بیوی کیوں نہ پیئے۔ ولس فلیک اسے بھی پسند ہے۔“

”بات یہ ہے پچھلے سال میرے معدے میں درد ہوا تھا۔“ وہ بولیں ”کئی دن بڑے سخت گذرے۔ کسی علاج سے فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک حکیم صاحب کی دوا سے فائدہ ہوا مگر انھوں نے ہدایت کی تھی کہ حقہ یا سگریٹ پی کر درد نہ مغایرے میں کینسر ہو جائے گا۔“
ان کا لہجہ اگرچہ بڑا رواں تھا مگر ہلکی ہلکی تترساری اس میں اب بھی تھی۔

”حقہ کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ خیر تکلف نہ کیجئے شوق فرمائیے۔“ میں نے پکیٹ اٹھا کر کھول ڈالا۔ انھوں نے پاس رکھے ہوئے نمی پرس سے ایک ٹھکانا لاٹٹر نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے ایک سگریٹ اپنے اور ایک ان کے لئے نکالی۔

”جی آپ سچے میں اس وقت نہیں پیوں گی۔“
”تکلف غیر ضروری ہے۔ غالباً صفوی صاحب سے تو پردہ نہ ہوگا۔“

”ان کو تو علم میں ہے مگر آپ سچے۔ میرا موڈ نہیں ہے۔“
”آپاجان۔ ہم تو لوگ زائر دیکھنے جاتیں گے۔“
دفعاً ادریس میاں نے زبان کھولی۔

”بکو اس ہے۔ کیوں ملا صاحب۔ یہ لوگ زائر کیا بلا ہے میں نے بھی کسی سے سنا تھا۔“

”بلا نہیں۔ وصال کے وقت ان کا قد فقط پانچ فٹ تین انچ تھا۔ دم نکلتے ہی بڑھنا شروع ہوا اور قبر تک پہنچتے پہنچتے لوگ نہ ہو گیا۔ وہ تو خدا مے تدفین میں جلدی کی ورنہ ایک گزنی ٹھنڈ کی رفتار سے بڑھتا جا رہا تھا۔“

”نہیں!“ وہ چونکیں۔ ان کے چہرے پر ذہنت کے

یہ سوس خبر ملی کہ صوفی صاحب کے سینے میں دفعتاً درد ہوا تھا وہ گھر لوٹ گئے ہیں۔

گھر پہنچا تو ایک گہرا م سادہ بیکھا۔ موصوف کے عزیز و اقارب جمع تھے۔ ثانی جان رو رہی تھیں ششتری بیگم کی بھی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ڈاکٹر صوفی صاحب پر جھکے ہوئے تھے اور صوفی صاحب لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑے تھے۔

انجمن دینے کے بعد ایک ڈاکٹر نے صوفی صاحب کے حیرے بھائی محرم علی کو مخاطب کیا۔

”انھیں بڑے ہسپتال لے جائیے گا۔“ پھر دوسرے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے وہ بولے ”خندوا میں لکھے دیتے ہیں صبح تک انھیں استعمال کرائیے۔ کل ہسپتال میں داخل ضرور کرا دیجئے۔“

بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ ہسپتال میں فوراً داخل مخصوص بخشوں کے بغیر آسان نہ تھا۔

ایک گھنٹے بعد انھیں ہوش آیا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ وہ غرطہ ضعف سے فوراً بول تو نہیں سکے تھے لیکن اپنے ارد گرد غوا اردوں کا ہجوم دیکھ کر مطمئن ضرور ہوئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد بولے بھی۔ نصف گھنٹے میں اچھی خاصی توانائی آگئی۔ بتایا کہ اب درد بالکل نہیں ہے بس ہلکی سی گھٹن ہے۔

عشاء کی آذان ہو رہی تھی جب انھوں نے جملہ حاضرین سے نہرایا۔

”آپ لوگ کچھ دیر کے لئے ہمیں تنہا چھوڑیں۔ بس ملا میاں ٹھیرے رہیں۔ کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔“

حاضرین کو برفرتی مراتب حیرت تو ہوئی مگر موقعہ ایسا تھا کہ این و اُن نہ کر سکے۔ چن منٹ بعد کمرہ خالی ہو گیا

”آپ تو جان ہی نکال لی تھی قبلہ و کعبہ“ میں نے بڑے پیار سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”بھلا یہ کیا موقعہ تھا یہاں پرٹنے کا۔ بچاری ششتری بیگم تو صدمے سے نڈھال ہو کر رہ گئی ہیں۔“

کے آثار ابھرے تھے۔ پیکر سیمیں میں شاید تھر تھری بھی آئی تھی۔

”آپ یقین فرمائیں۔ دفن کرنے والوں کی بھی گھٹکیاں بندھ گئی تھیں۔ میرے پیر رحمۃ اللہ علیہ کے دادے پیر رضی اللہ عنہ خود تانہ میں شریک تھے۔ کیا پوچھتی ہیں بڑے بڑے بزرگ ہوئے ہیں ہمارے یہاں۔“

اب صوفی صاحب داخل ہوئے۔ بڑے مشفقانہ انداز میں ششتری بیگم کی مزاج پر بھی کی بھرف پایا کہ درگاہ کی طرف چلا جائے۔ میں نے گھر جانے کی اجازت چاہی تو ششتری بیگم نے ٹوکا۔

”جلدی کیا ہے۔ درگاہ سے چلے جائیے گا۔“

”اب اجازت ہی دیجئے۔ میں شام تک گھر ملو گا۔“

”اپنے گھر تک بلا رہے ہیں؟“

”بس چل کے بیوی سے مشورہ کرتا ہوں۔ غالباً کل دوپہر کے کھانے پر آپ سب کو مدعو کر سکوں گا۔“

دعوت کا مسئلہ میرے اور زوجہ کے درمیان کافی جنگ و جدل کے بعد طے ہو سکا۔ جنگ صرف ذہنی و لسانی تھی

توپ بند و قوت تک نوبت نہیں پہنچی تھی۔ وہ بار بار باورچی خانے کی خانہ ویرانی کا مرتبہ شروع کرتی اور میں فوراً انہماں نوازی اور فیاضی تو توکل جیسے اوصاف حمیدہ کی شان

میں دو غلہ عرض کر کے اسے کنوئیں سے کاٹ دیتا آخر کار جب اسے ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ احساس ہو گیا کہ میرے دلائل قاہرہ کی تاب لانا اس کے بس کا لوگ نہیں تو

ہتھیار ڈال دیئے۔ مگر اس شہ طے کے ساتھ کہ تائی جان یعنی مسز شعبان کو بھی ضرور بلایا جائے گا۔ یہ بہت ہی واپس

بلکہ خطرناک شرط تھی مگر میں اسے رد کر کے اس کی چھٹی

خس کو بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

غھر پڑھ کر خوش خوش درگاہ پہنچا یقین تھا کہ صوفی صاحب مع ششتری بیگم وہیں ہوں گے مگر وہاں پہنچکر

منکشف ہوا کہ چار سو میں آدمی ہے۔ صندوق نکال کر لے جائے گا پھر ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“

”جان سے پیارے بر خوردار مال مٹول مت کرو۔“

”جو کچھ ہمارا ہے وہ سب تمہارا ہے۔“ پھر وہ تکیے کے سہارے نصف اٹھ بیٹھے اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔

”الافتم۔ ہم نے مشنری ٹیم سے تمہاری تعریف کی ہے۔ وہ تمہیں اسے گھر بھی بلائیں گی۔ ہم اگر نہ چاہیں تو تم اکیلے انھیں شیشے میں نہیں اتار سکتے۔“

”آپ نہیں چاہیں گے تو مجھے ضرورت ہی کیا ہو گی

انھیں شیشے یا پتھر میں اتارنے کی۔ میں تو آپ ہی کی درگاہ

کے لئے اس گھیل میں مشرک ہوا ہوں۔“

”وہ تو تمہارا لشکر یہ۔ لیکن یہ تو سرگرم نہیں کہہ سکتے

کہ مشنری ٹیم کے جمال کا کوئی اثر ہی تمہارے جذبات پر نہیں

ہوا۔ آہ۔ جھن سی بھر ہو رہی ہے۔“ وہ ہلکے سے جھٹکے

کے ساتھ سیدھے لیٹ گئے۔ چہرے پر کرب کی ہر نظر آتی تھی

”آپ زیادہ باتیں نہ کیجئے۔“

” وعدہ کرو۔ آج یہ کام ضرور کر ڈالو گے تمہیں ہماری

جان کی قسم۔“ انھوں نے عرض سی آواز میں کہا۔

” اچھا جناب وعدہ۔ آج ہی کوشش کروں گا۔“

” ہزاروں برس جو۔ ہم صبح تمہارا انتظار کریں گے۔“

۔ اب جاؤ اور دوسروں کو یہاں بھیج دو ہمیں دوا پلائیں۔“

میں اندازہ کر رہا تھا کہ ان کا کرب بڑھ رہا ہے۔ دونوں

ہاتھوں سے وہ سینہ دباتے جا رہے تھے۔ میں نے کمرے سے

نکل کر دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے افراد کو دہاں بھجوا دیا اور

خود زینے سے اتر گیا۔ مشنری ٹیم نے سب سے نیچے کھڑی ملیں۔

”کیا حال ہے۔ کیا بات تھی۔“ انھوں نے متاثرانہ

انداز میں اکدم دسوال کئے۔

”کچھ نہیں۔ بعض گھریلو معاملات۔“

”آئیے۔ کمرے میں بیٹھیں گے۔“

”اس وقت معافی چاہوں گا۔ آپ اوپر ہی چلی جائیں

”بات سنو۔ ایک خاص کام ہے جو تمہیں آج ہی رات

میں کرنا ہے۔ اور قریب ہو جاؤ۔ ہوں۔ دیکھو“ انھوں

نے بہت ہی رازداری کے لہجے میں کہا ”درگاہ میں جو برگد

کا پیڑ ہے اس سے جنوب کی طرف چوٹھی قبر کے سر پہنے ایک

لیکچر کا درخت ہے۔ اس کے تنے سے دو گز شمال کی طرف چھوڑ

کر ایک اور قبر ہے۔ اسے کھود ڈالنا۔“

”کھود ڈالوں!“ میں عالمِ تحریر میں بدبویا۔ ان کے

ہونٹوں پر دُور معنی قسم کا تبسم آیا۔

”گھر آؤ نہیں۔ وہاں لاش نہیں نکلے گی۔ لوہے کا چھوٹا

سایا صندوق نکلے گا۔ اسے ہمارے امانت سمجھ کر محفوظ

رکھنا طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد ہم لے لیں گے۔“

”آپ تو حیران کئے دے رہے ہیں۔ آخر قصہ کیا ہے۔“

”اب تو بتانا ہی ہو گا۔ دراصل سال بھر ہو گیا ہے

ہم نے اور ایک اور شخص نے صندوق وہاں گاڑا تھا۔ پھر وہ

شخص افریقہ چلا گیا۔ ایک مہینہ ہوا خبر ملی تھی کہ اس کا انتقال

ہو گیا ہے۔ مگر یہ خبر غلط تھی۔ آج ہی شام میں علم ہوا کہ وہ

زندہ سلامت واپس آگیا ہے۔ اگر ہم اچانک بیمار نہ ہو گئے

ہوتے تو تمہیں تکلیف نہ دیتے۔ تمہارے سوا کوئی بھروسے

کے قابل آدمی نہیں۔ اگر جلد سے جلد تم نے صندوق نہ نکال

لیا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ نکال لے جائے گا۔“

”آخر اس صندوق میں کیا ہے؟“

”تمہیں اس سے کیا بحث۔“

”ہمارا اعتبار نہیں ہے!“

”ہے میاں۔ اچھا سنو۔ اس میں ایک لاکھ کے نوٹ ہیں

اور کچھ زلیورات جن میں قیمتی ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔“

”یا خدا۔ اتنی دولت۔ یعنی کہ۔“

”بس دیکھو عزیزم“ انھوں نے بڑے پیار سے ہر ہاتھ

اپنے سینے سے چپکاتے ہوئے فرمایا ”یعنی یعنی کا بالکل وقت

نہیں ہے۔ ہم بعد میں تمہارے ہر سوال کا جواب دیدیں گے۔

اگر آج ہی یہ کام نہ ہو گیا تو سمجھو ساری دولت گئی۔ اس شخص

پر وقتی طور پر ہم نے اعتماد کر لیا تھا مگر بعد کی تحقیق سے

تو بہتر ہے صوفی صاحب کو پھر کچھ تکلیف شروع ہو گئی ہے۔
”مجھے تو معاملہ ڈیجس نظر آ رہا ہے۔ آپ کی کیا

راے ہے؟“

”خطرہ تو بہر حال ہے ہی۔ بارٹ اٹیک میں اطمینان
کیسے ممکن ہے۔“

”پھر بھی آپ جا رہے ہیں؟“

”قبل ہی کے کام جا رہا ہوں۔ افسوس کل کی دعوت
کا بد و گرم تباہ ہو گیا۔ دیکھئے آگے کو کیا ہو۔ اچھا پھر
ملوں صگا۔“

صوفی صاحب کے حکم کی تعمیل غیر ممکن تو نہیں تھی
لیکن میں نہ جانے کیوں اپنے میں آمادگی نہ پاسکا۔ یہ بھی
اندیشہ تھا کہ وہ دوسرا آدمی بھی کہیں آج ہی کھدائی کے
لئے نہ پہنچ جائے۔ ایسی صورت میں خون خرابہ بھی لازماً
ہو گا۔

رات کے گیارہ بجے تک یہی حالت دھل رہی۔
طبیعت اندبے انکار کئے جا رہی تھی۔ آخر میں نے سوچا
ایک بار صوفی صاحب کو پھر دیکھ آؤں۔ ان سے کہوں گا
کہ اپنا کام کسی اور سے کرائیں۔

اب جو موصوف کے در دولت پر پہنچا ہوں تو پہلے
سے زیادہ کبراً نظر آتا ہے۔ اوہ شاید کام ہی تمام ہو گیا
ڈرتے ڈرتے زینہ طے کیا۔ وہاں اجتماعی نوح کا گریہ و
اتم بساتھا۔

”ختم ہو گئے“ کسی نے میرے دریافت کرنے پر
حکولہ گیر آواز میں کہا۔

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کب کتنی دیر ہوئی؟“
”ابھی بس دس منٹ ہوئے ہوں گے۔ ڈاکٹر
آپ کے آگے ہی آگے گیا ہے۔ بڑا سخت دورہ پڑا تھا۔“
اتنے میں شری بیگم میری طرف بڑھا آئیں۔

”اب کچھ نہیں دھرا۔ اندر پردے والیاں آگئی
ہیں آپ نہ جاسکیں گے۔ آئیے نیچے چلیں۔ ایک

بہت ضروری بات ہے۔“

وہ جملہ پورے بغیر نیچے چلی گئیں۔ میں بھی لوٹا۔ نیچے
کمرے میں پہنچ کر انھوں نے کہا۔

”دورے کے بعد بیہوش ہو گئے تھے۔ بیہوشی میں
دو بار ان کے منہ سے آپ کا نام نکلا اور صندوق بند ہو
کچھ کہہ رہے تھے۔“

”تیار داروں نے کلمہ پڑھوانے کی کوشش نہیں کی؟“
”بہت کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ آخری لفظ جو
ان کے ہونٹوں سے ادا ہوا صندوق ہی تھا۔ ایک بار درگا
سمنویہ کا بھی نام لے رہے تھے۔“

”جی ہاں۔ بڑے اونچے درجے کے صوفیاء میں تھے
اللہ مغفرت کرے۔ مرتے مرتے بھی اپنے فرائض کی طرف سے
غافل نہیں ہوئے۔ صندوق وہ درگاہ کے لئے بنوانا چاہتے
تھے۔ بہت بڑا جس میں نذرانے کی چیزیں محفوظ کی جائیں۔
اچھا اب اجازت دیجئے۔ تدفین تو بہر حال دن ہی میں
ہو گی۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔“

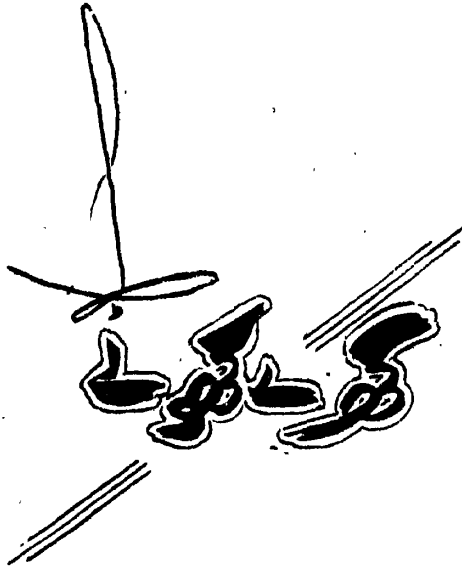
”آپ ہمیشہ جلدی میں ہوتے ہیں۔“ اس نے طنز کیا
”یہ بات نہیں۔ آپ دیکھیے کچھ لوگ ابھی اوپر سے
نیچے اتریں گے کچھ باہر سے آکر اوپر جائیں گے۔ ہمیں یہاں
آرام سے بیٹھا دیکھ کرہ کیا سوچیں گے۔“

”سوچا کریں۔ مجھے ایسی باتوں کی پروا نہیں ہوتی۔“
”آپ کو نہ ہو۔ مجھے تو ہوتی ہے۔ فی امان اللہ۔“
یہ کہہ کر میں اٹھ ہی گیا۔ انھوں نے بُرا مانا ہو گا مگر
اب کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اللہ بس باقی ہو س۔

کہانی نمبر

کچھ دیر سہی مگر اس خبر کو آکر رہنما ہے۔
طرز، تجزیہ، تبصیر، تحقیق، اصل اور نقلی صوفیوں
کی چلتی پھرتی تصویریں۔ تفریح اور عبرت
پہلو بہلو۔

حدیث دفاع، سفیث زرر گل، اعراف



حدیث دفاع

مصنف:- جنرل محمد اکبر خاں، متوسط سائز کے ۱۶ صفحات لکھائی
چھپائی کاغذ مناسب، قیمت جلد دس روپے، شائع کردہ:-
مکتبہ رحمانیہ، ویلینڈ (یو پی)

کیا ہے کہ دنیا کے دو بڑے بڑے جنرل اور جنگجو ہیرو اور فاتحین جن کا دنیا
عالم میں بچ کر رہا ہے حضورؐ کے آگے کوتاہی قیامت میں اور فکر و تدبیر کی ان
جادوں تک نہیں پہنچ سکے جن تک سرب کا یہ درمیت پہنچا تھا۔ صلی اللہ
علیہ وسلم فاضل مصنف چونکہ خود بھی سپاہی ہیں اور دوسری جنگ عظیم
کے آزمودہ کار اسلئے ان کا سپاہی کسی اناوی کا تجزیہ نہیں بلکہ ایک ماہر فن کا
تجزیہ ہے۔ وہ جگہ جگہ مغرب کے معروف ماہرین حرب اور اس فن کے
فرمودات پیش کرتے ہیں کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں غصہ خوش
عقیدگی کا آدرہ نہیں بلکہ معروضی مطالعہ کا حاصل اور حقائق ثابت سے ہم
آہنگ ہے۔

غیر معمولی خوشی یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ وہ اگرچہ حضورؐ کی محبت میں بوا
طہر غرق اور صحابہؓ کی عقیدت سے پیوستہ ہیں لیکن معقویت کا
دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے انہوں نے دوسرے شہرہ آفاق کمانڈروں
اور سیاست دانوں کے بالمقابل رسول اللہؐ کی جوشان
امتیاز کی ثابت کی ہے اس کے لئے روشن دلائل اور قوی شواہد
بھی زیب قراں کیے ہیں۔ ان کی نظر گہری، قوت اخذ و استخرا ح

یہ کتاب تقریباً بیس سال پہلے تصنیف کی گئی تھی۔ پاکستان میں چھپی اور کافی
مقبول ہوئی۔ اس میں یہ دفاع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رسول اللہؐ
صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق میں جو بے مثال کامیابی اور اسلام کو
غالب کرنے میں جولا جواب کامرانی حاصل ہوئی اسکے پیچھے اگرچہ بہت
ابلی کی کار فرمائی تو پھر حال بھی لیکن اسباب و دھل کی حد تک خود رسول اللہؐ
صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست فہم و دانش اور اعلیٰ صلاحیتوں کا بھی اس
میں بڑا دخل تھا۔ آپ بہترین سیاست دان، اعلیٰ ترین کمانڈر، زبردست
مدبر اور کمال درجہ فعال انسان تھے۔ مصنف نے فن حرب اور علم
سیاست کے زاویوں سے حضورؐ کے غزوات و سرایا کا تجزیہ کر کے ثابت

اسلام کی تربیت کیسے فرمائی گئی کہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ جنگ ایک عیسائی بازی ہے اور اس بازی کے کھلاڑی کو ہسوک پیاس مصائب اور خطرات کے مقابلہ کے لئے معزم و حوصلہ کے علاوہ سخت تربیت کی بھی ضرورت ہے

”چنانچہ آپ نے روزے کا حکم دیا تاکہ مسلمان مجاہد ہسوک پیاس کی تکلیف کو آسانی سے برداشت کر سکیں اور اس کے عادی بنیں۔“

لیکن سب جانتے ہیں کہ روزہ تو پہلی شریعتوں سے چلا آ رہا ہے اور امت محمدیہ کو بھی روزے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے کہ حضورؐ کی جانب سے یہ تجربہ تو اس وقت درست ہوتا جب حضورؐ اپنی طہارت سے زینہ صوم خانہ کرتے کوئی صاحب نظر قادی فوراً محسوس کرنے لگے کہ مصنف یہاں حقائق کی سطح سے مٹ کر جذبات کی لہروں میں بہہ گئے ہیں یہی صورت وہاں محسوس ہوتی جہاں مصنف نے غزوہ خندق کی بحث میں حضورؐ کو خندق کا پانی موجود قرار دیا ہے ۱۳۳۰ھ میں مصنف خود بھی ذرا قلم دیا کہ یہ اعتراض کر چکے ہیں کہ خندق گھونڈنے کا مشورہ سلمان فارسیؓ نے دیا تھا۔ اور یہ بھی انھیں یقیناً علم ہے کہ سلمان فارسیؓ بھی اسکے موضوع تھے۔ بلکہ فارسیؓ میں یہ طریقہ معروف تھا۔ لہذا زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عرب کی جنگوں میں اسکا پہلا استعمال حضورؐ نے کیا پانی و موجد کے الفاظ مبالغہ اور مغالطے سے خالی نہیں۔

مصنف کی انشاء زوردار اور دلنشین ہے مگر معنوی تکرار اس میں کافی ہے متعدد مقامات پر لفظی تکرار کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کئی جگہ غلطیاں اچھی خاصی رہ گئیں متعدد کو ایک سے زائد جگہ مستعد پر مضافاً۔ مثلاً پر مشیت الہی کا معیشت الہی بن گیا۔ صحت پر تہمیزی، کی جگہ اتنی چھپ گیا اگلے ایڈیشن میں تصحیح کی بیع کو شش کی جائے۔

سفینہ زر گل

مجموعہ کلام جناب فضلاء بن فیضی :- کتابت، طباعت اور کاغذی کار صفحہ ۲۷۲ قیمت مجلد بارہ روپے شائع کردہ :- دانش

فرداں لاہور، زنجیرہ و گمشدہ یہی تو تعجب ہوا کہ ایک سپاہی اور انشا اچھا استاد پر دنیا انشا پر دنیا کے علاوہ ان کی تحریر سے اسلام کا گہرا درد ایمان کا خروش، اسلام کا جذبہ اور اقدام و عمل کا دلورہ نمایاں ہے وہ کہتے ہی نوجوی میدان جنگ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہیں نئی رخ سے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ پیمائش سے بھی نہیں گھبرائے۔ کم دیش چورہ صدیوں قبل کے غزوات کو چشم تصور کے آگے لانے کے لئے انھوں نے غرق زہر محنت کی ہے اور اس میں کامیاب ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔

بعض حقائق سامنے تو سب کے ہوتے ہیں لیکن ان پر نگاہ چند ہی اہل بصیرت کی جیتی ہے۔ جیسے :- زور رسالت کی فتوحات کا دائرہ۔ فاضل مصنف نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ دس سالوں میں حضورؐ نے زمین کے اتنے وسیع رقبے پر فتح و فخر کا پرچم لہرایا جیسے دنوں میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو واسطہ ۲۷۲ میل یومیہ نکلتا ہے۔ جالی نقصان کا وسیلہ رہا کہ مسلمان جیسے میں ایک اور دشمن جیسے میں تقریباً ۱۰۰۰ یہ حقائق جو زندگانی میں ہیں اور سبق آموز ہیں۔ دورانِ حال و معروضہ چند گوشے ایسے بھی محسوس ہوئے کہ ان پر نظر ثانی جو جالی تو اچھا ہوتا۔ صحت پر کہا گیا ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کام کبھی فرشتوں سے نہیں کرائے میدان جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے رونے کے لئے کبھی فرشتے نہیں بھیجے۔“

ان فقرات سے مصنف کا مقصد تو نیک ہے۔ لیکن یہ نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ بعض آیات قرآنیہ سے ان کی تطبیق بہت دشوار ہے ”اسباب ہجرت“ کے زیر عنوان نفیس بحث ہے مصنف یہ بتا رہے ہیں کہ اہل مکہ کو متعدد وجوہ سے حضورؐ کی دعوت اسلام سے سخت میر تھا۔ ان کے بقول ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام تو سود کو ہر دم قرار دے رہا تھا لیکن اہل مکہ کی معاشی زندگی کا بڑا ادارہ بت خانوں کی مجاورت پر تھا یا تجارت اور سودی کاروبار پر۔ یہاں مصنف یہ سمجھ گئے کہ سود کی حرمت تو ہجرت سے کہیں بعد مدینے میں نازل ہوئی ہے۔ پھر اسے کیسے ان اسباب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جو قبل از ہجرت اہل مکہ کے عادات و اخلاق کا باعث بنے تھے۔ مثلاً پر یہ بتاتے ہوئے کہ حضورؐ نے لشکریان

دانش کدہ پبلیکیشنز مٹو ناتھ بھنجن۔ (دہلی)

فضا صاحب کو وقتاً فوقتاً رسائل میں پڑھنے کا موقع ملا تھا آج مجموعہ کلام کی بھی زیارت ہو گئی۔ اتنی دلکش لکھا ہی چھا ایسا اچھا کاغذ اور اتنے حسین و بلند پایہ اشعار۔ تحفہ ہو تو ایسا ہو تبصرہ تو ہمیں کرنا ہی تھا۔ اتفاق سے فضا صاحب ہی کا ایک شعر بھی ملیا جو مستقل دعوتِ تبصرہ ہے۔

میں خود اپنے آپ کو پہچان تو لیتا فضا

میرے بارے میں کچھ اور بابِ قلم بھی بولتے

”اربابِ قلم“ تو جو ہوں گے سو ہوں گے۔ ”بند گانِ قلم“

میں شمار ہمارا بھی ہے۔ جب کبھی کہیں بھی فضا صاحب کی کوئی چیز

پڑھی ہے محسوس کیا ہے کہ یہ ایک منفرد آواز ہے جو فن کی رعنائیوں

میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسلوب اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ

جدید و قدیم کا دلکش سنگم ہے۔ شاعری کا قالب رواہین مگر مغلوب

ترقی پسندانہ ترقی پسندی اگرچہ اپنی خرمستیوں اور لغوئیوں

کی بنا پر اب ایک عنوانِ تسنیر بھی بن چکی ہے لیکن فضا صاحب

کی ترقی پسندی اعتدال سے نہیں گزری اس لئے اس میں علمی

سنجیدگی بھی ہے اور سخن و رائے معنویت بھی، ان کے یہاں لطافت

ہے مگر صحت مند روایتی صوابی کی پابند۔ جدت پسندی ہے مگر

فصاحت و بلاغت کے قدیم معیار سے وابستہ۔ ان کا آہنگ

علمی ہے مگر جمالیاتی نزاکتوں کا امین۔ ان کا تخیل بلند و فکر عمیق اور

طرزِ ادا ممتاز ہے۔ وہ اپنے دور کے ان شاعروں میں ہیں جنہیں

پڑھا لکھا کہا جاسکتا ہے۔ ہمارا ناقص مطالعہ یہ ہے کہ اب پڑھے

لکھے شاعر کم ہی رہ گئے ہیں۔ زیادہ تر یا تو مشاعراتی شاعر ہیں یا

پھر نام نہاد ترقی پسندی کے سودا جی جنہیں جنونِ ترقی نے شتر

بے مہار بنا دیا ہے۔

پیش نظر مجموعہ کلام صرف غزلوں اور قطعوں پر مشتمل

ہے۔ اس میں سے کچھ منتخب اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

تیری ہستی ہے گلستاں میں ہوا بھونکا

تو جہاں سرو بنا ذو قن سوزے بھی گیا

جس طرف نظریں اٹھاؤ سوچتے چہروں کی بھیڑ

آدمی بے چارہ خوابوں کے کھنڈر سے بھی گیا

فتحا کو اس سخی کیا کیا نہ دوستوں سے مگر

یہ کھیت سوکھ گیا بادلوں کی بستی میں

قاتلوں سے ملتی ہے دوستوں کی صورت بھی آئینے پشیمان ہیں

سوچتا نہیں کچھ بھی کس سے فاصلہ یا ہو کس کو درمیاں رکھو

چمک کے تیرگی جاں بڑھا گیا کچھ اور

مرے لبوں کا تبسم شرار جیسا تھا

سفینہِ ذہن بھی ہے فضا سخن جس کا

خود اپنے سوختہ خوابوں کی گردہ بے شخص

منائے جاتے ہیں یوں زندگی کے جشن کہاں

پلک پلک وہ لہو کی برات اپنی سخی

فتحا کو توڑ تو پھینکا ہواؤں نے بسکین

یہ پھول اپنی ہی شاخوں کے درمیان گرا

سوزِ احساسِ سلامت اکہ اندھیرے کتنے

چاندنی بن کے مری روح کے اندر اترے

مگر کوئی بہ خوشی اس سے دستکش نہ ہوا

یہ زندگی جسے ہر شخص حادثہ بھی کہے

زندگی ٹوٹے رشتوں کا جھاڑ

جسمِ سانسوں کی بھرتی دیوار

سرد برتاؤ سے گھبرائوں کیا برف کسار کی زینت ٹھیری

سوز گیا ہوں تو کھلنے لگا ہوں یاروں کو

خواب تھا تو بہت بزرگزیہ میں بھی تھا

یہ راز کھولا تک پاش دوستوں نے فضا

کہ زندگی کا جرات رسیدہ میں بھی تھا

میرا وجود ہے کہ بیاباں کی خشک ریت

لوگو! متاع دیدہ تر کون لے گیا

یہی جگنو شبِ ہستی کو اجالیں گے فضا

ہاتھ میں شمع نہ لو، پلکوں پر تارے جن لو

کس قدر دھم ہیں تھوہل میں آنسو کتنے

لے لے نگہ ابد! حساب گل و بادہ کر لو

قاتل جو کوئی ہو تو گردوں خوں بہا طلب

یوں ہے کہ اپنے ہاتھ کی تلوار میں ہی تھا

افلاک کے درہست میں روانی اور عانی اور ہستی کا کافی اہتمام کرتے ہیں میں سے خشک تر زمین میں بھی کچھ تری پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا سرخ :-

بعض افلاک ان کے یہاں اتنی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ ان کی تکرار و جہان کو کچھ گراں سی گذری ہے۔ جیسے صلیب صدیاں۔ شعور آگہی۔ بھڑنا۔ تیشہ۔ پتھر۔ آئینہ۔ پنجوڑنا۔ سنگ۔ دشت و صحرا۔ سنگ ملامت۔ گرد۔

ننگی اور عذباتی سرشار کی کاہلک سادہ چاؤ ان کے اشعار میں یقیناً ہے لیکن تفرق کم ہے۔ تفرق جو جمالیاتی شاعری کی جان اور مذاق حسن کا فطری تقاضا ہے۔ اس کی نفسیاتی وجہ شاید یہ ہو کہ ان میں جذبہ نیاز مندی کم اور ذوق ناز آرائی زیادہ ہے۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر خود شناسی و خود پسندی ہیں اور دیوانگی عشق کو مضبوط و متانت کے دائرے میں محدود رکھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے زیرِ قلم ہر مجموعے میں ایسے اشعار کافی طے جو خود دوستی، احساسِ تعلق اور ان کی ہماہمی سے خالی نہیں ہیں۔

غلط لہجی نہ ہو۔ ایسی خود شناسی ہمارے نزدیک بھی نعمت ہے جو عرفانِ ذات اور خود آگہی سے عبارت ہو لیکن اسے رعوت یا کبر یا انانیت سے طوط نہیں ہونا چاہیے۔ ذیل کے نمونوں سے ہمارا مطلب بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

خیرِ بعیرت میں ایک ہی بس تنہا جل رہا ہوں مدلوں سے
یوں تو سب یہ کہتے ہیں، ہم حرکتے وارث ہیں تیرے گم گشت ہیں
یہاں "میں" کا مصداق کچھ میں نہیں آیا۔ "صدیوں سے" کی جگہ "ہمقت سے" کہا گیا ہوتا تو بات صاف تھی۔ "میں" کا مصداق اگر خود شاعر ہے تو "صدیوں" کا مصداق کیا ہوگا۔ بہر حال یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک شخص ضمیر متکلم کے ساتھ اپنی بعیرت کا اعلان اور دوسروں کی بعیرت کا ماتم کر رہا ہے۔

فتنا میں آئینہ شش جہت ہوں آج کہ ہے
ہر ایک چہرہ مرے خط و خال میں گم سا

کچھ کہو تو اپنے ہی قاتل بنو

چپ رہو تو روح پر غر چلے

ٹوٹنا تو یہاں شیشے کا مقدر ٹھہرا

کیسے پتھر کی یہ تحریر مٹائی جائے

سافر سحر پیاس کے شعلے مرہم مرہم زخم کی آغ

ہم جیسے صوموں سے بھی کو گئے دنیا داری لوگ

ہر ایک شخص ملامت سے آسمان کی طرح

جو ساتھ ساتھ چلے اور ہم سفر نہ لگے

جن پر بارش گل ہے ان کا حال کیا ہوگا

زخم کھانے والے بھی باغ باغ ہیں لوگ

ہے ہر اک رنگ میں قاتل یہ جنوں کا خم و بیج

تیری زلفوں میں رہے یا میری راہوں میں رہے

میں خود اپنی جگہ ایک شورش کہہ ، کارگاہ جنوں مشرب و گل

دقت کو میرے ذائقہ پر نیند آگئی ، حادثے میری باہوں میں گم ہو گئے

نور چہروں پر پھیروں میں اندھیرا ہے یہاں

کوئی گردار نہ تیرا ہے نہ میرا ہے یہاں

آنتوں کی کیا کی یا روڈ پھیل جاؤ اور افتخار

ہو جو ذوقِ مطالعہ تو کھلے پھول کی پکڑی صدق کی طرح

اس لئے راہ و قاصد میرے جنوں کو ہے پسند

ہر کچھ میں بھی حسین خم ترسے گیسو کی طرح

خود رخ و الش حاضر بھی کم نہیں سفاک

جو تیرے سے بچے روشنی میں ڈوب گئے

دوب لو اک جاؤ گھر ہے اس کے کتب دیکھ

دیراتوں میں ہیں بر سے اور آبادی ہنگام

قصا صاحب کی قدرت کلام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے

کہ عموماً وہ کافی مشکل زمیوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور خوب

شعر نکال لے جاتے ہیں۔ ان میں مضمون، آفرینی کی صلاحیت

غیر معمولی ہے اور حالانکہ ان کا آہنگ پوری طرح غزل کا آہنگ

نہیں مگر ننگی اور سوز و اثر کے رنگ و بوسے خالی نہیں۔ وہ

لے یہاں اس سے قطع نظر کہ لمحے کی قافیا کا قافیہ درق نادر ہے۔ اُفق میں آپر پیش ہے اور درق میں آپر زور۔ مضبوط شعر بہر حال پسند آید۔

مطلب جو کسی ہو خود ستانی کا پہلو بہر حال نمایاں ہے۔

یہ اعتراف مرے بعد سب کریں گے فقہا

شعبہ لفظ کو بیدار کر گیا ہے کوئی

مرے بغیر کئی نہ تیسری کی چستان

بڑھاؤں تک کہ میں روشنی کا قیشہ ہوں

مجھے نہیں مری آواز کو تو پہچان دو

نئے شعور نئی فکر کا وسیلہ ہوں

مری بلند نئی قد کو نہ رشک سے دیکھو

میں آسمان ہوں مگر خاک کا عطیہ ہوں

فقہا مرے سوا یہ فکر دینے کے کس کو

میں اپنی دین ہوں اپنے قلم کا نثر ہوں

مقطع میں شاعر اپنے آپ میں اس نذر کو گیا کہ پہلے مصرعہ کی تراش

کا نقص بھی اسے محسوس نہ ہوا۔ "فقہا مرے سوا" یہ بندش

الفاظ کو مشغول جیسی ہے۔

بل کی جست اپرو ہوا کی اڑان ہوں

ہر شخص سوچتا ہے کہ میں آسمان ہوں

مل کر مجھے ذرا جو ہے داناکے کائنات

اے عہدِ کم عیار تو اامتحان ہوں

پندارِ قلم بھی ہے کوئی شے کہ فقہا بھی

مغزور ترے غامخ خوابوں کی طرح ہیں

مری متاعِ قلم، دولت ہزلے جا

لہو کسی کا ہوا پنا پیار بھر لے جا

میں اپنی ذات سے دریا ہوں موتیوں کو بھرا

تجھے ہوس ہے تو مجھ کو کھنگال کر لے جا

میری قاتل ہے یہی منفرد آواز مری

سب جہاں رنگ سے گونے ہیں وہا تو جی بھی

بہت فریض ہیں دیدہ و زبان شہرِ فقہا

نقاب ڈال کے مل آگئی کے چہرے پر

گرنے لگی سروں سے کلاہ سخن وداں

بھکو فدا بلند نئی فن سے اتار دے

ناتنے ٹاڈا ہوں سر دشت آہواں

مانگو تو کوئی قیمتِ عرض ہرزہ دے

یاروں کو یا سبائی شعور نوا سے کام

تنہا مگر قلم کا ٹکڑا ر میں ہی تنہا

بھکو کہیں چھپا کے تو اس خاکداں میں رکھ

میں آسمان سے پھینا ہوا لا جو رو ہوں

میں اپنی ذات سے ہوں اک حکیم شعور نوا

اسے مرے نکتہ درو! مجھے سے استفادہ کرو

پر سخن جس کا ہے انمولِ فقہا

سب نے اس شخص کو گستاخانا

میری شیع قلم مطلعِ نذر ہے، میرا رنگ سخن دیکھنا دوستو

میں بہ این روشنیِ فردیغِ نیر، دو دسماں بھی شبِ گئی بھی

مسبو و فکر و فن رہی تنہا ہماری ذات

ہم اپنے بت کہے میں خدا کی طرح رہے

اک زمانے کو فقہا ذہن و قلم بنتا ہے

کچھ روایات ہیں ہم خوش سخنوں کے پیچھے

خود ستانی پر مشتمل اشعار کہتے ہی اساتذہ کے ہواں

پائے جاتے ہیں لیکن کثرت سے نہیں انسانی فطرت کسی بھی شخص کی

خود ستانی اور تنہا کہیں پسند نہیں کرتی چاہے بہ اعتبارِ واقعہ

وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔ فقہا صاحب اس سے پرہیز کریں تو

مناسب ہوگا۔

کہتے ہی اشعار ایسے بھی نظر آئے جنکا سمجھنا کم سے کم

ہماری عقلی عقل رکھنے والوں کے لئے مشکل ہی ہے۔ ان میں

سے کچھ کا مطلب تو کافی غور کے بعد نمودار سا ہونے لگتا ہے

لیکن کچھ بہر حال راز ہی بنے رہتے ہیں اور خیال پیدا ہوتا ہے

کہ شاعر اپنے فانی الغیر کو قابلِ فہم انداز میں ادا نہیں کر پایا۔

مثالیں :-

خود اپنا سرخ لہو چاٹتی پھر میں صدیاں

بکھرے ٹوٹے ٹکڑوں کا دار ایسا تھا

ہم نہیں کہتے کہ اس کا کوئی مطلب ہوگا ہی نہیں مگر بہر حال

اسے نہ پاسکے۔

تو درد کی موجودگی اب کیسے قرین قیاس ہوگی۔ اگر مندرجہ نہیں ہوئے تو کیا مطلب ہوا شعر کا۔

میں اپنے عہد کی یہ تازگی کہاں بیجاؤں
اک ایک لفظ قلم سے لبوہان نگر
اگر "تازگی" سہوکتا بت نہیں ہے تو یہاں اس کا مطلب گرفت
میں نہیں آیا۔ تازگی کی وجہ سے الفاظ کا لبوہان گونا بے تنگی
سی بات ہے۔

دوسرے مصرعوں "اک ایک" مجھ ہے۔ شاید بہتر
ہوتا اگر یوں کہاں جاتا۔

میں اپنے عہد کی عشوہ گری کو کیا کہوں
کہ حرفِ قلم سے لبوہان نگر
یا کسی اور طرح سہی۔

مرے وجود کی آرائشوں میں صرف ہونے
وہ میرے تجھیں پتھر کا حوصلہ بھی کہے

"حوصلہ" جاندادوں کی صفت ہے بلکہ صرف اُن جاندادوں کی جو
شعور و ادراک رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے شیر کو جری اور
بہادر وغیرہ تو کہتے ہیں "حوصلہ مند" نہیں کہتے۔ پتھر تو بے جان
شے ہے۔ اس کا حوصلہ کیا ہوتا ہے اس کی کوئی نشاندہی شعر نے
نہیں کی۔ بہت سے بہت پتھر کی صلابت کو اس کا حوصلہ کہہ
لیجئے لیکن پیر انو صلابت میں پتھر سے کہیں بڑھ کہے پھر اسکی
شدت جود اور صلابت کو اس سے کم سخت چیز سے ظاہر کرنا
کیا معنی۔ ہم واقعی اس کی تہہ کو نہیں پہنچ سکے۔ نہ یہ سمجھیں آیا
کہ شکر کا پورا مفہوم کیا ہے۔

زندہ شہروں کی علامت ہیں ابھی

ہانچے سائے، لرزتی دیوار

ہانچے سائے کیسے ہوتے ہیں اس سے قطع نظریہ تو سامنے کی
بات ہے کہ لرزتی دیواریں زلزلوں اور کھوجیالوں کی علامت
ہوتی ہیں نہ کہ زندہ شہروں کی۔ زندہ شہروں کی علامت وہ
دیواریں ہو سکتی ہیں جو بلند ہوں، مضبوط، شان سے سرمائے
کھڑی ہوں۔ پھر کیا مطلب ہوا شعر کا۔

سایوں کے ساتھ ہانچے کی صفت صرف اسی وقت قابل

قدم قدم کے حوادث سے ہم یہ کیا پوچھیں
ہمیشہ کیوں سفرِ روزگار ایسا تنہا
یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

مطمن ہر شخص اپنے مسئلوں میں تعاقبت
لبتوں میں جو نہیں وہ جنگلوں میں تعاقبت
یہ بھی کم و بیش چیتاں محسوس ہوا۔

کاش انہیں کوئی پکڑ لانا تری زلفوں کے پیچ
پاس کا اس اڑتے بادلوں میں تعاقبت
زلفوں کی صفت معروفہ "پاس بھانا" تو نہیں پھر شربے شکن کہاں
ہوا۔ مفہوم ہی عشرت بود ہو گیا۔

خواب خواب لمحوں کی بے زار باہوں میں رہا ہوں صدیوں
میں بہ صدمت قطرہ وقت کا سمندر ہوں مجھ کو دیکھو
طرز بیان اور لفظی دروہیت کے اعتبار سے عمدہ شریکین مفہوم
ابھرا ہوا۔ یہی پتا نہیں چلتا کہ "مکلم" کون ہے اور کس خارجی یا
داخلی کیفیت یا واقعے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

بہ نام آگہی کل کائنات اپنی تھی
یہ زہر پی گئے خود ہم کہ بات اپنی تھی
آگہی کو "زہر" کس پہلو کے پیش نظر کہا گیا اس کی طرف ایک لفظ
بھی مشیر نہیں۔ پھر آگہی "تو لفظ علم و ادراک کا نام ہے قبضہ و
تصرف کا نہیں" کل کائنات اپنی تھی "کا کٹرا بنیاد چاہتا تھا
وہ اسے نہیں ملی۔

ہر خواں میں جو بہادری کی گواہی دیگا
ہم بھی چھوڑ آئے ہیں اک شعلہ چنیرا
مطلب مجھ میں آتا ہے مگر نہیں آتا۔ شعلہ کس شے سے کیا ہے
اور وہ آنے والی تمام خزاؤں تک باقی کیسے رہ سکے گا۔ شعلہ
کی جگہ کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جسکے طول قیام کو وجدان
قبول کر سکتا۔

اب تو میرے ہم پر زخموں کی چادر بھی نہیں
اے دقا درد تو اس پیر بن سے بھی گیا
زخموں کی چادر دقا درد کے لئے مفید ہو سکتی ہے یا مضر یہ سوچنے
کا مسئلہ ہے۔ زخم کہاں لگے یہ بھی پتا نہیں چلتا۔ اگر مندرجہ ہوئے

نہم ہو سکتی ہے جب تیز ہوا چل رہی ہو اور درختوں کی تنہا ٹہنیوں کے سامنے ٹوڑش کا نظارہ پیش کر رہے ہوں۔

بچا کہ لوگ بفل میں کتاب رکھتے ہیں

مجھے بھی پڑھ لیں یہ دیدہ و دروں کے سر پہ نہیں

جسے دیدہ و در بھی نہ پڑھ سکیں وہ پڑھنے کے لائق ہی نہ ہو گا۔

دیدہ و دروں کی تنہا ٹہنیوں نے مفہوم بنا ہ کر دیا۔ بے شمار کتاب بفل

لوگ دیدہ و در تھیں ہوتے بلکہ بعض حرف خواں ہوتے ہیں۔ ان کے

بارے میں اگر کہا جائے کہ مجھے پڑھ لینا ان کے بس میں نہیں

تو بات بنتی ہے۔

اب اس کو بات سے چھوڑ کر ایک اک ذرا دیکھو

وہ سنگ تو نہیں یارو کہ پوتا ہی نہیں

یہاں "اس" کا مصداق مجھ میں نہیں آیا۔ اگر مراد محبوب ہو تو

مطلب پھر بھی تو دیدہ۔ اور کوئی ہو تو اس کا سراغ کس ترکیب

سے ملے۔

اب بھی تری حراب سخن میں شمعیں سی روشن ہیں

سورج کو یہ آگ اٹھتے ایک زمانہ بیت گیا

دوسرا مصرعہ اگر پہلے مصرعہ کا تشبیہ بدل ہے تو سورج کی بے حشا

آگ میں اور شمع ناچیزوں کی روشن میں آگ کو کیا تعلق ہے۔ پھر

پہلا مصرعہ ح ہے اور دوسرا ذم۔ اس کی فنی تو خیمہ کیا ہو۔

کیوں صلیبوں کا گرہیں پکڑو

روشنی حرف صداقت ٹھیر سی

الفاظ واضح مگر معنی مبہم۔

کون ہانپے گا قلم کی جاگیر

یہ مرے دور کی حرمت ٹھیر سی

دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی قابل نہم تکمیل نہیں کر سکا۔ حرمت کا

لفظ یہاں سوالیہ نشان بن گیا ہے۔

وقت تم سے کہیں مانگے گا مژدہ اس کا صاب

بیکراں صدیوں! یہ بکھرے ہوئے لمحے جن لو

اول تو صدی کے لئے بیکراں کا دمف ہی اجتماع صدیقین ہے

لفظ صدی کی جہین و جن میں حد بندی موجود ہے۔ سو سال

پھر بیکراں کیا معنی۔ اور اگر صدیوں کے مجموعے کو بیکراں کہا گیا

ہے تو آخر مراد کیا ہوئی؟ بکھرے ہوئے لمحے صدیوں سے الگ

کوئی چیز نہیں بلکہ ان کے اپنے اجزائے ترکیبی ہیں۔ لمحوں ہی کے

مجموعہ سے صدی کا وجود تقویم پاتا ہے مگر شعر تقاضہ کر رہا ہے

کہ بکھرنے والی شے کوئی اور ہو اور اسے چھنے والا کوئی اور۔

جب وقتا بہ زخم بدن کا گستاخ ہوں

خوش ہوں کہ اپنے دور کا میں ترجان ہوں

واللہ اعلم پہلے مصرعہ میں کیا کہا گیا ہے۔

صدیوں سے منتظر ہوں کہ تیرہ خلاؤں میں

بھگو بھی کوئی چاند بنا کر اچھا لکے

خود شاعر ہی بتا سکیں گے کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں۔ ہماری فہم ناقص

میں تو نہیں آیا کہ یہاں متکلم کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔

چہرہ دل پر بھگو مگر دہنا کر بھیسر دو

صدیوں سے ایک دیدہ بینا میں قید ہوں

وہی ابہام بلکہ شاید ابہام۔ کون بول رہا ہے۔ کیا بول رہا ہے۔

وہ کون قید ہے جو صدیوں سے قید چلا آ رہا ہے اور وہ کون سا

دیدہ بینا ہے جس کی عمر اتنی طویل ہے۔ پھر گرد تو چہروں پر ٹپی

جاسکتی ہے غارے کی طرح جمائی جاسکتی ہے۔ بکھیرنا کیسا۔

یہ موت دے دے موت کو بھی وہ گزرنے دے

ترجیع دار کو قدر دلدار پر نہ دے

لفظوں کا مطلب تو یہاں مگر مطلب کا مطلب کیا ہوا ہے سمجھنا آسان

نہیں۔ ایسے اشعار کو ہمارا وجد ان اشعار نہیں مانتا۔ آؤد

ہی آؤد۔

تم کو یقین نہ آئے تو غفلوں سے پوچھو

ہر دور میں وسیلہ اظہار میں ہی تھا

یہ "میں" بار بار ہمانی مجھ سے باہر چلا جاتا ہے مراد اگر "انسان"

ہے تب بھی مضمون محتاج شرح ہی رہا۔

دور تک نہیں ملتا جستجو کا سایہ بھی

ساتھ کس جگہ چھوڑا ہم سفر آ جاؤں

اجالے اگر ساتھ چھوڑ دیں تو مسافر کی نظروں سے ماسٹہ اوجھل

ہو سکتا ہے جستجو کا سایہ نہ ملنے کی بات کہاں سے پیدا ہو گئی۔

کم نہیں ہوتی نبوت کی ہوس

آگ اپنے پھر وہ پیغمبر چلے

یہ کیا کہہ دیا۔ بات مہل ہے اور تبلیغ خلاف واقعہ۔ حضرت موسیٰؑ کے تو وہ ہم مگن میں بھی نہیں تھا کہ۔

آگ لینے کو جاتیں پیغمبر کی لمبائی

پھر موسیٰؑ پر معنی دارد! اور یہ سبھی حل طلب ہی رہا کہ آخر کن لوگوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور اشارے کا حاصل کیا ہے۔

یوں تو نہ بھرے گا کبھی دقت کا یہ زخم

مریم بنکے دکھ مجھے لمحوں کے گھاؤ پر

خطاب کس سے ہے۔ یہ ”زخم“ میں۔ یہ ”کا مٹا ڈال دے“ کو نسا زخم ہے۔ لمحوں کے گھاؤ سے کیا مراد ہے اور مشکل کون ہے جو خود کو مریم کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ یہ سارے سوالات جواب سے محروم نظر آ رہے ہیں۔

کبھی تو ٹوٹے گا آخر بدن کا سناٹا

حرم جاں میں دیئے جا صد اسلیقے سے

خوبصورت الفاظ مگر مصداق سے عاری ”ذہن کا سناٹا“ تو ایک قابل فہم استعارہ ہو سکتا ہے لیکن بدن کا سناٹا کیا چیز؟ اور پھر حرم جاں میں صدا دینے کا کیا مطلب؟

یہیں سے ہم بھی کریمیں سیر عالم اسرار

ذرا در پچڑ بند قبا کشادہ کرو

محض الفاظ!۔ خطاب اگر محبوب سے ہے تو محبوب جا ہے کتنا ہی حسین ہو سکے جسم میں وہی سب اعضاء ہوں گے جو سب کے جسموں میں ہوتے ہیں۔ وہ اگر جامہ اتار پھینکے۔ یا پھینکے تو نہیں مگر بند قبا کھول کر عاشق کو اندر جھانکنے کا موقعہ دیدے تو وہاں ”اسرار“ کو سننے نظر آجائیں گے۔ زبان کی غلطی رہے کہ درتپے کے تعلق سے کشادہ کہہ دیا گیا لیکن یہ نہیں سوچا گیا کہ بند کونٹے کے لئے کشادہ کرنے کے الفاظ موزوں نہیں۔ بہت و کشاد اور چیز ہے اور کشادہ کرنا اور چیز۔ اگر کوئی بند قبا کھولے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بند قبا کشادہ کئے۔ کشادگی و صحت دینے کا نام ہے کھولنے کا نہیں۔ بہر صورت شعر گنجلک اور دور

اذ فہم ہی رہا۔

شاہد عشقہ خوں کے سلسلہ سے یہی

صاحبِ عمر میں یک دو نفس زیادہ کرو

ہم یہاں بھی اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہ پختہ کار ہی عمر جنوں کے تیور دیکھ

ہوئے گل بدن بہت سارہ کتے ہیں

یہ شاعری نہیں مدادی ہے۔ یعنی لوہے کو ٹھوکنے پینے کا فن!

بوجھ شاخوں سے پھسل جائے گا آہستہ چلو

ایک اک لمحے پر صدیوں کا بسیرا ہے یہاں

یعنی؟

ذرا مسائل بند قبا کو سبھاٹے

یہ کام بھی نہ فقیہانِ نکتہ جو سے ہوا

بند قبا کا تو بس ایک ہی مسئلہ ہے۔ باندھنے یا کھولنے۔ اگر یہ

واقعی مسئلہ ہے تو اس کے لئے فقیہوں کی کیا ضرورت؟ متعدد

جگہ قبا اور بند قبا کے ذکر سے کچھ ایسی غلط فہمی جوڑنے لگتی ہے

جیسے شاعر کے تحت الشعور پر محبوب کی پوشاک بہت گراں

گزر رہی ہے۔

یہ شاعریں موہیں شاعر کے اخلاق و ابہام کی یا پھر

ہماری کم سمجھی کی۔ اب زبان و بیان کی سلوٹوں پر بھی ایک نظر

ڈال لیں۔

شہر ہم جلاں میں ہم بھی لیکے نکلے تھے حرب جاں کی سونیاں

ہم یہ کیا سمجھتے تھے صاحبانِ بندش بھی آگہی کے دشمن ہیں

شعرا نہیں۔ مگر حرب جاں بے معنی ہے۔ اس کی جگہ ”فکر و فن“

موزوں رہتا۔

خیمہ بعیرت میں ایک میں ہی بس تنہا جل رہا ہوں صدیوں سے

صدیوں کا لفظ خدا جانے کیوں فقہا صاحب کے ذہن سے چپک

گیا ہے۔ ”عدت سے“ کہہ دیا ہوتا تو گلشن بھی جاتا۔

کتنا سخت موسم ہے دھوپ ہے جازوں کی قانون کی باتیں

”جازوں کی دھوپ“ جسے عقائد و ترقی پسندی ہے۔ دھوپ اور جازوں میں کوئی مماثلت نہیں۔

غیر قلم چلے۔ ہر صحت شعر گنجلک اور دور

صلہ حرفِ وفا سنگِ طاعت بھی نہیں
”حرفِ بے فروت ہے۔“

یہ کون کچھ میل ہے جو کچھ کو جانتا بھی نہیں
کہیں تو مروج بدن کا سراغ پا جائے

”روح“ نے کام بگاڑ دیا۔ اندر کا آدمی بے شک بسا اُفتاب
باہر والے آدمی سے جدا ہوتا ہے۔ مگر اس اندر کے آدمی کو ”روح“
سے تعبیر نہیں کرتے۔ روح تو مستقل ایک الگ وجود ہے جبکہ
اندر کا آدمی محض ایک وجہ ذاتی اور نظری شے ہے۔

جو میں نہ تھا تو کہیں دھوپ تھی نہ سایہ تھا
وہ اس ہمراہی ہوئی دنیا میں کتنا تنہا تھا

”میں“ سے مراد اگر شاعر کی ذات ہے تو شوقینا نہیں ہے
اگر مراد نوعِ بشری ہے تب بھی خلافِ واقعہ، کیونکہ دھوپ اور
سائے کے مظاہر کی آماجگاہ یہ زمین تو تحقیق بشر سے پہلے وجود
میں آچکی تھی۔ ”وہ“ سے مراد محبوب تو نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا
”خدا“ مراد ہیں۔

کچھ بھی مراد نیچے یہ بہر حال ناقابلِ حل مسئلہ ہے کہ دنیا ہمراہی
ہوئی بھی ہو اور دھوپ سایہ کا وجود بھی نہ ہو۔ اللہ جانے شاعر
کے ذہن میں کیا ہے۔

رفیقو! حرفِ روائت کا احترام کرو

اسے ہمارے نئے تجربوں نے کھٹا تھا

اے ہمیں شعروں کی نہشت میں آنا چاہیے تھا۔ رہ گیا۔

انکھیں زمیں نے کھولیں تو جاگا شعور زیت

وہ نہ یہ جرج پہلے شکستہ سی آس تھا

زمین کا آگھیں کھولنا اور بند کرنا عجیب بات ہے۔ اگر

مراد یہ ہے کہ زمین پیدا ہوئی اور پھر شعور زیت بھی جاگا تو یہ پھر

بھی نہیں سمجھ میں آتا کہ پیدائش زمیں سے قبل آسمان شکستہ

سی آس کیوں تھا۔ اور یہ بھی غلط طلب ہے کہ ”شکستہ سی آس“

کیا چیز ہوتی ہے اور آسمان سے اس کا کیا جوڑ ہے۔

پڑتے ذرا مجھے بھی کبھی آپ غور سے

دلچسپ اس کتاب کا ہر اقتباس تھا

”اقتباس“ تو اس عبارت کو کہتے ہیں جو کتاب سے اٹھا کر

نویں مسائل ہیں روبرو تو کیا، منہ میں پھول سی زبان رکھو
بحرِ نعت ہے۔ یہاں دوسرے مصرعے مضاف و موقوت رہ گیا ہے
یہ غلطی نہیں مگر کمالِ فن کے خلاف ہے۔ نقض صاحب جیسے فنکار
سے کمال ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بہت کم ایسے ملے گئے اسے صاحبِ نظر
”اے“ دب گیا۔ حرفِ ندا ہمیشہ پوری کشش کے ساتھ مزا
دیتا ہے۔

نشا طریغِ فنا گلِ رات میرا کرہ بھی
وہ سرُخ کپڑوں میں جلتے چنار جیسا تھا
ایسے گھٹیا شعرا تھے اچھے شاعر کو زیب نہیں دیتے۔ الفاظ
گھٹیا نہیں ہیں مگر.....!

صبا کے دھوکے میں پھولوں نے ملے بٹایا
جو دولتِ نفس بے ثبات اپنی تھی
توبہ ہے ”دولت“ کو مذکور بنا دیا گیا۔ ”بانٹ لی“ کا محلی تھا۔ یا پھر
دولت کے ساتھ علامتِ مغفولی ”کو“ آتی چاہئے تھی۔

”لوگوں نے ساری دولت آپس میں بانٹ لی“
یا۔ ”لوگوں نے دولت کو آپس میں بانٹ لیا“
”دولت بانٹ لیا“ تو ظاہر ہے کہ درست نہیں۔

جتنے دیں جو دیواروں سے ٹکراتے تیرے
دشتِ ہستی ہے ہمارے لئے گھر ہی ایسا
جب ”دشت“ کہا تو دیواروں کا کیا موقع۔

جو نامراد جیا با کمال انت تھا
خود اپنے عہد سے میرا سوال اتنا تھا
نقضا صاحب اگر خود غور کریں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ
مضون کی ادائیگی فصیح طویل نہیں ہو سکتی ہے۔

گراں و گذری بڑی سے بڑی قیامت بھی
ہماری ذات کے پیچھے و بالِ انت تھا
یہ شخص قاضی بندہ ہی ہے۔ ”وبال“ کا لفظ یہاں نا جنس ہے

مجھے خواب کیا غیرت ہنس نے مرئی
نہ اس سے پہلے میں آسودہ حال اتنا تھا
آسودہ حالی کا جنس آشفہہ حالی کا محلی تھا۔

نہیں اور نقل کو دی جائے۔ یہاں پر یا کالم یا صفحہ یا ورق
میں کوئی نقطہ یا معنی ہو سکتا تھا جب خود کتاب کو پڑھنے کی دولت
دی جا رہی ہے تو اتنا اس کا کیا عمل۔

پلکوں پر آنسوؤں کی جراحت ہی نے میں

ہم اس کے پاس غم کی امانت ہی لے چیں

”جراحت“ بس قافیہ ہے۔ جراحت ایک معنوی کیفیت کو
کہتے ہیں یا پھر ایک معنوی مفہوم کو۔ پلکوں پر آنسو ہو سکتے ہیں
اور وہی غم کی امانت بھی ہیں۔ جراحت پلکوں پر کہاں آجائے گی۔

اب کیا کروں سے مر مر میں چہرہ کے آئینہ

وہی سلوک ”اسے“ بھیج کر دے گیا۔

ہر ایک چہرے میں آسودہ ہیں کئی چہرے

”آسودگی“ کا موقہ نہیں تھا۔

وہ میں کتاب ہوں تو نے مجھے پڑھا ہی نہیں

خواہ خواہ تنقید گواری کی تھی۔ ”میں وہ“ کہنا تھا۔

ایک چھلکا ہے خالی ہے جو مزے آگہی کے جابوں میں کیا یاد گئے

”جہاں“ کی مناسبت سے معرعوں ہونا چاہیے تھا

چند جھلکے ہیں خالی ہیں جو مزے سے.....

دیے بھی مزہ ہونے نہ ہونے کی بحث متعدد جھلکوں والی اشیاء
سے متعلق ہے۔ جیسے یا نہ ایک چھلکا جن چیزوں پر ہوتا ہے مثلاً
صیب، پیر، آلہ، ہڈیاں ان کے اندروں کو مزے سے تعبیر نہیں کرتے۔

اک راستہ ہو بند تو سوراخ استا کھلے

نصا صاحب اور زبان کی ایسی غلطی! ”سوراخ سے کھلیں“

کہنا تھا۔

جب راستے کے ساتھ سو کا عدد لگا دیا تو موقہ واحد کا کہاں
۱۰۔ یہ کتابت کی بھی غلطی نہیں کیونکہ ”آ اور کر تبا وغیرہ قافیہ
ہے اور کھلے ردیف۔

حسرتوں کے آغوش میں پتے ایک نام نہایت گیا

”حسرتوں“ کی دھڑکا ہٹ نہ جانے کیوں شاعر کے ذوقِ شاعری
نے محسوس نہ کی غفلتوں کو یوں دانا بھیجنا تو بس انارٹیوں کو
ذہیب دیتا ہے بخت کا روں کو نہیں۔

کھل گیا شب کے رسولوں کا بھرم

روشنی حرفِ صداقت ٹھیکری

لفظ رسول بعض ایک نوعی ہی لفظ نہیں اصطلاحی ہی
ہے۔ اس کا استعمال آدو میں ہمیشہ تحسین و تعظیم کے سیاق
میں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہاں سیاق ذمہ ابدال الزام کا ہے۔

نہ پوچھ بچہ سے ترا کا دوبارہ محرومی

سمندر میں سے گھرا پیاس کا جریز ہو گیا

”کا دوبارہ“ کا لفظ بے جگہ آیا۔ محرومی ایک سببی وصف

ہے اور کا دوبارہ ایک ایجابی عمل۔ معرعوں میں بھی ہو سکتا تھا۔

نہ پوچھ بچہ سے مری داستانِ تشنہ لبی

”تشنہ لبی“ نہ پوچھ تو چھٹے محرومی ہی تھی مگر داستان کے

ساتھ۔

شوخ و شنگ غزل کا معرعہ وہ گیسواں دھجھا

تنہا اور سایا کا قافیہ معرعہ! یہ تو فنی شاعری دلی بات

ہوئی۔

داد خواہ اپنے قلم سے ہوں نفا

”خواہ“ کی باغاب ہی ہو گئی۔ ٹھیک ہے کہ ”اپنے“ کا

الف حرف علت ہو نیکی بنا پر گر سکتا ہے مگر کمال فن مجبور ہو جاتا
کا نام تو نہیں۔ اس سے قدرتِ کلام پر حرف آتا ہے۔

بے آدمی بچانے خود اک شمشیر خیال

اس معرعہ پر ادھر ادھر کائے ہوئے ضروری تھے۔ سبب

جانتے ہیں یہ غالب کا معرعہ ہے۔

لطفِ سوزِ غم سے ہم داغ داغ ہیں یاد

”لطف“ نہ صرف ذات ہے بلکہ خامی پیدا کر رہا ہے۔ داغ

سوز سے پڑتے ہیں نہ کہ لطف سے یہاں داغ کا جوڑ لطف سے
لگ گیا۔

ناشنا سوں کی تحسین رنگ لاتی ہے کیا کیا

”ناشنا سوں“ کا داغ اور ذوقِ غائب ہو کر رہ گیا۔

کوئے بھی اب لعلِ شبِ چراغ میں یاد

یعنی مجروحِ وقت ہے مگر یہاں ایک لحظہ ہو کر رہ گئی ہے
اے غلطی نہیں کہیں گے مگر چاند کا داغ ضرور کہیں گے۔

نقشِ پاکی تو ہے بیڑا تنی یہاں، قافلہ جتنی راہوں میں ہم ہو گئے
"چلتی" کا لفظ بھیج معہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ نیز
"نقشِ پا" کا نہیں نقوش پا کا صل تھا۔

میں اس بار دار میں بچے فن کا باب کیا د ا م لگے
غلط زبان ہے۔ یوں کہنا چاہئے تھا۔
دیکھیں اس بار میں اپنے نن کے اب کیا دام لگیں
اب زبان دام کو (قیمت کے معنی میں) جمع ہی بولتے ہیں۔

میری ہستی ہے کسی لالہ خود رو کی طرح
خود رو۔ خوشبو جادو اور گلین کا قافیہ کیسے ہو سکتا ہے۔
شاعر نے اگر اس کی آ کو مرفوع سمجھا ہے تو غلط سمجھا ہے۔ یہ
مقتوح ہے (رو) اس کا قافیہ ضرور اور پو اور نو ہے۔

وہ نقطہ صد عروج ہے بہارِ دل کا مری
"صد" فاضل ہے۔ نقطہ عروج خود درجہ کمال کا منظر تھا۔
دروازے کو بند ابھی پر دوں کو گوا دو
ابھی کیا الف تفل ہو کر رہ گیا۔

حالات کی دو صورتیں دیتی ہے انسان کو ابد اور ازل دیتی ہے
جس طرح زمین زلزلوں سے گھبرا کر پوشیدہ خزانوں کو اگل دیتی ہے
دوسرا مصرع سمجھ میں نہیں آیا۔ ازل تو اس نقطہ آغاز کا نام
ہے جب حالات کا محض "بیج" پیدا ہوا تھا۔ پھر حالات نے جنم
لیا۔ پھر مڑ آئے۔ مڑ کے نتیجے میں ازل نے وجود نہیں پایا۔
ابد کا بھی کوئی تعلق مڑ بدلنے نہ بدلتے سے نہیں۔ اگلے دو
مصرعے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ازل اور ابد بھی ایسی ہی چیزوں
کے نام ہوں جو حالات کے بطن میں چھپی ہوئی ہیں۔ پھر مڑ لو
کی طرح انہیں باہر لائیں۔

سانچے میں شباب کے وہ ڈھلتے ہوئے جسم
غزروں کے فناء سے جھلٹے ہوئے جسم
خلوت میں لگ اٹھتے ہیں کوئندے کی طرح
آغوش کی گرمی سے پگھلتے ہوئے جسم

معنی و مصداق کے لحاظ سے ایسی شاعری شاید نثریہ نہ
نہی جائے۔ تقاضا صاحب جیسے متین سخنور نے اس سطح پر
اتر آنا کیسے گوارا کیا یہ حیرت انگیز ہے۔

میں اخبار میں یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ "سفینہ رنگ" پر
پوپ اردو اکاڈمی کی طرف سے دو ہزار روپے انعام ملا ہے۔ بلاشبہ
فقا صاحب ایسے ہی سخنور ہیں کہ ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔
لیکن حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہونا چاہیے کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا
ہو جائیں۔ ہم متنا کرتے ہیں کہ فقا صاحب اپنے احساس ترغ
اور خود پسندی کو ذہن سے کھرچ کر خود تنقید کی عادت
ڈالیں۔ پھر وہ عظیم شاعر بن سکتے ہیں۔

اعراف

عبدالرحیم نشتہر کا مجموعہ فکر و صفات ۱۱۴
قیمت مجلد چار روپے پچاس پیسے
• ناشر۔ بی کے پبلیکیشنز ۲۰۷۲، پربتاپ اسٹریٹ
دریا گنج دہلی ۷۷

آغاز ہی میں شاعر کی تصویر بھیجے لیکن وہ نہ بھی ہوتی تھ
بھی کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نوعمر
ہی ہوں گے۔ اگر انھیں کوئی سمجھا دیا جاتا تو یقیناً وہ مشورہ
دیتا کہ ابھی "صاحب دیوان" بننے کا ارادہ نہ کریں بلکہ کسی سہولت
رہنما سے وابستہ ہو کر اپنے اشعار کے عیوب و مہمان کو سمجھنا
محسوس کرنے کی کوشش کریں تاکہ عیوب سے بچا جائے اور محاسن
کو فرغ دیا جائے۔

کوئی شبہ نہیں کہ عزیز نشتہر کو جھانے ذہانت بھی دی
ہے اور شعر کہنے کی استعداد بھی لیکن شاید غلط قسم کے ماحول
اور خارجی محرکات نے انھیں صحیح رخ پر نشوونما کا موقع نہیں
دیا اس لئے ان کی صلاحیتیں اپنا حقیقی حسن نماں نہیں کر پاتیں
ہیں۔ ویسے بھی چالیس سال سے قبل شعور میں پختگی آتی تھی کہاں
ہے۔

ترقی پسند شاعروں کی جدت پسندیوں اور غلامیوں نے
دنیلے شعروادب میں جو افراط و تفریط پھیلائی ہے وہ کسی
صاحب فکر سے پوشیدہ نہیں۔ نئے پن کا شوق اور آزاد خیالی کا

(۱۱۲) اکا اذہ ہے ایک لہذا ہے
میں اس کو سن رہا ہوں ہواؤں کے گانے

(۱۱۳) مٹے یا بھے نیک و بد سب برابر ہی ہیں
جو نیکو خدا کا ڈر ہو تو سو جا کر

یہ بس صفحہ ہم سب کے غونے ہیں۔ آگے پڑھنے سے
وہ جان لے انکار کر دیا۔ یہ فی الحقیقت اشعار نہیں ہیں۔ بلکہ
کوئی ایسی چیز ہیں جو کا مناسب نام اب تک کی کسی ڈکشنری
میں نہیں پایا جاتا۔ ذوق لطیف اور وجدان سلیم کے لئے انکی
مثال کچھ ایسی ہے جیسے چھت پر پڑے ہوئے تین پرگی کے
بچے روڑے پتھر پھینک رہے ہوں۔ فن اور قواعد زبان کے
اعتبار سے (درا فردا ایک سرسری نظر ڈال لیجئے) ہمارا خطاب
غریزی شاعر کے ہے

صفت اور موصوف میں کوئی لکری یا مشابہاتی مناسبت
نہ ہو تو کم از کم قیاسی اور تصوراتی مناسبت تو ہو جو ہواؤں کو
بوڑھا ہے اور کمزوری کا موصوف بنانا بس مسخرہ اپن ہے۔
ادب سے اس کا کیا تعلق چنگھاڑنا آواز کی اقسام میں سے ہے۔
سورج کا آواز سے کیا واسطہ۔ پھر یہ سوائے فضول گوئی
کے اور کیا ہے کہ سورج سینے میں بھریوں۔ مزید فضول گوئی
یہ کہ چٹائیں توڑوں۔ ان باتوں میں کیا ربط اور کیا سنجیدگی
دوسرے شعر میں مفہوم ہی غائب ہے۔ یہ "میرے" کون
ذات شریف ہیں جھکے ہاتھوں میں چاند اور سورج کے دو ٹکڑے
ہیں۔ کون بہکانے آیا ہے، کیوں آیا ہے۔

تیسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کسی طوائف سے گفتگو
کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کسی اجنبی ہاتھوں میں رات گزارنے والی جاش
ہی ہو سکتی ہے۔ پھر بھلا اسے اس سے کیا دلچسپی کہ اس کی رات
کا سامنی دن بھر کہاں رہا۔ ایسے شعر شاعر اور سامع دونوں کے
ذہن و قلب کو تار یک کرتے ہیں ان سے یہی ناپا پیئے۔

آخری بس چلی گئی تو اب صبح تک یا تو اسٹینڈ پر کھڑے رہیے
یا کسی بوتل میں جا سویئے۔ آخر شاعر غیب کو بس اسٹینڈ
کی سیر کرانے سے کیا فائدہ۔ بس دل نے یوں کہا کہ "بس"
کا قافیہ مزید ارد ہے گا ہو جائے ایک شعر۔

ہمیں جس طرح ہمتی ازم کو جنم دیتا ہے اسی طرح شعر ادب میں
جہت و جدت اور نئے تجربات کا جنوں جب اعتدال سے
گزر کر خلاؤں میں کود پھانڈ کر تا ہے تو بڑے دایہ تباہی نہکا
جنم لیتے ہیں۔

غریزی شاعر ایسے ہی تجربات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں
اور ظاہر ہے یہ تاثر شعوری و ارادی نہ ہوگا۔ اسی لئے ان کا نیا لہجہ
یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم ان کے مجھے سے چند اشعار
نمونہ نقل کئے کہ کو شیش کرتے ہیں کہ وہ کچھ میرس کر سکیں۔

(۱) بوڑھی اور کزدر ہوائیں دیتی ہیں آواز بے
سینے میں چنگھاڑتا سورج بھریوں چٹائیں توڑوں

(۲) میرے بھی ہاتھوں میں چاند اور سورج کے دو ٹکڑے ہیں
بھکھو بہکانے آئے ہو میں بھی تو تینیسر ہوں

(۳) وہ اجنبی تری باہوں میں جو رہا شرب بھر
کے خبر کہ وہ دن بھر کہاں رہا ہو گا
رات کیا جانے کیسے بیتے گی

(۴) چاچی اب تو آخری بس بھی

(۵) اچھا تو اس نے آپ کو مدعو کیا ہے آج
پھر کیا ہے سورج اڑائیے اچھی ہوا ہے آج
رنگوں میں قید کہ کے کچے شوخ چشم نے

(۶) اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنا لیا
دشت اٹکار میں سوکھے ہوئے پھول کٹے

(۷) کل نری ماد کے مقرب رسولوں سے
ایک حبشی کی طرح کالی سورج

(۸) راستے میں بنی ہوئی ہے ادا
بان کے ٹھیلے، بوتل، لوگوں کا جگمگ

(۹) اپنے تنہا ہونے کا احساس بھی کب
چھلنے لگا ہوں کی سڑکوں پہ ٹھوٹا کر

(۱۰) سلقی جنم رنگا ہوں سے چو ما کر
جھستی ہواؤں کے نیروں سے حملہ کر

(۱۱) سید پریتوں کے بدن کو ہر پہن کر

۵۔ یہ بھی شعر نہیں ہے دی گئی ہے۔

۶۔ یہ شعر نہیں ہے چمکلا ہے۔

۷۔ اس کا مطلب آپ خود ہی لوگوں کو بتائیں تو شاید دماغ میں اترے۔

۸۔ حیرت ہے "اراد" بیس لفظ نظم کرتے ہوئے آپ کو خدا

مخدوس رہا کہ یہ ارباب ذوق کے وجہ ان پر کیسا کاری

زخم لگائے گا۔ کالی "پج" بھی خرافات ذہنی میں سے ہے

۹۔ اس سے تو بہتر ہے کہ بطیفہ گڑھے جائیں۔ شاعری کا ان

بازاریات سے کیا سروکار۔

۱۰۔ شعرین مسکتا تھا اگر دماغ پر جدت طرازی کا سودا سوار

نہ ہوتا۔

۱۱۔ یعنی ؟

۱۲۔ بری بات۔ خدا مسخرے پن کا موضوع نہیں ہے !

۱۳۔ جو منہ میں آنا اگل دیا۔

مجموعے میں کچھ اچھے شعر بھی ہوں گے لیکن اعلیٰ درجے

کی دیک میں دس پانچ چوبیس بھی ابال دیئے جائیں تو
سو بچ لیجئے کون ٹوٹے کھائے گا۔

عزیزم شاعر کو ہمارا خضعا مشورہ ہے کہ مزید چھپنے سے
پہلے کسی مبین اور ذی علم استاد کا دامن پکڑ لیں۔

فقط والسلام

وحدة الوجود | اہل معرفت کے مشہور مسلک "وحدة الوجود"
پر حقائق گفتگو حضرت محمدی دلف ثانیؒ

کا بیان اور اسکے اسرار۔ قیمت مجلد — ڈھائی روپے۔

مکاتیب گیلانی | مولانا مناظر حسن گیلانیؒ کے قابل قدر

خطوط کا مجموعہ معقول و منقول

کا خزانہ۔ قیمت مجلد پلاسٹک — دس روپے۔

مجلد سادہ — آٹھ روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (پاکستان)

غزل

(عبدالمبین نیاز۔ بھوپالی)

اس جہاں میں کم ملیں گے اہل فوج سے سینہ چاک

غنجے ہوتے ہیں گلے ملکر یوں سے سینہ چاک

ہو گیا ہے آپ کے طرز سخن سے سینہ چاک

خواہشیں نکلی ہیں دل کی انجمن سے سینہ چاک

ہو گیا سوچ کی اک ننھی کمر سے سینہ چاک

کیا خبر تھی ہوا نکلیں گے چمن سے سینہ چاک

ان پہ ہی ہر شتر غم آزماتی ہے حیات

قربت محبوب لاتی ہے جدائی کا الم !

آپ تو میرے مسحا بن کے آئے تھے مگر

عشق کی ناشقہ عالی جانے کس منزل میں ہے

لوگ سمجھتے تھے دواچی ہے انا دھیر کا وجود

شوق سیر گل لئے پہنچے تھے ہم تو لے نیاز

بہت کچھ کہتا ہے۔ ان کی معرکہ الآراء تصنیف "خلافت و ملوکیت" کو پہلی فرصت میں دیکھئے "اسلامی ریاست" مل جائے تو اسے بھی پڑھیں۔ اور مکتبہ جماعت اسلامی ہند سے فہرست کتب طلب گہم کے بعض اور کتابیں منتخب فرمائیں جن میں یہ موضوع زیر بحث آیا ہو۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اتنا کچھ لکھنے کے باوجود شاید میں آپ کی انھیں رفع نہ کر سکا ہوں گا۔ یہ میری نااہلی ہی سمجھئے بہر حال آپ کے لئے موجودہ مرحلے میں سب سے زیادہ لائق توجہ اور متوجہ رہنا یہ بات ہے کہ موجودہ زندگی کے چند بقیہ دن گزارنے کے بعد آپ کو بالیقین جس نئی زندگی اور نئی دنیا سے سابقہ پڑنا ہے وہاں کے آرام و آسائش کی خاطر فوری طور پر کوئی مثبت قدم اٹھائیں۔ یا پھر انہی موجودہ ہی حالت میں موت کا استقبال کریں۔ میری دعا ہے اور تمنا بھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاآت عطا فرمائے اور جس پیغمبر کو آپ کے صداق و امین بن لیا ہے اس پر ایمان کا اعلان مانگ کر بھی کر سکیں۔ اس دعا اور تمنا میں جذبہ فہمیت کا کوئی شمول نہیں۔ درحقیقت آدم کے بیٹے کی حیثیت میں سب انسان بھائی بھائی ہیں اور آپ کے تو میرا دہرا ہشتہ ہے۔ آدمیت کا بھی اور ذنیت کا بھی۔ میرے دل کا تقاضا کیوں نہ یہ ہو کہ میرا سر بھائی اور ہر ہم وطن آخرت کے آرام و راحت سے ہم کنار ہو اور اس دین کو قبول کرنے کے لئے اس کا سہیلہ کھل جائے جسے قبول کرنے بغیر اخروی فلاح کی کوئی توقع ہی نہیں ہے۔ فقط والسلام علی من اتبع الهدی۔

تجارتی سود
تاریخی اور فقہی نقطہ نظر سے
جدید و قدیم دونوں علوم کی روشنی میں تجارتی سود پر گفتگو۔ زبان سلیس، راسخ و شگفتہ دلائل قوی، مواد حقائقانہ۔ آٹھ روپے۔

احکام شرعیہ میں از:- مولانا تقی امینی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ شریعت کے احکام حالات و زمانہ کی رعایت کے ساتھ ہر حال میں کمال نظر رکھتے ہیں۔ تمام مواد جو اہل علم سے آراستہ قیمت غیر مجلد۔ سات روپے۔

تاریخ دیوبند یہ مشہور کتاب اب علامہ اضافوں کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔ دیوبند کی مکمل تاریخ۔ حقائق اور دلچسپ۔ قیمت۔ آٹھ روپے۔
تفسیر رشیدی مولانا رشید احمد گنگوہی کے قلم سے ہیں آیات قرآنیہ کی قابل مطالعہ تفسیر عارنانہ اور حقائقانہ۔ قیمت۔ ڈھائی روپے۔

انفاس عسیٰ حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانی تصنیفات سے تصوف و شریعت اخلاص اصلاح معاشرہ اور دیگر بے شمار موضوعات پر دینی دانش کی روشنی میں دلچسپ اور روح پرور۔ قیمت۔ اٹھارہ روپے۔
مدارج سلوک ڈاکٹر میر ولی الدین کی مفید کتاب۔ مطالعہ آپ کے لئے مفید ہوگا۔ قیمت۔ ساڑھے چھ روپے۔
مکتوبہ مجد الفانی حضرت شیخ احمد سرمدی کے خطوط تمام اہل علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا تحفہ سمجھے گئے ہیں۔ سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے۔ قیمت مجلد اول۔ پندرہ روپے۔ جلد دوم۔ اٹھارہ روپے۔ جلد سوم۔ پندرہ روپے۔

حیات الحسنى مولانا علی میاں کے خامسہ اردو نگار سے۔ ایک ممتاز عالم دین اور خادم ملت کی ایک ایمان آور زندگی کا سوانح۔ قیمت مجلد۔ گیارہ روپے۔

محمد سلیمان میرٹھی دمدرد دار الحدیث مطلع العلماء میرٹھی

مولانا اسد رحمانی کے نام

محترم مولانا عامر عثمانی صاحب مدبر و مسئول ماہنامہ
نئی دیوبند۔ سلام مستنون۔

تجلی مطابق دسمبر ۱۹۸۳ء کے صفحہ ۴ پر ایک مضمون
رویت ہلال اور ہمارا موجودہ رویہ ”نظر سنجیدہ ۱۔“
نسل مضمون نگار مولانا اسد رحمانی صاحب نے اپنے
مون کو پھیلاتے ہوئے ایک ذیلی سرخی ”عوام کا
بھی ہلال عید ہے“ کے تحت رقم فرمایا ہے کہ ایک بار
نتہ کے اندر میری موجودگی میں ۲۹ رمضان کو چاند
رویت نہ ہو سکی۔ بڑی مسجد کے امام اور متولی نے
ناحمد حسین میرٹھی کو مشورہ کئے لئے بلوایا اور ایک جگہ
نامیرٹھی اور حافظ محمد یوسف کو رویت کی تحقیق کے
لیجا گیا۔ واپسی پر بالاتفاق فیصلہ کیا گیا کہ چاند کی خبر
نہ کے بعد غلط ثابت ہوئی لہذا کل عید نہیں ہوگی۔
اچانک رات کو گیارہ بجے بڑی مسجد کی سرخ جی
ی گئی جو اس بات کی علامت تھی کہ چاند ہو گیا
عید ہوگی۔ فی الفور مولانا میرٹھی بڑی مسجد کے
احب کے پاس شریف لے گئے۔ مولانا میرٹھی کے
مار پر امام صاحب نے فرمایا کہ چاند ہو گیا اس کا یقین
انہیں ہے مگر عوام کے تجربے عجیب ہو کر جی جلا دی
ہے۔ اس گفتگو کے بعد مولانا میرٹھی لوٹ آئے اور
لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو میں کل روزہ رکھوں گا۔ مگر
باؤ کے آگے مولانا میرٹھی مرحوم جھک گئے اور خود
رکھ کر نماز عید پڑھائی۔

اس مضمون میں جہاں حضرت مولانا سید عبد الرحیم

صاحب مرحوم دقانہ جماعت مولانا ڈاکٹر سید عبد الحفیظ
صاحب سلفی کے متعلق مبالغہ آیز غلط باتیں تحریر ہیں۔ اسی
کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا محمد حسین میرٹھی مرحوم پر بھی سرا
یہ افتراء اور بہتان موجد ہے کہ انھوں نے ”خود روزہ
رکھ کر نماز عید پڑھائی۔“

اس مضمون کو پڑھ کر مجھے یہ یاد آیا کہ مولانا میرٹھی
مرحوم ۱۹۵۶ء میں کلکتہ امام و خطیب کی حیثیت سے
دوبارہ تشریف لے گئے اور ۱۹۵۸ء تک جامع مسجد
اہل حدیث کلکتہ میں امامت و خطابت کے فرائض
بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

اس ۱۳ سالہ دور میں مولانا میرٹھی مرحوم برابر
عیدین کی نماز کلکتہ میں پڑھاتے رہے اور اہل الحدیث
نے لاکھوں سے لے کر چالیس لاکھ تک مولانا مرحوم کے ساتھ
ہی تمام رمضان گزراے اور عید الفطر کی نمازیں ادا
ادائیں مگر ایسا کوئی واقعہ میرے ذہن میں محفوظ نہیں
جس کے نتیجے میں مولانا مرحوم نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ
چاند نہیں پڑا اور روزہ بھی رکھا ہو اور عوام الناس کو
خوش کرنے کے لئے بحالیت روزہ عید کی نماز بھی پڑھائی۔
یہ حقیقت ہے کہ کلکتہ میں رویت سے متعلق اختلافات

کم و بیش ہر سال رونما ہوتے ہیں مولانا میرٹھی کے دور
میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا ۱۳ سالہ مدت میں سب سے
سنگین اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب کہ ناخذ مسجد
کے امام شیخ احمد کمال مدنی نے ۲۹ شعبان کو یہ اعلان
کہ رمضان کا چاند یارک میرٹھی کے علاقہ میں لکھا گیا ہے

خطوط لکھے مگر مولانا نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اب میں بواسطہ تجلی مولانا سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی تحریر کے ثبوت میں شواہد پیش کریں یا تجلی ہی میں محدث جاہیں تاکہ وہ خدا کے اس عذاب سے اپنے کو بچا سکیں جو مفسرین کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

تجلی

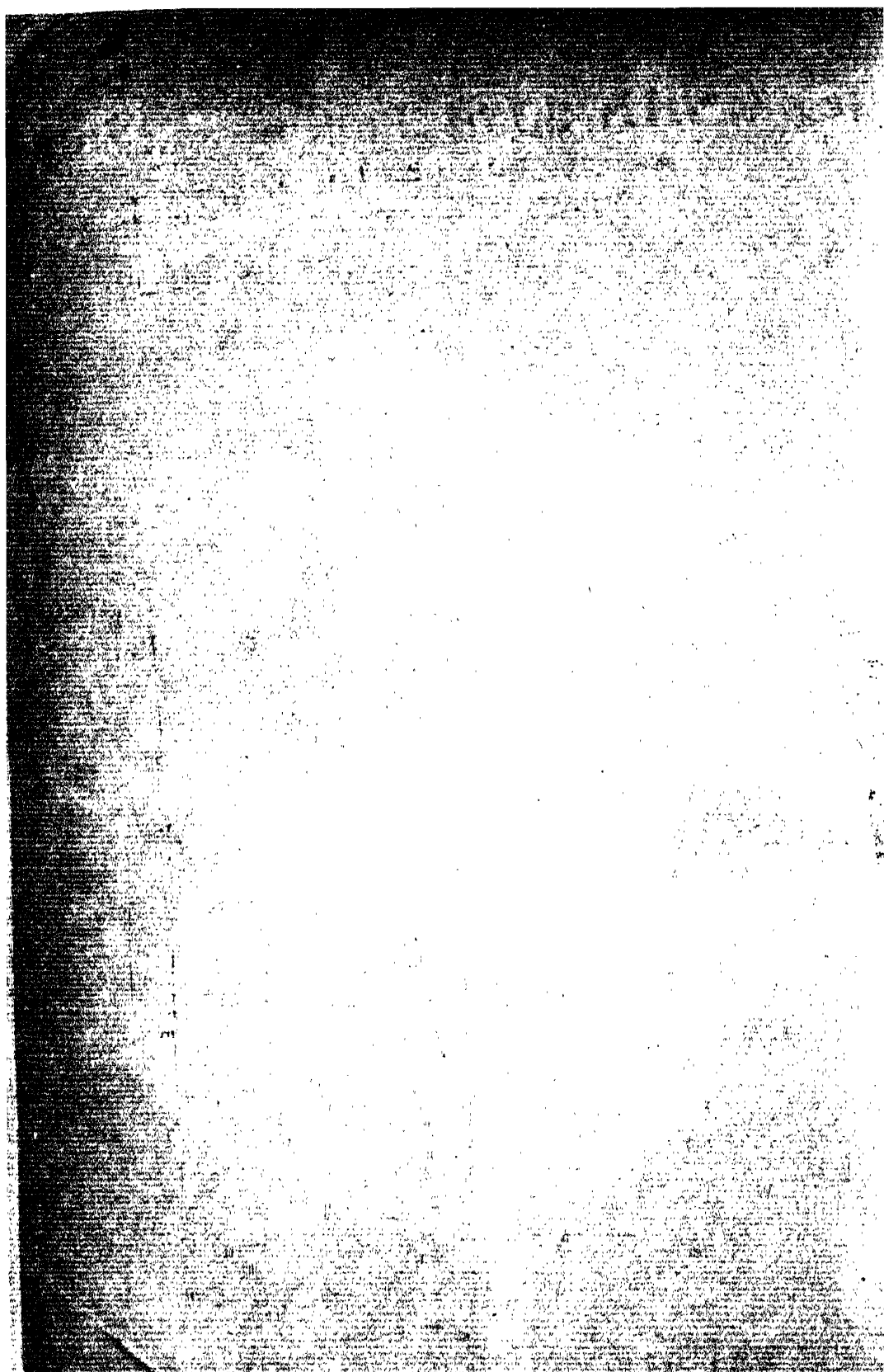
یہ مراسلہ اپریل ۱۹۳۷ء میں موصول ہوا تھا۔ اپریل کے بعد ”طلاق نمبر“ ہی نکلا ہے جس میں اس کے شمول کی گنجائش نہ تھی۔ اب گنجائش نکال کر اسے اس لئے شامل اشاعت کر دیا گیا ہے کہ صحافتی دیانت کا تقاضا پورا ہو۔ یہ بڑی تکلیف کی بات ہے کہ مراسلہ نگار جناب محمد سلیمان نے مولانا اسد رحمانی کو خطوط لکھے اور وہاں سے جواب نہیں ملا۔ ہمیں بے تحقیق الزام تراشیوں سے بھی بچنی نہیں ہوئی۔ مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اسد رحمانی نے تجلی میں جو مضمون شائع کرایا اس میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ یہ مسئلہ خبر و روایت کا ہے لہذا مزید بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ غلط الزام لگانے والوں کو نیک توفیق دے اور جن پر یہ الزامات لگائے گئے انھیں مظلومیت کا اجر عطا فرمائے۔

لہذا وہاں کی رویت پر میں اعلان کرتا ہوں کہ کل پہلا بند رکھا جائے چونکہ یہ اعلان نصف شرب کے کافی بعد کیا گیا تھا لہذا مولانا میرٹھی نے فرمایا کہ سحری کھائی جائے اور نماز فجر کے بعد ہم خود پارک سرکس جا کر تحقیق کریں گے۔ سحری کھائی، نماز پڑھائی اور نماز کے فوراً بعد ہی پارک سرکس کے علاقہ میں پہنچ گئے تقریباً تین گھنٹے تک ممکن درمکان گھومے لیکن اس علاقہ کے لوگوں نے یہی بتایا کہ یہاں کسی نے چاند نہیں دیکھا ہم نے تو بڑی مسجد کے اعلان پر روزہ رکھا ہے مولانا میرٹھی نے وہاں آکر بڑی مسجد کے ذمہ دار حضرات سے ان لوگوں کا تہہ معلوم کرنا چاہا جنھوں نے شہادت دی تھی لیکن بجائے مطمئن کرنے کے ملا جان مرحوم وغیرہ نے یہ فرمایا کہ ”رویت کی تحقیق ہر آدمی کا کام نہیں اعلان ہو گیا اس روز رکھ لو۔“ اس میں جنسین اور چٹان کی گنجائش نہیں۔ مولانا میرٹھی نے یہ فرماتے ہوئے کہ ہم اس رویت سے مطمئن نہیں روزہ توڑ دیا اور ایک بڑی تعداد نے اس معاملے میں مولانا میرٹھی کا ساتھ دیا۔

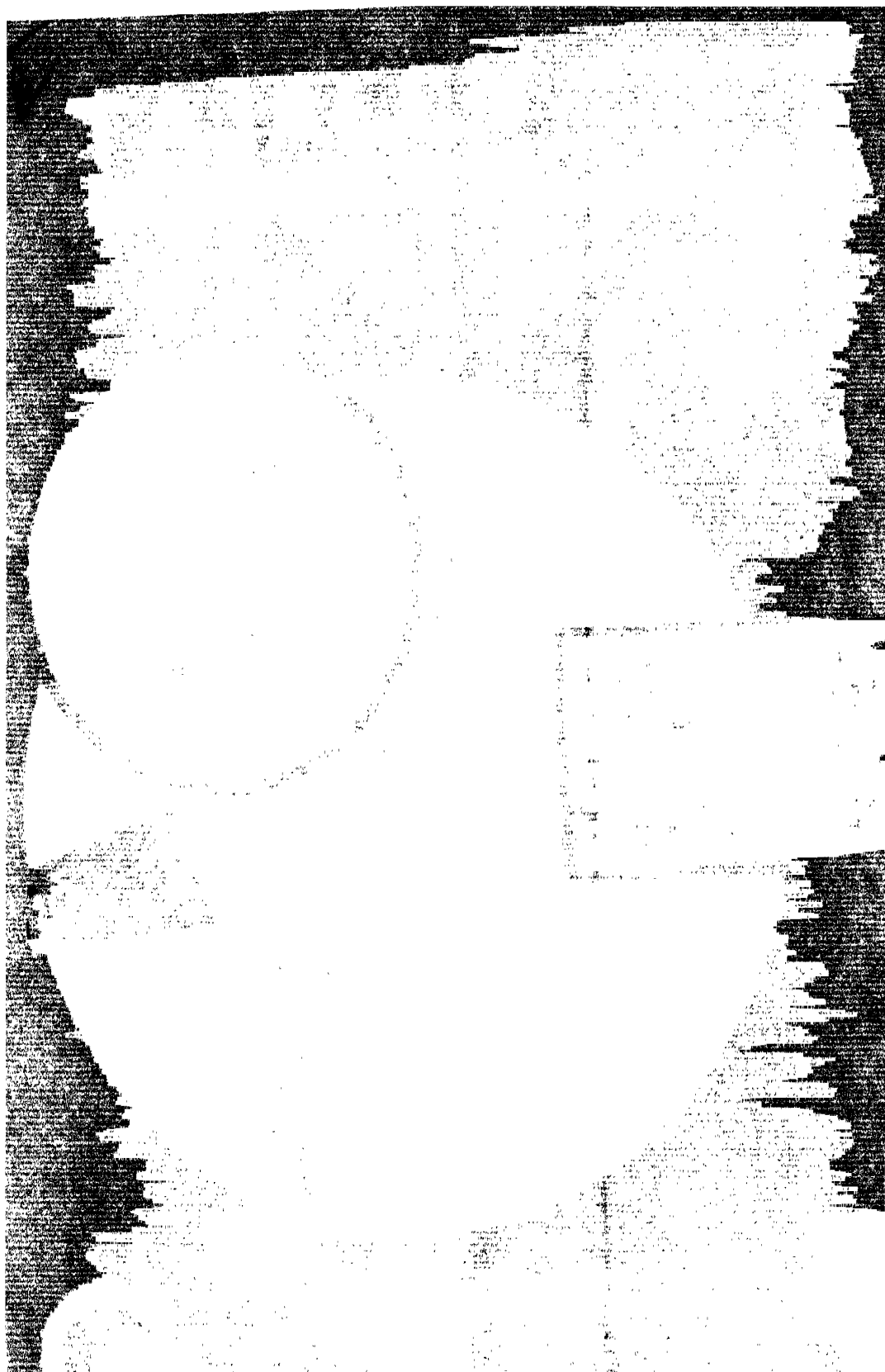
میرے خیال میں رویت سے متعلق یہ سبب شدید اختلاف تھا جو اختتام رمضان تک جاری رہا تا وقتیکہ چاند نے اس کا فیصلہ نہ کر دیا۔

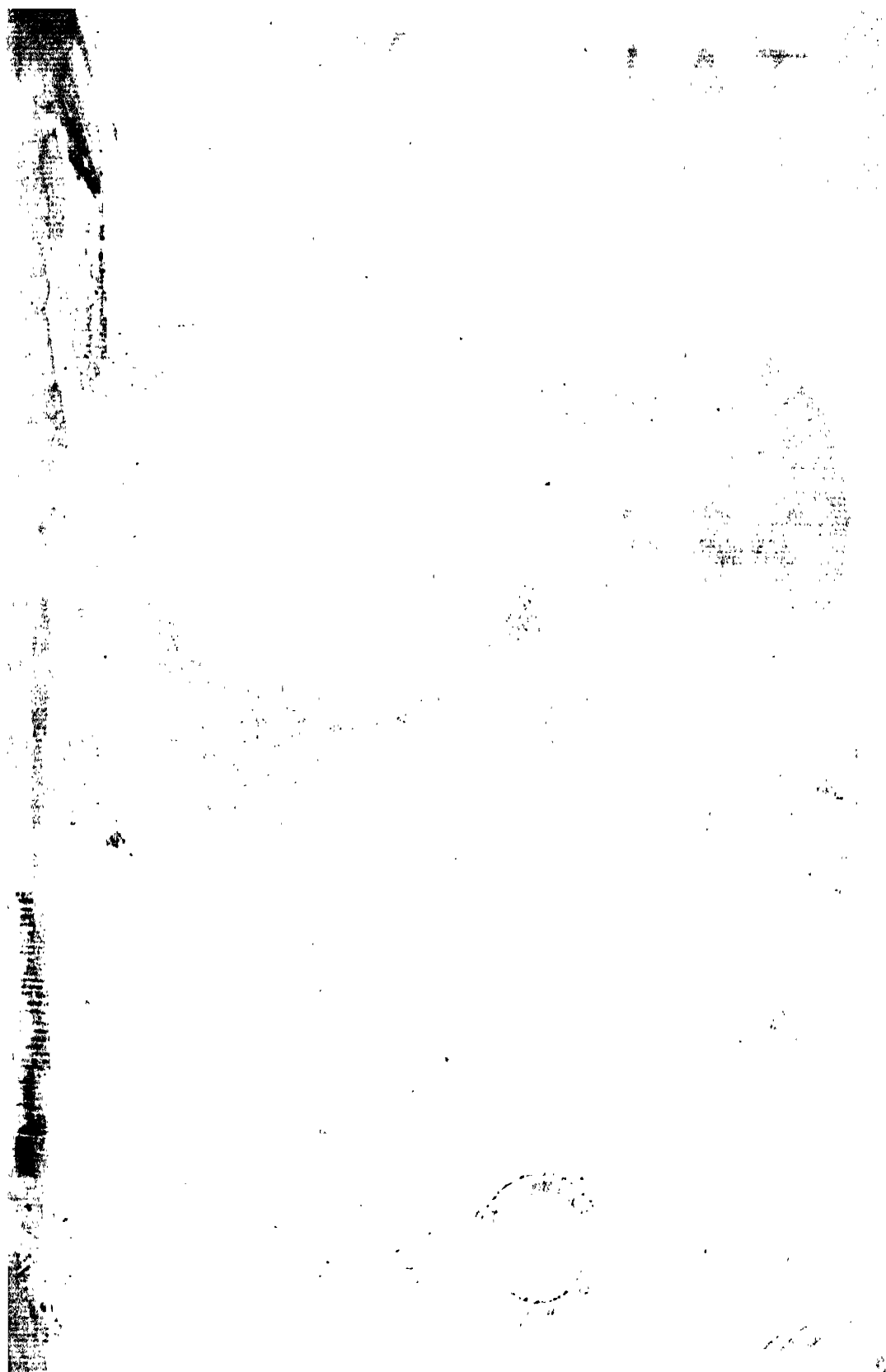
اس کے علاوہ چند بار اختلافات اور بھی ہوئے لیکن مولانا اسد رحمانی صاحب نے جو صورت حال سامنے رکھی ہے میں دعوے سے لکھتا ہوں کہ مولانا میرٹھی مرحوم کے ۱۱ سالہ دور میں ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی۔ کتنی بڑی غلط بیانی ہے کہ مضمون کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک فرضی واقعہ تحریر کر دیا اور اس کا انتساب اس شخص کی طرف کیا جس کی حق گوئی اور بیباکی کو صرف اہل کلکتہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ساری جماعت اہل حدیث جانتی ہیں ایسی باتوں کا نظریہ عام پر آنا بالکل مناسب نہیں سمجھتا یہی وجہ ہے کہ میں نے تجلی میں اپنی گزارشات بھیجنے سے قبل بواسطہ مولانا اسد رحمانی کے پاس متعدد

وحدة الوجود اہل معرفت کے مشہور مسلک ”وحدة الوجود“ پر محققانہ گفتگو حضرت محمد دلف بانی کا بیان اور اسکے اسرار۔ قیمت مجلد — ڈھائی روپے۔
مکاتیب گیلانی مولانا مناظر حسن گیلانیؒ کے قابل منقول کا خزانہ۔ قیمت مجلد بلا شکر — دس روپے۔
فضائل نماز شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مشہور کتاب۔ علمی طباعت کے ساتھ۔ قیمت — ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔
مکتبہ تجلی — دیوبند (دیوبند)









بسم اللہ الرحمن الرحیم

امریکہ۔ انگلینڈ۔ ناٹجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا اور
میلیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک ڈیڑھ پونڈ۔ ہوائی ڈاک
۵ پونڈ۔ بحرین افریقہ۔ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ
بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ۔

ماہنامہ سبلی
دیوبند

چھبیسویں سال کا چھٹا شمارہ

ایڈیٹر
عامر عثمانی

فہرست ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۴	ادارہ	احوال واقعی
۵	عامر عثمانی	آغاز سخن
۹	افندو آقباس	بلا تبصرہ
۱۱	عامر عثمانی	تجلی کی ڈاک
۳۳	"	غزل
۳۵	"	مدیر زندگی کا مراسلہ
۴۷	"	اور اس کا جواب
۵۱	ملا ابن العربی مکی	تفسیر باجدی
۶۳	عبد المجید (ترجمہ)	مسجد سے منجانب ناک
۶۷	عامر عثمانی	ترقی پسند مسلمان کہتے ہیں
		کھرے کھوٹے

اس دائرے میں شرح
نشان ہے تو سمجھ لیجئے
اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو
منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا دی بی
کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ
رکھنی بلکہ تبھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی
صورت میں اسکا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا
جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔
وی پی بائیس روپے کا ہوگا۔
منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی پیج
سے نچ جائیں گے

اس شمارے کی قیمت
دو روپے

سالانہ قیمت
بیس روپے

اسلامی پریس۔ دیوبند

احوال واقعی

اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ تجلی کی اشاعت کا بگڑا ہوا نظام درست ہوا۔ پچھلا شمارہ اعلان کے مطابق گزشتہ کے آخری عشرے میں آپ تک پہنچ گیا تھا۔ اب یہ شمارہ بھی انشاء اللہ بروقت ہی آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

کاغذ کا مسئلہ اگرچہ وقتی طور پر حل ہو گیا ہے لیکن ابھی سے یہ اطلاع بھی مل گئی ہے کہ کئی سو روپے ٹن دام اور پڑھ گئے ہیں۔ یعنی لاگت اور فروخت میں توازن قائم رکھنے کا جو براہِ علم بحالتِ موجودہ ہی ددِ سر بنا ہوا ہے وہ چند ماہ بعد درجہِ جگر اور درجہِ ذل بننے والا ہے۔ کس سے کہیں اور کیا کہیں۔ ہماری سرکار عالیہ سکیوں کے معاملے میں حد سے زیادہ وسیع نظر مونی جا رہی ہے۔ پہلے سال بہ سال ٹیکسوں کا اضافہ ہوا کرتا تھا اب دورانِ سال میں جب چاہے ہو سکتا ہے۔ ساتھ ساتھ حکومت یہ بھی اعلان کرتی ہے کہ عوام پر اس کا بوجھ نہیں پڑے گا لیکن یہ اعلان جیسا کچھ خسرو اور استہزاد اپنے اندر رکھتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہر نئے ٹیکس کا بوجھ آخر کار عوام ہی کی اس کمر بے جا بڑ تاسے جو دہری کے بعد ہری ہو چکی ہے اور خدا کے کروڑوں بندے انتہائی پریشانیوں اور مایوسیوں کے تاریک غاروں میں ٹیڑوں مکوڑوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسری طرف ایک بڑا طبقہ ہے جسے خبری نہیں کہ گرائی کس چڑیا کا نام ہے۔ اس کے پاس بے شمار دولت ہے۔ کوئی بھی چیز وہ برقریت پر بے آسانی خرید سکتا ہے۔ اس عجیب صورتِ حال میں ہم جیسے بے رنگ و نام بھی کھولیں تو کیا کھولیں۔

بہر حال صبر کے سوا چارہ نہیں۔ ہم جہاں تک لڑ سکتے ہیں حالات سے لڑیں گے اور دین و ملت کی جو کوئی پھوٹی خدمت انجام دے رہے ہیں اسے دے چلے جائیں گے۔ مددِ مدد پکارنا اور تعاون کی اپیلیں کرنا ہماری عادت نہیں۔ جو لوگ تجلی کو مفید سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی انھیں عزیز ہے وہ خود ہی اس حقیقت کو ملحوظ رکھیں کہ تجلی جیسے جریدوں کے لئے بڑے ٹھکانے مراحل آگئے ہیں۔ حکومت کے اشتہارات لینے پر ابھی تک ہمارے قلب کو اشتراح نہیں ہوا۔ اشتراح کے بغیر یہ کام ہم کریں گے نہیں۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ پرچے میں ایک بھی اشتہار نہ ہو۔ بغیر اشتہارات کی معقول اجرت کے پرچے کی آمدنی خرچِ پر بازی لے جائے یہ کافی دشوار بن گیا ہے لہذا تجلی کے خالصین اور محبین اپنے امکانی تعاون سے فاضل نہ ہوں اور یہ انتظار نہ کریں کہ جب کوئی اپیل شائع ہوگی اسی وقت مرگرجی دکھائی جائے گی۔

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرت ابنے سواتام مسلمانوں کو دہائی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اصل محمد بن عبد الوہاب کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو کمالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں اس کتاب کا مطالعہ فرما کر اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبد الوہاب کا عقیدہ نسبت کے خدائی بدعت کے دشمن اور دینِ ملت کے خیر خواہ تھے۔ اگر یہ سچ نہیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں اس بدنامی میں چارچاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف قطر کے حکمران شریعہ کے قاضی احمد بن جبرین اور ترجمہ صفی الرحمن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل ترجمہ نے مشرقت نوٹ بھی لکھے ہیں۔ قیمت۔ ساڑھے چار روپے۔ پتہ۔ مکتبہ تجلی۔ دیوبند (دیوبند)۔

آغاز سخن

اور مقلد کیوں نہ بن جائیں۔ یہی راستہ بہتر نظر آتا ہے۔
(۳) اگر اس طرح مسلک کی تبدیلی سے احباب و اعتدال
کی ناراضگی اور قطع تعلق کا خوف ہو تو انھیں سمجھائیے اور
بے خوف ہو کر مسلک تبدیل فرما لیجئے۔

یہ تھے مہل صاحب کے نامہ اخلاص کے مندرجات۔
وہ لکھتے ہیں کہ مجھے رابطہ و ضبط اور دیکھ بھال کی بناء پر مجھے امید
تھی کہ میرا خط کچھ سا گر ہو گا لیکن مہل صاحب کے دیئے ہوئے
جواب کے میری امید پر پانی پھیر دیا۔

اب یہ خط موصوف نے اس فرمائش کے ساتھ ہمیں
ارسال کر دیا ہے کہ اس پر تجلی میں لکھا جائے۔ خصوصاً تقلید
اور بے تقلیدی کے موضوع پر مفصل گفتگو کی جائے۔ اس
فرمائش کے ساتھ موصوف نے یہ بھی وضاحت فرمادی ہے کہ
شمس صاحب کا خط بہاں بھیج دینے کی اطلاع وہ صاحب خط
کو دے چکے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اظہار خیال
کرنے کا خواہر تجلی کے لئے پیدا کر دیا گیا ہے۔

نیچے شمس صاحب کا خط بھی ملا خطہ فرما لیجئے۔ وہ مہل صاحب

تجلی پڑھنے والوں میں ایک کرم فرما ہیں آدم۔ اس
اے ٹیل۔ دین کے معاملے میں پُر جوش اور اخلاص کی پیش۔
ان کے کچھ تعلقات جناب شمس پیرزادہ صاحب سے بھی ہیں مہل
پیرزادہ بھی ان مقالہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے تین طلاؤں
دانے سمینار کو اپنے مقالہ سے رونق بخشی تھی۔ ان کا مقالہ
بھی تجلی کے ”طلاق نمبر“ میں زیر بحث آچکا ہے۔

مہل صاحب نے تجلی طلاق نمبر پڑھ کر انھیں ایک خط لکھا
اس کے کچھ مندرجات یہ تھے۔

(۱) میرا مشورہ ہے کہ آپ عام عثمانی صاحب کے دلائل کو
سلیم کرتے ہوئے اپنے مقالہ سے رجوع فرمالیں۔ یا پھر ان
دلائل پر نقد و تبصرہ کر کے یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں یہ خاصی
دریہ گزری ہے۔

یہ مشورہ دیتے ہوئے مہل صاحب نے اپنے اس خیال کا
ای بر ملا اظہار کر دیا تھا کہ تجلی کے دلائل وبراہین کا رد
کے لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

(۲) آپ آخر ذیل حدیث اور غیر مقلد ہی کیوں نہیں حنفی

کہا جاتا ہے کہ :-
 "محمدری اسلام علیکم۔ مگر اسی نامہ مندرجہ حکم اگر
 موصول ہوا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے تجلی کا طلاق نمبر تو بڑھ
 یا لیکن زندگی کا طلاق نمبر جس میں مقالات شائع ہوئے
 ہیں، نہیں پڑھا۔ اس طرح مقالات کو دیکھے بغیر تجلی کی
 تنقید سے آپ مطمئن ہو گئے! بہر حال آپ جس رائے پر
 مطمئن ہیں وہی اختیار فرمائیں۔ راتم الحروف جب علم حبیب
 کے دلائل سے مطمئن نہیں ہے تو وہ کیوں ان کی رائے سے
 اتفاق کرے گا!

یہ بھی آپ کی فیصاحت کہ "حقیقی اور مفاد موعا۔ ہے۔"
 تو اس کے لئے قرآن و سنت کی کوئی دلیل ہو تو ارشاد
 فرمائیے ورنہ انہی من مانی باتوں کو شرعی حکم کا درجہ دینا
 کفایتی زبردست قلعی ہے اس پر آپ خود ہی بخور فرمائیں
 اللہ تعالیٰ نے تو صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
 کا حکم دیا ہے کسی مسلک کی تقلید کا حکم نہ قرآن میں ہے اور
 نہ سنت میں۔

رشتہ داروں سے کٹ جانے کا مجھے کوئی خوف نہیں،
 اور نہ میرے کسی مسلک کو اختیار کرنے میں میرا کوئی رشتہ
 دار کا وٹ پیدا کر سکتا ہے۔ آپ نے یہ بات محض اٹکل سے
 لکھی۔ والسلام۔ شمس پر زادہ :-
 آپ کے خاصا تفصیلی جواب تو ہم ٹیلی صبا کو دے
 چکے۔ اب مناسب معایم ہوتا ہے کہ مزید اظہار خیال کے
 لئے شمس صبا ہی کو مخاطب بنائیں تاکہ درمیان میں کوئی
 حیرری پردہ باقی نہ رہ جائے۔

اے بہت ہی محترم دوست! اللہ تعالیٰ آپ کو
 عافیت دارین سے نوازے۔
 جو بات آپ نے ٹیلی صبا کو لکھی ہے اس سے ظاہر
 ہوتا ہے کہ زندگی کے طلاق نمبر میں کوئی ایسا مواد بھی باقی
 رہ گیا ہے جسے نالائق مدیر تجلی نے نظر انداز کر دیا اور وہ
 مواد ایسے دلائل و شواہد اپنے دامن میں سیٹھکے ہوئے ہے
 کہ ٹیلی صبا جب اس کا مطالعہ کر لیتے تو محسوس کرتے

کہ تجلی کی تنقید ترشہ غیر تسلی بخش اور ناکام ہے۔
 میں عرض کروں گا کہ اگر یہ بات آپ نے محض
 دفع الوقتی کے لئے حوالہ علم نہیں کی بلکہ اس میں رانی
 برابر بھی سچائی ہے تو حق پرستی اور اخلاص فی الدین کا تقاضا
 ہے کہ آپ اس مواد کی نشاندہی کریں اور نالائق مدیر تجلی
 کے نقد و نظر کی زلف دوتا میں امیر ہو جانے والے بشمار
 بن جگان خدا کو بتلائیں کہ کھیں فریب دیا گیا ہے۔ زندگی
 کے مقالات میں ابھی فلاں فلاں دلائل ایسے موجود ہیں جو
 رد نہیں کئے جاسکے اور ان کی رو سے مقالہ نگاروں ہی کا
 مسلک و موقف برحق ثابت ہوتا ہے۔

میرا ناچیز خیال ہے کہ ایسا کہنا آپ کے لئے ممکن نہیں
 ہے۔ سچ ہی نہیں پہلے سے میری عادت اور روش یہ ہی
 ہے کہ جس مسلک سے مجھے اختلاف ہوتا ہے اس کے تمام
 موافق و مخالف دلائل پر دیانت داری سے نگاہ غور
 ڈالتا ہوں اور پھر ہر بہر مخالف دلیل کا ضعف واضح
 کرتے ہوئے تمام موافق دلائل کو ترجیح و بسط سے پیش کرتا
 ہوں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ کوئی مسلک اگر دس دلائل سے
 ثابت ہو رہا ہے تو اسے رد کرنے کے لئے اس کے دس
 دلائل کا توڑ کرنا ہو گا۔ اگر نو دلائل کی کمزوری واضح
 کر دی لیکن ایک دلیل شکست و ریخت سے بچ گئی تو
 یہ دعویٰ درست نہ ہو گا کہ یہ مسلک غلط ثابت کر دیا
 گیا۔ لہذا کیسے ممکن تھا کہ زندگی میں شائع شدہ مقالات
 کے صرف بعض دلائل پر میں گفتگو کرتا اور بعض کو نظر
 انداز کر جاتا۔ مجاورہ ہے نہ گھوڑا دور نہ میدان۔ دو پہر
 مجاورہ ہے ہاتھ لنگن کو آرسی کیا ہے۔ زندگی اور تجلی
 دونوں کے طلاق نمبر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مارکیٹ میں موجود
 ہیں۔ آپ کے پاس بھی ہوں گے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خود دہن لگا
 کر پھر سے مطالعہ کیجئے اور بلا تکلف نشاندہی فرمائیے کہ مسئلہ
 طلاق پر آپ کے موقف و مسلک کے حق میں وہ کونسی دلیل مقالہ
 میں بچی رہ گئی ہے جسے نالائق مدیر تجلی کے خامہ نقد نے
 کھریلا اور ٹولا نہ ہو۔ آپ تو فقط مقالات کی بات کر رہے

ہیں۔ مجھ ناکارہ نے تو آپ کے مسلک والے بہتیرے ایسے دلائل بھی دائرہ نقد میں لے لئے ہیں جو مقالات میں مندرج نہیں اور جن علامہ ابن قیم کی تقلید جاء آپ حضرات اس مسئلہ میں کرتے ہیں ان کے اکثر دلائل کو کھنگال ڈالا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرا ہر استدلال حرف آخر اور ہر خیال پتھر کی نیکر ہو اگر تاہم۔ العیاذ باللہ میں بھی ایک ضعیف اور ناتواں انسان ہی ہوں۔ مجھ سے بھی فکر و استدلال اور عرض و بیان کی خطائیں ہر ملامتزد ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ پیل حصہ کو جو جواب آپ نے دیا ہے وہ حقائق سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے اپنی ذرا نیت میں مقالات مطبوعہ کے کسی مثبت و منفی استدلال اور کسی عقلی و عقلی گوشے کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر پھر بھی آپ میری کوتاہ نظری پر مہر میں تو نسیم اللہ۔ زندگی کے صفحات سے وہ چیزیں نکال کر سامنے لائے جیسے جو آپ کے نزدیک میرے دست نقد کی پہنچ سے دور رہ گئی ہیں۔ میں اپنی کم نگاہی کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر دیانت دارانہ اظہار خیال کروں گا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوتی کہ پیل حصہ کو آپ نے ایک چلتا ہوا سا جواب دیدیا اور بات ختم کر دی۔

ابا میرے دلائل سے آپ کا مطمئن نہ ہونا۔ تو میرے درست میں ناکارہ کیا چیز ہوں۔ خدا کے جلیل القدر پیغمبر بھی بے شمار ان لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے جن کے لئے مسیت کا فیصلہ تھا کہ وہ مطمئن نہ ہوں۔ دلائل بنعوت کی گولی یا کمان کا تیر نہیں ہوتے کہ زبردستی بھیجے اور سینے میں ترار ہو جائیں۔ ان کی تاثیر کا مدار مخاطب کی اپنی نفیاً اور ذہنی و قلبی کیفیات پر ہے۔ آنجناب نے اگر تہہ ہی کر لیا ہے کہ جس معاملے میں جو رائے قائم کر چکے ہیں اس سے نہیں ہٹیں گے تو یہ بندہ بے بضاعت کیا حقیقت رکھتا ہے اسلاطون اور امسطو اور غزالی اور ابوحنیفہ بھی اپنی ابدی آرام گاہوں سے اٹھ آئیں تو آپ کی رائے پر اثر انداز نہ ہو سکیں گے۔

خدا تو رفیق دے تو تجلی کا طلاق نمبر ایک بار پھر ورق ورق پڑھیں اور غور فرمائیں کہ مدیر تجلی نے نام بنام جملہ مقالہ نگاروں کی جو عقلی نارسائیاں، فکری خامیاں اور نفس دروایت کی خطائیں شرح و بسط سے منقح کی ہیں انہیں کہاں کیا غلطی ہے اور جو آنجناب کے دلائل کے نام پر جو مواد اپنے مقالے میں پیش کیا ہے وہ جائزے اور نقد کے بعد کس حال میں ہے۔ مجھے بڑا رنج اور تہمت ہے کہ دلائل شواہد کا پورا راسخ بھی آپ پر مطلق اثر نہ ڈال سکا یہاں تک کہ خدا رسول اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے صف در صف فیصلے اور فتوے بھی آپ کی بارگاہ ناز میں ایسا سا مٹھ لے کر رہ گئے۔ یہ فیصلے اور فتوے اگرچہ عدم تجاوش کی بنا پر ترتیب و انضباط کے ساتھ طلاق نمبر میں نہ آسکے تھے لیکن ذیل بہر حال آئے تھے اور نیچے پھلے شمارے میں تو منضبط طور پر بھی آچکے۔ کیا ان کی کوئی قیمت نہیں؟ کیا حق پسندی کا شیوہ یہی ہے کہ اپنی رائے کے آگے کسی کی بات نہ سنی جائے؟

بہر حال یہ گناہ گار تو اپنا فریضہ ادا کر چکا۔ ہنوز کی ٹھیکیداری تو انبیاء تک پہنچ نہیں تھی۔ ان کا فریضہ بس پہنچا دینا تھا اسی طرح ان کے غلام عامر عثمانی کا بھی پارٹ نقد و نظر کے بعد ختم ہو گیا۔ کون مطمئن ہوتا ہے اور کون نہیں ہوتا یہ نسبت ایزدی کے اسرار ہیں۔ البتہ یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ روز محشر خدا کی بارگاہ میں یہ سوال آپ کے اور جملہ مقالہ نگاروں سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اے میرے بندو! تمہارے پاس اپنے مسلک پر جسے رہنے کا کیا جواز رہ گیا تھا جب ہمارے ایک بندے نے تمہاری ہر ہر باتھیں دلیل کی مکروری واضح کرتے ہوئے قوی دلائل دوسرے مسلک کی صحت پر قائم کر دیئے تھے۔ تم کیوں اپنی رائے کو اٹکے بنائے رہے اور مسلک تبدیل نہیں کیا۔

تقلید کے سلسلہ میں آنجناب نے جو کلمات ٹیل جھٹک لئے ان پر میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی

کروں۔ وہ شوق سے "غیر تقلید" بنے رہیں اس سے فی الحال کوئی نفاق نہ نظر انہیں ہوگا مگر طلاقِ ثلاث والے اجماعی مسلک کو مسترد کرنے سے تو ان لوگوں کے ہاتھ ایٹم بم آجائے۔
 ذنب و رذرا اس فکر میں گھلے جا رہے ہیں کہ مسلم پرسنل لاو کو اپنے باز پچے کی گیند بنالیں اور اُس دفاعی لائن کو توڑ دیں جسے "اجماع" کہا جاتا ہے۔

خدا شمس صاحب کو اور دیگر مقالہ نگاروں کو یہ سمجھنے کی توفیق دے کہ خبرِ داپنی رائے اور خیال کی بیج میں وہ کیسا جھلک ہتھیارِ مسلم ناغیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدینا چاہتے ہیں۔ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

اچھی کتابیں

- | | |
|--------|-----------------------------------|
| ۳/۵۰ | قرآن مجید کا چینلج مجلہ |
| ۲/- | آپ تقریر کیسے کریں |
| ۱۵۰/- | شرع آں پر ظلم |
| ۱/- | رحمت اللعالمین ایک نظر میں |
| ۲/- | تفسیر ضیاء القرآن ہم قطیں تیار |
| ۱۰/- | ملکوتیات حضرت علیؑ اُردو مع عربی |
| ۱۲/- | حدیث دفاع جنرل اکبر خاں |
| ۱۰/- | توضیح البیان شرح حفظ الایمان |
| ۱/- | حقیقت سماع مولانا تھانویؒ |
| ۱۸۰/- | خدا کا وجود مولانا ادیس کا ندھلوی |
| ۱۴۵/- | خدا کی صفات " " |
| ۱۵۰/- | حکایات لطیف فارسی مع فرہنگ |
| ۱۴۰/- | اچھا قاعدہ مولوی مقبول سیوہاروی |
| ۶۰/- | اللہ میاں کی کہانی " " |
| ۱۴۵/- | بی بی خدیجہ " " |
| ۱۰/- | نماز میں مسائل " " |
| ۳۱۵۰/- | درس تبلیغ " " |
- مکتبہ تجلی - دیوبند (دیوبند)

مذہبیت دونوں اعتبار سے بیکار نہ نوع کے ہیں۔
 بڑھ کر کچھ فہم اور قریب خوردہ کو نہ ہوگا جو اس خیال خاں میں مبتلا ہو کہ تقلید حضرت اللہ اور رسولؐ کے سوا بھی کسی کی اطاعت کا فاسد عقیدہ رکھتے ہیں۔ آپ ہی کی طرح ابو حنیفہ، شافعی، مالک اور ابن حنبل اور ان کے گروہوں تقلیدین کا عقیدہ اور حتیٰ فیصلہ یہی ہے کہ مطاع صرف اللہ اور رسولؐ ہیں۔ ان کے سوا کسی کا کلام گفتگو سے بالا تر نہیں۔ تقلیدِ اطاعت کا نام انہیں بلکہ ہم دیش اُس چیز کا نام ہے جس کی تلقین اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ کی ہے۔ فَتَقَلَّدُوا أَهْلَ الْبَيْتِ كَمَا كُنْتُمْ لَا تَقْلَمُونَ (النحل - الانبیاء)
 تقلید کے مسئلہ پر ٹبری بدو بخین ہو چکی ہیں۔ خود ناچیز بار بار موشگافی کر چکا ہے۔ پینل صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ تقلید عدم تقلید کے موضوع پر پھر ایک بار میں شرح و بسط سے کلام کریں۔ چواب عرض ہے کہ آئندہ کسی اور موقع پر میں اس فرمائش کی تعمیل انشاء اللہ کر رہی دوں گا لیکن جوڑے مرحلے میں اس کی ضرورت نہیں۔ اولاً یوں کہ جب تجلی کا طلاق نمبر بھی شخصِ جہا کے لئے مؤثر نہ ہو سکا حالانکہ یہ لائل کا لشکر ساتھ لئے ہوئے ہے تو تقلید ہی کے موضوع پر میرے دلائل ان پر کیا اثر کریں گے۔ میں آسمان سے وحی تو آتا رہ کر لانے سے رہا۔ وحی جلی کے بغیر میرے دست کسی بات کو ماننے پر آمادہ نہیں تو بتائیے اللہ اور جبریل پر میرا کیا بس ہے!

ثانیاً یوں کہ تقلید کے مسئلہ میں اور طلاقِ ثلاث کے مسئلہ میں فرق ہے۔ طلاقِ ثلاث ایک اجماعی مسئلہ ہے جس کے اجماعی ہونے پر میں دلائل دے چکا مگر تقلید کا مسئلہ ایسا نہیں۔ تقلید کو عوام اور کم علم خواص کے لئے انتہائی ضروری خیال کرنے کے باوجود میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ غیر تقلید حضرات اجماعِ امت کو توڑ رہے ہیں۔ وہ ازراہ غلط فہمی تقلید کو کتنا ہی بُرا کہے جاتیں لیکن عملاً وہ خود اس پر عامل ہیں اور تقلیدی جمود ان میں ہم متقلدوں سے کہیں زیادہ ہے۔ لہذا مجھے کوئی شوق نہیں کہ تقلید کے موضوع پر ان سے جنگ

بلا تبصرہ

دوستی کے پردے میں روس ہمیں کتنا نقصان پہنچا رہا ہے

دیسا ہے۔ روس صرف انھی صنعتیوں پر سرمایہ لگا رہا ہے جو اس کی مرضی کے تحت قائم ہوں۔ یعنی زمین۔ عمارت کا پلان۔ تعمیر۔ مشینری۔ کام کرنے والے اور ماہر وغیرہ سب اس کی پسند کے ہوں۔ کارخانے میں مال بھی اس کی ضرورت اور پسند کا تیار ہو اور اس کی مقرر کردہ قیمت پر دیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی منظور نہیں کی گئی تو ادا نہیں دیتا۔ بتایا جاتا ہے کہ روس نے جتنے بھی کارخانے ہمارے یہاں قائم کئے ہیں ان کی مشینری تھوڑا سا کلاس اور پرانی ہے۔ جہاں تک تجارت کا معاملہ ہے روس جو بھی مال ہم سے خریدتا ہے اس کی قیمت بین الاقوامی مارکیٹ سے آدھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس نے بھارتی سے دس لاکھ ٹن فولاد خریدا اور اس کی قیمت بین الاقوامی مارکیٹ سے آدھی ہے۔ امریکہ کو ایک کلو شکر ساٹھ پیسے میں فروخت کرتے ہیں لیکن یہی شکر روس ہم سے ۲۶ پیسے میں خریدتا ہے۔ روس کی خاطر ہم مصنوعی ریشے سے تیار کردہ کپڑا ۳۰ فیصد کم قیمت پر دیتے ہیں۔ روس جو پٹ سن ہم سے خریدتا ہے اس کی قیمت آٹھ فی صد کم ادا کرتا ہے۔ روس نے ہم سے ۴۵ ہزار واگن فی واگن بیس ہزار روپے کے حساب سے خریدے۔ جب مال تیار کر کے حساب لگایا گیا تو ایک واگن کی اصل قیمت ۲۲ ہزار نیکیٹری ہی میں پڑ گئی۔ اس طرح روس نے دوستی کے پردے میں ۸۰ کروڑ کا نقصان پہنچایا۔ روس جو بھی معاہدے کرتا ہے دس سال یا پانچ سال کے لئے کرتا ہے اور ان سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ روس ہمیں جو مال دیتا ہے اس کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ نکل عالمی مارکیٹ میں ۱۵ ہزار روپے فی ٹن

روس ہمارا دوست ہے اور حکومت ہند اس کی دن رات تعریف کرتی ہے۔ اور روس کو بحسن و عظم قرار دیتی ہے۔ روس ہم سے تجارت کرتا ہے۔ ہماری مدد کرتا ہے۔ ہمیں جانکاری فراہم کرتا ہے۔ گرانٹ بھی دیتا ہے لیکن ان تمام ابواب میں روس جس طرح سے ہمارا استحصال کر رہا ہے اور ہم جس قدر فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ روس ہمارا کتنا سچا دوست اور کتنا ہمارے دے اس کا حال تو اسی وقت معلوم ہو گیا جب کہ اخباری کاغذ کا معاہدہ کر کے بھی روس ملکر گیا اور اس کی قیمت بے انتہا بڑھادی دنیا سراسر ماہر دار ملکوں کو گالیاں دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روس کی ذہنیت جس قدر سرمایہ دارانہ ہے اتنی کسی کی بھی نہیں روس اخباری کاغذ پر ہمیں بین الاقوامی مارکیٹ سے دو ٹو فی صد زیادہ چارج کر رہا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ چو کاغذ روس ہمیں دے رہا ہے وہ اس کا اپنا نہیں بلکہ کنیڈا اور امریکہ سے کم قیمت پر خریدا ہوا ہے۔ روس نے امریکہ اور کنیڈا میں آنے والے پانچ سال تک کا تمام فاضل۔ گھیسوں ایک معاہدے کے تحت خرید لیا ہے اور کم قیمت پر خریدا ہوا گھیسوں دوست ممالک کو چار گنا مانافع رکھ کر فروخت کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ سوشلسٹ اور غریب پرورد ملک کہلاتا ہے۔ ناروے۔ سویڈن اور دوسرے ملکوں میں اس نے اخباری کاغذ بھی خرید لیا ہے اور ہمیں ایک روپیہ کا مال چار میں دے کر بھی احسان جتار رہا ہے۔ ہندوستان کو روس نے اب تک ۸۹۲ کروڑ روپے کا قرضہ دیا ہے، اس کے برعکس دوسرے ملکوں کو گیارہ ہزار کروڑ کا قرضہ

ادا کرتا ہے تو تیار مال فروخت کر کے ۸۰ روپے کماتا ہے۔ روس سے جو بھی چیزیں آتی ہیں وہ اچھی نہیں ہوتیں پھر بھی ہمیں دوستی کی خاطر انھیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہے روس کی دوستی کا فائدہ۔ (ڈینس (ہنگر) ۱۱ اگست ۱۹۳۲ء)

ہے مگر روس ہمیں نہیں ہزار میں دیتا ہے۔ ٹریڈروں کے گردے بھی تین گنا زیادہ قیمت پر ہمیں دیے جاتے ہیں۔ ٹریڈسٹائل پر ہم فیصد زیادہ قیمت پر ہمیں سپلائی کیا جا رہا ہے۔ روس فولاد، آون، کپاس اور دوسری چیزیں دے کر تیار مال لیتا ہے۔ ہندوستانی مزدوروں کو ۸ آنے

ہفت روزہ عزائم (کھنوں) کا خاص نمبر

جدوجہد آزادی کی تاریخ۔ نتائج کیا نکلے۔ ہم کہاں پہنچے۔ ان تمام امور پر نہایت موقع دلچسپ اور مبصرانہ مضامین۔ نظم و شر دونوں معیاری اور دلکش۔ یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ کی چیز ہے۔ قیمت :- پانچ روپے ۲۵ پیسے۔ (پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے) منیجر مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

آپ کے بچے کے لیے پیٹ کی خرابیوں سے بچے رہنے کا
ایک ہی قدرتی ذریعہ
ہمدرد گراپے اٹر

ہمدرد گراپے اٹر میں پائے قدرتی اجزاء شامل ہیں، جو آپ کے بچے کے نازک نظام ہضم کو درست کرتے ہیں اور پیٹ کی خرابی، درد، اہچار اور دستوں کی تعلیق میں مکمل آرام دیتے ہیں۔



ہمدرد

• وہی ذہنی بگاڑ • حضورؐ اپنی قبر میں! • اسلامی نظام اور حج اسورہ • غیر ضروری سوالات
• مسجد میں ذکر و شغل اور تبلیغی نصاب • اسلام اور عیسائیت • جماعت الاحمدیہ •

تجلی کی ڈاک

وہی ذہنی بگاڑ!

سوال :- از : عاصم فاروقی - سکندر آباد
مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی جو شہر حیدر آباد کے مشہور و ممتاز واعظ و عالم دین ہیں اور موصوف مسلم نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں فرما رہے تھے ”قاب قوسین“ سے اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب مراد ہے یعنی اتنی نزدیکی دو قوس کے برابر بلکہ اور بھی قریب جو تصور سے باہر ہے۔ اس تعلق سے عرض کرنا یہ ہے کہ جبریلؑ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت الٰہی سننے اور پڑھنے آئے تھے لیکن مولانا کا ایسا فرمانا کہاں تک صحیح ہے؟ کیا بعض علماء اللہ تعالیٰ اور حضورؐ کی قربت مراد لیتے ہیں؟ اگر علماء کرام میں اختلاف ہے تو کس حد تک؟ وضاحت فرمائیں۔

مولانا عاقل اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کے تعلق سے فرما

رہے تھے۔ ”جس حد تک اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسولؐ کو علم غیب سے سرفراز فرمایا تھا اس حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم علم غیب سے واقف تھے غیب کا علم حضورؐ کو تھا، یہی عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ہے اور صحیح ہے۔“

جواب

کوئی شخص عقل و منطق اور زبان و ادب کے تقاضوں سے بے بہرہ ہو کر محض مبالغے اور خوش عقیدگی کی راہ پر لگ جائے اس کے لئے تو ممکن ہے کہ سورۃ نجم کی آیت ”قاب قوسین“ سے یہ معنی نکالنے لگے کہ رسول اللہؐ کا اور خدائے وحدہ لا شریک کا درمیانی فاصلہ کم و بیش کمان کے برابر ہو گیا ورنہ واضح و قطعی اور بے غبار تفسیر اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آیت میں رسول اللہؐ اور حضرت جبریلؑ کے درمیانی فاصلہ کا ذکر ہے۔ مستند مفسرین کی بھاری اکثریت یہی کہتی آئی ہے اور ہم کچھ دنوں قبل تفہیم سے گفتگو کر چکے ہیں کہ اس کے سوا کوئی مطلب نکالنا قرآن کے ساتھ زبردستی ہے۔

ہی فضول ہے جب کہ اللہ ہی جسم ہی نہیں اور تمام مقامات پر اس کی موجودگی مسلمات میں سے ہے۔ اس مسئلے کے اعتبار سے وہ ہر وقت ہر بندے کے قریب ہے، لہذا جو شخص یہ تصور کرتا ہے کہ آیت میں اللہ اور رسولؐ کا جسمانی فاصلہ بیان ہو رہا ہے وہ غلط فہمی اور غلط اندیشی کا نشانہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں۔ قرآن میں بیان کیا گیا کہ نظم عالم و مرتبہ کرنے کے بعد اللہ عرش پر مستوی ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے مفسرین یہ ہرگز نہیں لیتے کہ اللہ کسی محدود جسم کی طرح عرش نامی کسی تخت پر بیٹھ گیا اور اس تخت سے باہر کائنات کا جو پھیلاؤ تھا وہ اللہ کے وجود سے خالی ہو گیا۔ اس کے برخلاف وہ ایسی تفسیر کرتے ہیں جس سے اللہ کے لئے جسم اور محدودیت لازم نہ آئے۔ اسی طرح قرآن کی کسی بھی آیت کا ایسا مطلب نکالنا درست نہیں جو اللہ کی تنزیہ میں خلل ڈالنے والا ہو۔

خلاصہ یہ کہ سورہ نجم میں کمان براہِ جن فاصلے کا ذکر ہے وہ حضرت جبریلؑ اور رسول اللہؐ کے جسموں کا فاصلہ ہے۔

(۲) علم غیب سے متعلق جو فقرے آپؐ نے مولانا موصوف کے نقل کئے وہ ایک اعتبار سے تو درست ہیں۔ یہ کہ جن جن امور میں غیب کا علم دینا اللہ کے نزدیک ضروری تھا وہ اللہ نے حضورؐ کو عطا کیا۔ لیکن اس معاملہ میں حضورؐ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اور بھی لاتعداد انسان گزے ہیں جنہیں اللہ نے وقتاً فوقتاً بعض امور غائبہ پر مطلع کیا اور یہ تو قرآن ہی میں آپؐ پڑھتے ہیں کہ فاطمہؑ انجوڑھا و تقوٰھا۔ یعنی تمام انسانی نفوس پر خیر و شر کا نبیادی احساس الہام کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے مجرد تقویٰ یا خیر و شر امور غائبہ ہی میں ہیں اور اللہ ان نفوس میں تمیز و احساس کی صلاحیت پیدا نہ فرماتا تو جو اس ظاہری سے یہ پتا چل ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی کی کیا ہے اور بدی کیا۔ حق کیا ہے اور تقویٰ کیا۔

گویا اللہ کی طرف سے دیئے گئے علم غیب کے باب

آپؐ کو معلوم ہی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ذی جسم نہیں اور محدود بھی نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ اللہ یہاں تو ہے اور دوسری جگہ نہیں ہے یعنی، حد بندی، تجسیم، ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور بالاتری تمام علمائے سلف و خلف کا متفق علیہ عقیدہ ہے۔ سب اس کے قائل ہیں کہ لفظ آں میں اللہ کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے وغیرہ کا جو ذکر آتا ہے وہ مجاز و کنایہ ہے نہ کہ حقیقت اور اللہ ایک نور بسیط ہے۔ مادیت سے بلند، ہمہ گیر بے حدود نہایت، اور اک کی گرفت سے بالاتر۔

حالانکہ اگر آیت کا وہ مطلب نکالا جائے جو مولانا عاتل صاحب نے نکالا ہے اور بعض اور ناقابل لحاظ حضرات بھی نکالتے رہے ہیں تو اللہ کی یہ تمام خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ کوئی بھی دو چیزیں جب تک دو مقامات کیساتھ مخصوص نہ کر دی جائیں ان کا درمیانی فاصلہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اللہؐ صاحب جسم تھے۔ وہ جب جس مقام پر بھی ہوں ان کا جسم اسی طرح خلا کا کچھ حصہ گھیرتا تھا جس طرح دوسرے اجسام گھیرتے ہیں اور انکلی اٹھا کر یہ کہہ دینا آسان تھا کہ آپؐ اس وقت فلاں جگہ ہیں اور فلاں جگہ نہیں ہیں۔ یہی حال اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کا بھی ہوتا تب تو یہ کہنا واقعی ممکن تھا کہ فلاں وقت رسول اللہؐ کے اور اللہ کے مابین اتنا کم فاصلہ رہ گیا لیکن اللہ کا حال یہ نہیں ہے پھر کیسے درمیانی فاصلے کا تعین یا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔

قرب و بُعد کو معنوی اور مجازی معنی میں استعمال کرنے کی مثالیں تو قرآن ہی میں موجود ہیں۔ مثلاً اللہ فرماتا ہے کہ ہم بندے کی رنگ گلو سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ اس کا مطلب سب جانتے ہیں کہ قرب جسمانی مراد نہیں بلکہ یہ کہنا ہے علم و خبر کے درجہ کمال کا۔ اس طرح کائناتی قرب و بُعد تو اللہ اور بندے کے درمیان صریح طور پر قابل فہم ہے لیکن جسمانی قرب و بُعد کی بحث

میں حضورؐ کے اور دوسرے انسانوں کے مابین کوئی جوہری اور اصولی فرق نہیں البتہ مقدار و نوعیت کا فرق ہے۔ حضورؐ کو جتنے کثیر امور غائبہ پر مطلع کیا گیا کسی اور کو نہیں کیا گیا۔ آپؐ معراج کے معاملے میں منفرد ہیں اور حجاج میں جس قدر غائب امور و اشیاء کا مشاہدہ کئے فرمایا ہے کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہذا منجہ یہ نکلا کہ اللہ کی طرف سے بعض غائب امور و اشیاء کا علم لطا ہونا ایک عا بات ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی کلام کرتا ہے۔ اصل مسئلہ در ہے۔ وہ یہ کہ جن امور غائبہ کا علم عطا کئے جانے کا یہی ثبوت حضورؐ کے بارے میں قرآن وحدیث میں موجود ہے ان پر قیاس کرتے ہوئے کیا ہم ایسے امور غائبہ کا بھی حضورؐ کو عالم تصور کر سکتے ہیں جن کے علم کا کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے یا ایسا قیاس غلط ہے۔

ہمارے نزدیک ایسا قیاس بہت ہی خاص شرائط و حدود کے ساتھ تو جائز ہو سکتا ہے لیکن وسعت اور نیم کے ساتھ نہیں۔ جن لوگوں نے شرائط اور حدود کا اظہار نہیں رکھا وہ یہاں تک جا پہنچے کہ حضورؐ کو تمام ماحول مایکون کا علم تھا یعنی جتنا علم خدا کو ہو سکتا ہے وہ سب حضورؐ کو بھی تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ خیال وعقیدہ لغو و باطل ہے۔ تل وحدان، شریعت سب اس کے باطل ہونے پر متفق ہیں۔ یہ کھلا شرک جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

ایک اور نکتہ سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ اگر کسی غائب شے کا ہم ہمیں کسی خارجی ذریعہ سے ہو تو اس علم کو اصطلاحاً غائبہ نہیں کہتے ہی نہیں مثلاً آپؐ امریکہ، فرانس، لینڈ، طب شمالی و جنوبی اور بحر الکاہل وغیرہ نہیں دیکھے۔ ان کے بڑا اور احوال اور جغرافیہ کا علم آپؐ کو خارجی ذرائع سے واسے تو کیا اصطلاحاً کبھی بھی کسی نے ایسا کہا ہے یا آپؐ یا سمجھا ہے کہ ان اشیاء کی حد تک آپؐ عالم الغیب ہیں۔ درحقیقت "علم غیب" کا اطلاق غائب امور و اشیاء

کے صرف ایسے ہی علم پر ہوتا ہے جس کا کوئی خارجی ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو بلکہ آدمی کی اپنی ذات اور اپنے عین میں اس کی صلاحیت موجود ہو۔ یہی وہ مفہوم و مراد ہے جسے ذہن میں رکھتے ہوئے علماء حق برابر کہتے آئے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں اور خود قرآن ہائیکے پکائے کہہ ہی رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی علم غیب کا حامل نہیں۔ اسی قرآن سے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ نے بے شمار امور غائبہ کا علم اپنے رسولوں کو عطا کیا اس کے باوجود اگر وہ بلا تکلف یہی اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں تو آپؐ ثابت ہو جاتا ہے کہ امور غائبہ کا جو علم اللہ نے اپنے بعض بندوں کو زیادہ اور بعض کو کم عطا کیا اس پر علم غیب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو صریح طور پر وسیلے اور ذریعے سے پہنچ رہا ہے۔ یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ کی ہے کہ انھیں اور پھیلی ہر چیز پر راہ راست اسکے علم میں ہے۔ وہ کسی خارجی ذریعہ کا رہن منت نہیں۔ اس کی عین ذات میں یہ وصف موجود ہے کہ کائنات کی ہر موجود اور سابق دلائل حق شے اس کے علم میں رہے۔ اس خصوصیت میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ حضورؐ کی اپنی ذات اور اپنی حقیقت بشری اور اپنے وجود نوعی میں ایسی کوئی صفت نہیں تھی اور نہیں ہو سکتی کہ آپؐ آپسے آپسے غیب ان کی نظروں کے سامنے رہیں یا اللہ عاقل صاحب خود تسلیم فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو علم غیب سے سرفراز کیا تھا تو اس کے سوا کیا مطلب نکلا کہ جس علم کا نام انھوں نے "علم غیب" رکھا ہے وہ حقیقتہً علم غیب ہے ہی نہیں جس میں بحث کی جاتی ہے اور جو قطعی طور پر اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ اگر محض لغت کے چھپے دوڑا جائے تب تو بلا تکلف اس نجومی اور عادیگر اور ماہر موسمیات کو بھی "عالم الغیب" ماننا پڑے گا جو بار بار کہتے ہی امور غائبہ کا انکشاف کر دیتا ہے۔ اور ہم سب بھی عالم الغیب ہی قرار پائیں گے کیونکہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے بے شمار ایسے مقامات اور احوال اور امور کا علم

بیان کیا جا رہا ہے۔

حضور انبی قبر میں

سوال :- از۔ احمد اللہ خان بک۔ (ضلع ناگپور)

مولانا غفرم۔ السلام علیکم۔ کوئی شریفی محسن
اجدی اپنی کتاب تحقیقات لدفع التلبیسات کے
آخری صفحوں میں یوں رقم طراز ہیں کہ اعلیٰ حضرت بریلوی
سے کسی سائل نے یہ سوال کیا کہ اولیاء کرام کی حیات برزخیہ
اور انبیاء کرام کے بعد وصال حیات میں کیا فرق ہے؟
اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے فرمایا کہ اولیاء
کرام کی حیات برزخیہ پیر دنیوی احکام جاری نہیں اور
انبیاء کرام کی حیات بعد وصال پیر دنیوی احکام جاری
ہیں۔ اولیاء کرام کا ترکہ تقسیم ہو گا۔ انبیاء کرام کا ترکہ
در نہ میں تقسیم نہیں ہو گا۔ اولیاء کرام کی ازدواج بر عدت
ہے۔ انبیاء کرام کی ازدواج بر عدت نہیں۔ اولیاء کرام
کی ازدواج بعد عدت عقد ثانی کر سکتی ہیں۔ انبیاء کرام
کی ازدواج بعد عدت بھی عقد نہیں کر سکتیں۔ اس فرق
کی تائید مزید توضیح کے لئے فرمایا کہ علامہ سید عبدالباقی
زرقانی فرماتے ہیں کہ "انبیاء کرام کی قبور مطہرہ میں انبیاء
مطہرات پیش کی جاتی ہیں اور وہ ان کے ساتھ شب بامی
فرماتے ہیں۔ اولیاء کرام کے لئے یہ بات نہیں" (الملفوظ
حصہ سوم صفحہ ۳۰)۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے
جو کچھ فرمایا اس کی سند صاحب تحقیقات والتلبیسات
نصفہ ۱۶ پر اس طرح دی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"سبکی نے اپنی طبقات میں ابن زورک سے نقل کیا
کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر اور میں تحقیقی
حیات بلا شائبہ مجاز زندہ ہیں۔ اذان اقامت
کے ساتھ نماز ادا فرماتے ہیں۔ ابن عقیل حبلی نے
فرمایا اور اپنی ازدواج مطہرات کے ساتھ ہمہ تن
فرماتے ہیں اور ان سے دنیا میں جو تمنع حاصل
فرماتے تھے اس سے بڑھ کر تمنع حاصل فرماتے ہیں

جو شخص ہم نے غائبانہ جاننا ہے خود جا کر نہیں دیکھا۔
سچی بات یہ ہے کہ اہل بدعت یا اہل ہندو کی کجی
میں سے آپ کوئی نرم یا محوم پھیر دالی کنگ استعمال کر لیں
کر لیں تو کر لیں وگرنہ کبھی بے لاگ اور واحد قطعی بات تو
صاف صاف یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں
اور مولانا عادل صاحب نے یہ بات محض عوام الناس کو پہلے
کے لئے فرمادی ہے کہ:-

"غیر کمال علم حضور کو تھا۔ یہی عقیدہ اہل سنت
والجماعت کا ہے۔"

ہماری معلومات میں اضافہ ہو گا اگر مولانا علامہ سلف
میں سے چند ان سرگوش کا نام کے دیں گے جنہیں اہل علم
عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ترجمان اور نمائندہ تسلیم
کرتے ہیں۔ ہم نے ایضاً تابعین، ائمہ اربعہ، فقہائے
عظام، مفتیان شہیر اور محدثین عظام کی کسی کے یہاں بھی یہ
قول نہیں پایا کہ "رسول اللہ عالم الغیب تھے" حالانکہ یہ
سب حضرات بھی ملا رب یہ ایمان رکھتے تھے کہ اللہ نے
بے شمار امور غائبہ کا علم رسول اللہ کو عطا فرمایا۔

کافی دلوں سے یہ فیشن بہت چل رہا ہے۔ اور
بریلوی مکتب فکر کو اس کا تقریباً موجد سمجھا جائے کہ چند
اونچے سیدھی دلیلیں کسی عقیدے کے لئے پیش کیں اور
بلا تکلف دعویٰ کر دیا کہ یہی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ
ہے۔ اس سے جہلاء پر رعب جزور پڑ جاتا ہے لیکن اہل علم
تحقیق کے لئے ایسی حرکات خفیفہ کا کوئی وزن نہیں۔

ہم مولانا عادل صاحب کے لئے حسن ظن رکھتے ہیں لیکن
ہمارا یہ بھی سختہ خیال ہے کہ جو شخص سورہ نجمہ کی آیت
"قاب قوسین" سے اللہ اور حضور کا درمیان فیاصلہ
نکلے اس کی فکر میں کہیں نہ کہیں کجی ضرور ہے۔ اس کے
منہ کو تو یہ بات کی چاٹ لگ جاتی ہے اور علم کے بجائے وہ
مبالغہ آرائی کی راہ چل نکلا ہے۔ آیت اپنے سیاق و سباق
میں اتنی صاف ہے کہ جس کا ذہن مریض نہ ہو وہ کسی طرح
بھی یہ مغالطہ نہیں کھا سکتا کہ آیت میں کن دو ہستیوں کا جملہ

جاسکتا ہے۔ اس حقیقت کی جملہ تفصیلات قویٰ مندوں کے ساتھ محفوظ ہیں اور اسی کے ساتھ کچھ اور دلائل بھی محفوظ ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو مسیحی کہہ کے باقی تمام انسانے آدم کی طرح اللہ کا آخری رسول بھی موت سے ہمکنار ہوا اور اپنے جسم کے مطابق نبی ہوئی قبر میں چھپا دیا گیا۔

موت نام ہے جسم سے روح کے نکل جانے کا۔ روح نکالنے کا کام اللہ نے ایک فرشتے کے سپرد کیا ہے۔ اسی فرشتے نے حضور کی بھی روح نکالی جسے محاورے میں ”روح قبض کرنا“ کہتے ہیں۔ اس طرح یہ بات شک سے بالاتر ہو جاتی ہے کہ ہر فرد بشر کی طرح حضور نے بھی انتقال فرمایا۔ انتقال کے بعد آپ کی روح شریفہ کو کبھی کبھی آپ کے جسم مبارک میں منتقل کر دیا جاتا ہے یا مستقل طور پر منتقل کر دی گئی ہے یہ بحثیں محض تخمین و قیاس کے بل پر اٹھائی گئی ہیں اور اس سلسلے میں جتنی بھی احادیث سے کام لیا جاتا ہے وہ نہ تو اتنی قویٰ ہیں کہ یقین کا فائدہ دے سکیں نہ اپنے معنی و مطلب کے اعتبار سے اتنی صریح اور قطعی ہیں کہ ان پر کسی عقیدے کی بنیاد رکھی جاسکے۔

کچھ حضرات نے جن میں ہمارے اپنے بعض اساتذہ اور مشائخ شامل ہیں اپنے اس خیال کے لئے کہ حضور کو قبر شریف میں دنیاوی زندگی حاصل ہے دو دلیلوں کو بہت فرو و شور سے پیش کیا ہے۔ ایک یہ کہ آپ کا ترکہ تقسیم نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ آپ کی بیویاں تھیں اور سے شادی نہیں کر سکتیں۔

ہم ان دلیلوں پر بار بار کلام کر چکے ہیں۔ جہاں تک ترکہ کا تعلق ہے خود حضور نے یہ قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ ہم گروہ انبیاء نہ تو دوسروں کے وارث بنتے ہیں ہمارا کوئی وارث بنتا ہے۔ یہ گویا ایک خصوصیت ہوئی انبیاء کی۔ اس کی علت یہ قرار دینا کہ انبیاء مرے ہی نہیں اور برابر زندہ چلے آ رہے ہیں محض خیال و گمان ہے جو دلیل کا درجہ نہیں لے سکتا۔ اسی طرح حضور کی ازدواج سے

وہ اپنے بہ حلف بیٹائی کرتے تھے کہ علامہ زرقانی فرماتے ہیں بظاہر اس سے کچھ مانع نہیں۔“ (زرقانی جلد سادس صفحہ ۱۶۹)

اب سوال یہ ہے کہ علامہ زرقانی اور اعلیٰ حضرت یلوی کے یہ مندرجات کیا واقعی حقائق پر مبنی ہیں کہ نابرتکلیف کیا جائے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں ان لوگوں کی کچھ نشاندہی کی ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی حدیث میں ایسا بیان آیا ہے؟

جواب :-

اسے چودہ سو برس پہلے سرزمین مکہ پر ایک بچہ کا نام محمد ہے اپنی ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح دوسرے سب انسان پیدا ہوتے ہیں۔ برس ساٹھ سے کچھ اوپر سال گزارنے کے بعد وہ اسی طرح جن الموت میں گرفتار ہوتا ہے جس طرح اور لوگ دیتے آئے ہیں۔ کبھی اس شخص کو دشمنوں نے نہر پٹی غذا بھی دی۔ اس کے چمکنے کا اثر اب بھی اس کے جسم میں کبیر ہیں موجود ہے۔ بخاری کتاب المغازی میں خود رسول پر کایہ فرمودہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اے عائشہ! خیر کی خ کے موقع پر مجھے جو زہر ملا گوشت کھلایا گیا تھا اس کے لئے کچھ موزی اثرات تو میں براہر ہی محسوس کرتا رہا ہوں لیکن اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زہر کی اثر میری رگ جاں ہی کاٹ ڈالے گی۔

اس وقت حضور کو شہید بخار ہے اور پھر نزاع کیفیات سے گزر کر آپ اسی طرح سر دلائے میں تبدیل ہو جاتے ہیں جس طرح دوسرے انسان ہوتے ہیں۔ عین ہی حالت جس کا نام ”موت“ ہے۔ فرستہ اجل نے جس کو جسم سے الگ کیا اور پھر آپ کے اعزاء نے آپ کو اسی طرح زہر زندہ دفن کر دیا جس طرح دوسرے مرنے والوں کو کیا جاتا ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی حقیقت جسے انکار کیا ہی نہیں

نکاح کی ممانعت بھی دوسری وجہ سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً قرآن ہی میں اللہ نے جملہ دیا ہے کہ رسول کی ازواج امت کی مائیں ہیں۔ یہی تنہا وجہ اس کے لئے کافی ہے کہ ان سے کوئی نکاح نہ کر سکے۔

ہم یہاں "حیات النبی" کے مسئلہ پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ نہ ہمارا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ مرنے کے بعد انبیاء کا حال بھی عام انسانوں جیسا ہے۔ نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کے اجسام ان کی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں اور یہ بھی بعید نہیں کہ جو روحیں موت کے وقت ان کے اجساد مبارک سے علیحدہ کر لی گئی تھیں انھیں کبھی کبھی ان کے اجساد کی طرف پھر لوٹا دیا جاتا ہو۔ یا لوٹائے بغیر ہی ان کا رابطہ کسی نامعلوم انداز میں سمیوں سے قائم ہو۔ یہ سب ممکن ہے۔ لیکن اس طرح کی صورتوں میں جو بھی زندگی انبیاء کو ان کی قبروں میں حاصل ہوگی وہ وہ نہیں ہو سکتی جسے ہم "دنیاوی" زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیاوی زندگی کے بقا کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں ان کا تصور قبر کے اندر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا ملہ سے انبیاء کی قبور کو اتنا وسیع کر دیتا ہے کہ وہ اس میں کسی وسیع کرے۔ یا صحن کی طرح چل پھر سکیں۔ نمازیں پڑھ سکیں۔ نقل و حرکت کر سکیں تب بھی یہ عالم الغیب اور عالم اسرار کی باتیں ہوں گی۔ انھیں مادی تصورات اور دنیاوی تعبیرات سے نہیں جوڑا جاسکتا۔ ان کیلئے یا تو عالم مثال یا عالم برزخ جیسی مرموز و مبہم اصطلاحات استعمال کی جائیں گی یا صاف کہہ دیا جائے گا کہ اللہ کے راز اللہ ہی جانے۔

اس تہدید کے بعد اب اصل سوال کی طرف آئیے۔ علامہ قسطلانی کی املوا حسب اللہ تباریکہ ایک مشہور کتاب ہے اور ذوق قانی نے اسے شرح سے مزین کر کے ضخیم جلدات میں تبدیل کر دیا ہے۔ ذوق قانی بلاشبہ بڑے عالم تھے اور یہ شرح ان کے تحریفی و وسعت مطالعہ اور فہم و دراست کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن جیسا کہ مسلمات میں سے ہے اللہ اور رسول کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ ہر ایک سے غلطی کا قصور

ممکن بلکہ واقع ہے لہذا ہمیں یہ کہنے میں کوئی غماز نہیں کہ ابن عقیل حبشی کا ایک بے دلیل اور بے بنیاد خیال نقل کر کے انھوں نے خطا کی ہے اور پھر یہ کہہ کر تو اس خطا کو اور بھی دو آتشہ بنا دیا ہے کہ "بظاہر اس سے کچھ مانع نہیں۔"

ابن عقیل حبشی نے نبی تھے نہ صحابی۔ وہ اگر اپنے کسی ذاتی خیال پر ٹھیک دلو اور کعبہ کے نیچے ہزار حلف بھی اٹھا لیں تو اس سے اس خیال کی صحت کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ یہ خبر اور رد وایت کا معاملہ نہیں عقیدہ اور فکرمند کا معاملہ ہے۔ خدا جلنے ان کی طرف حلف کی نسبت ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال امور غیب کے بارے میں کوئی بھی رائے مضبوط شہادت اور دلیل چاہتی ہے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی یوں یادو بند کے کوئی شیخ ہوں یا حرمین شریفین کے کوئی علامہ۔ اصول و قواعد سب کے لئے یکساں ہیں۔ کوئی ان میں ایسا نہیں جس کی ذاتی رائے اور خوش فہمی عقائد شرعیہ میں حجت بن سکے۔

حضور کے لئے ان کی قبر شریف میں ایک خاص قسم کی زندگی کا عقیدہ رکھنے کے بجائے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ عین دنیاوی زندگی سے بچے خود کا فی بخت طلب کریں لیکن اس سے دو قدم آگے بڑھ کر یہ تک کہہ گزرنے کہ آپ اپنی قبر میں بیویوں سے ہم بستری بھی فرماتے ہیں، ہمارا نزدیک انتہائی نازیبا جسارت ہے جسے شاعری کی مازوم اقسام میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ اس کا تو کھلا مطلب یہ ہوا کہ صرف حضور ہی کو نہیں ان کی تمام مرحومہ بیویوں کو بھی دنیاوی زندگی حاصل ہے اور وہ برابر اس پوزیشن میں ہیں کہ اللہ کا رسول اپنی قبر میں ان سے جنسی استفادہ کر سکے۔

العیاذ باللہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جو تائیدی فقرہ ذوق قانی کی شرح میں نظر آ رہا ہے وہ واقعی ذوق قانی کا ہے یا کسی فنکار نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ ہمارے خیال میں تو ذوق قانی اس قدر توہم پرست، شاعر مزاج اور بد مذاق نہ ہونے چاہئیں کہ ایسی لغو اور غیر مناسب بات انھیں مضائقہ اور حرج سے خالی نظر آئے۔

آئے گی اس کا حل کیا ہے؟ تو یہ قابل فہم ہے۔ مگر خود بعض مسلمان کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا کیا بنے گا!

نیز ہمارا ایک دوست کہتا ہے کہ تم بہت کے سامنے جانے والے ہندو کو بت پرست کہتے ہو۔ مگر حجر اسود کے سامنے تم جو کچھ کرتے ہو۔ وہ بھی تو بت پرستی ہی ہے انھوں نے قصص الانبیاء پر بھی ہے تو ان سوالوں کا جواب دیجئے۔

(۱) کیا حجر اسود پتھر ہی ہے۔ یا کوئی ملک۔
(۲) حجر اسود کو بوسہ دینا مذہب میں کیا اہمیت رکھتا ہے اگر اسے بوسہ نہ دیا جائے یا اس کی طرف جھکا نہ جائے تو کیا کچھ گناہ ہوگا۔ ہم نے سوال کرنے والے سے کہہ دیا تھا کہ حجر اسود کو بوسہ دینے وقت ہمارے ذہن میں وہ تصور نہیں ہوتا ہے جو بت پرست کے ذہن میں ہوتا ہے۔ ان کا جواب ہے کہ پھر اگر بوسہ دینا چھوڑ دو تو کیا حرج ہے؟

جواب:-

سوال کے دو جزو ہیں۔ بالترتیب جواب یہ ہے۔
اسلامی نظام کیا ہے اور اس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ذمہ داریاں، سرائض اور حقوق کیا ہوں گے یہ سب قرآن، حدیث اور علماء حق کے فرمودات میں ہو چکے ہیں۔ ہمارے زمانے میں اسلامی نظام کی تحریک اور دعوت کا مقدس فریضہ جس بندہ مومن نے پوری استقامت اور لگن اور مسلسل کے ساتھ ادا کیا اس کا مشہور نام ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اس شخص نے اس کام کو نظم و ضبط اور باہمی تعاون و اشتراک کے ساتھ آگے بڑھانے کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام ہے ”حجۃ اسلامی“ اور اپنی عالمانہ تحریروں کے ذریعہ دنیا کو بتایا کہ اسلامی نظام کیا ہے اور اسے قائم کرنے کے لئے کن خطوط پر جدوجہد کرنی چاہیے۔

پھر مینڈوستان تقسیم ہوا اور دونوں حصوں کی جماعت اسلامی بھی تقسیم ہو گئی۔ ہندو پاک کے حالات الگ الگ تھے۔ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور

ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ نے جنسی تعلق کو افزائش نسل کے مقصد پر استوار کیا ہے۔ دوسری مصلحت اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان لذتوں کا نمونہ دکھلا جو بہشت میں نصیب ہونے والی ہیں۔ یہ دونوں مصلحتیں ان زندوں سے مربوط ہیں جو قبر کے اندر نہیں صفحہ گنتی پڑندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ کا رسول ہر حال سببہ ارض پر تو ہے نہیں۔ بطن ارض میں مدفون ہے لہذا اس کے لئے اللہ ہمہ گیری کا بھی انتظام کرے گا یہ خلاف قیاس بھی ہے اور معیار سے گرا ہوا بھی۔

ہر حال اعلیٰ حضرت بریلوی دنیا سے جا چکے انھوں نے اپنے دینی عقائد کے لئے محض ہوائی باتوں کو بھی کافی سمجھ لیا یہ ان کا ذاتی فعل تھا ہماری دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور عرفان و رحمت سے نوازے۔ خود ہمارے شیوخ میں بھی ایسے خیالات عنقا نہیں جن کی عمارت کمزور دایمیں یا خیالی قیاس آرائیوں پر ٹھہری ہے۔ ہم ہر حال یہ پسند کرتے ہیں کہ جن امور غائبہ اور اسرار مکنونہ کی وضاحت اللہ اور رسول نے بے غبار طریقے پر نہیں کی اور امت کے ان کے پیچھے لگنے کی ہدایت نہیں فرمائی ان کے سلسلے میں سکوت اور ذہنی بے تعلقی اختیار کی جائے۔ شریعت کا کوئی عقیدہ اور عمل اس پر منحصر نہیں کہ قبر رسول کے اندر جھانکا جائے اور طے کیا جائے کہ وہاں اللہ کا رسول کیسی زندگی گزار رہا ہے۔

اسلامی نظام اور حجر اسود

سوال:- سلام۔ غلام قادر کشمیر۔

ہمارے ہندو بزرگ مندروں میں بت پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سے تو ہم واقف ہی ہیں۔ اگر وہ لوگ ہم سے کوئی سوال پوچھتے اور جواب ہم سے منسلک تو بات قابل انیس نہ تھی۔ مگر اب مسلمان ہندوؤں کے دلیل نظر آ رہے ہیں۔ اسلامی نظام کی بات کی جائے اور کوئی غیر مسلم اٹھ کر سوال کرے کہ ہم کو اسلام کے نظام میں یہ اور یہ مشکلا پیش

ہندوستان میں ایسی مخلوط حکومت جس میں غلبہ بہر حال غیر مسلموں ہی کا تھا اور ہے۔ پاکستان میں آبادی کی اکثریت اہل اسلام پر مشتمل رہی اور ہندوستان میں غیر مسلموں پر۔ اسی اعتبار سے دونوں ملکوں کی جماعت اسلامی کا محاذ سببان بھی بدل گیا۔ پاکستان میں تو اس کے کہنے کا کام یہ رہ گیا کہ اپنی مسلم حکومت سے وہ قانون نافذ کرائے جسے اسلامی قانون کہتے ہیں اور جسے نافذ کرنے کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے دی ہے لیکن ہندوستان میں اب اس کا سوال ہی موجودہ مرحلے میں پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ غیر مسلموں سے آخر یہ مطالبہ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ آپ قانون کو اسلامی بنائیں۔ یہاں جماعت اسلامی جو کچھ کر سکتی تھی یہی کر سکتی تھی کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو اسلام سے وابستہ رہنے اور غیر اسلامی تصورات سے بچنے کی تلقین کئے جائے۔ انھیں ان کی اصلی حیثیت یاد دلانی رہے۔ ان سے کہہ کہ اپنے اسلامی اخلاق کا تحفظ کرو اور اپنے کردار کو اتنا عمدہ بناؤ کہ غیر مسلم اس پر زلفیہ ہوں اور ان کے قلوب میں اسلام سے حسن عقیدت پیدا ہو۔ نیز یہ نہ بھولو کہ ہم ایک ایسی امت ہو جسے دنیا میں اس لئے برپا کیا گیا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اچھی باتوں کی ترغیب دینی رہے اور بُری باتوں پر ٹوکتی جائے۔

یہی کام یہاں کی جماعت اسلامی اپنی استطاعت اور فہم کی حد تک محسن و خوبی انجام دے رہی ہے۔ غلطیاں کس انسانی کام میں نہیں ہوتیں۔ عجب نہیں کہ جماعت اسلامی والوں سے بھی کچھ غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ جس طرح کے نامساعد اور حوصلہ شکن حالات ہم سب کے سروں پر ابنا شامیانہ تانے ہوئے ہیں ان میں جماعت اسلامی ہند کا کردار عظیم الشان مندانہ اور دور اندیشانہ ہے۔ وہ کھوئے کی چال سے اپنی راستہ قائم پر چلی جا رہی ہے حالانکہ سنگین قسم کی رکاوٹیں راستے میں اس قدر ہیں کہ کچھوے کی چال چلنا بھی انتہائی دشوار ہی کہا جاسکتا ہے۔

بحالات موجودہ اس کی ضرورت ہی نہیں کہ نظام اسلامی پر بحث کی جائے اور کسی غیر مسلم تشویش ہو کہ نظام اسلامی میں ہمارا کیا ہے۔ حاکم حقیقی کسی غیر مسلم کو تشویش ہے بھی نہیں۔ یہ تو دراصل بعض مسلمانوں کو تشویش ہے جو اپنے غیر اسلامی کردار اور بیزار ذہن پر پردہ ڈالے رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً اسلامی پر اعتراض و طعن کو ضروری خیال کرتے ہیں اس طرح کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں جن اس جہاں کے خلاف فضا پیدا ہو۔ ان کی زبان درازیاں علم سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ بے چارے تو واقف نہیں ہیں کہ اسلام حقیقت میں ہے کیا اور اسلامی کس چیز کو کہتے ہیں۔ انھیں دنیا چاہیے۔ عیش و آرام منصب اور دولت چاہیے۔ یہ چیزیں اکثریت کا دفا بن کر ہی حاصل ہو سکتی ہیں اور اکثریت کی دفا دار، اظہار اس سے بڑھ کر کس طرح ہو سکتا ہے کہ جماعت اسلامی پر اعتراض کئے جاؤ۔ نظام اسلامی پر طنز کا اور اسلامی احکام کے خلاف شکوک پھیلانے جاؤ۔

آپ کو ہمارا مشورہ ہے کہ اپنے تھکات کو مٹا کر مرنے دیجئے اور اپنے کام سے کام نہ لیتے۔ آپ اد اُلجھ کر خواہ ناخواہ اپنا وقت برباد کریں گے۔

(۲) حجر اسود ایک چھوٹا سا پتھر ہے جو دیوار کعبہ کے ساتھ ایک بلند مقام پر رکھا ہوا ہے۔ اس کے تعلق کبھی کبھی اس طرح کے وہابی اعتراضات اور طعن سنا آتے رہتے ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

آپ نے اپنے جس دوست کا ذکر کیا ظاہر ہے کہ ایک بے پڑھے ٹٹھے آدمی ہیں۔ پڑھا لکھا آدمی وہ ہے جس نے کچھ علوم باقاعدہ پڑھے ہوں اور عمر کا اخصمیل علم میں صرف کیا ہو۔ نقص الانبیاء جیسی کہ تو عواموادہ لوگ پڑھتے ہیں جن کی قابلیت پر ائمہ کے بچوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اگر علم دین کے سلسلہ کوئی اعتراض اٹھائیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک

بتائے کیا اس اختیار کی جو منے میں اور بتوں کی پوجا پاٹ میں کوئی دور کی بھی مناسبت ہے؟ آدمی پاگل پن پر اتر آئے تو وہ بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں دو دو کھیل اور دو دو کان رکھتے ہیں۔ دونوں کے بدن پر کھالیں ہیں اور جسم میں خون۔ دونوں کا جسمانی نظام بڑا بڑا سے معمور ہے۔ دونوں کھانے پینے کے محتاج ہیں اور دوسری بہت سی باتوں میں ان کے مابین یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن ہر ذی عقل جانتا ہے کہ ایسی مشابہتوں سے آدمی اور جانور ایک صف میں کھڑے نہیں کئے جاسکتے۔ اس طرح اگر بت اور حجر اسود کے درمیان صرف اتنی سی مشابہت پائی جاتی ہے کہ دونوں پتھر ہیں تو اس مشابہت کی بنا پر حجر اسود کے جوئے کو بت پرستی جیسا کہ ڈانڈا دیوانے کی بڑ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

آپ اور ہم اور تمام غیر مسلم کیا اپنے بچوں کو نہیں جوتے؟ چومنا تو پوجا اور عبادت کے دائرے کی چیز نہیں بلکہ محبت اور اُس کے دائرے کی چیز ہے۔ اگر آپ اپنے بھتیجے صاحبزادہ کو گود میں لیکر پیار کر رہے ہوں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ صاحبزادے کی پوجا کر رہے ہیں؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو آخر حجر اسود کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کس نے کیا سلیا ہے کہ مسلمان دور ان حج میں اسے پیار کرتے ہیں۔

پیار کیوں کرتے ہیں یہ بھی سن لیجئے۔ اس پتھر سے بعض ایسی روایات منسوب ہیں جن سے اس پتھر کا تقدس مبارک ہو ناقابل میں آتا ہے۔ تقدس اور برکت کا مطلب کسی پر پوشیدہ نہیں۔ ماں باپ کے پاؤں تک سعادتمند اولاد کے لئے مقدس اور بابرکت ہیں۔ استاد اور گروہ اور شیخ سب میں تقدس پایا جاتا ہے کسی مندر یا مسجد اگر دار کے یا گرجا کے اندرونی فرش کو بھی تمام اہل مذہب اس حد تک مقدس اور بابرکت مانتے ہیں کہ اس پر جوتے اُتار کر چلتے ہیں اور وہاں پیشاب کرنا یا گندگی پھیلانا ہرگز گوارا نہیں کرتے۔ تقدس کے اس تصور میں نہ کوئی مشرک ہے

سائنسی مسائل پر زبان درازی کرنے لگے۔ انھوں نے حجر اسود کے تعلق سے جو کچھ کہا وہ ذرا بھی قابل توجہ نہ تھا مگر اور بھی کچھ لوگ چونکہ اس طرح کا ہدیان کرتے رہتے ہیں اس لئے جواب عرض کیا جاتا ہے۔

بت پرست اپنے بت کے آگے پجاری کی حیثیت سے جاتا ہے۔ اس کے نزدیک بت دیوتا ہے یا اوتار۔ اس کے نزدیک پتھر کی اس صورتی میں بعض ایسی صفات پائی جاتی ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں۔ اس کے آگے وہ ماتھا ٹیکتا ہے۔ اس سے مرادیں مانگتا ہے۔ یہ محض ایک جسمانی رویہ نہیں بلکہ ذہنی اور اعتقادی رویہ ہے اور اس کا خلاف توحید ہونا دو اور دو چار کی طرح صاف ہے۔ اس کے برخلاف حجر اسود کسی صورتی اور بت کا نام نہیں بلکہ وہ تو ایک ناتراشیدہ پتھر ہے جسے اللہ کے ٹھکانے کا طواف کرتے وقت صرف پیار کیا جاتا ہے۔ پیار کرتے ہوئے ایسا کوئی تختی اور عقیدہ مسلمان کے ذہن میں نہیں ہوتا کہ اس پتھر میں کوئی طاقت اور اختیار ہے یہ نقصان یا نفع پہنچا سکتا ہے۔ اس سے کسی قسم کی مدد لی جاسکتی ہے۔ اسی لئے پیار کے سوا اور کوئی بھی ایسا عمل اس پتھر کے تعلق سے وہ نہیں کرتا جسے پوجا اور عبادت کے خانے میں فٹ کیا جاسکے۔

حجر اسود کو جو منے کی حیثیت اسلامی شریعت میں کیا ہے یہ بھی سن لیجئے یہ فرض ہے نہ واجب۔ اگر کوئی حاجی اسے چومے بغیر چور کر لے تو حج بلاشبہ ادا ہو جاتا ہے۔ اس پر نہ تو دنیا میں کوئی جرم مانا جاتا ہے نہ آخرت میں عذاب ہے۔ چومنا بہت سے بہت سنت ہے۔ یعنی ایسا عمل کہ اس کے گرنے میں نواب ہے مگر نہ گرنے میں عذاب نہیں۔ اسی لئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ زیادہ بھڑ یا کسی اور وجہ سے اگر حجر اسود کو بوسہ دینا مشکل ہو تو صرف ہاتھ سے چھو کر ہاتھ چوم لیا جائے۔ ہاتھ سے چھونے کا بھی معاملہ مشکل ہو تو کسی لکڑی وغیرہ سے چھو کر یہ لکڑی چوم لی جائے۔ یہ تک نہ کیا تب بھی حج میں کوئی خامی نہیں۔

اندہد نیست ہیں جن سے بحث میں وقت برباد کر کے سوائے
زریاں کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

خلاصہ جواب کل یہ ہے کہ آج کا دور فتنوں کا دور
ہے۔ شیطان خوب خوب کھل کھیل رہا ہے۔ آپ اپنی طاقت
محفوظ رکھنا چاہیں تو فضول قسم کے دستوں سے بچتے ہوئے
خدا پرست لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں، اچھی مستند کتابیں
پڑھتے اور لپے کر دائرہ عقائد کو بہتر بنانے پر پورا دھیان
دیجئے۔

غیر ضروری سوالات

سوال پہلے: از۔ ولایت علی۔ حیدر آباد۔
رام کرشنا آشرم کے طلباء دریافت کرتے ہیں کہ۔
نماز روزانہ پانچ وقت کیوں پڑھی جاتی ہے؟ اور نماز فجر
دو رکعت، نماز مغرب تین رکعت، نماز ظہر و عصر و عشاء چار
چار رکعت پڑھنے کی کیا مصلحت ہے؟ اور سب سے آخری
نماز واجب الوتر تین رکعت رکھنے کا کیا مقصد ہے؟ اس
کے معقول منطقی جوابات دئے جائیں۔

۲۔ ایک مسلمان صبا دریاقت کرتے ہیں کہ۔ ”حضور
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں موجودہ التحیات ہی پڑھتے تھے یا
کچھ اور پڑھتے تھے۔“ انھیں حوالہ حدیث مطلوب ہے۔
براہ کرم تجلی کے ذریعہ جواب دیا جائے۔

جواب:-

ان طلباء سے یہ دریافت فرمائیے کہ آدمی کے چہرے
پر دو آنکھیں کیوں ہیں جب کہ ایک سے بھی کام چل سکتا ہے
ناکس دو کیوں نہیں۔ ہر اچھے پیر میں پانچ پانچ اچھلیاں کیوں ہیں
چار چار یا چھ چھ ہوتیں تو کیا حرج تھا۔

اسی طرح آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ آسمان پر اتنے
بہت سے ستارے کیوں پیدا کئے گئے۔ چاند کو سورج کی طرح
ذاتی روشنی کیوں نہ دی گئی تاکہ وہ سورج کا محتاج نہ رہتا۔
بچہ ماں کے پیٹ میں نو دس ماہ کیوں رہتا ہے ایسا کیوں ہوا

بقلمی۔ اسی طرح حجرا سود کو بعض روایات کی بنا پر مقدس
موسم سمجھنا نہ شرک ہے نہ بدعتی۔ اللہ کے آخری رسول
سے بوسہ دیا اس لئے بوسہ دینا سنت قرار پایا۔ بوسہ
مکھ ہی چکے کہ افعال عبادت میں سے نہیں بلکہ اظہار
ت کا ایک طبعی اور معروف طریق ہے۔ اور یہ بھی سمجھ
کہ مسلمان حجرا سود کے مقابلے ایسا کوئی بھی تصور نہیں رکھتے
امت کے سچاری امت کے مستقل رہتے ہیں لہذا ظاہر
بندہ نہ قیاساً نہ معنائی بھی اعتبار سے دونوں چیزوں
کوئی ہم آہنگی اور یکسانی اور مشابہت نہیں۔

یہ ہم عرض کر رہی چکے کہ حجرا سود کا بوسہ نہ فرض ہے
احباب۔ حج اس کے بغیر بھی ادا ہو جاتا ہے لہذا یہ فعل ایسا
ہی نہیں جس کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جس طرح
امت پرست باقاعدہ ارادہ کر کے امت کی خدمت میں
نرمذو تاسے اسی طرح مسلمان بھی باقاعدہ ارادہ کر کے
سودگی ”خدمت“ میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہ حج کرنے
تے ہیں اور اس کے ایک ذیلی جزو کی حیثیت سے حج
رکو چوتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ جس فعل کو خود رسول اللہ
لیا ہو اس سے مسلمان پرہیز کرے اور حجرا سود کو قصداً
نہ نہ دے۔ جو حضرات یہ چاہتے ہیں کہ بوسہ کا یہ عمل
س کر دیا جائے وہ اگر مسلمان ہیں تو ان سے پوچھیے کہ آپ
اسلام کا سرچشمہ اور ماخذ کیا ہے۔ آپ اسلام کی کیا
بیت سمجھتے ہیں۔ آپ نے کتنا وقت اسلام کو سمجھنے اور اس کے
نام کی حقیقت و حکمت جاننے میں صرف کیا ہے؟

اور اگر غیر مسلم ہیں تو ان سے عرض کیجئے کہ کیا نقطہ یہی
عمل ایسا رہ گیا ہے جس پر آپ کو اعتراض ہے اور بانی
سے اسلام سے آپ متفق ہیں؟ اور کیا آپ امت پرستی سے
بکا اعلان فرمادیں گے اگر مسلمان یہ کہہ دیں کہ ہم آئندہ حج
رکو نہیں چومیں گے؟

جس وقت آپ یہ عرض کریں گے اس وقت آپ پر
فت مٹے گی کہ اعتراض کرنے والے حضرات نہ تو طالب حق
نہ دیانتدار اور معقولیت پسند بلکہ محض جھکی اور متعصب

کہ جہنہ میں دن میں تو لہ پذیر ہو جا کر تا۔

جو لوگ ہر پڑھنے کے لیے منطقی جواب حاصل کرنے کے چکر میں پڑ جائیں گے وہ ایک ایسی بھول بھلیاں ہیں جنہیں جانیں جس سے زندگی بھر نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ ان طلباء سے کہتے کہ خدا کی تخلیقات اور احکامات کے اسباب و وجہ کو منطقی طرح سے سمجھ لینا انسان کی چھوٹی طبیعت کے بس سے باہر ہے۔ وہ یہ تک تو سمجھ سکتا نہیں کہ اس کی پیدائش آخر ماں کے پیٹ ہی سے کیوں ضروری قرار دی گئی یوں کہ نہ ہو کہ وہ غلطی طرح زمین سے اُگتا یا پھلوں کی طرح شاخوں پر لٹکتا۔ لہذا انسان کو اپنی تمام تر توانائی ذہانت اور ولایت وقت صرف اس تحقیق و تجسس میں صرف کرنی چاہیے کہ کائنات کے خالق و مالک نے کیا کیا ہدایات دی ہیں کیا کیا احکامات نازل فرمائے ہیں، کن کن افعال و عقائد کو موجب سزا قرار دیا ہے اور کن کن اعمال و انکار پر انعام کا وعدہ فرمایا ہے۔ تحقیق و تجسس کے بعد جو کچھ معلوم ہوا اسے سننے سے لگانا اور فرماں بردار بندوں کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرنا آدمی کی تمام تر سعی و جہد کا محور ہونا چاہیے۔ فضول قسم کے سوالات وقت کی بربادی کے سوا کوئی فائدہ نہیں رکھتے۔

بعض علمائے اسلام نے اگرچہ ہزار روزے زکوٰۃ سرکے تفصیلی حکمتیں اور تعداد وغیرہ کی لطیف مصلحتیں بیان ضرور کی ہیں اور ہم بھی اپنے قیاس و فہم سے کچھ اضافہ کر کے انہیں دہرا سکتے تھے لیکن سرکے بات وہی ہے جو ہم نے عرض کی۔ خواہ مخواہ "کیوں" کے پھر میں پڑنا بری عادت ہے۔ ہاں مفید اور نیک خیر سوالات ضرور کرنے چاہئیں۔

(۲) ان مسلمان صاحب کے کہنے کے سوال وہ کرنا چاہتے جس سے کوئی فائدہ بھی ہو۔ اگر یہ سوال کیا جاتا کہ ہم مسلمان نماز میں جو انتحیات پڑھتے ہیں اسے پڑھنے کا حکم کیا اللہ اور رسولؐ نے دیا ہے یا فقہانہ نے بطور اجتہاد اسے داخل نماز کر دیا ہے تو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا کہ صحیح جواب پاکر طبیعت مطمئن ہو جاتی کہ واقعی اللہ کے رسولؐ ہی نے

انتحیات پڑھنے کا حکم دیا تھا اور اس کی صحت میں ایسا کوئی شبہ نہیں جس کا امکان اجتہادی مسائل میں ہو کر تا ہے۔

لیکن یہ دریافت کرنے سے آخر کیا فائدہ کہ خود حضورؐ بھی نماز میں یہی انتحیات پڑھا کرتے تھے یا نہیں پڑھتے تھے۔ وہ پڑھتے ہیں یا نہ پڑھتے ہیں اُمت کو تو بس اتنا کافی ہے کہ انھوں نے اسے پڑھنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ مسلمان صاحب حوالہ حدیث طلب کرنے کے بجائے اگر خود رحمت فرما کر بخاری و مسلم دیکھ لیتے تو انھیں متعدد صحیح روایات اس سلسلہ کی مل جاتیں اور معلوم ہو جاتا کہ انتحیات کا لفظ لفظ حضورؐ کا لکھا یا ہوا ہے۔

کسی بھی شرعی مسئلے میں قرآن و حدیث کا حوالہ طلب کرنا اس شخص کے لئے تو جائز و مناسب ہو کر تا ہے جو تھوڑی سی محنت خود بھی قرآن و حدیث کے مطالعہ میں کر لے اور پھر وہاں اسے کسی مسئلہ کی دلیل نہ ملے تو اوپر معلوم سے پوچھے۔ اگر مطالعہ کی فرصت یا صلاحیت نہیں ہے تو ایسے کسی مسئلے میں جو جہور امت کے یہاں متفق علیہ ہو، اور شرق سے غرب تک اس پر عمل بھی جاری ہو، قرآن یا حدیث کا حوالہ دریافت کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ شخص اپنی کاپی یا بے علمی کے باوجود تمام علمائے امت اور فقہائے علم سے باطن ہے۔ اس بدظنی کو ظاہر ہے جہل مرتکب ہی کہیں گے۔

ہم ایک بار پھر مشورہ دیں گے کہ آپ ان مسلمان صاحب سے یہ ضرور دریافت فرمائیں کہ حضورؐ نماز میں یہی انتحیات پڑھتے تھے یا نہیں پڑھتے تھے اس تحقیق و تفتیش سے آخر انھیں کیا ملے گا اور کیوں وہ ایک لاکھ بحت میں سرکھانا جاتے ہیں۔ اگر فرض سمجھیں تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو کہ حضورؐ کسی اور طرح پڑھتے تھے یا انتحیات پڑھتے ہی نہیں تھے تو کیا اس سے وہ یہ استدلال کریں گے کہ پھر تو ہم بھی نہ پڑھنا چاہیے۔ اگر یہ استدلال کریں گے تو اس کا مطلب ہوگا دین سے انحراف اور شریعت سے

میں خلل اندازی و حرمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

اقتباسات درج ذیل ہیں:-

۱۔ حضرت ابویرمۃ اور ابوسعیدؓ دونوں حضرات اسکی گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ارشاد فرماتے ہیں کہ جو جماعت اللہ کے ذکر میں مشغول ہو فرشتے اس جماعت کو سب طرف سے گھیر لیتے ہیں اور رحمت انکو ڈھانک لیتی ہے اور سکینہ ان پر نازل ہوتی ہے اور اللہ جل شانہ انکا تذکرہ اپنی مجلس میں تقاضا کے طور پر فرماتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو تبلیغی نصاب جلد اولیٰ باب فضائل ذکر ص ۲۷)

ب۔ جہاں اللہ کے ذکر کی مجلس ہو اللہ کا ذکر کیا جا رہا ہو وہاں جمع ہوں اور اس کو سنیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۲)

ج۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ صحابہؓ کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور در یافت فرمایا کہ کس بات نے تم لوگوں کو یہاں بٹھایا ہے۔ عرض کیا کہ اللہ جل شانہ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بات پر اس کی حمد و ثنا کر رہے ہیں کہ اس نے ہم کو اسلام کی دولت سے نوازا یہ اللہ کا بڑا ہی احسان ہم لوگوں پر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہیں۔ حضور صلعم نے فرمایا کسی بدگمانی کی وجہ سے میں تم کو قسم نہیں دی بلکہ جبریل میرے پاس ابھی آئے تھے اور یہ خبر سنا گئے کہ اللہ جل شانہ تم لوگوں کی وجہ سے ملائکہ پر نوح فرما رہے ہیں (ایضاً ص ۲۶)

د۔ حضور صلعم کا ارشاد ہے کہ جو بھی لوگ اللہ کے ذکر کے لئے مجتمع ہوں اور ان کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہو تو آسمان سے ایک فرشتہ نازل کرے کہ تم لوگ بخش دیئے گئے۔

س۔ حضور اقدس صلعم دولت کہہ میں بیٹھے تھے کہ آیت (وَأَصْبَحْنَا فِرْقًا) نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے اپنے آپ کو ان لوگوں کے پاس بیٹھنے کا پابند کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ حضور اقدس صلعم اس آیت کے نازل ہونے پر ان لوگوں کی تلاش میں نکلے۔ ایک جماعت کو دیکھا کہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہے۔ بعض لوگ ان میں

معاذت۔ حضور کے لئے اللہ نے بہترے امور و معاملات میں تخصیص فرمائی مثلاً آپ بیک وقت جا رہے زائد ہو یاں رکھ سکتے تھے۔ آپ کی بیواؤں سے کوئی شخص نکاح نہیں کر سکتا تھا۔ آپ کا نذر کہ تقسیم نہیں ہو سکتا تھا وغیرہ ذلک کسی شخص کے لئے ان امور میں حجت نہیں۔ امت تو اس بات کی پابن۔ بنائی گئی ہے کہ اللہ اور رسولؐ کو جس طرح تعلیم دیں اس طرح مانو۔ حضور نے نفع نہ مانو نہیں انجیات کی تعلیم دی ہم پر ضروری ہو کہ چون دیر کے بغیر مان لیں اس بحث میں نہ پڑیں کہ خود حضورؐ بھی انجیات پڑھتے تھے یا نہیں پڑھتے تھے۔ ہاں اس پہلو سے ہر وقت گفتگو ہو سکتی ہے کہ حضورؐ کی تعلیم صحیح روایات سے ثابت ہے یا نہیں تو ہم نے عرض کر ہی دیا کہ بخاری و مسلم جیسی مستند کتابوں میں متعدد صحیح و قوی روایات موجود ہیں۔ مسلم کا باب الشُّعْرَانِی الصَّلَاةُ ہی دیکھ لیا جائے تو کافی ہوگا۔

مسجد میں ذکر و شغل اور تبلیغی نصاب

سوال ۱:۔ از۔ محمد عبدالولی۔ حیدر آباد۔

فاضل و دقیق مسائل مختلفہ پر آنجناب کے افاضات عالیہ قلوب پر نقش کا بھر کی حینیت رکھتے ہیں۔ کم سے کم مجھے آنجناب کے فرمودات سے دالہانہ عقیدت ہے اور میرے لئے مشعل راہ ہیں۔ میں نے دیکھا مسجد میں چند اصحاب جمع تھے اور ذکر و تسبیح کا شغل جاری تھا۔ ان میں میرے ایک کرم فرما بھی شریک تھے۔ میں نے ازراہ فلاح انکو ٹوکا اور اس نظر فریب عبادت میں بدعت کی حرمت ظاہر کی موصوف کی جسیں شکن آلود ہو گئی اور فرمانے لگے اس عمل صالح کی تائید میں احادیث اور اللہ کا حکم موجود ہے۔ پھر تبلیغی نصاب جلد اولیٰ مرتبہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ کترین میں اتنی دلی دینی بصیرت کہاں کہ رد و قدح یا مناظرے کے ذریعہ کوئی مسکت جواب دے کہ اپنے موقف کو مستحکم کرے۔ اس لئے آنجناب سے رجوع کر رہا ہوں اور گراں قدر اوقات

بکھرے ہوئے بالوں والے ہیں اور خشک کھالوں والے اور صرف ایک کپڑے والے ہیں جب حضورؐ نے ان کو دیکھا تو ان کے پاس بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ خود مجھ کو ان کے پاس بیٹھنے کا حکم ہے۔ (ایضاً ص ۷۷)

جواب:-

تبلیغی نصاب کے محترم مؤلف اور تبلیغی جماعت کے ممتاز رہنما اور مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحی ریت مولانا محمد زکریا دام ظلہ اگرچہ بعض اعتبار سے بہت بڑی شخصیت ہیں اور صاحب علم بھی ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف اور شروح ہیں، ان کا شغل حدیث پڑھنا ہے اور ان کے مربی بہت ہیں۔

لیکن ان تمام اوصاف حمیدہ کے باوجود یہ ماننا مشکل ہے کہ وہ فقیہ بھی ہیں۔ نقاہت یعنی سوچھ بوجھ اور بصیرت و فراست کے بہت سے درجے اور اسٹیج ہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں فقیہ تو فلاں اور فلاں سمجھے جاتے ہیں۔ مگر نقاہت کا وہ درجہ جو عقیدت کی شان لئے ہوئے ہو اور ہی چیز ہے۔ اس کا انحصار کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات اور ذکر و تسبیح کی فراوانی اور عبادات کی ہر گز کمی پر نہیں بلکہ ایک خداداد صلاحیت اور اعلیٰ ترین ذہنی استعداد پر ہے یہ استعداد کمائی یا خریدی نہیں جاسکتی بلکہ ماں کے پیٹ سے ملتی اور سازگار حالات سے نشوونما پاتی ہے۔

یہاں وہ دلائل بیان کرنے کو مشکل ہیں جنہوں نے ہمیں اس رائے تک پہنچایا البتہ اتنا ضرور عرض کر سکتے ہیں کہ بھی ان کی ایک کتاب آئی ہے جس میں انھوں نے تبلیغی جماعت پر وارد ہونے والے متعدد اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اسے پڑھ کر بالو سی ہوتی ہے کہ اس میں تمام نقائص موجود ہیں جو کسی کمزور موقف کی پیشہ ورانہ اور غلو آمیز دلائل میں ہو کر رہتے ہیں۔ دعوے اور دلیل میں مطابقت غنایا برائے نام۔ غیر ضروری نکات پر طویل مونوگرافی اور

اور ضروری نکات سے صرف نظر معترض کے دلائل کو سمجھنے سے دانستہ یا نادانستہ اعراض۔ صحیح اقوال و نصوص کا غلط انطباق۔ رکوع کے موقع پر سجدہ اور سجدے کے موقع پر قیام۔ قوی ترین احادیث سے بے اعتنائی اور ضعیف روایات سے گہری دل چسپی اور وابستگی۔ اس کتاب کے مطالعہ نے ہمارے اس تاریکی صحت کا ثبوت ہٹا کیا جو تبلیغی نصاب کے مطالعہ سے کبھی پہلے قائم ہو چکا تھا۔ تبلیغی نصاب کسی اعتبار سے قیمتی اور مقدس شے ہے۔ لیکن اسکی مثال کم و بیش اس سالن جیسی ہے جس میں کچھ اجزاء تو نہایت مفید اور صحت بخش اور مقوی ملائے گئے ہوں لیکن کچھ اجزاء زہریلے اور امراض پیدا کرنے والے بھی آمیز کر دیئے گئے ہوں۔ یہ تو طے ہے کہ محترم شیخ الحدیث نے جان بوجھ کر ایسا نہ کیا ہو گا۔ کوئی بھی باورچی اپنی دنگ کو قصداً تو نہیں جگاڑا کرتا لیکن اجزاء کے خواص اثرات سے بے خبری یا ان کے بارے میں غلط فہمی اور غدا کے مجموعی اثرے اور حامل کے بارے میں بے شعوری یا خوش فہمی ثقہ کی کمی اور زرف نگاہی کی قلت اور بصیرت کی نارسائی ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ تبلیغی نصاب صلیحیت اور خدا رسیدگی کا جو مجموعی تصور دیتا ہے وہ جوہری اعتبار سے کم و بیش وہی تصور پرید کرتا ہے جو رامہوں اور سنیاسیوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مصطلح عبادات اور طریقت کے اختراع کردہ اور ادرا د اشتغال سے روحانی قوت حاصل کر کے دفعتاً جنت میں چھلانگ لگا جانے کا درس تو یہ نصاب بڑی خوش اسلوبی سے دیتا ہے لیکن موجود دنیا کے مسائل سے بچہ کشی اور دوسری اقوام پر اثر انداز ہونے والے اخلاق و کردار اور ایمانی فراست کا لوہا منوانے والے اطوار و اعمال کے رخ پر اس کا رویہ نہ صرف منفی ہے بلکہ کہیں کہیں تو یہ دیوار بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔

اس اشارہ اتی تبصرے کے بعد اب ہم آپ کے سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

جو اقتباسات تبلیغی نصاب سے آپ کے سامنے پیش کئے گئے

انھیں مسجد کے مذکورہ زیر بحث اجتماع اور ذکر و غسل کے حق میں بطور دلیل پیش کرنا ٹھیک و سیاہی علم کلام ہے جو بریلوی مکتب فکر استعمال کرتا ہے۔ کون مسلمان ہو گا جو ذکر الہی کی فضیلت سے انکار ہی ہو یا ان مجالس کو برا سمجھتا ہو جن میں اللہ اور اس کے رسول کی تعریف کی جائے۔ کون مسلمان ہے جسے تسبیح و درود سے بے رغبت ہو۔ کون مسلمان ہے جو اللہ کی رضا جوئی پر زربان اعتراض ٹھول سکے۔ پھر کیا ان لوگوں کو کم عقل اور سادہ لوح نہیں کہیں گے جو اعتراض کی اہل نوعیت تو سمجھتے نہیں اور ایک متفق علیہ اور مسلم بات کے ثابت کرنے میں اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک معمار چھت کی اینٹوں کو کستونوں میں استعمال کرنے لگے اور ٹوکنے پر یہ تقریر شروع کر دے کہ چھت کی اینٹ زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ خوش نما بھی ہوتی ہے۔ سبک بھی ہوتی ہے وغیرہ۔ یا یہ ایسا ہی ہے جیسے بدعتی لوگ اذان کے وقت انگوٹھے جوڑتے ہیں، مساجد میں صلوٰۃ پکارتے ہیں، نذر و نیاز اور سیلا و دفتار کے شبن مناتے ہیں، قبروں پر جھٹکاتے ہیں، قوالیوں میں دھمکتے ہیں اور عرسوں کے میلے لگاتے ہیں پھر لوگ تو نعمت رسول اور درجات اولیاء اور اہمیت نماز اور شرف و کرامات پر داد و تحیق دینے لگتے ہیں۔ یہ دراصل خباثت اور بے مغزی کی ایک قسم ہے جو کبھی کبھی مایوسیانہک جا پہنچتی ہے۔

اللہ کا ذکر ہو، رسول کی ثنا ہو، صحابہ و اقیبہ کی توصیف ہو ان سب کے کچھ حدود اور کچھ حدود ہیں۔ جو وقت بال بچوں کی روزی کمانے کا یا حتیٰ زوجیت ادا کرنے کا ہے اس وقت کوئی نرا اہل میں جتنا ہے یا اللہ کی ضرر میں لگانے میں مست ہو تو اسے مردِ مومن نہیں بلکہ عابدِ احمق کہیں گے۔ اللہ کی رضا اور خوشنودی اس کی شریعت میں منحصر ہے۔ کسی بھی عمل کو موجبِ ثواب و برکت سمجھنے سے پہلے ہمیں دیکھنا ہو گا کہ اللہ اور رسول کی تعلیم اور صحابہ کا اس پر اس کے بارے میں کیا ہے اور فقہائے کرام کیا فرماتے ہیں۔ مساجد میں کیا کرنا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسکی دریافت

یہ واقعہ سند دار میں بیان ہوا ہے۔ ابن عبد اللہ مہتمی دار الحی امام بخاری کے ہم عصروں میں تھے۔ ان کی روایت کرنے والوں میں امام مسلم، امام ترمذی، امام ابو داؤد، اور امام احمد کے بیٹے عبد اللہ اور محمد بن یحییٰ ذہلی جیسے بزرگ شامل ہیں۔ خراسان کے چار حفاظ حدیث میں انکا شمار تھا۔ ان کی جمع فرمودہ کتاب حدیث مسند دار الحی کے نام سے مشہور ہے جس میں کم و بیش ساڑھے تین ہزار حدیثیں ہیں۔ چند تعارضی الفاظ صحابی رسول عبد اللہ ابن مسعود کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ ان کا شمار فقہ ترین صحابہ میں

بارہ رکعات بھی نقل ہوئی ہیں۔ یہ ہر حال طے ہے کہ نماز چاشت حضور کم و بیش پابندی سے ادا فرماتے تھے۔ اس کے باوجود بخاری و مسلم جیسی مستند کتابوں میں یہ فقہ مذکور ہے کہ حضرت مجاہد اور حضرت عروہ ایک صبح بعد طلوع آفتاب مسجد میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ صحابی جلیل حضرت عبداللہ ابن عمرؓ حجرۃ عائشہؓ کے قریب تشریف فرما ہیں اور چند حضرات مسجد میں نماز چاشت ادا کر رہے ہیں۔ مجاہد کا بیان ہے کہ ہم نے حضرت ابن عمرؓ سے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے برملا فرمایا کہ یہ لوگ بدعت کے مرتکب ہیں۔

ابن عمرؓ کے اس صریح ارشاد کے ساتھ مدح ذیل امور بھی ملحوظ رکھے جائیں :-

ایک یہ کہ معاملہ نماز کا ہے کسی ایسے ذکر اللہ کا نہیں جس کی شکل و ہیئت غیر معین ہو۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہؐ نماز چاشت پڑھنا مسلمات میں سے ہے۔ جو علماء یہ نہیں مانتے کہ حضور پابندی سے یہ نماز پڑھا کرتے تھے وہ بھی یہ ضرور مانتے ہیں کہ جب آپ سفر میں جاتے یا سفر سے آتے تو یہ نماز بے شک پڑھا کرتے تھے۔ تیسرے یہ کہ عین مسجد ہی میں بارہا آپؐ کا نماز چاشت پڑھنا قوی روایات سے ثابت ہے۔

اس کے باوجود ابن عمرؓ جیسے فقہ صحابی نے برملا یہ یہ کہا کہ یہ مسجد میں نماز چاشت پڑھنے والے بدعت کے مرتکب ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوگا کہ مسجد میں عبادات کے قبیل کا صرف وہی عمل درست ہے جس کی نہ صرف شکل و ہیئت حدیث سے ثابت ہو بلکہ یہ بھی ثابت ہو کہ صحابہؓ نے دو برس رسالت میں یا اس کے بعد اس پر فلاں انماز میں عمل کیا ہے۔ یہی چیز عبداللہ ابن مسعودؓ والے مذکورہ فقرے سے ظاہر ہے اور اسی کے مماثل اور بھی واقعا

ہے یعنی دین و شریعت میں مجہدانہ بصیرت رکھنے والے۔ امام ذہبیؒ شارح مسلم تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ قرآن کے علم و تحمل میں وہ چاروں خلفائے راشدین سے بھی آگے تھے۔ علامہ ابن عبد البرؒ الاستیعاب میں رسول اللہؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعودؓ تمھارے لئے جس شے کو ناپسند کرے اسے میں بھی ناپسند کرتا ہوں یہی ارشاد رسولؐ بعض اور کتاب میں بھی منقول ہوا ہے۔ ابن مسعودؓ زینقاہت میں ایک بلند مقام حاصل تھا اس پر تمام چوٹی کے علماء متفق ہیں۔

جو واقعہ ہم نے بیان کیا وہ سند درجی ہی تک محدود نہیں۔ بہتیری کتابوں میں یہ بیان ہوتا آرہا ہے۔ مثلاً علامہ شہیر ابن ذہبیؒ العیاد احکام الاحکامہ میں اسے بطور استدلال پیش فرماتے ہیں۔ ان کی نقل کے مطابق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے حلقہ ذکر کے شرکاء سے یوں فرمایا تھا۔

”کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ سے بھی زیادہ بدعت پڑھتے ہو؟ ظالمو! تم نے ایک بہت بڑی بدعت کا آغاز کیا ہے۔ کیا تمھیں یہ خوش نہیں ہے کہ اصحاب رسولؐ سے بھی بڑھ کر عالم فاضل ہو گئے؟“

فقیر شہیر علامہ ابن عابدینؒ سدا احتساب میں فتاویٰ بزازیہ کے توسط سے ایک فقہی استدلال کے ذیل میں یہی بات لاتے ہیں اور اس میں تصریح ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ نے ذکر اللہ کے ان متوالوں کو مسجد سے نکال باہر کیا تھا یہ۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ طلوع آفتاب کے کچھ دیر بعد ایک نماز حضورؐ پڑھا کرتے تھے جس کا معروف اردو نام ”چاشت“ ہے۔ اور عربی میں اسے ”صلوۃ الضحیٰ“ کہتے ہیں کبھی چار رکعت کبھی چھ یا آٹھ یہاں تک کہ ”مرانی الفلاح“ میں

ہیں مثلاً ابن عمرؓ نے اجتماع دھانے قوت پڑھنے کو بدعت کہا بعد اللہ ابن مغلضہؓ صحابی رسولؐ نے مساجد میں زور زور سے اسم اللہ پڑھنے کو بدعت کہا۔ نماز تہجد کو مسجد میں اجتماعاً پڑھنا فقہاء کے نزدیک بدعت ہے۔ غناطے کے امام شاطبیؒ نے انبی الاعتصام میں اس مسئلے پر بڑی اہم اور بنیادی باتیں لکھی ہیں۔ جس قسم کے اجتماعی ذکر و تسبیح کے بارے میں یہاں سوال کیا گیا ہے ٹھیک اسی کے بارے میں امام شاطبیؒ یہ الفاظ لکھتے ہیں:-

ومنها التزام الکلیات والھیئات
المعینۃ کالذکر ہیئۃ الاجتماع۔

(ترجمہ) اور ان ہی بدعتوں میں سے متین کیفیتوں اور ہیئتوں کا التزام کرنا ہے جیسے کچھ دیوبند کا جمع ہو کر ذکر کرنا۔

عبد اللہ ابن سعود کا یہ ارشاد اس باب میں حرف آخر ہے
اتبعوا آتائنا وادلاتنا فقد کفینم
(الاعتصام۔ جلد اول ص ۱۷۵)

دھارے نقش قدم پر چلو اور نئی نئی باتیں نہ نکالو۔
ایسا ہی کرنا تمھاری فلاح کیلئے کافی ہے،

اس موضوع پر اگر ہم لکھنا چاہیں تو بلا مبالغہ ہزار صفحات لکھ سکتے ہیں لیکن یہاں تو اتنا ہی مواد بہت ہے۔ ہر مصنف مزاج اندازہ کرے کہ مسجد کے جس ذکر و فعل کا آپ نے ذکر کیا وہ بدعت ہے یا نہیں اور اس کے عاملین سادہ لوح ہیں یا نہیں۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ اصل تصور ان بیچاروں کا نہیں ہے جو تبلیغی نصاب پڑھ پڑھ کر خود ان جنت کے قرب خیالی سے مخطوط ہو رہے ہیں۔ بلکہ اپنے شیوخ ہی سے انھیں یہی مزاج ملا ہے۔ مثلاً حضرت محترم شیخ الحدیث مولانا زکریا کے یہاں ہر سال رمضان میں اعتکاف ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات یہاں نہیں ہیں۔ مریدین و متوسلین دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں اور مسجد شیخ میں معتکف ہوتے ہیں سیکڑوں کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ معتکفین کی ایک لہری بس

جاتی ہے۔ اجتماعی انداز میں سحر و افطار ہوتا ہے کتنے ہی بزرگانِ خدا ہیں جن سے گفتگو کرتے ہوئے ہم نے اندازہ کیا ہے کہ مسجد شیخ میں شیخ کے ہم پہلو معتکف ہونے کو وہ بہت بڑی سعادت اور خوش نصیبی تصور کرتے ہیں۔

اب آئیے اسوۂ رسولؐ اور آثار صحابہؓ کی طرف۔ اعتکاف حضورؐ کی سنت ہے اور قرآن سے بھی اس کا استحباب نکلتا ہے۔ لیکن کیا تبلیغی جماعت کے اہل علم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ مذکورہ قسم کے اجتماعی اعتکاف کا استحباب کہاں سے نکالا گیا۔ کیا کچھ صحابہؓ بھی حضورؐ کے زمانہ اعتکاف میں مسجد نبویؐ کے اندر معتکف ہوئے تھے؟

ایک حدیث صحیح مسلم میں یہ ملتی ہے کہ ایک مرتبہ رمضان کے آخری عشرہ میں رسول اللہؐ نے مسجد میں اپنا خیبرہ لگوا دیا۔ اس پر ام المؤمنین حضرت زینبؓ نے بھی اپنا خیبرہ لگوا دیا۔ پھر بعض دوسری ازواج مطہرات نے اسے چمے لگوائے۔ اب جو نماز فجر سے فراغت پا کر حضورؐ پر نظر دیکھتے ہیں تو ناخوشگوار سی کے انداز میں فرماتے ہیں اکبڑ یزدن لفظاً اس کے معنی یہ ہیں کہ کیا انھوں نے نیکی کا ارادہ کیا ہے یا یہ کہ کیا ان کا ارادہ نیک ہے مگر اصطلاحاً اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا ارادہ نیک نہیں ہے۔ چنانچہ آپؐ نے نہ صرف ان کے چمے اُکھڑا دیئے بلکہ رمضان میں اعتکاف ہی چھوڑ دیا۔ (مسلم۔ جلد اول۔ کتاب الاعتکاف) تبلیغی جماعت کے اکثر و بیشتر افراد میں تو خیبر یہ صلاحیت ہے ہی نہیں کہ تبلیغی نصاب آگے کی کوئی چیز زیر غور لاسکیں۔ ہم حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کا یہ حال دیکھتے ہیں کہ ان سے سوال کرتے ہیں کہ اس حدیث کے کیا کیا مضمرات و نتائج ہیں۔

یہ تو ایک موٹی موٹی سی بات ہے کہ اس سے عورتوں کے اعتکاف فی المسجد کی ممانعت نکلتی ہے مگر کیا کچھ اور نہیں نکلتا؟

مذکورہ ازواج مطہرات کے ارادہ اعتکاف میں

خلوص کی قائل قرار پائی اور ان کے ارادہ اعتکاف کو بارگاہ پیغمبری سے کمر بستگی کا خیر طرح نمائا۔ بسک مبنی دو گوش خیمے ہی اکھڑا دیئے گئے اور حضورؐ نے رمضان کا اعتکاف تک چھوڑ دیا۔

جو لوگ اقعہ وہی اعتکاف کرنا چاہیں جو حقیقت شرعی کے اعتبار سے اعتکاف ہے تو کو نسا جذبہ یا کو نسا جذبات ہیں جو انھیں شیخ الحدیث سہارنپوریؒ کی مسجد میں کھینچ کر لاتے ہیں یہ کیا یہ مسجد مسجد نبویؐ سے بھی زیادہ بابرکت ہے اور کیا شیخ الحدیث کا سیکر خاکی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ مبارک سے بھی بڑھ چسپڑہ کر مقدس ہے کہ مریدین و متوسلین اس سے قربتِ اتصال کا شوق نہ سربائیں اور پھر بھی ان کا اعتکاف غلخصانہ نہ ہو جائے۔ کھلی بات ہے کہ یہاں بھی داخلی محرک و سیاحی ایک جذبہ ہے جیسا ازدواج کے فعل میں نظر آتا ہے۔ یہاں بھی بنے اور آقا کے درمیان ایک انسان حائل ہے۔ یہاں بھی عابد اپنے معبود کے آگے براہ راست حاضر ہونا نہیں چاہتا بلکہ اپنے پیر و مرشد کے جسمانی قرب کی مفروضہ برکتوں کا سہارا لیتا ہے اور ایک ایسا احوال پسند کرتا ہے جہاں کم سے کم افکار و سحر میں وہ خلوت اور انجمن کی کیفیت سے ہمکنار ہو۔ نیز دیگر اوقات میں بھی یہ محسوس کر سکتے کہ وہ اکیلا نہیں ہے ہم مشرب اور بھی آس پاس ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں۔ یہ احساس بجائے خود اعتکاف کی معنویت کا قائل ہے۔

پھر کیا وہ دوسرا نفسانی جذبہ بھی ان عاشقانِ شیخ کے اندر نہیں پایا جاتا جس کا اندر اک و احساس حضورؐ نے ازدواج کے طرزِ عمل میں کیا تھا۔ کیا ان میں باہمی مباحثات اور حرصِ حرمی اور تفاخر کے وجود سے انکار ممکن ہے۔ خدا کے لئے ہیں کوئی بناؤ کہ آخر صحابہؓ کو اجتماعی اعتکاف کی کیوں نہ ہو بھی اور معتکفین کا یہ سیکہ کیوں عبت کے زمرے سے خارج ہے جو ہر سال مسجدِ نبویؐ میں لگتا ہے صحابہؓ کے بعد تابعین آتے ہیں۔ مجتہدین وائمہ آتے

برائی کا پہلو کیا تھا اسے سوچئے۔ ایک خرابی تو یہ بھی کہ مسجد میں عام لوگ آتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ منظر بھی اور دیہاتی بھی۔ ازدواج مذکور کو حرجِ حضورؐ کے لئے بہر حال روزانہ ہی مسجد سے باہر آنا ناگزیر تھا۔ اس صورت حال کو حضورؐ کے مذاقِ بلند نے ٹھٹھیا تصور کیا اور بجا کیا۔ لیکن اس کا ازدواجِ مہلرات کے ارادے اور نیت سے تو کوئی تعلق نہ ہوا۔ حضورؐ کا ہر جہتہ ارشاد کسی اور ہی پہلو کی طرف مشیر ہے۔ وہ پہلو کیا ہو سکتا ہے یہ سمجھنا مشکل نہیں۔ دراصل اعتکاف نام ہے ایک ایسی خلوتِ کاملہ کا جس میں بندہ تمام علاقوں سے کٹ کر اپنے رشتہ جوڑے۔ ذہنی و قلبی رشتہ۔ اور مکمل کیسوئی کے ساتھ اپنے اعمال نامے پر نظر ڈالے اور اپنے گناہوں پر گھر گئے۔ یہ وہ محابِ خلوت ہیں جن میں بندہ اور آقا مالک اور مملوک، عابد اور معبود تنہا ہیں۔ ان کے باہر جسمانی یا ذہنی یا روحانی طور پر کوئی حائل نہیں۔ حضرت زینب حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہم حضورؐ کی بیویاں ہیں۔ آپ انھیں اندھا دہر سے خرب جاتے ہیں۔ آپ کے فوراً محسوس فرمایا کہ ان کا اعتکاف خالصتہً لکھ نہیں ہے بلکہ یہ میرے قریب تر رہنا چاہتی ہیں اور آپس میں نحر و مباحثات کا جذبہ ان کے اندر کام کر رہا ہے۔ اسی چیز کو آپ نے خرابیِ نیت کا نام دیا۔ صاف کہا کہ ان کا ارادہ نیک نہیں ہے۔ اب غور کیا جائے۔ کیا فی ذاتہ یہ کوئی معیوب بات تھی کہ بیویوں نے اپنے شوہر سے قربِ جسمانی کی حرص کی۔ اللہ اور رسولؐ کو تو نون و شومہ ہر کا ذہنی و جسمانی ارتباط اس قدر پسند ہے کہ اسے عین مطلوب قرار دیا گیا۔ پھر رسول اللہؐ جیسا شوہر کہ اس کا پسینہ بھی عطر اس کے سانس بھی مشک و عنبر اس کے قدموں کی خاک بھی سعادت دارین کی ضامن۔ اس کی ہمسائی نعمتِ عظمیٰ۔ اس کی وساطت کے بغیر تو خدا کا بھی صحیح عرفان محال۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس خاص موقعہ پر قرب کی یہی حرص و خواہش ازدواج کے

خصوص میں مدلل روشنی ڈالتے تاکہ دونوں فرقوں کے صحیح عقائد واضح ہو جائیں اور دونوں بڑی قومیں صلاح انسانیت کے کام مل جل کر لیا کریں اور دنیا کو آخرت کی سرسبز و شاداب کھیتی نامت کر دکھائیں۔

جواب :-

آپ کے سوال کا شافی جواب چند سطروں میں بھی ہو سکتا تھا لیکن خود میں اور طرز فکر اس سوال کے تجھے کام کر رہا ہے وہ نہایت زہریلا اور فاسد ہے اس لئے ہم شرح و بسط سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلے ہم ان تہذیبی فقروں کو لیں گے جنہیں آپ نے سوال کی تقریب میں حوالہ قلم فرمایا ہے۔ ان میں آپ نے ایک مرموز قسم کی تعریف کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کے مطالعہ کا آپ کو موقع نہیں ملا ہے حالانکہ حضرت عیسیٰ کے بے بدرد ہونا اور آسمان پر اٹھانے جانے کے عقائد کا صریح تقاضا یہ تھا کہ آپ ایک ملامد کی حیثیت سے پہلے قرآن پر طالب علمانہ نظر ڈال لیتے اور اس کے بعد اگر کوئی اشکال ذہن میں کھٹکتا تو اسے سامنے لاتے۔

”ابن“ عربی میں بیٹے کو بھی کہتے ہیں۔ عزیز و محبوب کو بھی اور بغیر کسی لغوی معنی کے یہ کئی تئوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ابن حجر، ابن بطوطہ وغیرہ۔ یہ سیاق و سباق ہی بتاتا ہے کہ کہاں یہ کیا مفہوم دے رہا ہے۔ مثلاً آپ کی نقل فرمودہ آیت تَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُ میں اس استعمال میں اور فرزند کے معنی میں نہیں ہوا بلکہ محبوب، مقرب اور برگزیدہ کے معنی میں ہوا ہے۔ عیسائی اور یہودی جھڑپت کہا کرتے تھے کہ ہم سب اللہ کے چہتے اور لاکڑے ہیں۔ لیکن یہی لفظ بعض روایات میں لائے ہوئے اور دکن کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورہ توبہ فرمایا گیا۔

قَالَتِ الْيَهُودُ عِزَّاوَنَ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ

ہیں۔ یہ بھی اس کی تعلیم نہیں دیتے۔ پھر کیا بدعت کے سر پر سینگ نکلنے چاہئیں تب ہی اسے بدعت قرار دیا جاسکے گا۔

مردہ جہ تصوف کو بائبل مدعات کا منبع اور مصدقہ خارج ہے۔ مگر حضرت شیخ الحدیث تواتر اللہ عالم دین ہیں۔ اس بارے میں شارح حدیث ہیں۔ وہ بھی اگر بدعت و سنت کے فرق کو حفظ نہیں دے سکے تو یہی ماننا پڑے گا کہ گمراہ تصوف اب کبھی اُس راہ پر نہیں آسکے گا جسے راہ احسان کہتے ہیں۔

اسلام و عیسائیت

سوال :- از۔ میر ولایت علی۔ حیدر آباد۔
تجلی مارچ و اپریل ۱۹۸۷ء کے صفحہ ۴۷ پر یہ سلسلہ ”حضرت عیسیٰ کی بشریت“ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ”عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو جو غور باللہ خدا کا بیٹا بنا دیا وہ بھی ایسی ہی غالی اور غیر عقلی عقیدہ تہذیب کا شاخسانہ تھا پھر دیکھ لو کہ آج بھی کروڑوں افراد حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ مانتے ہی چلے جا رہے ہیں۔“ عیسائی نہ صرف حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ کہتے بلکہ اپنی پوری قوم کو ”ابن اللہ و احبائہ“ کہا کرتے۔ میں اس وقت ابن اللہ کی لفظی بحث میں جانا نہیں چاہتا صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب خود مسلمان حضرت عیسیٰ کی پیدائش بے پدر مانتے ہیں اور انھیں آج تک آسمان پر بحمدِ عنصری زندہ مانتے ہیں تو عیسائیوں پر کیا الزام کہ وہ اپنے پیغمبر کو دیگر تمام پیغمبروں سے ایک اعلیٰ اور ممتاز درجہ پر فائز مانتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے سامنے قرآنی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ دیکھو پیغمبر اسلام نے بھی خدا کی طرف سے نہ صرف ”سچ“ کا سہرا اعلیٰ اور ممتاز درجہ تسلیم فرمایا ہے اور کہتے ہیں کہ ”مسلمان محض ہر طے دھری سے حضرت مسیحؑ تھے اس خصوص میں امتیاز کے انکاری ہیں۔ اور پیغمبر اسلام کو قرآنی سند کے بغیر غلوئے عقیدے سے انفس الایمانہ منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ براہ کرم اس

ہی کے ان دوسرے مقامات کو نظر انداز کر دیا جائے جہاں اس کا مفہوم فرزند کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ لکھ لکھا کہ وہ تو لکھ لکھ کر صریح الفاظ نازل کیے تھے ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾

اب آئیے اصل سوال کی طرف توجہ کرنا کہ کیا تعلیم یافتہ مسلمان ہو کر بھی یہ حقیقت آپ کے پاس نہیں رہی کہ جہاد پر امت کبھی کسی طبع زاد اور خانہ ساز عقیدے پر متفق نہیں ہوتے بلکہ صرف اُن عقائد پر اتفاق کرتے ہیں جو یا تو قرآن سے یا احادیث منوثرہ سے ثابت ہوں حضرت علیؓ ابن مریم بغیر آپ کے پیدا ہوئے اور انھیں دلی ہرگز نہیں دی گئی بلکہ آسمان پر اٹھایا گیا۔ مسلمانوں کے ان دو متفق علیہ عقیدوں کا تذکرہ آپ کے اس انداز میں فرمایا گویا ان کی صراحت قرآن و حدیث میں تو ہے ہی نہیں اس مسلمانوں نے انھیں قیاس و اجتہاد سے داخل ایمان کر لیا ہے۔ نیز آپ کے اسلوب سے یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ ان عقیدوں سے اتفاق نہیں رکھتے۔ یہ دونوں ہی باتیں سراسر غفلت اور خبر گیری کا ثمرہ ہیں۔ علم و تحقیق سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اگر مسلمان کی حیثیت میں قرآن و حدیث کو بغیر شرطیں تو کوئی شبہ اس میں نہ رہے گا کہ ان دونوں باتوں کی خبر خود اللہ اور رسولؐ نے دی ہے اسلئے امت ان پر ایمان لے آئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قیاس، اجتہاد، منطق، اُتکل اور پرداز خیال کے زور سے یہ عقیدے پیدا کر لئے گئے ہوں۔

عیسائی کچھ کہتے رہیں۔ توجہ آپ پر ہے کہ مسیحی ہوش و حواس کے باوجود آپ کو امت کے ان عقیدوں میں اور عیدائوں کے ابن اللہ والے عقیدے میں وہ زمین و آسمان کا فرق محسوس نہیں ہو رہا ہے جو امت قدر ظاہر باہر ہے جیسے ہمالیہ پہاڑ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بغیر آپ کے پیار ہونے کی اطمینان اور زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کی خبر قرآن و حدیث سے اور ان خبر کے کسی پہلو میں کوئی ابہام اگر متصور

الْصَّوْحَىٰ الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَا لِكُلِّ قَوْلِهِمْ
بِأَفْوَاهِهِمْ مُضَاهِيَةً قَوْلِ الْكَذِبِينَ
كُفْرًا وَإِيمَانًا قَالَتْ لَهُمُ اللَّهُ أَفِي
يَوْمِ فَكُونُوا التَّوْبَةَ - آیت ۳۰

اور یہود نے کہا کہ خیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منہ سے۔ حرص کرتے ہیں اپنے سے پہلے والے کافروں کے قول کی۔ خدا انھیں غارت کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کو اللہ کا محبوب و مقرب کہنا تو کفر نہیں ہے بلکہ انھیں اللہ کا محبوب و مقرب ماننا تو عین ایمان ہے لہذا یہ طے ہو گیا کہ ابن سے مراد یہاں ”بیٹا“ ہے اور نصرائی حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا اور فرزند کہنے ہی کی بنا پر قول کفر کے مرتکب قرار پائے ہیں۔

لفظ ”ابن“ عربی سے منتقل ہو کر جب اردو میں آیا تو اپنے اسی واحد مفہوم میں آیا۔ چنانچہ ہم یا کوئی بھی شخص جب یوں کہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ مانتے ہیں تو کسی شخص کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ ابن کا مطلب یہاں فرزند ہے نہ کہ محبوب اور لاڈلا۔ یہ ایسا ہی جیسے احادیث کی اسناد میں جب کسی راوی کا نام ابن کے ساتھ آتا ہے تو قطعی طور پر اس سے باپ بیٹے کے رشتے کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ محبیت اور قربت کا۔ زید بن ثابت کا مطلب ہے ثابت کا بیٹا زید اور سعید بن عمران کا مطلب ہے عمران کا بیٹا سعید۔

جب یہ بات منقطع ہو گئی تو آپ خود دیکھ لیجئے کہ آپ کے وہ تہیدی فقرے کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں جو اس حقیقت ثابتہ پر غبار اڑانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ نصرائی حضرات حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں نہ کہ صرف محبوب اور مقرب۔ قرآن میں اگر ایک دو جگہ لفظ ابن یا اس کی جمع ”ابناء“ محبوب و مقرب کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ قرآن

ہو سکتا ہے تو اسے حدیث رسول دور کر دیتی ہے۔ اس کے برخلاف ابن اللہ والے عقیدے پر قرآن بار بار سخت ٹکیر کرتا ہے اور اسے کفر شدید قرار دیتا ہے۔ کیا پچھو بھی ایک مسلمان کی حیثیت میں کسی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایسے خیالات رکھے جیسے آپ کے سوال سے عیاں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو تعریض آپ نے فرمائی وہ عقل و منطق کے لحاظ سے کبھی غیر معقول ہے۔ ناش آپ نے سوچا ہو تا کہ سچ کو ابن اللہ ماننا کس باطل مضمرات و ثمرات کا حامل ہے۔ بہت موٹی سی بات ہے کہ دنیا کی ہر مخلوق میں باپ اور بیٹے کی نوع اور اجزاء ترکیبی اور مادہ تخلیق اور حمیر جسمانی میں یکسانیت ہوتی ہے۔ امتزاج ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی کے ٹھلکے فرشتہ یا جن پیدا ہو جائے۔ عورت کے لہن سے کوئی نوری یا ناری مخلوق نکل پڑے۔ اللہ کا اگر کوئی بڑا ہوتا اس کا قطعی مطلب یہ ہو گا کہ اس کی اور اللہ کی نوع ایک ہے۔ دونوں میں جو ہری یکسانی پائی جاتی ہے۔ دونوں یا تو مادیت سے ماوراء سترتا سر نور میں یا ناریائی۔ دونوں کا نام حمیر ایک ہے۔ یہ مطلب جہاں توحید کا قائل ہے وہیں عقل سلیم کے خلاف اور قیاس سے متصادم اور منطق کی ضد ہے۔ کوئی غیر مسلم خواہ کسی ڈھنگ سے سوچے لیکن ایک مسلمان آخر کس طرح اس منصفکہ خیر اور فاسد ترین عقیدے کو شتمہ برابر قوت دے سکتا ہے۔

رہے وہ دونوں عقیدے جنہیں آپ نے اسی فاسد ترین عقیدے کے محامل و مشابہ قرار دینے کی کوشش کی ہے تو وہ ایسے ہر فساد اور سقم سے پاک ہیں۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا تو اس میں کیا قباحت ہے کہ وہ ایک انسان کو بغیر باپ کے محض ماں کے پیٹ سے پیدا کر دے۔ جو شخص اللہ کے ان اوصاف سے واقف ہے جن کی نشاندہی اللہ اور رسولؐ نے کی ہے اس کیلئے تو اس میں کوئی استعجاب اور استحجاب نہیں۔ اور اسی طرح یہ بھی کوئی محال بات نہیں کہ اللہ کسی بندے کو جسم سمیت زندہ

آسمان پر اٹھائے۔ ایک جسم تو کیا اگر اللہ نے یہ اطلاع دی ہوتی کہ ہم نے فلاں قوم کے تمام افراد کو زندہ آسمان پر اٹھالیا یا فلاں پہاڑ کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر لے آئے یا فلاں سمندر ہمارے حکم سے زمین کا سینہ چھوڑ کر ساتویں آسمان پر جا پہنچا تو کوئی بھی تا مل اس اطلاع پر ایمان لانے میں نہ ہوتا۔ جو خدا قادر مطلق ہے۔ جو بانی کی بند سے انسان جیسی شاہکار مخلوق نکال سکتا ہے۔ پتھر میں نرم و نازک پردے اٹھا سکتا ہے اپنے آخری رسولؐ کو بل کے بل میں عالم بالا کی سیر کر سکتا ہے اس کے لئے آخر کیا مشکل ہے کہ ایک بندے کو یا پوسے کرۂ ارض کو سمیٹ کر آسمان پر اٹھائے جائے۔ جن مخلوق پر غبار چھایا ہوا ہے وہی اسے محال و ناممکن تصور کر سکتی ہیں نہ یہ اتنا ہی ممکن ہے عقائد کے بعدرات کا اتنا اور غروب کے بعد چاند کا طلوع ہونا۔ پھر ان دونوں ہی واقعوں میں۔ یعنی بلا باپ کی پیدائش اور جسم سمیت آسمان پر اٹھالیا جانا۔ کوئی پہلو اور گوشہ ایسا نہیں جس سے خدا کی ذات و صفات پر حرف آتا ہو۔ کوئی عقل یا اخلاقی یا طبیعی یا نفسیاتی انجمن نہیں۔ کوئی علت اور سقم نہیں۔ کوئی مترک نہیں۔ کوئی کفر نہیں۔

کیا اب بھی آپ ادراک نہیں فرما سکے کہ مسلمانوں کے مذکورہ عقیدے کسی بھی التزام سے بالاتر کیوں ہیں اور عیسائیوں کے عقائد سر اسر باطل و فاسد کیوں۔ عیسائی حضرات قرآن سے جیسی سفیانہ اور بدردانہ کھلوار کھاتے ہیں اور نبرعم خود جس جہل آزائی کا نام "قرآنی نبوت" رکھتے ہیں اگر اس کی نامعقولیت اور نفرت آپ نے محسوس نہیں فرمائی تو اس کا مطلب ہے کہ نہ تو آپ قرآن پر بڑھانہ عیسائیوں کے علم کلام کا مطالعہ فرمایا۔ عیسائیوں کے دلیل کی حیثیت سے جو نکتے اجمالاً آپ پیش فرمائے وہ سوائے جرب زبانی کے آخر کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن زور و دیتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے بیٹے نہیں بندے ہیں اور ان کی مصیبت بس یہ ہے کہ جس طرح اور بے شمار انسان منصب نبوت پر

فائز کے لئے وہ بھی کہے گئے۔ مگر عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ عیسیٰ ہرگز مقتول یا مصلوب نہیں ہوئے۔ عیسائی کہتے ہیں بلکہ ان کے عیسائی دین کا محور ہی یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ مسیح کو سولی دی گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ محمد خاتم النبیین ہیں۔ تمام امت کی طرف سے آخری پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اب ان کی ہی شریعت دنیا کے لئے آخری مشعل راہ ہے مگر عیسائی سرے سے محمد کو آخری پیغمبر ہی نہیں مانتے اور حضرت عیسیٰؑ کو تمام انبیاء پر ایسی فوقیت دیتے ہیں جیسی خدا کو بندوں پر حاصل ہے۔ قرآن صرف اُس انجیل کی تصدیق کرتا ہے جو حضرت مسیحؑ پر نازل ہوئی تھی مگر عیسائی متی اور مرقس اور یوحنا اور لوقا کی انجیلیں اٹھائے پھرتے ہیں جو مسیحؑ کے ساٹھ سال بعد لکھی گئیں اور انکی اصل بھی نہیں موجود نہیں اور شرم و حجاب کو بالائے طاق رکھ کر کہتے ہیں کہ قرآن ہماری انجیلوں کی تصدیق کرتا ہے۔

یہ حال جس قوم کے طرز استدلال اور علم کلام کا ہر دو طرف سے دکانت کسی مسلمان کو تو رعب دے نہیں سکتی اور اگر کسی مسلمان کو یہ شوق لاحق ہو ہی گیا ہے تو اپنے استدلال میں کم سے کم اُس معیارِ معقولیت کا ملحوظ رکھنا ہی چاہیے جو پوری دنیا میں معروف و مسلم ہے۔ کیا آنجناب کا خیال یہ ہے کہ قرآن میں واقعی حضرت عیسیٰؑ کو سب سے اعلیٰ اور افضل قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہے تو دلائل پیش فرمائیں۔ نہیں ہے تو پھر آپ کو خود ہی عیسائیوں کے دعوے کے باطل ہونے پر مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ اور کیا آپ عیسائیوں کے مانند خود بھی یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنی سند اور قطعی دلائل و شواہد کے بغیر محض عقیدت میں افضل الانبیاء مان لیا ہے۔ اگر رکھتے ہیں تو ہٹنا کہیے تاکہ ہمیں یہ دھوکا نہ ہو کہ آپ مسلمان ہیں اور ہم وہی طرز بحث اختیار کریں جو کسی غیر مسلم کے لئے موزوں ہو سکتا ہے لیکن اگر نہیں رکھتے تو پھر عیسائیوں کے ایک باطل و ناسد خیال کو دہرانے سے فائدہ ؟

آخر میں جو فقرہ آپ نے لکھا وہ بھی ہمارے نزدیک خطا سے خالی نہیں۔ عیسائی جھگڑتی کے اعتبار سے ایک بڑی قوم ہے لیکن یہ بڑی قوم اپنی پوری تاریخ میں کب کہاں کس دن اس مسیح پر آئی ہے جہاں صحیح طرز فکر کیساتھ آخرت کی فلاح کے لئے بھی کوئی کام کیا جاتا ہے۔ اُن گہرے مصیبت کو چھوڑتے جو اس قوم میں مسلمانوں کے خلاف متواتر چلے آ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن کے دین و ایمان کی کوئی مستند اصل ہی نہ ہو اور جو خدا کے ایک بندے کو اس کا بیٹا مانے بیٹھے ہوں ان سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ کبھی بھی آخرت کے لئے کچھ کرنے کی پوزیشن میں آسکیں گے۔ استغفر اللہ قرآن تو اس قوم کے عفت اند کو بدترین کفر سے تعبیر کرتا ہے اور آپ ایک مسلمان ہو کر یہ آس باندھ بیٹھے ہیں کہ اس قوم کے ساتھ مل جل کر کوئی ایسا کام بھی کیا جاسکتا ہے جس سے یہ دنیا آخرت کی سربسبز و شاداب کھیتی ثابت ہو جائے۔! پھر میں چونک لگ سکتی ہے سورج مغرب سے اور چاند زمین کی تہ سے نکل سکتا ہے ہمارے نصیحت اردو میں بات کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی قوم شرک میں بھی گرفتار ہو اور فلاح آخرت کا بھی کوئی حصہ اس کے نصیب میں آجائے۔ آقائے کائنات، آمر مطلق، خدا کے لم بزل کا ڈنکے کی چوڑا اعلان کرتا ہے کہ میں ہر گناہ کو معاف کر سکتا ہوں مگر شرک کو معاف نہیں کر سکتا۔ ہاں شرک سے توبہ کرتے ہوئے میرے سامنے گھر گراؤ تو شاید معاف کر دوں۔

ہم سمجھتے ہیں آپ عقیدہ و فکر کی بھول بھالیوں میں کھوکھے ہیں۔ دوستانہ مشورہ ہے کہ آدھا تیر آدھا بیڑ کسی مصروف کا نہیں۔ یا تو تہہ دل سے قرآن و حدیث پر ایمان لائیے اور بنیادی عقائد اسلام کو سینے سے لٹائیے ورنہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کیجئے۔ مسلمان اور عیسائی۔ دونوں قوموں کے عقائد و نظریات

سب سے بڑھ کر خیر و برکت اور انصاف والی حکومت کہا اور اپنی وفاداری کا طرح طرح سے اعلان کرتے گئے۔

لیکن یہ شکل نہ ہوتی تھی ابھی ان کا خامراج از اسلام ہونا شبہ سے بالاتر تھا۔ حضورؐ کے بعد کسی بھی نبی کا قائل تمام علمائے حق کے نزدیک کافر ہے۔ پھر جو شخص نہ صرف دعوہ نبوت کرے بلکہ پوری بے تکلفی کے ساتھ تشرآن کی متعدد آیات کا خاص و خاص طلب اپنے آپ کو بتائے اور بے شمار واہمی باتیں اپنی کتابوں میں لکھے اس کا درجہ کفر آپ خود سوچ لیجئے۔

ان کی نماز جنازہ کا کیا سوال جب یہ مسلمان ہی نہیں آپ بھولے سے پڑھ چکے تو استغفار کیجئے بھول چوک معاف ہو جاتی ہے۔ آئندہ پڑھیں گے تو عذاب الہی کے مستحق ہوں گے۔

پاکستان میں یا کہیں بھی مسلمان اگر یہ مطالبہ کریں کہ قادیانیوں کو مسلمان نہ مانا جائے بلکہ غیر مسلم قرار دیا جائے تو یہ عقل و نقل ہر لحاظ سے ایک صحیح اور جائز مطالبہ ہے۔ قادیانی تو خود یہیں مسلمان نہیں مانتے۔ ان کی دسیوں تحریروں اس کے نبوت میں موجود ہیں اور علی نبوت آپ ارد گرد دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی قادیانی اپنی لڑکی ہم مسلمانوں کو نہ دیکھا کسی بھی ملک کی تحریکات کے سیاسی پہلوؤں سے

ہمیں کوئی بحث نہیں۔ پاکستان میں جو تحریک چل رہی ہے قدرتا اس کے کچھ سیاسی پہلو اور سیاسی مضمرات عواقب بھی ہو سکتے ہیں۔ ان پر گفتگو سیاست دانوں کا حصہ ہے۔ ہماری گفتگو فقط شرعی نقطہ نظر سے ہے اور شرعی نقطہ نظر اس معاملہ میں اتنا واضح ہے کہ سوائے جاہل یا احمق مسلمان کے اور کوئی بھی فرد مملکت ایسے کسی فرقے کو مسلمان نہیں مان سکتا جو حضورؐ فدائے الہی کے بعد کسی کی نبوت کا قائل ہو یا ایک جعلی نبی کو ہمدی اور برکت مانتا ہو۔ فنعوذ باللہ من ذلک۔

عام ہو چکے ہیں لہذا ہم سے ان کی وضاحت طلبی فضول ہے۔ وہ سراسر شرک ہیں بلاریب و ابہام۔ اور مسلمان بلا شک و تردد ہیں بشرطیکہ وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو سینے سے لگائے رہیں اور خرافاتی عقائد سے بچیں۔

جماعت احمدیہ

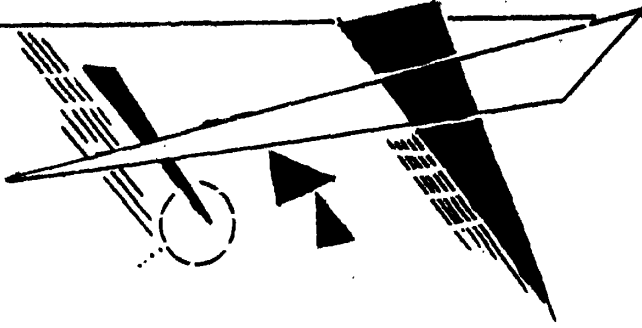
سوال :- از۔ حسن کیفی۔ درجمل (دکن)

کیا جماعت احمدیہ حق پر ہے۔ اور کیا یہ انگریزوں کی پیداوار ہے؟۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے اتحاد میں تفرقہ ڈالنے کے لئے بطور سیاسی ہتھیار استعمال کیا تھا۔ اس کے جغرافیے سے واقف کرائیں۔ ان لوگوں نے قرآن مجید میں تحریف کی ہے۔ ان لوگوں کی نماز جنازہ بڑھنا کیسا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اس کا از الہی کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ یعنی میں اس عمل کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ پاکستان میں اس جماعت کو غیر مسلم قرار دینے کی جو تحریک چل رہی ہے اس مکتب خیال سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں۔

جواب :-

آپ نو عمر ہیں۔ جس زمانے میں آپ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے اس زمانے میں علمائے حق نے جماعت احمدیہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور آئینہ کی طرح یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ یہ جماعت مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ اسلام سے خارج ایک نئے مذہب کی حامل ہے جو شریعت اسلام کی نظر میں دیگر مذاہب کفر کی طرح ایک مذہب کفر ہے۔

انگریزوں کی پیداوار ہونا نہ ہونا الگ مسئلہ ہے۔ جعلی نبی مرزا غلام احمد قادیانی کی اپنی تحریروں سے دو اور دو چار کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ اس جماعت کو انگریزوں کی نہ صرف پشت حاصل رہی بلکہ مرزا نے بہت کھل کر ان کے نصیذے پڑھے اور ان کی حکومت کو دیا میں



یار و کتنے دیوانے ہیں آج کی دنیا کے فرزانے
 نین کے سائے میں جو گزرے صدف وہی لمحے تھے سہانے
 کتنے فنکاروں نے سجانے جسم ہو بس پر عشق کے چہرے
 مجھ کو میرے ہی اندر کی کشمکش پہ سہم نے مارا
 اس کو سیما مان ہے میں درد بڑھایا جسکی دوانے
 تعبیریں توڑ دیئے ہیں خوابوں کے سب تانے بانے
 دیوانوں کا بھیس بادل کر پھرتے ہیں کتنے فرزانے
 عقل کی باتیں عشق نہ سمجھے عشق کی باتیں عقل نہ مانے
 میں نے پہلی ہی تو بہ پر توڑ دیئے سارے پیانے
 بستی بستی پھیل گئے ہیں حسرت و حرام کے دیرانے
 شہروں کی رونق کے پیچھے ایک بھیانک سنناٹا ہے

یہ جو کئی سودائی عام آج درِ جانناں پہ پڑے ہیں

مدت گزری واعظا بنکر گئے تھے مجھ کو سمجھانے



آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں جو مسلمان اس غلط خیال

کا شکار ہیں کہ رسول اللہ بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل فقہاء مجتہدین مستند حوالے۔ قیمت مجلد — آٹھ روپے۔

مناجات مقبول (دکری عیسیٰ) مولانا اشرف علی تھانی مقبول عام اور مفید ترین کتاب

پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔

قیمت — چھ روپے۔ مجلد سات روپے۔

رمضان کیا ہے؟ مولانا محمد عبداللہ دہلوی کے رتجات قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوشتر

کتاب۔ قیمت مجلد — تین روپے۔

تبلیغی تعلیمی سرگرمیاں سلف میں جس میں بتایا

مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے، بازار کہیں بھی ہوا مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا۔ انہی۔ قاضی اظہر مبارک پوری۔

قیمت — ڈیڑھ روپے۔

التشرف احادیث تصوف کی معرفت مولانا اشرف علی کی معروف کتاب۔ سو لہ روپے

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندی معارف و اسرار ہدایت و نصائح

اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت — چھ روپے۔

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں مولانا اشرف علی نے معاملات

کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ بڑے کام کا رسالہ ہے۔ قیمت صرف ۸۰ پیسے۔

قرآن و تعمیریت تعلیمات قرآنی کا بخیر تصوف اور ادب صالح کا دل کش مجموعہ

ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ قیمت مجلد — ۹/۵۰

جائزہ تراجم قرآنی دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے۔

اس کی تحقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ بہت عمدہ اور معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت — چھ روپے۔

غنیۃ الطالبین مصنفہ: شیخ عبدالقادر جیلانی۔ قیمت — تین روپے۔

اسلام اور ترقی مولانا اشرف علی کے افادیت سے لبریز ارشادات۔ قیمت ۶۰ پیسے

تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانی ملک ملت کی ایک ممتاز

شخصیت مولانا عبد اللطیف نعمانی شیخ الحدیث مفتاح العلوم مشہور ۳۹۲ھ کی دینی، علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندہ جاوید کارنامے اور اہل علم و رہنمایان ملک و ملت کے خراجِ جہانے عقیدت۔ قیمت — پانچ روپے۔

تاریخ الفخری تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اردو فارسی اور

فرنجی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت — تیرہ روپے ۵۰ پیسے۔

سفر مصر و حجاز امیر شریعت مولانا منشا اللہ بھاری کے قلم سے ایک بصیرت افروز

معلومات افزا سفر نامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے۔

امرت مسلمہ کی رہنمائی مولانا تقی امینی کی ایک نازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی

حضر عمر کی تعلیمات میں زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات، دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت — دو روپے۔

مدیر زندگی کا مراسلہ اور اس کا جواب

— ۲ —

موضوع خط کی دوسری شق

تین طلاؤں کو ایک تسلیم کرتے تھے۔ آپ نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

”بر زندگی کا اجماع میں شہرہ ظاہر کہ ناظر ہر ا عقیدیت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ وہ بجا طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سیکڑوں سال سے اہل علم اپنی کتابوں میں اختلاف کا ذکر کرتے ہی آ رہے ہیں اور علمائے خلف کی کتابیں بھی اس ذکر سے خالی نہیں۔“

داعی اس صورت میں سمجھنا ہی چاہئے کہ مسئلہ کسی درجے میں اختلافی ہے لیکن ہم نے انھیں بتایا کہ یہ نکتہ اور اختلاف کا بیج دراصل خواجه اور رد افض کا بویا ہوا ہے۔ دس بارہ ناک تو بعض کتابوں میں اختلاف کرنے والوں کے درج ہو گئے ہیں وہ سب دھوکے کی مٹی ہیں۔ جہاں تک صحابہ کا تعلق ہے ان میں سے تو کسی ایک کی طرف بھی اختلاف کی نسبت کذب و افتراء کے سوا کچھ نہیں۔ سفید جھوٹ۔ باقی ناموں میں اکثریت انکی ہے جو اجتہاد و تفقہ کے بازار میں پھوٹی ٹوکری کی بھی قیمت نہیں رکھتے۔ رہے ایک دودھ نام جن کی داعی کوئی اہمیت ہے تو ان کی طرف اختلاف کی نسبت ہی درست نہیں۔ تو یہ مسئلہ سے نقل کا کہیں بہتہ نہیں البتہ اجماع ثابت کرنے والی نقلیں قوی ترین اور کثیر سندوں سے

ایک مجلس کی تین طلاؤں کے طلاق بائن مغلفہ ہونے پر اجماع کے دعویٰ کو میں نے اپنے مقالے میں ”محل نظر“ قرار دیا ہے۔ آپ نے مجھ سے اس پر گفتگو کی تھی اور طلاق منہر میں بھی آپ نے اس پر گفتگو کی ہے۔ اس کے باوجود اس مسئلے کو اجماعی اور قطعی سمجھنا دشوار ہے۔ میرے نزدیک دعویٰ اجماع کے محل نظر ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت اس مسئلے پر اجماع کا انکار کرتی آرہی ہے اس سلسلے میں میں نے غلطی سے ابن حزم کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ میرے حلقے میں ”بعض اہل الظاہر“ کے الفاظ محفوظ تھے۔ لکھتے وقت داؤد ظاہری کے بجائے ابن حزم کا نام قلم بند ہو گیا۔ اس غلطی پر آپ کی تنبیہ کا میں شکر گزار ہوں۔

علماء کی جو جماعت دعویٰ اجماع کا انکار کرتی آرہی ہے اس میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے ساطین اہل بیت بھی شامل ہیں میں اس کو ایک ثبوت اس لئے مانتا ہوں کہ اگر اس مسئلے پر بلا اشتباہ یقینی طور پر اجماع ثابت ہوتا تو یہ لوگ اس کا انکار نہ کرتے کیونکہ کسی مسئلے پر ثابت شدہ اجماع سے انکار گمراہی ہے۔

دعویٰ اجماع کے محل نظر ہونے کا دوسرا ثبوت میرے نزدیک یہ ہے کہ جو علماء و فقہاء ایک مجلس کی تین طلاؤں کے طلاق بائن مغلفہ ہونے کے قائل ہیں وہ بھی اپنی کتابوں میں اسے اختلافی مسئلہ قرار دیتے آرہے ہیں اور متعادل صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علماء کی طرف یہ منصوب کرتے آرہے ہیں کہ وہ ایک مجلس کی

مردی ہیں جنہیں جھٹلانا کسی واقعہ فن کے لئے
مکمل ہی نہیں۔ (تجلی دیوبند، طلاق نمبر ۱۱۱)

گذا رکھیں کہ آپ کو یہی اس عبارت پر دوبارہ غور
کرنا چاہیئے۔ آپ کی تحریر پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے
کہ جن علماء نے اس مسئلہ کو اختلافی قرار دیا اور بعض صحابہ
و تابعین کی طرف ایک دوسرا قول منسوب کیا ہے۔ کیا وہ
غور افترا کرتے رہے اور سنی جھوٹ لکھتے رہے ہیں یا وہ
استنباط خبر سے ہیں کہ انھیں اس ”دھوکے کی فتنی کذب“
افسار اور سنی جھوٹ کا احساس تک نہیں ہوا؟
آپ کی یہ عبارت علماء و فقہاء کی کثیر جماعت کو
کس پوزیشن میں ڈال رہی ہے؟ روافض پر آپ کا
الزام بھی قابل غور ہے۔

اب میں ایک اور بات آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش
کرنا ہوں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مسئلہ پر اجماع
منعقد ہو گیا ہے، ان کی دلیل کیا ہے؟ ان کی سب سے
بڑی دلیل مسلم شریف کی وہی روایت ہے جس کے ناقابل
استدلال ہونے پر میں نے مقالہ شائع کیا ہے اور آپ نے
بھی اسے انداز میں اس کی زیر تائید کی ہے۔ اجماع کا
دعویٰ کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ
سے پہلے ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار میں کی جاتی
تھیں۔ یہی ہوں ان کے فیصلے کے بعد اس پر اجماع منعقد
ہو گیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں اب تین ہی ہوں گی،
انھیں ایک شمار نہیں کیا جائے گا۔ انعقاد اجماع کی دلیل
یہ ہے کہ کسی نے بھی ان کے فیصلے سے انکار نہیں کیا اختلاف
نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ روایت ہی قابل احتجاج
نہیں ہے تو پھر اس سے اجماع ثابت کرنا کس طرح صحیح
ہو گا؟ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس روایت کے سوا کوئی
دوسری روایت موجود نہیں ہے جو اس مسئلے پر انعقاد اجماع
کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہو۔

اس صورت حال میں اگر کسی دعویٰ اجماع کو غفلت
نظر قرار دیا ہے تو کیا غلطی کی ہے۔

اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے غور فرمائیے۔ اجماع
کی اصطلاح تین قسم کے اجماع کے لئے استعمال کی جاتی ہے
(الف) ان احکام و مسائل پر اجماع جو کتاب و سنت
کے صریح اور قطعی الثبوت دلائل سے ثابت ہوں جیسے
نماز پنجگانہ۔ زکوٰۃ۔ صوم رمضان اور حج وغیرہ ان کے
لئے بھی علماء ”ثابت بالكتاب والاشئہ والاجماع“ کے
الفاظ لکھتے ہیں۔

(ب) کسی مسئلے میں پہلے کچھ اور حکم تھا اور پھر اس کے خلاف
پراجماع ہو گیا مثلاً پہلے ام ولد کی بیع جائز تھی پھر اس
کے عدم جواز پر اجماع ہو گیا۔

(ج) کسی آیت یا حدیث سے مستنبط اجتہادی مسئلے پر
اجماع مثلاً مانعین زکوٰۃ سے جہاد پر صحابہ کا اجماع
ہو گیا۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ ایک مجلس کی
تین طلاقیں کے تین ہونے پر آپ جس اجماع کا دعویٰ
کرتے یا زوردار تائید کرتے ہیں وہ اجماع کی کس قسم
میں داخل ہے؟ پہلی قسم میں داخل نہیں اس لئے کہ کوئی
اس کا قائل نہیں اور غالباً آپ بھی اس مسئلہ کو بنا
پنجگانہ کی طرح قطعی نہیں سمجھتے ہوں گے۔ دوسری قسم
میں بھی داخل نہیں اس لئے کہ آپ یہ نہیں مانتے کہ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایک مجلس کی تین طلاقیں کو ہر حال
ایک شمار کیا جاتا تھا اور بعد کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ
فیصلہ کیا۔ تیسری قسم میں بھی داخل نہیں اس لئے کہ آپ
اس کو اجتہادی مسئلہ تسلیم نہیں کرتے تو پھر غور فرمائیے کہ
آپ جس روز مشور سے اس مسئلے پر اجماع ثابت کرنے
کی کوشش کی ہے وہ کس قسم کا اجماع ہے؟

جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہ دعویٰ صحیح نہیں
کہ عہد رسالت، عہد صدیقی اور ابتداء عہد فارسی
میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ہر حال ایک شمار کی جاتی
تھیں اور یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ
کے بعد اس مسئلے پر کوئی اجماع منعقد ہو گیا ہے بلکہ میرے
نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ جمہور کے مسلک کے دلائل قوی

تجلی

آپ نے ادنیٰ تحقیق کے بغیر حافظ ابن حزم کا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایک وقت کی مین طلاقیں مین نہیں ایک ہوتی ہیں مین نے آپ کو بتایا کہ یہ بالکل الٹی بات ہے۔ ابن حزم تو ان لوگوں میں ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایک وقت کی مین طلاقیں نہ صرف پڑ جاتی ہیں بلکہ وہی طلاق سنت بھی ہیں۔

یہ معاملہ بحث و نظر کا نہیں نقل کا تھا۔ میں نے بطور ثبوت ابن حزم کی الہ حلی کا نام بھی لیا تھا۔ آپ کے لئے قطعاً گنجائش نہیں تھی کہ اسے سہو کی کوئی بری بھلی تاویل کر سکیں، لہذا آپ مجبور ہو گئے کہ اسے سہو کو تسلیم کر لیں۔ لفظ ہر بات ختم ہو گئی لیکن فی الحقیقت ختم نہیں ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ نے عذر کیا پیش فرمایا ہے اور اس عذر کے مضمرات کیا ہیں۔

آپ کہتے ہیں کہ میرے حلفے میں بعض اہل اظہار کے الفاظ محفوظ تھے۔ لکھتے وقت داؤد ظاہری کے بجائے ابن حزم کا نام قلم بند ہو گیا۔

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ایک انتہائی اہم مسئلہ پر ذمہ دارانہ مقالہ تحریر فرماتے ہوئے آپ نے یہ اہتمام نہیں فرمایا کہ صرف مستند مصدق باتیں تحریر فرمائیں بلکہ مکمل کے تیر بھی چلا دیے۔ تین طلاقیں کے مسئلے پر جن چند علمائے سلف نے طویل و مفصل کلام کیا ہے ان میں حافظ ابن حزم بھی ہیں۔ کوئی بھی شخص اگر اس موضوع پر واقعی داؤد تحقیق دینا چاہے تو اس کے شوق و تحقیق کا تقاضا لازماً یہ دینا چاہیے کہ ابن حزم کی الہی میں بھی یہ بحث پڑے۔ آپ نے الہی دیکھی تاکہ نہیں مگر مطمئن ہو گئے کہ میں جس موضوع پر مقالہ لکھ رہا ہوں اس کی تمام وسعتوں اور گہرائیوں کا مجھے علم ہے اور تمام نقاط نظر کا مطالعہ ان کے دلائل سمیت کر چکا ہوں۔ یہ ایک غیر ذمہ دار ذہن کا رویہ تو ہو سکتا ہے اس ذہن کا نہیں ہو سکتا جسے یہ فرائض تو

اس لئے ان کا مسلک راجح ہے اور جن لوگوں نے اب مجلس کی مین طلاقیں کو بہر حال ایک قرار دیا ہے ان کے دلائل ضعیف ہیں اس لئے ان کا مسلک مرجوح ہے۔

۳ مسلم شریف کی روایت پر میرا جو مقالہ شائع ہوا ہے اس کے تعلق سے آپ میری طرف ایک ایسی بات سوب کی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ زبان گفتگو میں آپ مجھے مخاطب کر کے صرف یہ کہا تھا کہ ”آپ فقہاء نے خفائیوں میں ہے“ آپ نے کہیں میری عبارت کی نشاندہی نہیں کی تھی اس لئے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میری عبارت میں آپ کو فقہاء کی تحقیر و تحقیف نظر آئی اور برے کس عبارت سے آپ نے یہ معلوم کیا کہ میرے دل میں لہاء کی طرف سے باطنی اور زبردست موجود ہے فقہاء کی ریف اور ان کے احترام میں آپ کی تقریر و تلقین زہم کہ احساس ہوا کہ مجھ سے زیادہ خود آپ اس کے ناظر ہیں۔ زبان آپ نے فرمایا تھا کہ طلاق مہر آپ کے بہت فرجی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ لیکن آپ کی جارحانہ قید کی عادت اپنا کر شمشہ دکھانے سے باز نہیں آئی ہے جب آپ نے مجھے تقلید کو دانتوں سے پکڑنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنی تقلید پر نڈی کا اقرار کیا تھا تو میں نے بے ہوشے عرض کیا تھا کہ آپ کسی مسئلے میں تقلید جاری نا جاتے ہیں اور کسی مسئلے میں جہتہا مطلق ہو جاتے ہیں۔ اب یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر میں تقلید کو دانتوں سے پکڑے رہتا تو مسلم شریف کی روایت پر وہ مقالہ ہی تیار نہ ہوتا جس کو آپ نے بھی ”بہت اچھا“ کہا ہے اور اگر آپ خود تقلید کو دانتوں سے نہ چھوڑتے تو لائق تبصرہ مرتب نہ ہوتا۔ میں بھی اپنے آپ کو جہتہا میں سمجھتا جس طرح آپ اپنے کو جہتہا نہیں سمجھتے۔ اس تحقیر و بھی یہ علم ہے کہ اجتہاد کا درجہ بہت بلند ہے۔

آپ کا بھائی

سید احمد قادری

رہنے کی وکالت میں ایسے بے رنگ و نام گواہوں کا تعاون چاہل کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ خود کہہ لیجئے کہ آپ کی عذر داری پر ”عذر گناہ بدتر از گناہ“ کی کہاوت صادق آتی ہے یا نہیں آتی۔

مزید آپ فرماتے ہیں :-

”علماء کی جو جماعت دعویٰ اجماع کا انکار کرتی آ رہی ہے اس میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اساطین امت بھی شامل ہیں۔“

غلط کہا آپ نے۔ علماء سلف میں ایسی کوئی جماعت نہیں پائی گئی۔ صرف یہی دو نام ہیں جو آپ نے لئے۔ ان کا وظیفہ آپ ہزار بار پڑھیں مگر یہ مغالطہ مت دیں کہ ان کے علاوہ بھی متعدد اساطین دعوتہ اجماع کے مستند رہے ہیں۔ جسارت آپ کی یہ ہے کہ خود مجھے مخاطب کر کے یہ مغالطہ دے رہے ہیں حالانکہ میں نے طلاق نمبر میں دلائل و شواہد کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ سلف میں کوئی جماعت تو کیسا ایک بھی معروف و مستند عالم ایسا نہیں پایا گیا جس نے دعوتہ اجماع کو مشکوک کہا ہو۔ بس ابن تیمیہ اور ابن قیم سات سو سال بعد شک اندوزی کرنے آئے ہیں۔

جمود اور ضد کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ یہ لاپرواہ اب بھی اپنی اس دعوت کو دہراتا ہے کہ جماعت تہ درکنار آپ اسلام کے ابتدائی تین سالوں میں ایک بھی معروف و ثقہ مجتہد صحابی، تابعی، فقیہ، محدث، مفسر، حکم کا نام نامی پیش کر دیجئے جس نے صاف صاف یہ کہا ہو کہ ایک وقت کی تین طلاؤں کو تین ماننے پر اجماع مشتبہ ہے۔

آگے چلیے۔ آپ نے منطق یہ استعمال فرمائی کہ اگر اس مسئلہ پر یقینی طور پر اجماع ثابت ہوتا تو ابن تیمیہ و ابن قیم اس کا انکار نہ کرتے کیونکہ اجماع سے انکار اگر ایسی ہے منطق کم پیش ایسی ہی ہے جیسے قرآن و حدیث کا کوئی حکم پیش کرنے پر بعض خوش عقیدہ پھٹ سے یہ

میں حرف حرف کے لئے عند اللہ مستول اور عند الناس جواب دہ ہوں۔

دوسرا مطلب آپ کے عذر کا یہ ہوا کہ بجائے ابن حزم کے اگر آپ داؤد ظاہری کا نام لکھتے تو آپ کی دانت میں بات قابل اعتراض نہ ہوتی۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ نے کبھی تحقیق فرمائی ہے کہ داؤد ظاہری کون تھا اس کے کیا عقائد تھے۔ علمائے حق اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نہیں فرمائی۔ اگر فرماتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ علماء اہل سنت کے نزدیک ان ذات شریف کا طرز فکر و ادبی اور طریق اجتہاد فاسد تھا۔ انھیں ایسا بد عقل اور بر خود غلط شخص کہا گیا۔ ہے جسے نہ اصول شرعی کا ادراک نہ اجتہاد کے طریقوں کی خبر۔ ان کے بعض معتقدات انتہائی لغو و باطل مانے گئے ہیں۔

آپ نے اگر طلاق نمبر پڑھنے کی طرح پڑھا ہوتا تو اس صفحہ ۱۲۲ سے کم سے کم اجمالاً اور مختصراً تو آپ کو معلوم ہی ہو جاتا کہ داؤد ظاہری کا حدود و اربعہ کیا ہے میں نے وہاں اندازہ اختصار صرف تین کتابوں کے مختصر اقتباسات پیش کئے ہیں۔ ان ہی سے ہر موشمند کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی عالم حقانی اور حق پسند محقق کا داؤد ظاہری جیسے شخص کو دین و شریعت کے کسی مسئلہ میں گواہ بنا کر لانا اپنے ذہنی افلاس اور بے علمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یکم پیش ایسا ہی ہو گا جیسے ابو بکر و عمر کو معاذ اللہ منافق اور غیر راشد ثابت کرنے کے لئے روافض و شیعہ کی گواہیاں پیش کی جائیں اگر آپ بھولے سے ابن حزم کا نام نہ لکھتے بلکہ داؤد ظاہری کا لکھتے تو اگرچہ غلطی کی نوعیت بدل جاتی مگر یہی یہ بھی پہاڑ ہی جیسی غلطی۔ فقہ اہل علم داؤد ظاہری کو ایک ایسا غلط اندیش اور گم کردہ راہ شخص تصور کرتے ہیں جو اپنی فکر و علمی استعداد کے لحاظ سے تھا تو فقط عانی اور تیسرے درجے کا آدمی لیکن بعض علوم عقلیہ کی آڑ میں اس نے مجتہد کا بھیس بدلا اور شہرت پا گیا۔

افسوس کی بات یہ ہے آپ جیسا ذمہ دار آدمی اپنی

ان بزرگوں کے بعض بنیادی دلائل و افکار کی کیفیت واضح کر کے پیش کر دیا ہے کہ اس مسئلہ میں یہ حضرات غلط فہمی اور نارسائیوں کا شکار ہیں۔ یہ انسان ہی تھے جو دھوکا بھی کھاتا ہے اور غلط بھی سوچتا ہے۔ ان کا دعوہ اجماع سے انکار و جی الہی نہیں ہے کہ اسے کسی بھی دلیل و شہادت سے ساقط الاعتبار ٹھیرایا ہی نہ جاسکے۔

دعوہ اجماع کے محل نظر ہونے کا جو دوسرا ثبوت آپ نے پیش فرمایا اس کا جو اس وقت تو تھا جب تک طلاق نمبر آپ کی نظر سے نہیں گذر تھا۔ چنانچہ میں نے خود آپ کو معذرت ٹھیرایا تھا اور میری یہی عبارت آپ نے نقل بھی فرمادی ہے لیکن جب میں نے دلیل و شہادت کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ جو بھی اہل علم اپنی کتابوں میں اختلاف کا ذکر کرتے آ رہے ہیں وہ اس مسئلے کی حد تک فریب خوردہ ہیں وہ پروسیگنڈے کا شکار ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ایک شور مٹا اور اس کی حکایت کر دی لیکن یہ تحقیق نہ فرما سکے کہ شور کی اصل حقیقت کیسا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کسی بھی طالب حق کے لئے دو ہی راہیں تھیں۔ یا تو وہ یہ کہتا کہ نالائق عامر کی فلاں فلاں شہادت اور فلاں فلاں دلیل کمزور یا غلط ہے اور اس دعوہ کی دلیل لاتا۔ یا پھر وہ مان لیتا کہ اجماع کو دھواں دھواں پروسیگنڈے کے بل پر کیا گیا ہے ورنہ احادیث و آثار اور تابعین و فقہاء کے نزدیک یہ مسئلہ بے ریٹ تنگ اجتماعی رہا ہے یعنی مکمل طور پر متفق علیہ۔

لیکن جناب نے تو پہلی راہ اختیار کرتے ہیں نہ دوسری بلکہ میری راہ اختیار کرتے ہیں یعنی اپنی بات پر اڑنا اور خود مجھ سے ناصح مشق بن کر یہ منہ مانا کہ۔

”آپ کو اپنی اس عبارت پر دوبارہ غور کرنا چاہیے“

ایک سوال بھی یہاں آپ نے پیدا کر ڈالا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اگر عامر نالائق مسئلہ کے اجتماعی ہونے پر مصر

فرمایا کرتے ہیں کہ وہ صاحب فلاں شخص صاحب اور فلاں اعلیٰ حضرت نے تو یوں کہا ہے کیا وہ قرآن و حدیث سے نابلد تھے؟ کیا آپ ہی قرآن و حدیث کے ماہر ہو گئے! حیرت اور عبرت کی بات ہے کہ آپ تو اس عجیب اسلامی کے رکن ہیں جس کے بنیادی عقائد میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ ”اللہ اور رسول کے سوا کوئی معیار برحق نہیں۔“ میرے نزدیک یہ عقیدہ ذرا خالص ہے اس میں کوئی کھوٹ نہیں۔ لیکن آپ کے اعصاب پر نقطہ ذرا آدمی ابن نیمہ اور ابن تیم اس طرح سوار ہو گئے کہ نہ تو اٹھ احادیث رسول کی اہمیت رہی نہ چودہ صحابہؓ کے فتاویٰ کی نہ ان نصف درصف دلائل کی جو طلاق نمبر میں ملاحظہ سے گزے ہوں گے۔

ذرا ارشاد تو فرمائیے۔ آپ ایک حدیث کو فن کے ذی ترین دلائل سے من گھڑت ثابت کرتے ہیں تو کیا کسی شخص کا یہ ٹوکنا معقول ہو سکتا ہے کہ اگر میں گھڑت ہوتی فلاں فلاں محدث اسے اپنی کتابوں میں کیوں جگہ دیتے۔ انھوں نے جگہ دی تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حدیث موضوع نہیں ہے؟

آپ کو معلوم ہے بہت سی کتب حدیث میں۔ حتیٰ کہ بعض ان کتابوں میں بھی جو حدیث کی چھ صحیح کتابوں (صحاح ستہ) میں شمار ہوتی ہیں کتنی ہی روایات موضوع داخل ہو گئی ہیں۔ بعد کے متعدد علمائے فن نے نقد و نظری روشنی ڈال کر ان کی نشاندہی کی اور اہل علم نے مان لیا کہ بیشک یہ من گھڑت ہیں تو کیا ان کے باب میں بھی آپ یہی منطق استعمال فرمائیں گے کہ جب بعض بڑے محدثین نے انھیں موضوع نہیں سمجھا تو اب یہ بات ٹھیک نہیں کہ انھیں قیمت فراز یاد جائے اور ان سے حجت نہ کھڑی جائے؟

محض سنی سنائی پر اعتبار کر کے نقاہت کی مسند چھانا مسجودہ طریق نہیں۔ آپ نے ابن تیمیہ اور ابن قیم کے ان دلائل کو بھی فن کی سبوتی پر نہیں پرکھا جن کے سہارے وہ اجماع میں فی نکالے ہیں۔ میں نے طلاق نمبر میں صحتاً

ناصح مشفق یہ فرما رہے ہیں کہ:-
”آپ کی یہ عبارت علماء و فقہاء کی کثیر جماعت
کو کسی پوزیشن میں ڈال رہی ہے۔“

ایک اور مغالطہ آپ کے یہاں دیا۔ یا خود مغالطہ کھا گئے
میں نے جو یہ کہا ہے کہ کسی بھی صحابی کی طرف مخالف نقطہ
نظر کی نسبت کذب و افتراء اور سفید جھوٹ کے سوا کچھ
نہیں تو اس کا یہ مطلب آپ کے کیسے نکال لیا کہ میں ان
علماء کو مفسری و کذاب کہہ رہا ہوں جنہوں نے اختلاف
کو محض نقل کیا ہے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں گھڑی
اپنے مذکورہ فقرے سے متصل قبل جب میں یہ کہتا ہوں
کہ اختلاف کا بیج دراصل خوارج و روافض کا بویا ہوا
ہے تو معمولی نہم کا آدمی بھی میرے اس مدعا کو بخوبی
سمجھ سکتا ہے کہ کذب و افتراء کی نسبت میں نے خوارج
روافض کی طرف کی ہے اور بعد میں جن علماء نے بلا تحقیق
اس میں گھڑت کو واقعہ سمجھ کر نقل کر دیا وہ فریب خوردہ
ہیں نہ کہ مفسری اور کذاب۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مثلاً امام
ابن ماجہ عام تحقیق کی بنا پر متعدد موضوع احادیث
انہی صحیح ہیں درج کر گئے ہیں لیکن اس فریب خوردگی
کی بناء پر انھیں وضاع اور مفسری تو نہیں کہا گیا۔ گناہ
وضیع کے مرتکب اور جھوٹے صرف وہ لوگ تھے جنہوں نے
حدیثیں گھڑیں۔ انھیں مطعون کہنے کا یہ مطلب نہ ہو گا
کہ امام ابن ماجہ یا دوسرے فریب خوردہ محدثین کو مطعون
کیا جا رہا ہے۔

اس مقام پر فقرے کے آخر میں آپ نے جملہ بھی حوالہ
قلم کر دیا ہے کہ:-

”روافض پر آپ کا الزام بھی قابل غور ہے۔“

میں عرض کروں گا کہ جب آپ تحقیق کے بجائے تفریح
کے موڈ میں ہوں اور اہل مکمل بچو نام بھی بلا تکلف لے سکتے
ہوں تو آپ کی کبھی کبھی قابل غور نظر آئے گا۔ اپنی رائے
پر اصرار کی رو میں اگر آپ روافض تک کی وکالت

ہے تو گویا وہ ان علماء کو مفسری اور کذاب اور مغفل قرار
دے رہا ہے جنہوں نے اس مسئلہ کو اجماعی نہیں مانا بلکہ
کہا۔

میں پلٹ کر آپ سے پوچھتا ہوں کیا طلاق نمبر میں آپ
نے یہ نہیں پڑھا کہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی اور حافظ
ابن عبد البر اور امام ابن رجب اور علامہ شامی جیسے اہلین
نے اجماع کو مسلم مانا۔ ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس اجماع کی
مخالفت کرنے والا اجماع سے منحرف ہے اس کا قطعاً کوئی
اعتبار نہیں۔ علامہ عینی کہتے ہیں کہ اس اجماع کا ذکر ہی سنت
کا مخالف اور بدعتی ہے۔ علامہ شامی نے۔ جنہیں آپ بھی
بہت بڑا فقیہ مان کر ہر اسلہ کی پہلی شق میں ان کی کتاب سے
نفاذ نقل کر آئے ہیں جو کچھ فرمایا ہے اسے طلاق نمبر کے صفحہ ۱۳۲
اور ۱۳۳ پر پڑھئے۔ وہ تو نسبتاً ماضی ترقیب کی شخصیت
ہیں۔ انھیں آپ زیادہ اس بات کا علم تھا کہ بہت سے
علماء اس مسئلہ کو اختلافی لکھتے آئے ہیں لیکن اس کے باوجود
وہ کہتے ہیں کہ جملہ صحابہ تمام تابعین اور ان کے بعد کے
ائمہ المسلمین اس مسئلہ میں متفق ہیں۔ پھر وہ یہ بھی دعویٰ کرتے
ہیں کہ یہ اجماع ڈھکا چھپا اور مشتبہ نہیں بلکہ ظاہر و باہر
ہے۔ اس کی دلیل بھی وہ ارشاد فرماتے ہیں اور پھر صفاً
الفاظ میں کہتے ہیں کہ جو اس اجماع سے گریز کرتا ہے وہ
گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے لہذا قاضی بھی اگر اس اجماع
کے خلاف فیصلہ دے گا تو وہ نافرمان ہو گا۔

اگر طلاق نمبر آپ کے پڑھنے کی طرح پڑھا تھا تو یہ سب
آپ کے کیوں نہ پڑھا اور اگر یہ سب پڑھ لیا تھا تو یہ موٹی
سی بات آپ کے ذہن مبارک میں کیوں نہ آئی کہ جو الزام
میں سوال کی شکل میں عامر نالات پر لگا رہا ہوں وہ کہیں
زیادہ شد و مد کے ساتھ علامہ شامی اور علامہ عینی اور
حافظ ابن حجر جیسے مشاہیر اساتذہ پر پہلے عائد ہو جاتا ہے
عامر نے تو اس اجماع سے اختلاف کرنے والوں کو نہ بدعتی
کہا نہ گمراہ اہل سنت سے خارج مگر یہ حضرات کبھی کبھی
کہہ رہے ہیں اور آپ صرف میری طرف منہ کر کے بطور

کرنے کا شوق فرمانا چاہتے ہیں تو بسم اللہ۔ ذرا تفصیلی دلائل رد افض کی صفائی میں پیش فرمائیں پھر میں انشاء اللہ آپ کو بتاؤں گا کہ میں نے رد افض و خواجہ بر الزم دل سے گھڑ کر نہیں لگایا بلکہ اس کیلئے بزرگوں کی نقل لکھا ہوں۔ موجودہ مرحلے میں مجھے ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے مجل سے فقرے پر تفصیل کے دفتر کھولوں۔

یوں بھی سوچیے کہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی اور علامہ شامی ان علماء میں ہیں جو متعدد اختلافی اقوال خود ہی اپنی کتابوں میں نقل فرما گئے ہیں۔ اس کے باوجود جب انھوں نے حائل گفتگو کے طور پر مسئلہ کو اہل سنت کے مابین شد و مد سے اجماعی قرار دیا تو ثابت ہوا کہ اختلاف کا یہ غل غباڑہ ان اساتذہ کے نزدیک ایسا ہے ہی نہیں جو اجماع میں مانع اور قاذح ہو سکے۔ اجماع کس کہتے ہیں۔ وہ کب اور کس طرح منعقد ہوتا ہے، کس معیار کے علماء کا اختلاف اجماع کو مشتبہ بناتا ہے اور کون کون کے اختلاف سے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا یہ باتیں مذکورہ مشاہیر فریاد آپ سے اور مجھ سے تو زیادہ ہی جانتے ہوں گے۔ پھر کیا بات ہے کہ آنجناب اختلاف کی بے بنیاد کہانی کو خواہ مخواہ اہمیت دیکر اجماع میں فی نکالے جا رہے ہیں اور تجلی طلاق نمبر کا تہ در تہ مواد دیکھنے کے بعد بھی بڑے اطمینان سے یہ فرما رہے ہیں کہ مجھے اپنے موقف میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اجماع کے محل نظر ہونے پر دو مذکورہ ثبوت پیش کرنے کے بعد آپ کے جو گفتگو چھڑی ہے اب اس کے بارے میں لینے کہ اس کی بسم اللہ ہی غلط ہے۔

آپ کے یکس نے کہہ دیا کہ اجماع کا دعویٰ کرنے والے اپنی سب سے بڑی دلیل مسلم کی اس روایت کو قرار دیتے ہیں جس کے ناقابل استدلال ہونے پر آپ نے مقالہ شائع کیا ہے۔ طلاق نمبر آپ کے آگے موجود ہے مسئلہ کی مذکورہ

روایت پر حقے رخ سے گفتگو ممکن تھی وہ میں نے کر ڈالی ہے۔ آپ اچھلی رکھ کر بتائیں کہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ اجماع کی سب سے بڑی دلیل یہ روایت ہے۔ اس کے برخلاف میں تو پایاں کار یہ ثابت کیا ہے کہ یہ روایت اپنی موجودہ شکل میں قابل حجت ہے ہی نہیں۔ اس کا تعلق غیبہ و خولہ باکرہ کی طلاق سے ہے نہ کہ زیر بحث طلاق سے۔ اگر آپ پر اپنی بات کی بیجا کا جذبہ طاری نہ ہو تا تو طلاق نمبر میں شرح و بسط سے بتا دیا گیا ہے کہ دعویٰ اجماع کے دلائل کیا ہیں اور کس قدر روشن اور دو ٹوک ہیں۔ طلاق نمبر کے علاوہ آپ خود اپنا یہ لکھا بھول گئے۔

”ان احادیث نبویہ آثار صحابہ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی ہوتی ہیں۔“

آپ کا یہ ارشاد گرامی ”زندگی سے“ میں نے طلاق نمبر میں بھی نقل کر دیا تھا۔ جب خود آپ کے نزدیک ایک حدیث نہیں بلکہ متعدد احادیث نبویہ اور جملہ آثار صحابہ نے پوری طرح ایک قانون شرعی واضح کر دیا تو اب اس گل افشانی کا کیا جو از ہے کہ دعویٰ اجماع کی سب سے بڑی دلیل بس مسلم کی ایک روایت ہے!

تقاہرت کے لئے میرے دوست ایسا متحمل اور ضابطہ داغ چاہئے جو کچھ پھیلا بھی یاد رکھ سکے۔ یہ نہیں کہ جب جو میں آیا کہہ ڈالا۔

آپ نے اجماع کی اصطلاح پر جو متعدد سطروں والے قلم کی ہیں ان پر اگر میں کلام کروں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ آپ کو شاید معلوم تو ہو گا کہ اس اصطلاح پر اہل فن نے سیکڑوں صفحات لکھے ہیں۔ انھیں چند سطروں اور کالوں میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ میرے قارئین ویسے ہی خشک و دقیق مسائل سے بھر ہو رہے ہیں اس لئے میں اس تطویل میں نہیں پڑوں گا کہ الف، ب اور جیم کی ترتیب سے آپ کے جو اقسام پیش فرمائی ہیں وہ کس کس پہلو سے ناقص و تشنہ ہیں۔ ویسے بھی

ہیں۔

یہ ایک ملکتی اور فنی بحث ہے کہ کونسا اجماع کس قسم میں داخل ہے اور کونسا عنوان کہاں مناسب رہے گا۔ بے محل اور دور انداز کار نکلتوں سے بات کو الجھانا حق پسندوں کا شیوہ نہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ اس آئینے کی طرح روشن صورت حال سے گزرنے والی آپ کے پاس کیا راہ ہے اور کیا آپ کسی قانون شرعی کو صرف اسی صورت میں قطعی اور ناقابل تغیر مان سکتے ہیں جب آسمان سے صاف صاف ندا آئے؟ یا جبریل امین سامنے آکر گواہی دیں؟

آئیے میں آپ کے علم کلام کی ایک اور غلطی سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ آپ نے پہلے تو ایک ایسی بات یہ فرض کر لی کہ مدعیان اجماع کی سب سے بڑی دلیل مسلم کی وہ روایت ہے جو ناقابل استدلال ہے۔ حالانکہ یہ روایت مدعیان اجماع کی نہیں بلکہ منکرین اجماع کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ عاجز لائق کی تحریر اگر کسی طرح آپ کے فہم مبارک کو اپیل نہیں کرتی تو کم سے کم اپنے ”زندگی“ ہی کا وہ نمبر دیکھ لیا ہوتا جس میں مقالات شائع فرمائے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو اجماع کے انکار ہی ہیں اسی روایت کو مستدل بنا کر یہ ثابت کرنا چاہے ہے کہ کھٹی تین طلاقیں دور رسالت اور حدیقی ہیں ایک ہو کر تین تھیں حضرت عمرؓ نے انھیں تین بنایا۔ مولانا محفوظ الرحمن نے بھی اسی روایت کو اپنے حق میں استعمال فرمایا ہے۔ مولانا سمس پیر زادہ بھی اسی کے بل بوتے پر یہ کہنے کی پوزیشن میں آئے ہیں کہ دور رسالت اور دور حدیقی ہیں تین طلاقیں ایک ہو کر تین تھیں۔ مولانا حامد علی نے بھی اسی روایت کو اپنی سب سے پہلی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ گویا تمام وہ مقالہ نگار جو اجماع سے منحرف ہیں صرف یہی اس روایت سے اپنے حق میں استدلال کرتے ہیں اور آپ نہ جانے کس عالم خیال میں یہ شگوفہ چھوڑ رہے ہیں کہ مدعیان اجماع کی سب سے بڑی دلیل یہ روایت ہے! اس شگوفے کے بعد آپ نے ہزاروں کے طرز بحث

اس لمبی بحث میں پڑنا ایک صاف و سادہ حقیقت کو الجھانے کے مراد ہو گا۔ انجیل بیچ اور خواہ مخواہ کی موثر گانہوں سے ہٹ کر صاف و سادہ صورت حال یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے تین طلاقیں کا قائل نکاح ہونا واضح ہے اور ایسی حدیث متعدد پائی جاتی ہیں جن میں ایک وقت کی تین طلاقیں کو تین شمار دیا گیا ہے اور بدعی طریقہ اختیار کرنے کو موجب گناہ ٹھہرانے کے باوجود حضورؐ نے مؤثر مانا ہے۔ خود قرآن کا بھی یہی انداز نظر ہے۔ اس میں صاف کہا گیا کہ بیوی کو ماں کہنا اگرچہ جھوٹ اور گناہ ہے لیکن یہ قول مؤثر ہو گا۔ بیوی حرام ہو جائے گی اور کفارہ ادا کر کے ہی اسے حلال کیا جاسکے گا۔

اس کے برخلاف ایسی ایک بھی حدیث نہیں پائی جاتی جس میں کسی شخص نے تین صریح و غیر مبہم طلاقیں دی ہوں اور حضورؐ نے انھیں ایک قرار دیا ہو۔

آتا رہا صحابہؓ کا حال یہ ہے کہ جتنے بھی صاحب افتاء اور فقیہ صحابہ ہیں ان میں سے سترہ فیصد کے قنادی ایک ہی نقطہ نظر کی تائید میں ملتے ہیں اور باقی میں فی صد میں سے ایک بھی اس نقطہ نظر کے خلاف قول نہیں کرتا۔

ائمہ مجتہدین کا حال یہ ہے کہ وہ سب اسی نقطہ نظر پر متفق ہیں۔ ان کے معروف تلامذہ بھی اسی کی حمایت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تابعین اور تبع تابعین میں بھی جملہ اساتذہ اور اساطین حمایت و اتفاق کے سوا کوئی روش اختیار نہیں کرتے۔ سات سو برس تک تمام مالک میں جملہ اہل سنت کے مابین یہ قانون منفقہ طور پر قانون شریعت مانا جاتا رہا ہے کہ تین صریح طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں چاہے اکھٹی دو چاہے الگ الگ۔ کوئی ایک بھی معروف فاضل اس کے خلاف فیصلہ نہیں دیتا۔

کیا یہ صورت حال اس دعوے کے لئے کافی ثانی دستاویزی شہادت نہیں ہے کہ پیسہ اجماعی ہے کیا جھوٹے انسابات اور من گھڑت قصے اور اختلاف کی غیر مصدقہ داہی کہانیاں اس شہادتِ ناطقہ کو مشتبہ بنا سکتی

بھی جانتا ہے کہ اس تقریر سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اہل اجماع نے روایت کا وہی مفہوم صحیح مان لیا جو تشریق مخالف لیتا ہے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ دور رسالت اور دور صدیقی کے معمول کا افسانہ حقیقت مان لیا گیا نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اعلان پر اجماع کی بنیاد رکھی گئی بلکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر تشریق مخالف کے غلط و عادی اور باطل مفروضات کو کچھ دیر کے لئے درست بھی فرض کر لیا جائے تب بھی اس کی کاٹری آگے نہیں چلتی۔

لیکن انتخاب اس جو ابی تقریر سے یہ عجیب و غریب مفہوم نکالا کہ اجماع کے مدعی ایک ایسی روایت کو مستدل بنا رہے ہیں جو قابل استدلال ہی نہیں ہے اور بلا تکلف یہ فقرہ حوالہ قلم کر دیا کہ:-

”سوال یہ ہے کہ جب وہ روایت ہی قابل احتجاج نہیں ہے تو پھر اس سے اجماع ثابت کرنا کس طرح صحیح ہو گا۔“

یا اللعجب - یہ آخر آپ کر کیا رہے ہیں۔

میرے کرم دوست! مسلم کی جس روایت کو آپ بار بار ناقابل استدلال کہہ رہے ہیں تو لے دے کے ایک یونجی ہے مخالفین اجماع کی۔ اسی کے سہارے تو یہ غلط کہانی مشہور کر دی گئی ہے کہ دور رسالت اور دور صدیقی میں تین طلاقیں ایک ہوتی تھیں۔ اسے ناقابل استدلال مان لیا جائے تو مدعیان اجماع کا کچھ نہیں بگڑتا فروع ثانی کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے۔ میں واقعی حیران ہوں کہ آپ کس ترکیب سے بالکل اونڈھی باتیں سوچ لینے اور انھیں سپرد خامہ کر دینے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

آپ کو شکوہ ہے کہ مسلم کی روایت پر آپ کا جو مقالہ شائع ہوا تھا اس کے تعلق سے میں نے آپ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر دی جس کی کوئی دلیل نہیں دی۔

اور علم کلام سے نادانیت کا ایک حیرت ناک مظاہرہ کیا۔ وہ یہ کہ اجماع کا انکار اور ایک طبع زاد مسلک پر اصرار کرنے والوں نے جب مسلم کی مذکورہ روایت پیش کر کے یہ استدلال کیا کہ تمام دور رسالت اور تمام دور صدیقی میں اکھٹی تین طلاقیں کو ایک مانا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے انھیں تین قرار دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کا یہ اقدام محض ایک وقتی اقدام تھا جو کسی وقتی مصلحت پر مبنی تھا۔ لہذا امت کو حق پہنچانے کے جب صحاح تبدیل ہوں تو وہ دور رسالت اور دور صدیقی کی سنت کی طرف لوٹ جائے۔

اس استدلال کا جواب اجماع کا دعویٰ کر نیوالوں نے جس جس پہلو سے دیا اس کی تفصیل تجلی کے طلاق نمبر میں موجود ہے۔ جو آپ کے مختلف اسالیب میں سے ایک اسلوب یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ مدعی کی ایک غلط بات کو تھوڑی دیر کے لئے صحیح فرض کر لیا جائے اور پھر یہ بتایا جائے کہ صحیح فرض کر کے بھی تمھارا دعویٰ اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ اہل اجماع نے بعض مواقع پر یہ اسلوب بھی اختیار کیا اور فرمایا کہ اگر اس روایت کو قابل احتجاج مان لیں اور اس کا مطلب بھی وہی مان لیں جو تم لے رہے ہو تب بھی تمھیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ جب حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا تو کسی صحابی نے اس سے اختلاف نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ کے علم میں کوئی ایسا نسخہ موجود تھا جس کی بنا پر دور رسالت اور دور صدیقی کا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ نسخہ حضرت عمرؓ کا ذاتی خیال تو ہو نہیں سکتا کیونکہ رسولؐ کے حکم کو کوئی امتی منسوخ نہیں کر سکتا۔ یقیناً رسولؐ ہی کی کوئی ایسی حدیث ہی ہوگی جسے صحابہؓ نے نسخ مانا لہذا اب کسی کو یہ اختیار کہاں سے مل سکتا ہے کہ اللہ کا رسولؐ جس حکم کو منسوخ کر چکا ہو اسے پھر سے زندہ جاوہاری کرے۔

یہ بھی اہل اجماع کی جو ابی تقریر۔ علم کلام کا مبتدی

آپ بھول گئے۔ زبانی گفتگو کے دوران میں نے آپ کے کہا تھا کہ خود آپ کے مقالات پر جو فصل تحریر میں لکھی ہے اسے شائع کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میرے اور آپ کے درمیان مباحثہ ہو۔ اس تحریر میں میں نے اپنی عداوت کے مطابق اس بات کا ثبوت بھی پیش کیا تھا کہ آپ فقہاء پر خواہ مخواہ گہرے ہیں۔ وہ تحریر میں نے پھاڑ دی اور نئے سرے سے فقط وہ دو صفحے لکھے جو طلاق نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔

آپ تجاہل عارفانہ پر اترا آئے ہیں تو لیجئے دلیل بھی لیجئے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی ”زندگی“ کے شمار میں آپ نے مسلم والی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے شوکانی وغیرہ کے جذباتی غلو کا ذکر فرمایا اور پھر ترمذی کے پڑے اس طرح برابر کئے۔

”اسی طرح فقہائے احناف اس روایت کے دوسرے ٹکڑے کو اس مسئلہ پر اجماع کی دلیل بناتے ہیں اور پہلے ٹکڑے کی دوزخ کا رد تاویل کرتے ہیں۔ مسالک و مذاہب فقہ کی یہ روش نہایت نامناسب رہی ہے۔“ ص ۱۶

میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا اس اثر شاگردی میں جملہ مذاہب فقہ کی عموماً اور احناف کی خصوصاً تحقیر و تنقیص موجود نہیں ہے؟

آپ شاید فقہاء کی تحریروں میں اپنا ذہن پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے ان کی بعض کارآمد باتیں بھی آپ کو دور از کار محسوس ہوتی ہیں اور ان کی مناسب روش بھی نامناسب لگتی ہے۔ میں نے طلاق نمبر میں زیر بحث مسئلہ پر بڑے بڑے فقہاء کا طرز فکر اور انداز بحث اور علم کلام مفصلاً پیش کر دیا ہے۔ انجلی رکھ کر بتائیے کہاں کون سی بات انھوں نے دور از کار کہی اور کس حکم نامناسب روش پر چل نکلے۔ الزام لگایا ہے تو دلیل دیجئے۔ میں تو اس مسئلہ میں مستند فقہاء کی روش کو کہیں بھی غیر مناسب اور دور از کار نہیں پاتا۔

آپ میری تنقیدوں کو جارحانہ نہیں قائلانہ بھی کہہ لیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ حاضر ملائق کو زبان و قلم کے معاملہ میں نااہل مان لیا جائے۔ بدتمیز اور بے سلیقہ ٹھیرا دیا جائے۔ علیے سر نہ کھوں پر۔ لیکن اس سے اُن عقلی و نقلی دلائل کا جواب تو نہیں بنتا جنہیں یہ نااہل تجلی کے صفحات پر بکھیرا گیا ہے۔

آج کل عام طریقہ ہے کہ ہر جملہ آور اپنے آپ کو مدافع اور جس پر حملہ کیا ہے اسے جارح قرار دیتا ہے۔ یہی تکنیک آپ بھی استعمال فرما رہے ہیں۔ تاہم میں اپنے جارح نہ ہونے پر اصرار نہیں کروں گا۔ اصرار کموں کروں۔ خداداد کچھ رہا ہے کہ میں اپنی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتا۔ میں ایک خامی دستا ہار طالب علم ہوں جو ذاتی قابلیت کچھ نہیں رکھتا شخص دوسروں کے خوان علم و تفہم سے ریزے چلتا ہے۔ مجھے جارح کہو۔ ہرزہ سرا حسد ر دو۔ بے بضاعت اور کم فہم ٹھیراؤ۔ میری انانکے کانوں پر جوں تک نہیں رینگے گی۔ انانکے شیطان کو میں نے کبھی قریب نہیں آنے دیا۔

لیکن پیارے دوست۔ برا نہ مانیں تو ایک بات کہو! میں نے دسیوں بار تجلی کے صفحات میں اپنی مختلف غلطیوں کا کھلا اعتراف کیا ہے۔ کیا آنجناب نے بھی زندگی کے صفحہ میں یہ توہین کبھی گوارا فرمائی ہے؟

اور اسے بھی چھوڑیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میں لوگوں کے عیوب کے ساتھ ان کے کچھ محاسن بھی بیان کر دیا کرتا ہوں۔ مثلاً اسی طلاق نمبر میں آپ کے مقالات کے لئے میں نے تعریفی الفاظ بھی لکھے ہیں اور ایک مقالہ کو بہت اچھا بھی کہا ہے لیکن آپ کا ظرف یہ ہے کہ طلاق نمبر سلا حظ فرمانے کے بعد اتنا لمبا مراسلہ تعریف و اعتراف کا تو رقم فرما دیا مگر اس میں ایک حرف ایسا نہیں کہنے دیا جس سے عامر بیچارہ یہ تاثر لے سکے کہ اس کی کوئی ادا حضور کو پسند بھی آئی ہے۔ بخجل سا بخجل۔ لوگ اخلاقاً بھی ایک آدھ کلمہ خیر کہہ ہی دیتے ہیں مگر شاباش ہے آپ کی وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کو

بعد آپ اپنے طویل مکتوب گرامی میں تھوڑوں کو بھی کوئی لفظ حوصلہ افزائی کا نہ لکھیں۔ گو یا آپ علم و فقہ کے اتنے اونچے مینار پر سکونت پذیر ہیں کہ وہاں سے عام جیسے اطفال مکتب کی کوئی بھی درد سری اور محنت فقط بچوں کا کھیل نظر آتی ہے۔ اگر صاحبیت اور حسن اخلاق اور علم فیاضی اسی کا نام ہے تو میں بس ایک شعر پر یہ کالم بند کر دوں گا۔

کامل اس فرقہ نوآباد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رند این قلع خوار ہوئے

تقلید کے سلسلے میں آپ نے یہ طعن فرمایا ہے کہ تم کسی مسئلے میں مقلد جامد بن جاتے ہو اور کسی مسئلے میں مجتہد مطلق بن جاتے ہو۔

بے شک یہ طعن منستے ہوئے ہی کیا گیا تھا اور میں جوابی تبسم کے ساتھ اسے پی گیا تھا۔ بی اس لئے کیا تھا کہ مجھے ملاقات کی اس مختصر سی مجلس کو مکدر کرنا پسند نہ تھا۔ نیز مجھے توقع تھی کہ میرا نرم اور نیا زمندانہ رویہ شاید آپ کے خود پسند ذہن کو اس بات کے لئے تیار کر سکے کہ آنے والا طلاق نمبر ٹھٹھکے دل سے پڑھیں اور اپنی بعض ناقص اور سے رجوع فرما لیں۔

لیکن اب جب کہ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ آپ اپنی کسی بھی رائے سے پسپائی اختیار کرنے والوں میں نہیں ہیں کہ قلم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔

طعن کا جواب سنئے۔ پہلے آپ کو یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں اور تقلید کسے۔ میں گناہگار اپنے ہر نقطہ نظر کو اگر شد و مد اور زور شور سے پیش کرنا عادی ہوں اور قاتلانہ جارحیت میرے قلم میں پائی جاتی ہے تو آپ نے شاید اسی کو یہ معنی پہنایا ہے ہیں کہ عامر بجائے مقلد کے مجتہد مطلق بن بیٹھتے۔ یا پھر آپ شاید اس لئے یہ طعن فرما رہے ہوں کہ عامر اپنے اساتذہ اور ہم حلقہ بزرگوں کی رائے کے برعکس جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی حمایت کرتا ہے لہذا وہ مقلد کہاں ہوا۔

کہ حوصلہ افزائی، محبت، تحسین کا ایک حرف زبان پر لانا گوارا نہیں فرمایا حالانکہ پورا اطلاق نمبر اسی موقف کی حمایت میں ہے جو بنیاداً خود آنجناب کا موقف ہے اور اختلاف جناب کے مجھے گناہ گار نے محض جزواً اور ضماً کیا ہے۔ گو یا جو شخص آپ سے حرفاً اتفاق نہ کرے بلکہ کسی جزو سے اسے کچھ اختلاف ہو اس کے خلاف آپ کے ذہن و قلب میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ تو اضماً اور اخلاقاً ہی ایک دو حرف تحسین کہنے کے روادار ہو سکیں۔

مجھے دیکھئے۔ آپ نے بالمشافہ گفتگو کا جو حال میں نے طلاق نمبر کے صفحہ ۱۵۶ پر لکھا ہے اس میں تو اضع کی کیا روش اختیار کی ہے۔ آپ نے غلط طور پر ابن حزم کا نام درج متعلقہ کیا۔ میں نے تو کہا کہ یہ الٹی بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ابن حزم کی محلی مجھے میری نہ ہوئی لہذا بے تحقیق ابن حزم کا نام لکھا گیا۔ اس واقعے کے سلسلے میں میں نے یہ طرز تحریر اختیار کیا ہے:-

”اس اعتراض کا جواب موصوف نے ایک دیندار

اور بندہ مومن کی طرح یہ دیا کہ.....“

انصاف کیجئے۔ آپ کے تصور پر لے دے کرنے کے عوض میں نے دو اعلیٰ درجے کی صفات آپ کی طرف منسوب کر دیں حالانکہ آپ کے اعتراف خطا میں نہ کوئی شانِ دیانت تھی نہ شانِ ایمانی۔ وہ تو ایک عجوبہ روی میں آپ اعتراف کر رہے تھے۔ آپ کے بس میں نہیں تھا کہ کوئی نیا ابن حزم پیدا کریں یا محلی کے متعلقہ اور اق ناپید کر دیں۔ تاویل کی کوئی ادنیٰ صورت میر نہیں تھی اس لئے اعترافِ خطا کرنا پڑا۔ ظاہر ہے اس طرح کے اعترافات کا تعلق جذبہ دیانت یا خلوص ایمانی سے نہیں ہو اگر تا پھر بھی میں نے تو صافی پردہ اختیار کیا۔ علاوہ اس کے اوپر نیچے متعدد جگہ آپ کی صاحبیت اور اعلیٰ ظرفی اور اخلاص وغیرہ کے گن گنائے۔ پھر اگر میں جارح ہوں تو انصاف اور حسن اخلاق شاید اسی کا نام ہو گا کہ جس طرح طلاق نمبر کے ورق ورق پر مجھے قلم کے مزدور کا پسینہ اور خون جگر ہر شخص دیکھ سکتا ہے اسے اول سے آخر تک پڑھ لینے کے

تفسیر ماجہدی

۹۰

بادود الفاظ اور ان کا رد و استہزا ترجمے کے یہاں الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ فاضل مفسر نے اپنے ترجمے میں کہیں کہیں محض نقل سے بھی کام چلایا ہے۔

دوسری بات جو یہاں قابلِ گفتگو ہے وہ غُھْدُ شَمْرُ مِنْ الشَّعْرِ کہین کا ترجمہ ہے۔ فاضل مفسر اور مولانا اشرف علیؒ دونوں ہی نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔ جن سے تم نے عہد لیا۔

بہاری ناچیز لے لے یہ ہے کہ اردو رد و استہزا کے اعتبار سے یہ ترجمہ ناقص ہے۔ بلکہ خود عربی فاعل سے بھی اس میں خامی ہے۔ غُھْدُ شَمْرُ کا مصدر ہے معاہدہ اور معاہدہ اس عہد کو کہتے ہیں جو دو شخصوں کے درمیان واقع ہو۔ اس میں دونوں فریق اپنے اپنے شرائط رکھتے ہیں اور اپنے اپنے لئے ذمہ لے لے قبول کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف کسی کا کسی سے عہد لینا بالکل دوسری ہی بات ہے۔ یہ ایسے موقع پر ہوتے ہیں جیسے مثلاً باپ بیٹے سے یوں کہے کہ عہد کرو آج کے بعد مدرسہ جانے میں دیر نہیں کرو گے۔ یہاں معاہدہ نہیں ہوا بلکہ وعدہ لیا گیا۔ یہ ذرا فرق کا معاملہ نہیں بلکہ یہاں فرق کوئی ہے ہی نہیں۔

”مریکہ اور جرمنی نے معاہدہ کیا“ جس موقع پر یہ فقرہ لاجاً تا ہے کیا اس موقع پر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ”امریکہ نے جرمنی سے عہد لیا۔“؟ نہیں کہہ سکتے۔ شران یہاں معاہدوں کا ذکر کر رہا ہے جو کفار و مشرکین کے مابین

پھیلی روش کے مطابق ہم پہلے سورہ توبہ کے ترجمے کاہ داتے ہیں پھر تفسیر کا مطالعہ کریں گے۔

اس سورہ کی چوتھی آیت کا ترجمہ مولانا دریا بادی نے یہ فرمایا ہے۔

”مگر ہاں وہ مشرکین اس سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی سوا انکا معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک پورا کر دو۔“

بہ مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ دیکھتے ہیں تو یہ ملتا ہے۔ ”مگر وہ مشرکین مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی سوا ان کے معاہدے کو ان کی مدت تک پورا کر دو۔“

نوں ترجموں میں خود مولانا دریا بادی بھی اور جملہ ان بھی مقابلہ کر کے دیکھیں کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ جب دوسرے ترجمے کی تقریباً نقل ہی ہے نہ کہ کوئی الگ مالا کہ جب فاضل مفسر نے مترجم ہونے کی ذمہ داری نہ ہے تو ترجمے میں الفاظ ان کے اپنے اور فقرہ کا رد و استہزا بنایا ہوا چلائے تھا شعروں اور مصرعوں میں تو توارد ہے اور ہوتا ہے لیکن میں سے زیادہ الفاظ والے بھی لفظاً متوارد ہو جائیں یہ عادتہ محال ہے۔ اردو بت سے ترجمے ہوئے ہیں لیکن مفہوم کی یکسانیت کے

دو فرقوں کی حیثیت سے کئے گئے ہوں۔ کسی ایسے وعدے اور عہد کی بات نہیں کر رہا ہے جو مسلمانوں نے اپنی قوت اور بالادستی کے تحت کفار سے لیا ہو۔

دیے بھی دیجھ لیجئے۔ ایک باپ یا استاد یا حاکم اگر کسی سے کوئی وعدہ اور عہد لیتا ہے تو اس عہد کو پورا کرنے کی ذمہ داری اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس سے عہد لیا گیا ہے۔ عہد لینے والے پر اس سلسلہ میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی حالانکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ اے مسلمانو! اگر کفار و مشرکین معاہدے پر قائم رہیں تو تم بھی معاہدے پر قائم رہو، اور جس وقت تک کے لئے یہ معاہدہ ہوا ہے اس وقت تک اس کی خلاف ورزی مت کرو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں کسی ایسے وعدے اور عہد کا ذکر نہیں ہے جو مسلمانوں نے کفار سے لیا ہو بلکہ ایسے معاہدے کا ذکر ہے جس میں خود مسلمانوں نے بھی کچھ وعدے کئے ہوں اور کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر لی ہوں۔

چنانچہ رئیس المترجمین شاہ عبدالقادر کا ترجمہ

یہ ہے۔

”مگر وہ کوئی کہ عہد کیا ہے تم نے مشرکوں سے۔“

شاہ صاحب نے اگرچہ معاہدہ کا لفظ استعمال نہیں فرمایا لیکن ”عہد لیا“ کے بجائے ”عہد کیا“ لکھ کر قرآن کا اصل مطلب واضح فرمادیا۔ ”لیا“ اور ”کیا“ میں جو فرق ہے محتاج تشریح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بات اگرچہ معاہدے ہی کی ہے لیکن قرآن کے مخاطب یہاں چونکہ صرف مسلمان ہیں اس لئے حقیقتہً بات صرف ان وعدوں کی ہے جو مسلمانوں نے اس معاہدے کے اندر مشرکوں سے کئے ہوں۔ وعدہ کرنے والے ہی اس حکم کے مخاطب بن سکتے ہیں کہ مائت مقررہ تک انھیں پورا کرو۔

حضرت شیخ الہند کا ترجمہ یہ ہے۔

”مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا۔“

مولانا مودودی کے الفاظ یہ ہیں۔

”بحر ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدہ کئے۔“

عہد لینا اور عہد کرنا دو مختلف باتیں ہیں مداخل مفسر اور حضرت مولانا اشرف علی دہلوی کے ترجمے نے بات کو الٹ دیا ہے حالانکہ اساتذہ انھوں نے ایسا نہیں کیا مفہوم ان کے ذہنوں میں بھی جینا دہی رہا ہو گا جو آیت شریفہ کا ہے مگر ذہن کی تھوڑی سی اونگھ نے قلم کا قدم دھکا دیا۔

دیے مولانا دریا بادی یہ فرما سکتے ہیں کہ ”تو“ ”کیا“ لکھا تھا کا تب نے ”لیا“ لکھ دیا۔ لیکن مولانا اشرف علیؒ کی طرف سے یہ معذرت مشکل ہے کیونکہ ہم نے ترجمہ اشرفیہ کے متعدد ادیشن دیکھے جن میں تاج کمپنی والا صحیح ترین ایڈیشن بھی شامل ہے سب میں ”لیا“ ”یا“۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کی کوئی ہی ہمیشہ سے یہ چلی آرہی ہے کہ ہر انسان اپنی بشری کمزوریوں کا عملی ثبوت دیتا رہے۔ بس بے خطا اور کمزوریوں سے پاک تو صرف ایک ہی ذات ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ و علم والہ۔

(۲) آیت ۱۳۔ وَهَذَا بَدَأَ دُكْرَ اَوَّلِ صَرَفِ۔

فصل مفسر کا ترجمہ۔

”اور انھوں نے تمہارے مقابلے میں اول خود ہی

ابتدا کی پہل کی۔“

یہاں بھی گفتگو مفہوم میں نہیں الفاظ میں ہے۔ شاہ عبدالقادر کے زمانے میں زبان اردو اور ادب اردو کا جو معیار تھا اس کے اعتبار سے اگر وہ ایسا ترجمہ کرتے تو حیرت کی بات نہیں تھی لیکن آج ادب اردو اور انسانے اردو کا جو معیار ہے اسے ملحوظ رکھئے تو حیرت ہی کرنی پڑے گی کہ مولانا دریا بادی جیسا ادیب شہیر اور ایسا بے ہنگم ترجمہ۔ اول۔ ابتدا۔ پہلا۔ سارے ہی ہم معنی الفاظ بھی لکھے رکھ دیئے۔ مولانا خود ہی اس پر نگاہ غور ڈالیں کیا بدوائی ان کے نمایاں شان زبان ہے۔ یہاں تو مولانا اشرف علیؒ کی زبان بھی اتنی فنی و سادہ نہیں حالانکہ وہ ماضی کی شخصیت ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

”اور انھوں نے تم سے خود پہل چھڑ نکالی۔“

حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے:-

”اور انھوں نے پہلے چھڑکی تم سے۔“

مولانا مودودی کا ترجمہ یہ ہے:-

”اور زیادتی کی ابتداء کرنے والے وہی تھے۔“

قرآن ہی تو بتا رہا ہے کہ جن اہل کفر نے اپنی زمینوں پر اور رسولؐ کو جلا وطن کرنے کی ٹھانی اور تمھارے ساتھ زیادتی کرنے میں پہل کی ان سے قتال کرو۔ اس کے لئے آخر اس کی کیا ضرورت ہے کہ اول اور ابتداء اور پہل سنا کر ہی الفاظ ترجمہ میں جمع کر دئے جائیں۔

(۳) آیت ۲۸- وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَتَهُ تَسْوَفْتُمْ يُغْنِيَكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ۔

مفسر ممدوح کا ترجمہ:- ”اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ

ہو تو اللہ تمھیں اگر چاہے گا اپنے فضل سے

(ان سے) بے نیاز کر دے گا۔“

پہلی بات تو زبان سے متعلق ہے۔ اشعار میں تعقید تو اس لئے گوارا ہو جاتی ہے کہ وزن کی پابندی ہے لیکن نثر میں تعقید عموماً ناگوار ہی ہوتی ہے۔ ”تمھیں“ کا لفظ ناموزوں جگہ آیا۔ فصیح عبارت یوں ہوتی:-

”اللہ اگر چاہے گا تو تمھیں اپنے فضل سے۔۔۔۔“

دوسری بات قواعد عربی سے متعلق ہے۔ عربی کی وسعت اور

گو ناگوئی کے کیا کہنے۔ غ۔ ن۔ ی سے نہ جانے کتنے باب اور کتنے معانی بنتے ہیں۔ جیسے غنی، یغنی (باب سمر سمیع) نکاح کرنا بے نیاز آرائش ہونا۔ غنی، یغنی (باب تفعیل) گانا، عیش بازی کرنا۔ تعریف یا مذمت کرنا۔ پھر اسی باب میں جب یوں کہیں کہ غنا، غلا، فلاں تو مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اسے مالدار بنا دیا۔ مفسر ممدوح بھی یقیناً جانتے ہی ہیں کہ عربی میں کیسی باریکیاں ہیں اور ہم جیسے اطفالِ مکتب اُن جیسے فاضل استاد سے یہی توقع رکھ سکتے ہیں کہ قرآن کا ترجمہ وہ عربی زبان کی باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کریں گے۔

مگر بعض اور مقامات کی طرح یہاں بھی اس توقع کو دکھانا لگا۔ ”یُغْنِيكُمْ“ یہاں باب افعال سے آیا ہے۔ اِغْنَاءُ کے معنی

بے نیاز کر دینے کے بھی آتے ہیں مگر جبکہ اس کا صلہ عن آئے یا پھر ایسا جن آئے جو سبیت کے لئے نہ ہو بدل کے لئے ہو۔ قرآن ہی سے چند مثالیں لے لیجئے۔

سورہ جاثیہ:- اَتَّخِمْ لَكَ يٰعِزُّوْا عَنَّا اللّٰهُ شَيْئًا يُّوسِفُ:- مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ۔

طور:- يٰوَدَّ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُكُمْ شَيْئًا۔

دخان:- يٰوَدَّ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَيْئًا۔

ان جیسے تمام مقامات پر امیری و دولت مندی کا کوئی ذکر نہیں بلکہ بے نیازی ہی وادعہ مفہوم ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ سب جگہ عن صلہ آرہا ہے۔ سورہ نجم اور سورہ یونس میں:- اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي عَنِ الْحَقِّ۔

یہاں بھی دولت کا ذکر نہیں کیونکہ حرفت میں بدل کے طور پر سب سبیت کے لئے نہیں ہے۔ اسی طرح سورہ غاشیہ میں لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُحُمٍ۔ یہاں بھی سبیت کے لئے نہیں لہذا مفہوم بے نیازی ہے نہ کہ دولت مندی۔ لیکن مثلاً سورہ نور میں:- اَنْ تَكُوْنُوْا اَفْقَادًا يُغْنِيْكُمْ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ کا ترجمہ لازماً یہ ہو گا:-

”اگر یہ فلس دبے نہ ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے

فضل سے امیر و زردار بنا دے گا۔“

یعنی بے نیازی عیساً و سماع المصداق لفظ ترجمہ میں استعمال نہ ہو گا بلکہ ایسے ہی الفاظ استعمال ہوں گے جو مال و جائیداد کا مصداق لئے ہوئے ہوں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بے نیازی کے وادعہ معنی ایسے کی بے نیازی نہیں ہوتی اور نیاز مندی کا ترجمہ لازماً مفلسی نہیں ہو کر تا۔ خلاصہ یہ کہ جہاں بھی فقر و افلاس کے مقابل میں لفظ غنی آئے گا اس کا صحیح ترجمہ دولت مند اور مالدار ہو گا اور صلہ عن نہیں آئے گا۔

اب اس ترجمے پر نگاہ ڈالئے جو ممدوح نے فرمایا ہے۔

آیت عن سے خالی ہے اور میں موجود ہے مگر سبیت کے

لئے ہے۔ پھر مقابلہ مفلسی (عَيْلَتُهُ) سے لہذا ترجمہ میں

لفظ ”بے نیاز“ کا محل نہیں تھا بلکہ ایسے لفظ کا محل تھا جو

اچھی کتابیں

- ۱۲۵/- محبت فاتح عالم - مولانا ابوالحسن علی ندوی
۴/- یا جاشہ ایخ زندگی
۳/- ذکر خیر
۱۲۵/- باب رحمت
۵/- مشعل راہ - مولانا عبد الرؤف عالی
۱/- جمال مصطفیٰ (مجموعہ لغت) دزد قریشی
۰/۶۰ عقیدت کے پھول
۱۰/- الفاسوق علی محمد مع کور
۸/- کلیات شکیل بدایونی مجموعہ کلام
۶/- صہبائے خیال مجموعہ کلام عاصم بریلوی
۶/- لفظوں کا سفر جمیل احمد آبادی
۶/- انکشاف بجواب نزلہ
۵/- تاریخ ادب اردو - ڈاکٹر نذیر احمد
مکتبہ جلی - دیوبند (پوئی)

خاص طور پر مالی احتیاج سے گلو غلامی کی خبر دے۔ چنانچہ
شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ہے۔

”اور اگر تو تم محتاج سے پس قریب ہے کہ دو ہند
کرے گا اللہ فضل اپنے سے اگر چاہے گا۔“
حضرت شیخ الہند کا ترجمہ یہ ہے۔

”اور اگر تم دیتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کر دے گا
تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے۔“
مولانا مودودی نے بھی کم و بیش یہی ترجمہ کیا۔
مولانا اشرف علی کا ترجمہ یہ ہے۔

”اور اگر تم کو مغلی کا اندیشہ ہو تو خدا تم کو اپنے
فضل سے اگر چاہے گا محتاج نہ کر دے گا۔“

مولانا دیبادی نے بھی آیت کا مفہوم تو درست ہی سمجھ
رکھا ہے اور اپنے تفسیری نوٹ میں تو وہ خود وضاحت کرتے
ہیں کہ بات بے زری اور نرداری کی پل رہی ہے لیکن ترجمہ
میں چوک ہو گئی۔ بریکٹ دیکر ”ان سے“ کا اضافہ بھی غیر
ضروری محسوس ہوتا ہے۔
(جاری)



پھول کی طرح تروتازہ

الرجلی امراض یا فساد خون کی
شکایت ہو تو تیرہ پڑمردہ نظر آتا ہے

خون صفا

پھوڑے پھنسی خارش اور داسے نجات دے
کرم اور پیرے کو چھل کی طرح تروتازہ رکھتا ہے

دواخانہ طبیکان لکھنؤ نیوٹری علی گڑھ

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے محبت تک

چند ماہ قبل خریدی تھی۔ خریدی اس لئے تھی کہ نئی نئی شادی کی تھی۔ شادی اس لئے کرنی پڑی کہ کھلی سیٹھان ایک ایکسٹینٹ کا شکار ہو کر عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی تھیں۔ ایکسٹینٹ اس لئے ہوا تھا کہ ان کی گاڑی کا ڈرائیور گھنٹیاں معمول سے کچھ زیادہ پی گیا تھا۔ نہ زیادہ اس لئے پی گیا تھا کہ اس کی گرل فرینڈ مس ریٹھانے دفعتاً اسے چھوڑ کر ایک نیا دوست بنالیا تھا۔ نیا اس لئے بنایا تھا کہ گھنٹیاں باوجود ہزاروں وعدوں کے اسے میلوین سیدٹ خرید کر نہیں دے سکا تھا۔

بہر حال مجھے اس سے بحث نہیں کہ امیالا خریدنے کے بعد سیٹھ نے کھلی تین گاڑیوں کا کیا کیا تھا۔ اسٹیرنگ خود سیٹھ صاحب نے سنبھالا۔ ڈرائیور تو دیے انھوں نے کتنی کتنی رکھ چھوڑے تھے مگر شتوں ہی تو ہے۔ ان کے برابر میں مولوی ہدایت علی بیٹھے۔ وہ اس لئے بیٹھے گنیش پور سے رام گنج تک جانے والی زبردست بیڑک پر بس چلانے کے لئے انھیں پریٹ مطلوب تھا۔ سیٹھ صاحب نے ازراہ تعلق وعدہ

اصلی نام نہیں لوں گا۔ فرض کر لیجئے ان کا ناؤ درگا پر شاد ہے۔ وہ اپنے ہندوستان جنت نشان کی حکومت عالیہ کے راج محل میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھ جیسے پیچھے لوگوں کی پہنچوان تک کیا ہوتی مگر سیٹھ غایت اللہ پیر والا کے واسطے سے درشن اور پھر مہانجے اور پھر استھانے کا موقع ملا تھا۔ سیٹھ غایت اللہ پیر والا سے مجھ فقیر کی رسم در راہ مدت ہوئی اُس وقت شروع ہوئی تھی جب پیران کلی شریف کے عرس میں انھیں ایک نئے عافیت اولیاء سے انس ہو گیا تھا۔ میں نے ازراہ اخلاق اس سلسلے میں ان کی کچھ خدمات انجام دیں اور ہماری شادمانی بے تکلفی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

سیٹھ غایت درگا پر شاد سے ملنے جا رہے تھے تو مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ میں شاید نہ جاتا لیکن ان کی نئی شادیوں پہ لانا مجھے مقناطیس کی طرح کھینچا۔ کسی جسم چم کرتی ہوئی دل میں اترتی ہوئی روح میں محسوس کرتی ہوئی۔ ہاتھ تو ہاتھ جگہ تک پھسلے۔ یہ گاڑی انھوں نے ابھی

کر لیا تھا کہ وہ انھیں درگاہ پر شادی سے نہ صرف ملا دیں گے بلکہ سفارش بھی کر دیں گے۔

پچھلی سید پر سید کی نئی نوبلی بیگم زریا غوثیہ بیگم اور محمد ناچیز کو بھی وہیں جگہ ملی۔ غوثیہ ان کی ماں کا نام نہیں تھا بلکہ ایک مذہبی قسم کا امتیازی نشان تھا۔ ان کے والد غیاث الدین گو کہ مذہبی آدمی نہیں تھے لیکن غوثیہ الاءظم پیران پیر دستگیر کے بے حد چاہنے والوں میں تھے۔ جب بھی کوئی دشواری پیش آتی غوثیہ کے گھر گئے نماز غوثیہ پڑھتے اور شوری بے چاری اپنا سامنہ لیکر رہ جاتی۔ گھر اگر چہ کرایہ کا تھا مگر اس پر غوثیہ منزل کی قسمی لٹکا دی تھی۔ پھر کھلا بیٹی زریا کے ساتھ غوثیہ کا اضافہ کیسے بھولتے۔

موصوفہ کے لباس سے اتنی تیز خوشبو بھوٹ رہی تھی کہ میرے بھیجے پر بقول شاعر قاطر اطراف شریعہ بڑ گیا۔ یعنی نزلے کی بھواری سے کھو پڑی کی دستوں میں چوٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ایک دو تھینکیں بھی ہاتھوں ہاتھ آئیں جو میرے نے برا سامنہ بنایا۔ ان کی عمر بائیس سال سے زائد نہ ہو گی۔ سید پچاس سے اوپر جا چکے تھے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے انھوں نے اپنی باویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی تھی جس میں باون قسم کی مٹھائیاں سرد ہوئی تھیں۔

دیے دیکھنے والے انھیں ساٹھ سے بھی اوپر کا سمجھتے تھے کیونکہ چہرہ مکمل طور پر بوڑھا ہو گیا تھا۔ معرے کی منتظر خزانے چہرے کا نور صبور اور بدن کا سمت چوس لیا تھا۔ اب زریا غوثیہ نے آکر توازن کچھ درست کیا۔ وہ حسن اور صحت کا مجسمہ تھیں۔ بلا کی پیرکشش۔ جب ایک طرف جھاڑ جھنکاڑ ہوں اور دوسری طرف پھولوں کی کیاری تو توازن آپ ہی پیدا ہو گا۔ معنوی توازن بھی خدا کے فضل سے اس لئے پیدا ہو گیا تھا کہ سید جس قدر چلتا پڑھتے تھے زریا غوثیہ اسی قدر سادہ لوح تھیں۔ مگر سادہ لوح ہونے کا یہ مطلب ہے کہ زبان چلانے میں کسی سے پیچھے ہوں۔ پھر سکندر امیر تک تعلیم بھی تو مکمل کر لی تھی اس لئے زبان چلانے کا انداز دنیاوی نہیں رہ گیا تھا۔ زبان چلا

چلا کہ وہ چند ہی ہفتوں میں مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئیں تھیں اور اسی بنا پر برا سامنہ بناتے ہوئے انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا۔

”تمہیں ملا صاحب کچھ بھی تمیز نہیں۔ اتنی زور سے چھینک دیا۔“

”آپ شاید خوشبو کے طب میں غوطہ لگا کر آئی ہیں۔“

میں نہ چھینکتا تو شاید میرا رٹ ہی فیل ہو جاتا۔

”گنہگار ہو۔ کیا تمہیں خوشبو پسند نہیں۔“

”بہت سے مگر حد بھی تو ہونی چاہیے۔“

”دیہاتی جو ٹھیرے۔ خبر بھی ہے یہ ایندنگ ان برازیل ہے۔ ہاٹ اونس کی شیشی پانسویں امپورٹ ہوئی ہے۔“

”یہ ایندنگ ان قطب شمالی بھی ہو تو نزلہ اسکی کوئی بردا نہیں کرے گا۔ چلنے میں ناک باہر کر کے لیتا ہوں۔“

میں نے بازو کھڑکی سے ٹپاک کر منہ سڑک کی طرف کر لیا۔

”نان سینس۔ میں یہ تو مہینہ برائت نہیں کر سکتی۔“

ادھر منہ کر دو۔“

”حکا طمی تار کول کی سڑک پر اس طرح تیر رہی تھی جیسے ناکام تنداؤں کے بحر ظلمات میں مستقبل کے حسین خواب تیرتے ہیں سبحان اللہ۔“

سید غایت اور مولوی ہدایت بھی خاموش نہیں تھے۔ ان کے پورے مرکا لمے تو سمجھ میں نہ آسکے لیکن موضوع بالکل واضح تھا۔ پرمٹ۔ لائنس۔ امپورٹ ایکسپورٹ برنس۔ تعمیرات کے ٹھیکے۔ ایک فقرہ یہ کان میں پڑا جو مولوی ہدایت کے منہ سے نکلا تھا۔

”میں بہت سے بہت ایک لاکھ لگا سکتا ہوں۔“

آپ کا اور میرا کیا مقابلہ۔“

”ناک پر سے ہاتھ ہٹاؤ۔ یہ فقرہ ظاہر ہے سید نے تو کہا نہ ہو گا۔ سید کو اس سے کوئی بحث ہی نہ تھی کہ

پچھلی سید پر کیا ہو رہا ہے۔ میں نے چہرے کا رخ جو میرے کے پچھلے آرڈر پر بے شک درست کر لیا تھا مگر ایک انگلی

ناک کے تھنوں پر اب بھی رکھی ہوئی تھی۔
”مجھ پر اختلاج کا دورہ پڑ جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے
میں نے انگلی ہٹائی۔

”تم جان بوجھ کر میری جان جلاتے ہو۔ اس دن
بھی تم نے میرا سفید سوٹ دیکھ کر بڑا توہین انگیز فقرہ کہا تھا۔
بھلا کیا کہا تھا؟“

”آپ ہی کو یاد نہیں تو مجھے کیا یاد ہوگا۔“
”نہیں۔ تم جھوٹے بھی ہو۔ اس دن وعدہ کر کے
گئے تھے کہ ٹھیک کر بیچ رہا ہوں۔ ہم لوگ سوانوٹک
انتظار کرتے رہے پھر تمہارے بغیر ہی بیچ جانا پڑا۔“
”اس کے لئے میں سیٹھ جی سے معافی مانگ چکا
ہوں۔“

”مجھ سے تو نہیں مانگی۔ کیا انتظار کی بوریٹ میں میں شریک
نہیں تھی۔“

”تین گاڑیاں خریدنے کی مجھ میں سکت نہیں۔“ یہ
جملہ ظاہر ہے میں نے تو نہ کہا ہوگا۔

”سکت تو بد لکی جاتی ہے۔“ سیٹھ کا فقرہ سنائی دیا۔
”کیا سوچنے لگے۔“ محترمہ جھلٹائیں۔ انھیں اگلی سیدٹ
کے رکالوں سے ذرہ برابر چسپی نہیں تھی۔

”میں سوچ رہا ہوں میں تو ایک رکشا بھی نہیں خرید
سکتا۔ یہاں تین تین گاڑیوں کی بات ہو رہی ہے۔“

”ارے تو تم پر کیا آفت آئی ہے رکشا خریدنے کی۔
اوٹ پٹانگ باتیں مت کیا کرو۔ اچھا بناؤ تاج محل کے
بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔“

”میرا خیال ہے اس کی تعمیر میں پچاس ہزار روپے لگ
گئے ہوں گے۔“

”ایڈیٹ کہیں کے۔ میں روپوں کو نہیں بوجھ رہی ہوں۔
کیا کہا پچاس ہزار تم گھاس تو نہیں کھا گئے۔“

”نہیں کھائی تو اب کھائی پڑے گی۔ ٹاٹر چار روپے
کلو۔ آلو تین روپے۔ جینٹلے۔“

”میں گاڑی نہ تو کر تھیں باہر دھکا دیدوں گی۔ تاج محل

اور چاندنی کے عنوان سے میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ کیا
تم کہانیاں پڑھ لیتے ہو۔“

”انوس پچیس میں قاعدہ نورانی پڑھا تھا۔ پھر
صاحب نے حافظ جی کی درس گاہ میں بٹھا دیا۔ سات سال
تک قرآن ہی تم نہیں ہوا۔ حافظ بہت خراب ہے۔ آج پڑھتا
ہوں کل بھلا دیتا ہوں۔“

”تم سے بات کرنا فاضول ہے۔ کسی دن میں خود پڑھ کر
تھیں یہ کہانی سنائوں گی۔ کیا تجھے ہو کالج میں جس نے بھی
سنی تھی دل بہتر کر رہ گیا تھا۔“

”لالہ جانی اس بھی ہماری بات ماننے والے نہیں۔
بس ذرا لالچی ہیں۔“ سیٹھ کا یہ فقرہ میرے کان میں پڑا مگر
محترمہ اپنی دنیا میں مگن تھیں۔

”تم ادھر کیا سننے لگے ہو۔“ محترمہ کی جھنجھٹیں گھٹیں۔
”میں سوچ رہا ہوں ان دونوں بزرگوں کا کوئی فقرہ
شاید میرے لئے بھی نسخہ کیسیا ثابت ہو۔ میں سیٹھ عنایت نہ
سہی مولوی ہدایت اللہ تو بن جاؤں۔“

”یہ سے کونسی۔ نان سینس۔ تمہیں میں شاعر قسم کا آدمی
سمجھتی تھی۔“

”شعروں سے پرٹ نہیں بھرتا۔ اب دیکھ لو آٹھ دھائی
روپے کلو۔ سوختہ بارہ روپے میں۔“

”اچھا بس اب چپکے بیٹھو۔ تم بھی شاید اسی لئے ساتھ جا
رہے ہو کہ کوئی پیرمٹ ورمٹ حاصل کرنا ہوگا۔“ ان کا لہجہ
بڑا سنج تھا۔

”نہیں۔ میں درگا پر شاد حبیبی عظیم انسان کی نہایت
کے لئے جا رہا ہوں۔ گماندہی جی کی فلاسفی پر یہ شخص تھارتی
مانا گیا ہے۔“

”مجھے خبر ہوئی کہ تم ایسی بور باتیں کر رہے تو اگلی
سیدٹ پڑھتی۔ تمہاری عمر بھلا کیا ہوگی۔“

”یہی کوئی سنتر سال۔“

”میں سچ کہتی ہوں چاٹا مار دوں گی۔ میرا اندازہ ہے
تم میں سے اوپر نہیں گئے۔“

ہو سکی کامیابی اور نفیس قسم کے لٹھے کا باسجامہ پہنے ہوئے تھے۔ چیل شاید جاپانی تھے۔ کونے میں ڈوڑھی جوڑے نظر آئے جن کی ساخت امریکن بھی جھوٹی پر متعدد ملبوسات لٹھے ہوئے تھے جن میں سے ایک بھی ایسی نہ تھا۔

میرا معمولی سا تعارف کرا پا گیا۔ انھوں نے رسماً مصافحہ تو کیا مگر دو انگلیوں سے۔ پھر مولوی ہدایت علی کے حصہ میں شاید تین انگلیاں آئیں۔ البتہ جب سیٹھ عنایت نے محترمہ زریبا کا تعارف کرایا تو درگاہ پر شاد جی کر سی سے آدھے اٹھ گئے اور میں نے کیا کمرے کے درودیوار تکے دکھا کر زریبا کی آنچوں انگلیاں ان کے چوڑے چکلے نیچے کی گرفت میں گم ہو گئیں۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر“ وہ جکے جھکنا میں نے لب و لہجے کی نسبت سے کہا ہے ورنہ آواز تو پھٹے ہوئے بانس جیسی تھی۔

زریبا کے چہرے پر ناخوشگوار اثرات صاف دیکھے جاسکتے تھے اس نے ہاتھ جھڑپایا اور سب سے دور والی کرسی پر جا بیٹھی۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ یہاں صوفے نہیں تھے ڈاک جھگڑا چھڑا۔ چند کرسیاں تھیں۔ ایک پلنگ تھا۔ مولوی ہدایت پلنگ پر ٹپک گئے۔ اب ان بزرگانِ کرام میں اپنے موضوعات پر گفتگو چھڑی۔

”میں سمجھنے سے قاصر ہوں محترمہ کہ میسر اور آپ کا مصروف یہاں کیا ہے۔“ میں نے زیر لب سرگوشی کی۔ فاصلہ ان لوگوں سے اتنا تھا کہ کھینچنا ہٹ دہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر بے بھی وہ خاصی بلند آواز میں اپنے مسائل کی جنگالی شروع کر چکے تھے۔

”محترمہ تم نے میری جڑھ بنالی ہے۔“ انھوں نے گوشہ خیم سے میری طرف دیکھ کر زیر لب ہی کہا۔ لہجہ خاصا کھر درا تھا۔

”تو یہ تو بہ۔ کیا احترام بھی نہ کروں۔“

”اپنا مصروف تو تھیں خود معلوم ہو گا۔ میں اپنی

”چلے یو نہی سہی۔ پھر؟“

”مگر ذہنی اعتبار سے تم کھوسٹ ہو چکے ہو۔ میں نے تمہاری فریج کٹ ڈال دی دیکھ کر خواہ یہ تصور کر لیا تھا کہ تمہارے خیالات بڑے رومانٹک ہوں گے۔“

”تھے تھی۔ میں سڑکوں پر چلتے چلتے سنہری خواب بکھا کرتا تھا۔ تاج محل جیسے حسین خواب۔ لیٹی اور شیریں کے خواب۔ افق میں تیرتے ہوئے رنگین اہریوں کے خواب۔ ایک دفعہ تو کار سے جا کھرا یا تھا بس کسررہ گئی ورنہ ہو گیا تھا بیڑا پار۔“

”کبھی کبھی اچھے فقرے بول لیتے ہو۔ رنگین اہریوں کے خواب مجھے بھی پسند ہیں۔ افق پر تیرتے ہوئے حسین بادل۔ پھولوں کی مہک میں ڈوبے ہوئے شمالی ہواؤں کے نرم نرم جھونکے۔ بلبل اور فاختہ کے نغمے۔ سمندر میں ڈوبتا ہوا سورج۔ اور کچھ کہو۔“

”میں سورج رہا ہوں۔ بنا سیتی تھی کا بنس شروع زردوں۔ ایک باؤ کر لیں۔ ایک باؤ سنگھارے کا آٹا۔ ایک بوتل صاف کیا ہو اسی کا تیل۔۔۔۔۔“

فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی امپلاڈ آکر منگل کے پورچ میں رک گئی۔ محترمہ کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ گارڈی سے اترتے اترتے میری کان کے قریب

ولیں۔

”میں تم سے سمجھ لوں گی۔ ایڈیٹ ہو بالکل۔“

چند منٹ بعد ہم ایک بڑے کمرے میں درگاہ پر شاد جی کے سامنے تھے۔ چہرہ بارونق۔ بدن پلا ہوا۔ وزن اتنا ضرور ہو گا کہ میں اور سیٹھ عنایت اور محترمہ زریبا تینوں برابر سے ٹپک جائیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی میں تصور کرتے ہوئے تھا کہ گاندھی جی کی فلاسفی کا یہ بین الاقوامی شیدائی بہت دُعا پتا ہو گا جیسے گاندھی جی تھے۔ بدن پر لنگوٹی کے علاوہ زیادہ سے زیادہ کھدر کی جاکٹ ہو گی۔ آنکھوں سے مسکینی اور ہونٹوں سے تواضع برستی ہو گی مگر وہ اعلیٰ درجے کی غیر ملکی

”اس لفظ سے مجھے کھن آتی ہے“ سیٹھ کو ”اخلاق اخلاق کی رٹ لگانے والے خود تو سمو جاؤنٹ ہضم کر جاتے ہیں اگر اس پاس کوئی نہ ہو مگر شیخ برائے اخلاق اور سماج اور الہا کی دہ رٹ لگاتے ہیں کہ خدا کی پناہ میں بچتا ہوں ضلع میرٹھ کے لئے صرف پچاس کانیں کم ہوں گی۔ سو تنک کی اچھی خاصی گنجائش موجود ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے“ درگا پر شاد جی نے بے تکلف فرمایا ”لیکن شہر زیادہ جتنا اس لئے الحاح پچاس سے شروعات کی گئی ہے۔ گماندہی جی کا فلسفہ تھا کہ بڑی برائی کا خاتمہ کرنے کے لئے چھوٹی برائی کو گوارا کر لینا چاہیے۔ ملک کی ترقی رک جائے۔ دفاعی لائنوں میں کمزوری آجائے۔ اس سے بڑی برائی کیسا ہوگی۔ شراب ہلکی برائی ہے۔ نشہ میں آدمی کھوٹری سے باہر نہ ہو تو سرے سے وہ کوئی برائی ہی نہیں۔ ایک مشروب ہی تو ہے۔“

”میں کہتا ہوں کھوٹری سے باہر ہو کر بھی آدمی کسی کا کیا جگاڑنا ہے“ سیٹھ بولے۔ ”محض چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھ ہی باز ہو اور سودا کی فرقہ پرست پھیلا پھیلا کر پیش کرتے ہیں۔ بکو اس سمرے سے۔“

”ہمیں گاندھی جی کے فلسفے کی روح کو کھنا چاہیے۔ روح کے بجائے سبت یعنی جو ہر کہہ لیجئے۔ میں نے تو برائی غور کیا۔ مجھے تو اس غل خباڑے میں کوئی جان نظر نہیں آتی کہ ہمارا دس گاندھی جی کی تعلیمات سے دور چلا گیا ہے۔ یہ درگا پر شاد جی کا ارشاد تھا۔“

”میں سوئی صدی آپ کی تائید کروں گا۔ مولوی حبیب الرحمن لکھ میں بولے ”صنعتی دور میں اخلاقیات کو بھی نئے زاویوں سے دیکھنا چاہئے۔ ہر اخلاق کی ایک روح ہوتی ہے اور ہر روح کا ایک پتھر ہوا کرتا ہے۔ پتھر سے آپ جیسے عظیم مفکر جو بھی سمت نکالیں وہی دراصل قوم کے لئے آپ حیات ہو گا۔“

”اے محترمہ۔ سنا آپ نے“ میرا بند ضبط ٹوٹ گیا۔

رضی سے نہیں آئی جو اپنا مصروف بھی جانوں۔ انھوں نے کہا تھا میں نے مان لیا۔“

”آپ اپنا آنچل درست کریں۔“ میں نے اور بھی بی آواز میں کہا ”میرا خیال ہے درگا پر شاد جی کی جو نظریں بار بار آپ کی طرف پڑ رہی ہیں۔“

”تمہارے خیالات بڑے گندے ہیں۔“ یہ کہنے کے باوجود انھوں نے آنچل درست کر لیا تھا۔

”گندگی اور پاکیزگی کے فلسفہ پر ہم کسی اور موقع پر بحث کریں گے۔ فی الحال ذرا غور سے سنئے“ گاندھی ازم کے پیغمبر تھیں اسرار درموز کی پردہ کشائی فرما رہے ہیں۔

”عربی بولتے ہو۔ میں رعب میں آنے والی نہیں۔“

”آپ کچھ دنوں مجھ سے عربی پڑھیں۔ صرف پانسو روپے ماہوار۔ ناشتہ آپ کے ذمے۔“

”تم نے ٹھیک کہا تھا۔“ انھوں نے میری طرف رخ لئے بغیر نیچا اٹھ کر کہا۔ ”منحوس بار بار ادھر ہی گھورے بارہا ہے۔“

”کہو تو ایسا تعویذ لکھو انکھیں پھوٹ جائیں مردود کی۔“

”اچھا اب چپ رہو۔ مجھے تو بڑی بوریت ہو رہی ہے۔“

”مجبوراً اگر امی قدر حضرات کی طرف متوجہ ہو نا پڑا۔“

درگا پر شاد جی فرما رہے تھے۔

”بڑی پریشانی ہے سیٹھ بھائی۔ گورنمنٹ کے پاس کافی روپیہ نہیں۔ بے وقوف لوگ اعتراض تو کر رہے ہیں کہ گورنمنٹ شراب کی دکانیں کھلاو اسے چلی جا رہی ہے۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ مزید آمدنی کے بغیر ملک کیسے آگے بڑھے گا۔ بے روزگاروں کو روزگار کیسے ملے گا۔ دفاعی اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔“

”جی بے شک“ مولوی ہدایت علی نے نہ بان کیا تھا سرادر ہاتھوں کو بھی زوردار تائیدی جنبش دی ”اخلاقیات لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ ملک ترقی نہیں کرے گا تو اخلاقیات کا کیا اچار ڈلے گا۔“

منزل پر پہنچے جاؤ۔ شام کو ہم تھیں درگاہ پر شاد جی سے تنہائی میں ملوادیں گے۔

خترمہ زیا غوثیہ پہلے ہی کمرے سے باہر جا چکی تھیں گھاڑی کے قریب پہنچکر وہ اگلی گھاڑی کی طرف بڑھیں۔
”ٹھہرے خترمہ۔ آپ پھلی سیٹ پر بیٹھیں گی۔“
میں نے چھٹ کر قریب پہنچے ہڑے کہا۔

”مجھ دماغ تو خراب نہیں ہوا ہے۔ میرا جہاں جی چاہے بیٹھوں تم حکم چلانے والے کون۔“
”بس تو ڈرائیونگ سیٹ پر اجلاس فرمائیں۔ اچھے بیٹھ جائے گا۔“

”مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔“
”بس تو یقین کیجئے میں گھاڑی کسی عمارت کی تیسری منزل پر چڑھادوں گا۔“

”تھیں کچھ عقل بھی ہے۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ پھلی سیٹ پر بیٹھنے والے مالک کہلاتے ہیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے والا ملازم۔“

”کوئی حرج نہیں۔ آپ جیسی شاندار خاتون کا ملازم ہونا بھی کچھ کم فخر کی بات نہیں۔“

”مجھ بھی کہیں تو آگے ہی بیٹھوں گی۔ تم برابر میری توہین کئے چلے جا رہے ہو۔“

میں نے طویل سانس لیکر تھپاڑا لے پھر انجن کھولا وہ مذاق اڑانے کے انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے خترمہ۔ آپ کے شوہر نے آپ کا کتنا خوبصورت نام بگاڑ دیا۔ بھلا نہ وہی بھی کوئی نام ہوا۔“
”اے خترمہ۔ تھیں تو ہمارا چھی چیز بری ہی لگتی ہے۔“

لغنت ہے تمہارے ذوق پر۔

”آپ ذرا سا ادھر کو سرک جائیں۔ مجھے ذہن دست چھینک آنے والی ہے۔“ میں نے تھنے سیکڑے۔

”ارے ارے۔“ انھوں نے جھٹ سے رد مال میری طرف بڑھایا۔ ”خدا تمہاری جھینگوں کو غارت کر دے۔“
بھلا اینڈ ڈھلا کمپنی کے آفس پر گھاڑی روک کر

پونٹ دبا کر منتنا نا ہی بڑا۔ انھوں نے گردن نیچی کئے گئے گوشہ چشم سے مجھے غصہ کی بشارت دی۔

”خترمہ کچھ مجھے بھی سنو یہ کیو اس۔“
”کان تو غالباً آپ کے بھی ہیں۔“

”میں ایک نئی کہانی کا پلاٹ سوچ رہی ہوں۔ تمہارے ہی جیسا پانچل قسم کا ہیروز میرے ذہن میں گھوم رہا ہے۔ مگر اس میں آرٹسٹ سب سے ضرور ہو گا۔ تم نے آرٹسٹ ہو۔“

”شکریہ۔ اور ہیروز کس ٹائپ کی ہو گی۔ میرا خیال ہے اگر آپ خود ہی اس میں ہیروز بن جائیں تو قارئین بالکلن پانچل کتوں کی طرح بھونکنے لگیں گے۔“

”سور کہیں کے اچھا یہاں سے چھٹکارا ملنے دو چھہہہ دیکھیں گی تھیں۔“

”میرا خیال ہے ڈیر زوئی تم واپس جاؤ۔“ دفعتاً سیٹھ صاحب نے گردن موڑ کر فرمایا۔ ”اور تم بھی میاں ملو۔ یہ لو چاہی۔“

انھوں نے گھاڑی کی چابی میری گود میں پھینکی۔
”مگر دیکھو۔ بھلا اینڈ ڈھلا کمپنی کے آفس ہوتے ہوئے

جانا۔ وہاں سیٹھ منوہرجی ملیں گے۔ ان کا فون کل سے خراب پڑا ہے۔ کہنا فوراً ڈاک بنگلے آجائیں۔“

مجھے کچھ متامل سا پاکر سیٹھ صاحب نے گھورا اور غرائے۔
”کیا بات ہے؟“

”اوہ۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔ دراصل آپ سے ایک بات عرض کرنی تھی۔“

”تو کر دے گا۔“
”پلیز۔۔۔ ادھر ایک منٹ۔“

وہ متحیر ہو کر اٹھے اور میرے قریب آئے۔
”یہ نیاز مندی بھی حکومت کی خیر خواہی میں درگاہ پر شاد

جی کے آگے ایک اسکیم پیش کرنا چاہتا ہے۔“ میں نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ کوئی اور نہ سنے۔

”اوہو۔۔۔ تو ہم تھیں اس کا موقع ضرور دلائیں گے۔ مگر اس وقت نہیں۔ بڑے اہم معاملات ابھی طے کرنے ہیں تم

تم دیگر معاملات میں بڑے کامیاں ہو مگر بنڈس کی بجھ بھی نہیں جانتے۔“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مولوی ہدایت جمعیۃ المصلحین کے مہیا بنڈس میں صرف چار سو روپے ماہوار کے ملازم ہیں۔ باپ دادا نے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی۔ پھر یہ لاکھوں کی باتیں کیسے کر لیتے ہیں۔“

”سب تمھاری طرح اپنے دشمن نہیں ہوتے۔ جمعیۃ المصلحین نے انگریزی اخبار کے لئے جو جنہ جمع کیا تھا لاکھوں سے کم نہیں تھا پھر کیا جمعیۃ کے ذمہ دار اراکین کو یہ حق بھی نہیں پہنچا کہ اس رقم کو ملک و قوم کی ترقی میں لگائیں اور دوسکھار بنائیں۔“

”ملک تو تم آپ کس چیز یا کو کہتے ہیں۔“

”لے لے گے۔ انسان تو خیال کر لیا کہ میں تجھ سے کتنا بڑا ہوں۔“ انھوں نے منہ کر کہا۔

”پیران کلیئر شریف والی کہانی تو یاد ہو گئی آپکو۔ کیا آپ نے وہاں خیال فرمایا تھا کہ یہ حقیر پر تقصیر آپ سے کتنا چھوٹا ہے۔“

”جُب“ انھوں نے ہونٹوں پر ہلکی رکھی ”زودی کے کانوں میں بھنک نبی پڑ گئی تو دماغ چاٹ جائے گی۔“

”وہ تو شاید گھر میں ہیں نہیں۔“

”ہے کیوں نہیں۔ اپنے کمرے میں ہے۔ کہہ رہی تھی میں ملا سے ناراض ہوں۔“

”اُخوا کچھ بتایا آپ کو کیوں۔“

”کہہ رہی تھی میری ہر بات ٹھکرا دیتا ہے میرے سامنے چھینکیں لیتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے انھوں نے زور کا قہقہہ اڑایا۔ مگر اگلے منٹ سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگے۔

”میاں کیا واقعی کوئی اسکیم ہے؟“

”جی ہاں آپ کی دعا سے۔“

”تو اب منھ سے پھوٹو۔“

”میرا خیال ہے عربی میں عرض کروں۔ اردو بچاری

ایسے مضامین عالیہ کو شاید ہی برداشت کر سکے۔“

”بجو اس رہنے دو۔ حکومت واقعی آج کل آخرت کے باعث بے حد پریشان ہے۔ کوئی بھی منافع بخش اسکیم وہ دل و جان سے قبول کرے گی۔“

”مجھے حیرت ہے گا نہ ہی جی کی تعلیمات کائنات نکالنے والوں کے ذہن میں خود ہی یہ اسکیم اب تک کیوں نہ آئی۔ شراب اور عورت تو قافیہ ردیف ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ انھوں نے آنکھیں نکالیں۔

”کچھ دن پہلے بڑے شہروں میں اچھے خالصے بازار ہو ا کرتے تھے۔ اب بھی ناپید تو نہیں ہوئے لیکن عنوان بدل گیا ہے۔ سوال یہ ہے ہمارے گورنمنٹ نے اس معاملہ میں وہی طرز فکر کیوں نہ اختیار کیا جو شراب کے معاملہ میں کیا ہے۔“

”بازاروں سے تمھاری مراد۔۔۔۔۔۔“

”بس آگے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ مراد تو آپ سمجھ ہی گئے۔ اندازہ کیجئے خواہ خواہ کے امتناعی قوانین بنانے کے عوض اگر گورنمنٹ اسے بھی ایک نفع بخش کاروبار کی حیثیت سے نیشنلائز کر لیتی اور منظم طور پر چلاتی تو کتنا فائدہ ہوتا۔“

سیدھا جھپتی ہوئی نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھے جا رہے تھے۔ ہونٹوں پر ہلکا سا ہنس بھی تھا۔ میں نے فقرہ پورا کیا تو بسم کو کچھ اور نکھارتے ہوئے بولے۔

”بہت ہی سیور ہو۔ اچھا ہوا درگا پر شاد جی چلے گئے در نہ یہی سور پن تم ان کے آگے بھی پھیلاتے۔“

”میں سنجیدہ ہوں قبلہ حضور۔ آپ حساب پھیلا کر تو دیکھتے۔ ملک میں لاکھوں عورتیں ہیں جو اپنے طور پر یاد دلاؤں اور لکھنٹوں کے ذریعہ یہ بنڈس چلا رہی ہیں۔ کتنی ہی فریمیں اور اسٹیٹیوٹس ہیں جن کا اصلی کاروبار یہی ہے۔ پردے کے لئے انھوں نے کسی دوسرے بنڈس کا پورڈ آؤیزاں کر رکھا ہے۔ بڑے شہروں کے ہوٹل، پارک، کلب گھر، آرٹ گیلریاں، بال روم اور گیٹ ہاؤس

سے شراب پخڑنے میں جتنا وقت لگا ہے اس سے کہیں زیادہ وقت جس پخڑنے میں لگے گا۔ ورنہ عوام کتے کی طرح بھونکنے لگیں گے۔“

ذہنًا بجلی بھاگی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اسی وقت کچھ دھماچو کڑی سی ہوئی اور دیوار سے کوئی چوکٹا فرش پر گر ا۔ آئینہ ٹوٹنے کی چھٹا کے دار اور تار یک کرے میں پھیل گئی۔

”ارے اوشتہ۔ فقرے۔ مردود کہاں مر گئے۔“ سیدھ حلق کے بل چیخے۔

”آیا حضور۔ دیالستانی نہیں مل رہی ہے۔ ابھی آیا۔“

”بڑے اعذا ہے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں غوغا ہے ”جب دیکھو غائب۔ جب دیکھو غائب۔“

”اب ہم تبرکے مرے لوٹ رہے ہیں۔ سوچئے قبلہ اتنا ہی گھپ اندھیرا بلکہ اس سے بھی کچھ کھاڑا اور تہہ بر تہہ ہماری قبر پر تھپ۔“

”بکو اس بندہ کرو۔ میرا خیال ہے گاندھی جی والا فریم گر ہے۔ اس طرف وہی تھا۔ یہ ایک بلی حرام زادی اکثر یہاں آنے لگی ہے وہی کودی ہوگی۔“

”پروانہ کیجئے۔ صرفہ شیشہ ٹوٹا ہو گا۔ گاندھی جی امر ہیں۔ ان کی تصویر پر ہزار بار نئے شیشے اور سریرم چڑھائے جاسکتے ہیں۔“

”خبیث انڑیاں۔ اندھیرے میں تو زبان کو لگام دے لو۔ کس قدر کھٹن خموس ہوتی ہے۔“

”یہ اندھیرا مانی ڈیر قبلہ لالین اور قمقے سے دور ہونے والا نہیں۔ ہم اندھیروں کے ایک ناپید کنارہ سمندر میں۔۔۔۔۔“

”بس۔ اب ایک لفظ نہیں۔ ابے او خبیث

شد و اب تک ماتیں نہیں ملی کیا۔“ وہ پھر نیچے۔ اسی وقت باہر سے محترمہ زبیا کی بھی آواز آئی۔ ”اری او خورشیدن کہ صر جلی گئی۔ جان مصیبت میں لگتی ہے۔“

اس منافع بخش بذنس کی منڈیاں ہیں۔ اتنا عوامی تو انیسویں سے زیادہ کچھ نہیں کرتے کہ درمیان میں کچھ اور لوگوں کو ہاتھ نہ گننے کے مواقع فراہم کر دیں۔ میں سمجھتا ہوں گورنمنٹ کو اس کے لئے کوئی نیا حکمت بھی قائم نہیں کرنا پڑے گا۔ اب کاری کا زرخیز محکمہ پہلے ہی سے موجود ہے اسی میں ایک نئے شعبے کا اضافہ کر دیا جائے دیپارٹمنٹ آف کامو پولیشن آرٹ۔ بلکہ دو نام رکھے جائیں۔ ایک تو یہی۔ یہ ان لوگوں کے لئے باعث کشش ہو گا جن کے ہندوستانی جسموں میں تناسخ کے گھیلے کی بنا پر انگریزی روح داخل ہوئی ہے۔ دوسرا ان ناری نویدن و شال کا رالیہ۔ اس سے ان نیک بختوں کو فیض پہنچے گا جو۔“

”سارے مقرر۔ دم لے کر۔“ انھوں نے ہاتھ ٹھاکر بچے خاموش کیا۔ ویسے ان کی آنکھوں میں ایک بے بے خوش کی علامتیں صاف نظر آرہی تھیں۔

”تم اس خوش فہمی میں ہو کہ یہ اسکیم پہلی بار تھارے ہی ذہن میں آئی ہے۔ تم غلطی پر ہو عجزم۔ ذمہ دار حلقوں میں پہلے ہی کئی بار اس سلسلے میں غور و فکر ہو چکا ہے ہمارے ایک بڑے قومی مفکر کی یہی رائے ہے کہ برائیوٹ سیکٹر کے اس بذنس کو مزید ڈھیل نہ دی جائے خود حکومت اسے اپنے طور پر منظم کرے۔“ وہ ایک لحظہ کے پھر اڑے کو جھک کر بولے۔ ”مشکل یہ ہے ابھی تک کوئی ایسا نقشہ نہیں بن سکا ہے جسے بہ آسانی رد و بدل لایا جاسکے۔ ٹیکنیکل اور انتظامی دشواریوں کے علاوہ عوام کے بھڑک جانے کا اندیشہ بھی سدراہ بنا ہوا ہے۔“

”عوام کی ایسی میسی۔ بات کرتے ہیں آپ۔ عوام گھی کی جگہ گریں اور جینی کا ملو بہ پندرہ روپے کل خرید رہے ہیں۔ دھنیے کی جگہ گھوڑے کی لید کھا رہے ہیں۔ وہ کیا کر لیں گے حکومت کا۔“

”تم نہیں سمجھو گے۔ وٹ تو بہر حال عوام ہی سے لینا ہے شراب کے معاملہ میں ان کے احساسات نے نازک نہیں جتنے جس کے معاملے میں ہیں۔ گاندھی جی کی خلافتی

فون کر دوں گا۔“

سیٹھ چلے گئے تو میں نے محترمہ سے کہا۔

”تو جناب پیشنگ کا بھی شوق فرمالتی ہیں!“

”مجھ سے بات مت کرو۔ تم جیسے دہقانوں کو منہ

لگانا میری توہین ہے۔“

”میں نے منہ لگانے کی فرمائش نہیں کی۔ آپ صرف

زبان بلائیے۔“

”بولے جاؤ میں سن ہی نہیں رہی ہوں تمہیں اب تک

میں نے اپنی کوئی پیشنگ اسی لئے نہیں دکھائی کہ خدا جانے

کیا ایک دو گے۔ بند کر دیا جانے اور کافر اچھے اسکول

میں ایک تصویر پر اندام ملا تھا۔“

”کیسے مان لیا جائے۔ کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس۔“

”کیا“ انھوں نے جتنے کے انداز میں کہا اور آنکھیں

نکالیں۔ ”تم مجھے جھٹلانے کی ہمت کیسے کر سکتے ہو۔“

”جب کوئی جھوٹ بولے گا تو جھٹلایا ہی جائیگا۔

کیڑے کھڑوں کو پیشنگ نہیں کہتے۔ اچھی تصویر بنانے

میں خون جگر بلکہ خونِ دل وغیرہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔“

”خدا تمہیں غارت کر دے۔ تم کیا جانو آرٹ کسے

کہتے ہیں۔“

سیٹھ ٹیراٹسین کا طوب اٹھالائے مگر موڈ بگڑا ہوا

”جانے کیا کیا لڑھک گیا کلاس پر سے۔ کل ہی جرنلٹر

کا انتظام کروں گا۔“

انجلی زیادہ نہیں کٹی تھی سیٹھ طوب استعمال کرتے

ہوئے بولے۔ ”ڈارلنگ تمہارے قیمتی خون کا ایک ایک

قطرہ میرے سے زیادہ قیمتی ہے۔ مجھے اپنی روح میں زخم کا

احساس ہو رہا ہے۔“

”یہ تو چند قطرے نکلیں“ محترمہ نے ناخوش گوار

لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ کے ملا آج ہی آج میں میرا نہ جانے کتنا

خون حلا چکے ہیں۔ خدا انھیں غارت نہ کرے دل تو نے میں

انھیں بڑا لطف آتا ہے۔“

”آپ غضب کر رہی ہیں جناب۔ ابھی چند منٹ

آخر کار شد و جلتا ہوا لیمپ ہی آیا یہ الگ بات

ہے کہ اس کا شعلہ چمک چمک کر رہا ہو۔ ساتھ ہی محترمہ

بھی داخل ہوئیں۔ انھوں نے دانے ہاتھ کی انگلیوں سے

بانیں ہاتھ کی انگشت شہادت پکڑ رکھی تھی اور قریب آنے

پر سیٹھ اور ملا دونوں ہی کو اچھلنا پڑا کیونکہ انجلی کے سرے

پر خون نظر آ رہا تھا۔

”ارے ارے یہ کیا ہوا۔“ سیٹھ بولے۔

”بلڈ سے کٹ گئی۔ میں ایڑی پر جھپٹنے کیلئے

کاغذ کا سائز کاٹ رہی تھی اکدم بجلی جو بھاگی بلینڈنگ

پر چل گیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ باس دان کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”اب مجھے اپنا ہی جرنلٹر لگانا ہو گا۔“ سیٹھ جرنلٹر

لہجے میں بولے ”روز روز کا عذاب۔ ارے تو انوکھے چٹھے

کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔“ انھوں نے دکانی طرف رخ کیا ٹیوب

کو میز پر رکھ کر کسی دوسرے حکم کا منتظر تھا۔ ”میرے بڑے دم

میں کانس پر طاسچ رکھی ہے۔ اسے جلا کر الماری سے

ٹیراٹسین کا ٹیوب اٹھا لیا۔“

”سرکار اندھیرے میں طاسچ بھی ملتی مشکل ہے۔

وہاں بہت سی بوتلیں بھی رکھی رہتی ہیں ٹکڑے میں پتا نہیں

کیا کیا ٹکڑے۔“

”لائٹیں کیوں نہیں جلائی چھ لائٹیں ہیں اور تو

یہ بھٹکتا ہوا لیمپ اٹھا کے لایا ہے۔“

”حصہ! چھ کی چھ خراب ہو رہی ہیں۔“

”ہائیں۔ اے دو تو ابھی پچھلے ہی پہنچے آئی تھیں۔“

”وہ تو سرکار بھی سے خراب نکلیں۔ جلتے ہی

بھڑکنے لگتی ہیں۔“

”تم سب سو رکے بچے حرام کی کھاتے ہو۔ لو بتاؤ

نئی لائٹیں اس سے نہیں جلتیں۔ یہ فقیر کہاں مر گیا۔“

”مصور ہرنے تو اسے تھوڑی دیر ہوئی بھیجا تھا۔“

”اوہ۔ اچھا ایک بک بند کر دو۔“ زوئی

ڈارلنگ میں خود اٹھا کے لاتا ہوں ٹیراٹسین۔ وہ فوری

طور پر کافی سکون دے گی۔ پھر بجلی آجائے تو ڈاکٹر کو

”میں جانتا ہوں — وہ ایک خوبصورت چارہ ہے جسے آپ بڑی پھلیوں کے لئے استعمال کرنا جانتے ہیں — بُرا مت مانتے گا۔ میں نے گاندھیائی فلسفہ کا مطالعہ آپ کی اور درگا پرت ادجی کی عینک سے نہیں کیا۔ آخر کتنی دولت آپ کو اور مطلوب ہے۔“

”اے گدھے۔ مجھ پر مولویت کا رعب مت جماؤ میں سیٹھ نعلانی کو ہر قیمت پر شکست دینا چاہتا ہوں۔ ان کا بینک بیلنس تین کروڑ ہے اور میری الحال دو کروڑ۔ ان کی چھ فیکٹریاں ہیں اور میری پانچ۔ میں ہر قیمت پر ان سے آگے بڑھوں گا۔“

”بس تو بڑھتے رہتے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”یقیناً کر سکتے ہو۔ زوہبی کو ہینڈل کرو۔ اسے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں مجھے ڈر ہے کوئی بھی چالاک جو ان سے مجھ سے چھین سکتا ہے۔ تم میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ تم اسے بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔“

”خوب۔ مگر یہاں قبلہ! مجھے فرشتہ آپ نے کیسے سمجھ لیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ہی اسے آپ چھین لے جاؤں۔“

”ناممکن“ انھوں نے پوری سنجیدگی سے کہا ”میں تمہیں آزا چکا ہوں۔ میرے انداز سے بہت کم غلط ہوتے ہیں۔ اور ویسے بھی مانی ڈیر تم شادی شدہ ہو۔ تم اسے چھین کر کہاں لے جاؤ گے۔“

”بڑا غلط موضوع چھیڑ دیا ہے آپ نے۔ نہیں مجسم۔ میں یہ خدمت انجام نہ دے سکوں گا۔ میں اتنا فرشتہ نہیں ہوں جتنا آپ نے سمجھا ہے۔“

”کیا واقعی؟“ انھوں نے عین نظروں سے مجھے گھورا۔

”جی بالکل واقعی“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”آپ کی زوہبی بہت حسین ہے۔ بہت معصوم ہے۔ آپ ایک اعلیٰ درجے کے شہکار کو بر باد کر کے اچھا نہیں کریں گے۔“

”کیا کہتے ہو۔ میں اتنا کمینہ تو نہیں ہوں جتنا تم

پہلے اپنے اس کے برعکس دعادی تھی۔ خدا غارت کرے اور خدا غارت نہ بھی کرے، کیا بات ہوئی۔“

”دیکھا۔ دیکھا آپ نے“ وہ چپنائیں روکے خطاب سیٹھ کی طرف تھا ”اس طرح میرا خون پھونکتے ہیں۔“

”بڑے واہیات ہو تم میاں ملا۔“ سیٹھ نے تیوی چڑھا کر فرمایا ”دلدار ہی بھی کوئی چیز ہے۔ تم ان کے ساتھ شائینگ کو نہیں گئے۔ اسے گھر بھی نہیں لے گئے حالانکہ انھوں نے تم سے فرمائش کی تھی۔ یہ کہاں کا اخلاق ہے۔“

اسی وقت مقلعے جل اٹھے۔ سیٹھ کا خیال درست نکلا حکماء بھی جی کی تصویر والا چوکشا ہی فرش پر پڑا تھا اور آئینہ کسی عاشق نامراد کے قلبِ مجبور کی طرح چمکنا چور ہو گیا تھا۔ نوکر نے بڑھکر اسے سمیٹا۔

”میں تمہاری ایک تصویر بناؤں گی جس میں دو سینگ اور ایک دم ضرور لگاؤں گی۔“ مختصر مہرے ایک انگلی کو ہوا میں حرکت دیتے ہوئے مجھے گھورا۔ سیٹھ منے۔

”بالکل بنانا۔ ہو سکے تو دو دمیں لگانا۔“ سیٹھ نے گرہ لگائی۔

وہ چلی گئیں۔ نوکر بھی گیا۔ اب ٹھننے فرمایا۔

”تم صاحب زادے بعض معاملات میں تو افلاطون کے کان کاٹتے ہو مگر بعض معاملات میں بالکل ہی بدھوتابن ہوتے ہو۔ کیا تم واقعی میرے ہمدرہ نہیں ہو؟“ ان کا لہجہ متین تھا۔

”تشریح چاہوں گا!“ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا

”میری اور اس کی عمر کا تفاوت بالکل ظاہر ہے۔“

ناممکن ہے کہ میری ذات اس کے جمالیاتی جذبات کا واحد مرکز بن جائے۔ عمر کا طبعی تقاضا اسے ادھر ادھر بھٹکا جائے وہ بہت بھولی ہے مگر بھول پن ضرور رساں بھی ہو سکتا ہے۔

”سمجھ رہے ہو نہ؟“

”مگر آپ اسے درگا پرت شادی سے متعارف کرانے کیوں لے گئے تھے؟“

”سیاستہ۔ تم ابھی طرح جانتے ہو کہ۔“

ایک ہزار روپے ہینہ ملے گا۔ یہ تو کسب حلال ہوا نا؟
 ”ٹیبو ٹرٹاپ کو سو روپے ہینہ پر بھی مل سکتا ہے۔“
 ”مگر تم نہیں آمادہ ہو گئے“ وہ جھٹلائے۔
 ”میرا موڈ اس وقت خراب ہو گیا ہے۔ پھر کسی
 وقت گفتگو کریں گے اب اجازت چاہوں گا۔“
 پھس میں اٹھ ہی گیا تھا۔

کہانی نمبر

دینی و علمی موضوعات پر تجلی کے بیشتر خاص نمبر آپ
 دیکھ چکے۔ نہ جانے کتنے شائقین کا بریتہ تقاضا ہے کہ ایک نمبر
 ”مسجد سے بچانے تک“ کا بھی ہونا چاہیے۔ یہ کالم تجلی جیسے چرچے
 کے معیار و مزاج سے مطابقت اگرچہ نہیں رکھتا لیکن یہی کالم
 ہے جس نے ہزاروں ایسے افراد کو تجلی سے وابستہ کیلئے جو عام
 حالات میں کسی مذہبی و علمی جریبے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔
 وابستگی کے بعد یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ان کی نظروں سے کالموں
 پر نہ پڑے۔ چنانچہ دوسرے کالموں کے مطالعے نے انھیں یہ
 احساس دلایا کہ دینی و علمی مضامین بھی پڑھنے کی چیز ہیں اور
 کچھ نہ کچھ توجہ آخرت کی طرف بھی رکھنی ہی چاہیے۔

اب ایسے ہی حضرات کی مسلسل فرمائش پر ”کہانی نمبر“
 نکالا جا رہا ہے۔ یہ نمبر ہیئت کے اعتبار سے پورا ناول ہی ہو گا۔
 مگر مقصد و معنی کے لحاظ سے مرقعہ عبرت۔ اس میں کردار نگاری
 کے ذریعہ یہ تصحیح کی جائے گی کہ اصل تصوف کیا ہے اور نقل کیا۔
 ملا کی تعریف یا تنقیص میں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف یہ توقع
 ظاہر کر سکیں گے کہ یہ ناول ”مقصدی ادب میں ایک منفرد
 اضافہ ہو گا اور پڑے سے بڑا خشک مزاج بھی اس دو صفحے
 پڑھ کر آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

مزید تفصیل اور تاریخ اشاعت کا انتظار کیجئے۔

مذبحہ تجلی - دیوبند - یو پی

کہتے ہو۔ لاجل ولا توة۔“

”کیا لاجل ولا توة۔“

”بات سمجھو۔ اب مثلاً درگاہ پر شاد جی نے دیکھ
 لیا کہ سید عنايت ایک جوان حسین بیوی کا شوہر ہے
 وہ اب سید کو زیادہ زیادہ ممنون احسان بنانے کی کوشش
 کریں گے۔ کیا سمجھو!“

”اور پھر احسانات کی قیمت بھی آپسے چاہیں گے۔“
 ”یہ کوئی کھلا سود اتو نہ ہو گا کہ وہ زبان سے کوئی
 مطالبہ کر سکیں۔ مجھ سے کبھی کبھار ان کی آتش شوق کو
 شعلہ زن رکھنے کے لئے زو بی سمیت ان کی خدمت
 میں جانا ہو گا۔ اکیلے وہی کیا۔ بدش میں نہ جانے کتنوں
 کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میں نے اب تک تو کوئی پتھر
 انیاد دیکھا نہیں جس میں حسن کی چونک نہ لگتی ہو۔“
 ”اس مقصد کو آپ بغیر شادی کے بھی پورا کر سکتے
 تھے۔ چارے کی بازار میں کیا کمی ہے۔“

”تم نہیں سمجھتے۔ یہ لائن تمھاری ہی نہیں پھر
 کیا سمجھو گے۔ چھوڑو۔ اچھا سنو تمھیں ایک دولائسنس
 دلوائے دیتا ہوں۔ کم سے کم ایک گاڑی تو خرید ہی لو۔
 پیرل پھرتے ہو۔“

”میرا معدہ خراب نہیں ہو تا کیونکہ ٹانگوں کی
 حرکت اسے تعاون دیتی ہے۔ آپ بات ٹلا گئے۔
 میں کہتا ہوں نقطہ نظر بدلئے۔ جتنی دولت آپ کے پاس ہے
 یہی آپ زندگی بھر استعمال نہ ہو سکے گی۔ زو بی بڑی پیاری
 بیوی ہے۔ نعمت کی قدر کیجئے۔“

”تم دولت کی پیاس کو نہیں جانتے۔ مولوی
 ہدایت علی کبھی آخر تمھاری ہی طرح مولوی ہیں وہ تو ایسا
 دقیا نو سی ذہن نہیں رکھتے۔“

”وہ اور آپ شاید آپ حیات پی گئے ہیں۔ مجھے
 تو مرنا ہے۔“

”جلد چھوڑو۔ ایک اور طریقہ بتاتا ہوں۔ زو بی
 کو فارسی عربی پڑھاؤ۔ شاعری سکھاؤ۔ انشا پر از بساؤ

لڑکے پسند مسلمان کسے کہتے ہیں؟

سوویت سرکاری نظریہ کے مطابق کوئی مسلمان ترقی پسند تب ہی کہلا سکتا ہے۔ اگر وہ خدا پر ایمان سے مکمل طور پر دست کش ہو جائے۔ اپنے تہذیبی ورثے کو مکمل طور پر خیر باد کہہ دے اور اپنا اسلامی نام تک ترک کر دے۔

سوویت حکام اس معاملے میں کسی قسم کی نرمی برتنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر کوئی مسلمان مولوی مسلمانوں کے سامنے ایسی احمقانہ باتیں کہنے کو تیار ہو جائے کہ ”اسلام کے جو چالیس احکام ہیں ان میں ایک ایسا سوال حکم بھی ہونا چاہئے۔ روسی زبان پر عبور حاصل کرنا، تو بھی وہ سوویت حکام کی نظریں غیر مشتبہ نہیں گھبراتا۔ کیونکہ ایسی باتیں کہتے وقت فحشی و اسلامی احکام ہی کا حوالہ دیتا ہے۔ اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ ”ہر چیز کا فیصلہ خدا ہی کرتا ہے۔“

اس سرکاری سوویت نظریہ کا ظہار ایک سے زائد بار ہوا ہے۔ لیکن اس کا غیر مبہم ترین اظہار سوویت ماہر نظریہ ایف اشیرود کے ایک مضمون میں ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے ”اسلام اور قومی روابط“ یہ مضمون سوویت جریدے ”سائنس اور مذہب“ کے ۱۹۷۶ء کے دسویں شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

مضمون کا مطالعہ کرتے وقت آدمی یہ محسوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ سوویت نقطہ نگاہ اور اس نکتہ چینی میں ہندوستانی مسلمانوں کے رویہ کے خلاف ہندوستانی کمیونسٹوں اور ان کے ہمسفروں یعنی سیکولرازم کے خالی حاسیوں کی نظر سے ہوتی رہتی ہے۔ کافی مشابہت ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوستانی کمیونسٹ اور ان کے ہمسفر کیونکہ محروم اقتدار ہیں، اس لئے وہ اپنی بات روسیوں کی طرف کھل کر نہیں کہہ سکتے۔ عبدالغنی

کیونکہ اس میں انہیں اپنے مذہب کے لئے خطرہ نظر آتا تھا۔ مسلمان مولویوں کا یہ خیال بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ کیونکہ مغربی یورپ میں قومی ریاستوں کی تشکیل سے مذہب کی بنیادوں کو ضعف ہی پہنچا تھا۔

ہمارے ملک کی وہ قومیں جو ایسے علاقوں میں رہتی تھیں۔ جہاں اسلام کا دور دورہ تھا وہاں قومی ریاستوں کی تشکیل سوشلسٹ انقلاب کے فوراً ہی بعد شروع ہوئی ان قوموں کے نام ہیں۔ قازق، تازک، ترکمان، کرغز، باشکیر اور چیمین وغیرہ۔ یہاں جن ریاستوں کی تشکیل ہوئی وہ نئی قسم کی ریاستیں تھیں۔ سوشلسٹ ریاستیں جو سرمایہ دارانہ قسم کی ریاستوں سے مختلف تھیں یہی وجہ ہے کہ یہاں

جب سرمایہ دارانہ نظام کا ظہور ہوا تو سماجی شیرازہ ہندی کی ایک نئی شکل اُبھر کر سماجی شیرازہ ہندی کی یہ نئی شکل قومی۔ قومی اقتصادیات اور قومی تہذیب کو فروغ دینے کے لئے قومی وحدت اور قومی احساس کو تقویت دینا ضروری ہو گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں قومی ریاستیں وجود میں بھی آئیں اور ان کا استحکام بھی ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اس عمل کی طے شدہ اسلام کا رویہ کیا تھا۔ جس نے جاگیر داری اور قبیل از جاگیر داری دور میں جن لیاہ مسلم تنظیموں اور مسلمان مولویوں کا یہ خیال تھا کہ قوموں کا وجود ملے آنا اور قومی انداز کی نشوونما اسلام کے اصولوں اور اسلامی اقتدار کے لئے خطرہ ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے قومی احکام اور ان کی قومی ریاستوں کی تشکیل کی مخالفت کی

کے باشندہ کو سیکر رزم کی راہ پر گامزن کرنے میں کافی مشکلات پیش آئیں۔

مسلمانوں کی مذہبی تنظیموں اور مولویوں نے مشرق کے عوام کی سماجی یا قومی نجات کی سرگرم مخالفت کی انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ عوام میں قومیت کو فروغ ہو۔ مسلمانوں کی مذہبی تنظیمیں اور مولوی یہ دوسرے دیتے تھے کہ قومی یا طبقاتی وحدت اسلامی وحدت کی ضد ہے۔

یہ تصور کہ مسلمان قومیں مذہبی طور پر ایک اکائی ہیں خود قرآن میں موجود ہے۔ اس دینی وحدت کو مسلمان من اللہ سمجھتے ہیں۔ لہذا یہ وحدت دوائی ہے۔ اور اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک قومی وحدت کا تعلق ہے۔ اسلام انھیں دوسری انسانی تخلیقوں کی طرح ہی سمجھتا ہے جو بامعاذ ہیں۔ اس کی تائید پان اسلام ازم کے مبلغ تھانی منظر کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے: جہاں تک موجودہ دور کی ایک اصطلاح قومیت کا تعلق ہے اسلام کی تعلیمات میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق مذہب اور قومیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اسلام کی تعلیمات صرف ایک ملت کو تسلیم کرتی ہیں جو ہیں الا قوامی اسلامی ملت ہے۔

موجودہ دور میں جہاں کہیں بھی مذہبی وحدت کے تصور کا قومی یا طبقاتی وحدت کے غل سے تصادم ہوا ہے۔ وہاں لامحالہ جیت آفرانہ کر کی ہی جاتی ہے اس کا ایک ثبوت سودیت یونین میں سودیت قوموں کی تشکیل ہے جو اسلامی تنظیموں کی مخالفت کے باوجود کامیاب رہی۔ اس کا ایک اور ثبوت مشرقی پاکستان کی قومی آزادی کی تحریک کی کامیابی ہے جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش کی ریپبلک قائم ہوئی۔

اس وقت جب کیونسٹ اور سودیت یونین کے محنت کش سودیت ریپبلکوں کو ایک واحد سوشلسٹ ریاست کی شکل دینے میں مصروف تھے جو ان کے نزدیک سوشلزم کی تعبیر اور ملک کی تمام قومی تہذیبوں کی ترقی اور ملک کے اقتصادی نظام کے نشرو نما کے لئے ضروری تھا۔ مسلم مذہبی تنظیموں اور مولویوں نے اسی عمل کی زبردست مخالفت کی۔ ایسا کرتے وقت وہ

بین الاقوامی سامراج کے حلیف بن گئے۔ جو ہر طریقے سے سودیت یونین کے قیام کو روکنا چاہتا تھا۔ وسطی ایشیاء کا کشمیر اور وہنگا میں انہوں نے مسلمانوں سے یہ نہیں کہا کہ وہ روسیوں کو کریں اور بیلوروسی کے مزدوروں کے ساتھ تعاون کریں۔ بلکہ انھیں یہ سبق دیا کہ وہ ترکی کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا ساتھ دیں۔ ان کے ایک ناخاندے مصطفیٰ جو جو کا کہنا تھا کہ ہم سب مسلمان خواہ وہ کون ہو خواہ باشکی خواہ تاتاری ایک واحد ترکی خاندان کے رکن ہیں۔ ہم ایک ترکی قوم ہوں ایک واحد مسلم ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ سودیت مشرقی خطے کے عوام اگر ان لوگوں کی بات مان لیتے جو انہیں پان اسلام ازم یا ترک وحدت کی تلقین کر رہے تھے تو ان کا حال بڑا ہوتا۔ ان کا وہی حال ہوتا جو ان دنوں در اسلامی دنیا کے بہت سے لوگوں کا ہے۔ اسلامی دنیا کی یہ قومیں سامراج کی مکمل طور پر ماتحت بن گئیں اور اقتصادی و تہذیبی طور پر پس ماندہ ہیں۔

پان اسلام ازم اور ترکی وحدت کے جو حامی باہرنگ گئے تھے۔ وہ اب بھی یہ حقیقت ماننے سے انکاری ہیں کہ سودیت یونین کے سابق عوام نے اپنی اپنی ریاستیں قائم کر لی ہیں۔

اسلامی تنظیموں اور مولویوں نے روس کے مشرق میں قومی ریاستوں کی تشکیل اور ان کی مدد دینے کی جو مخالفت کی اور سماجی اور اقتصادی نظام کی بنیادی تہذیبوں کی جو حمایت کی اسکی بنا پر محنت کش مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اسلام کو خیر باد کہنا شروع کر دیا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اسلامی تنظیموں کا رویہ عوام دشمن ہے۔ بعد میں حامیان اسلام نے اپنے رویہ پر نظر ثانی بھی کی۔ لیکن اس کے بعد بھی انہوں نے واقعات کو ایسی شکل میں پیش کرنا شروع کیا جو ان کی حقیقی شکل سے مختلف تھی۔ اب اسلام کے حامی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام قومیت کا حامی ہے۔ اور مشرقی عوام کی قومی تہذیبوں اور ان کی ترقی کی ہر پہلو حمایت کرتا رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکتوبر انقلاب کی کامیابی کے بعد بھی اسلامی تنظیموں اور مولویوں نے مسلمانوں کو تہذیبی طور پر علیحدگی پسندی کا راہ

دیا اور یہ کوشش کی کہ سوویٹ یونین کے مشرقی خطوں کے
کی رسائی یورپ کے ترقی یافتہ ملک تک نہ ہو سکے۔

مسلمان مولویوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں اور
قوم کے غیر مسلم ممبروں میں رابطہ قائم نہ ہو اور اس سلسلے
میں وہ قرآن کے اس قسم کے احکام کا حوالہ دیتے رہے کہ
مومنوں اور منکروں یا کسی اور مذہب یا ملت کے لئے والوں
کے درمیان دوستی اسلام کے منافی ہے قرآن کا حوالہ دیکر
مولویوں نے یہ بھی کہا کہ غیر مسلم قوموں کی زبان سیکھنا بھی
مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ بہر حال اس سوال پر عوام
نے مولویوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ انہیں رفتہ رفتہ
احساس ہو گیا کہ روسی زبان کو سیکھنے سے ان کی ترقی کے
سوانح بہت بڑھ جائیں گے۔ روسی زبان سیکھ کر مشرقی خطوں
کے عوام کے لئے عالمی ترقی کے تاریخی غل اور ایک عالمی
تہذیب میں حصہ دار بننا ایک آسان امر ہو جائے گا۔

عوام کی اس ذہنی تبدیلی نے مسلمان مولویوں کو مجبور
کر دیا کہ وہ اپنے پیرائے لغو کو خیر باد کہہ دیں ان دنوں
وہ اپنے وعظ میں دوسری زبانوں کو سیکھنے کی تلقین کرتے
ہیں اور سب سے زیادہ زور روسی زبان کو سیکھنے پر دیا
جاتا ہے۔ بہت سے مولوی تو مسلمانوں سے یہاں تک کہتے ہیں
کہ اسلام کے جو چالیس احکام ہیں ان میں اب اکتالیسویں
حکم کا اضافہ ہونا چاہیے۔ اور اس حکم کے ذریعہ روسی زبان
کا سیکھنا فرض قرار دینا چاہیے۔

بہت سے مسلمان مولویوں نے ان خطوں میں جہاں
اسلام بہت موثر عقائد صنعتی ترقی کی بھی بہت مخالفت کی۔
کاشت کو تو مشترکہ بنانے کی انہوں نے خاص طور پر مخالفت
کی اور عورتوں کی آزادی میں بھی رخنہ ڈالنے اس آزادی کو
وہ رد کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں سے اس میں تاخیر
ضرور ہوئی۔

اب اسلام کے معتقدوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قوی معائنات
کے محافظ ہیں۔ لیکن تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی
تعلیمات نے صدیوں تک قوموں میں نفاق ہی ڈالا ہے اور قوم

کے مختلف حصوں میں عناد پیدا کیا ہے۔

مسلمان مولوی اپنے وعظوں میں با اوقات کہتے ہیں کہ
ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی زبان سکھا
وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی مادری زبان
کے تحفظ سے یا مسجد کو دیکھ کر یہی ہے یا مولویوں کو۔ اس طرح
وہ یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ قوی روایات
کی پاسبانی صرف مذہبی تنظیمیں ہی کر سکتی ہیں۔ مولویوں
کے اس طریقہ عمل سے اسلام کو ملنے والوں میں اپنے ان ہم
مذہبوں کے خلاف جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے بچوں کو مادری
زبان کے بجائے کسی اور زبان میں تعلیم دیتے ہیں۔ اور آپسی
بات چیت کے لئے بھی اسی زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس
طرح ایک ہی قوم کے مختلف افراد میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔
یہی معاملہ ناموں کا ہے کہ وہ مسلمانوں کو بلو بار یہ
یقین دلاتے رہتے ہیں کہ مسلمان قوم کے ہر فرد کو اپنے بچے کا نام
اسلامی رکھنا چاہیے اس طرح ان مسلمانوں کے لئے حقارت
کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو اپنے بچوں کے روسی نام رکھتے
ہیں۔

کئی معاملوں میں مسلمانوں نے جو اپنے رویے میں تبدیلی
کی ہے۔ اس کے پیش نظر بعض لوگ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ کیا
اسلامی تنظیموں کی سرگرمیاں مختلف قوموں کے روابط کی بہتری
کے لئے اب بھی نظر ہیں؟ آخر انہوں نے اپنے بہت سے پرانے
نقص و عیوب کو خیر باد کہہ دیا ہے اور سائنس ٹیکنالوجی اور آرٹ
کی ترقی کی حمایت شروع کر دی ہے۔ مختلف قوموں کی دوستی کے
بھی اب وہ مخالف نہیں رہے۔ اس قسم کے سوالوں کے جواب
کے لئے چند باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات
یہ ہے کہ مسلمان مولویوں کے رویہ میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ
سوشلسٹ سماج کا نتیجہ ہے۔ سماجی ترقی اور قومی روابط
کے بارے میں مسلمان مولوی جوئی باتیں کہتے ہیں وہ اسلام
کا جزو نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کی ضد میں مولوی اپنے
وعظوں میں جو باتیں کہتے ہیں۔ با اوقات وہ ان سوشلسٹ
نقص و عیوب کا اعادہ ہوتی ہیں۔ جواب ہر سوویٹ شہری کو دل

مولانا مودودی کی کچھ کتابیں

اسلامی تہذیب اور اس کے	۵/۵۰	۱/۲۰	ایک جماعت کی
اصول و مبادی	۱۳۶	۱/۲۵	ہندو دھرم
مسلمانوں کی پہچان	۱۵	۱/۵۰	اسلام کی دعوت اور
کلہ طیبہ کے معنی	۱۵	۱/۵۰	مسلمان کا تہذیب العین
سوچنے کی باتیں	۱۵	۱/۵۰	عالم برزخ
ایمان کی کسوٹی	۱۵	۱/۵۰	دعوت حق
مسلم اور کافروں کا	۱۵	۱/۵۰	خدا کی اطاعت کس لئے؟
اصل مسرت	۲۵	۱/۲۰	جہاد کیا ہے؟
مسلمان کسے کہتے ہیں؟	۲۵	۱/۲۰	امر بالمعروف
تاجری کیوں بے اثر ہو گئیں	۲۵	۱/۲۰	دہی من المنکر

ایک سو روپے کے آرڈر پر

تاجرانہ نمیشن

لکھنے کا پتہ

اسلامی مکتبہ

۲۸/۳۰-۲-۱۰ نرندوجیا نگر

حیدر آباد ۲۸۰۰۵

سے عزیز ہیں۔ اور کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان مولوی ان کی شکل بگاڑ کر پیش کرتے ہیں۔

یہ جہد ملی یہ ثابت نہیں کرتی کہ اسلام قدامت پسندی اور اس کی تعلیمات رجعت پسندانہ نہیں سوویٹ سماج کی اقتصادمی اور تہذیبی ترقی کے بارے میں مسلمان جو کچھ بھی کہتے ہیں اس لیے میں کہتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز کا فیصلہ خدا ہی کرتا ہے۔ اس طرح وہ عوام کے ذہن کو مارکسزم لیسن ازم سے دور لے جاتے ہیں۔ اور سائنٹفک آئیڈیالوجی کے بجائے ان کے ذہن کو غیر سائنٹفک آئیڈیالوجی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں مادی طاقتوں پر بھروسہ کرنے کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح سماجی ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلامی مذہبی تنظیمیں اور مولوی خواہ کوئی بھی بہروب بھر کر سامنے آئیں لیکن ان سے قومی علیحدگی کے عناصر کو تقویت ملتی ہے اور مختلف قوموں میں مفاہمت کے عمل کو ضعف پہنچتا ہے۔ ان کی مذہبی آئیڈیالوجی رجعت پسندانہ رسم و رواج کو تقویت پہنچاتی ہے اور عالمگیر رسم و رواج کی پیرائی کو مشکل بناتی ہے۔ ان کی تعلیمات سے مختلف فرقوں میں شادی بیاہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور قوموں کے باہمی میل جول میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے

کچھ نئی اور پرانی کتابیں

۶/۱۰	کتاب الصوم - مولانا مودودی (درس حدیث)	۱/۲۵	مذہب افیم ہے؟ (اردو) سید قطب شہیدؒ
۲۰/۱۰	تہذیب کی جدید تشکیل مجلہ مولانا تقی امینی	۲/۳۰	اقلیتوں کے حقوق اسلامی ریاست میں
۱۰/۱۰	اساس تہذیب - ڈاکٹر سید عبداللطیف	۲/۲۵	اسلام کا روشن مستقبل - سید قطب شہیدؒ
۱۰/۱۰	اساس تہذیب اسلامی	۱/۱۰	دھرتی پر انسان - عبدالقادر عودہ شہیدؒ
۵/۵۰	بنیادی تصورات قرآن - ابوالکلام آزادؒ	۱/۹۰	روح توحید - حسن البنا شہیدؒ
۲/۵۰	محمد بن عبداللہ اباب نجدی - مرتبہ صفی الرحمن	۱/۹۰	خطبات حرم - مولانا مودودی
۱/۹۰	جہنمیت - قاضی سلیمان منصور پوری	۳/۵۰	فضائل القرآن (درس حدیث)
۲/۵۰	پیام انسانیت - مولانا عبدالحق علی ندوی		
۲/۱۰	مقام انسانیت		

مکتبہ جلی دیوبند (دیوبند)

صبح فاران شمیم کربانی، الکحرف الآخر (مولانا عبدالرحیم دیوبند)۔ اعراس
(عبدالرحیم شمس)۔ شیخ الہند مولانا حمید حسن (اقبال حسن خاں)۔

کھڑے کھوٹے

صبح فاران

ملک کے معروف شاعر جناب شمیم کربانی کی ایک طویل نظم۔ صفحات ۶۲۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ قیمت تین روپے۔ شائع کردہ: حسین اختر مراد کربانی ۱۹۷۶ء حوض سوئی والاں۔ دہلی۔

شمیم کربانی۔ زیادہ شہرت یافتہ نہیں تو بالکل گناہ بھی نہیں۔ غزل اچھی کہتے ہیں اور مشاعروں میں تو وہ سے سنے جاتے ہیں۔ ان کی نظم پہلی بار سال ۱۹۳۲ء مصرعوں کی اس مسئلہ میں نظم میں انھوں نے پہلی نعت رسول کا مقدس ذبیحہ ادا کیا ہے پھر اسلام کے دور عروج کی کچھ مجلسیں تصویر کشی کی ہے اور اس کے بعد مہاجرین فلسطین کی طرف روئے سخن پھیرا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غزل اور نظم شعری دو الگ صنفیں ہیں جن میں صرف طویل و اختصار ہی کا فرق نہیں

ہوتا بلکہ دروہیت، ہیئت اور معنویت کا بھی فرق ہوتا ہے۔ نظم زنجیر جیسا تسلسل چاہتی ہے اور غزل صرف ایسے پھولوں کا گلہ بستہ ہے جو ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ بہت کم لوگ ہیں جو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قادر ہوں۔ اس کا تعلق دراصل ذہن کی قدرتی ساخت سے ہے۔ تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ جناب شمیم کربانی کی ذہنی ساخت غزل ہی کے لئے موزوں ہے۔ انھیں اپنی بہترین صلاحیتیں اسی صنف سخن پر صرف کرنے چاہئیں نظم نہ کہیں تو بہتر ہے۔

نعت رسولؐ اور توصیف اسلام کے بعد جب وہ مہاجرین فلسطین کا ذکر شروع کرتے ہیں تو بیسیوں اشعار تک پتا ہی نہیں چلتا کہ درحقیقہ کس کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ اگر انھوں نے آغاز ہی میں یہ نشانہ ہی نہ کر دی ہوتی کہ نظم مہاجرین فلسطین کے حالات سے بھی واسطہ رکھتی ہے تو پڑھنے یا سننے والے سمجھ ہی نہ سکتے کہ نظم چلتے چلتے کیا کس دادی میں مڑ گئی ہے۔ کافی آگے چل کر احساس ہوتا ہے

چھایا ہوا طلسم زیاں کائنات پر
 ”طلسم زیاں“ خواہ خواہ کی ترکت ہے، زبان بخت
 سے قبل دنیا عموماً اور اہل عرب خصوصاً کردار و افکار کی
 جن گراوٹوں کی مجسم تصویر تھے اسے لفظ ”زیاں“ سے تعبیر
 کرنا یوں بھی صحیح طریق تعبیر نہیں پھر ”طلسم“ کے اضافے نے
 اسے اور بھی ناموزوں بنا دیا۔ یہاں ”کائنات“ کا لفظ بھی
 بے محل ہے۔ انسانی کردار و عقائد کی تمام گراوٹوں کا تعلق
 ظاہر ہے اس سرزمین آدم ہی سے ہے جو کائنات کے سیکڑے
 سمن زمیں ایک قطرے سے زیادہ نہیں۔ پھر یہ ”طلسم زیاں“
 پوری کائنات پر کیسے پھیلا دیا گیا۔

وہ چھوٹی چھوٹی تنگ خیالوں کی بستیاں
 اُن بستیوں میں نحوث باطل کی مہستیاں
 دوسرا مصرعہ کسی اہل زبان کے کہنے کا نہیں۔ شمیم
 صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تنگ خیالوں کی چھوٹی چھوٹی
 بستیوں میں وہ لوگ بس رہے تھے جو سراسر باطل پر تھے
 اور اپنی اس حالت پر انھیں ٹھنڈ بھی تھا۔ یہ مضمون ان کے
 مصرعے سے سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ
 بات کو ڈھنگ سے کہا گیا ہے۔ ”نحوث باطل کی مہستیاں“
 لغو ٹکڑا ہے۔

”انصاف آدمی کے لئے ہے نہ داد ہے“

انصاف اور داد یہاں مراد الفاظ ہیں۔ ان کے
 استعمال میں ایسی ہی خامی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ
 ”زید غم سے چھٹکارا نہ پاسکا نہ الم ہے“
 اور ”بکرے کے حصّہ میں دولت آئی نہ سرمایہ“
 داد کو اگر ”بخشش“ کے مفہوم میں لے لیں تب بھی
 اس کا یہاں موقع نہیں۔

تقصیر کہ کیوں نہ ہم ہوئے سردار سردوں
 نفرت کہ سر بلند ہے کیوں مطلب کی جاں
 محترم شاعر ان کفار کے خیالات کی حکما سی کرتے ہیں
 جو رسول اللہ کی روز افزوں عظمت و مقبولیت سے غصہ و
 غم اور حسد و حسرت میں مبتلا ہیں۔ ”سردار سردوں“ کا

کہ چھلے بہت سے اشعار کا تعلق ہاجر بن قیس بن جابر سے ہے۔
 وہ ایک اچھے غزل گو ہیں اس لئے بہت سے اچھے
 مصرعے تو ان کی نظم میں یقیناً دستیاب ہو جاتے ہیں مثلاً:-

- (۱) رحمت کی چھاؤں جیسی کھٹی کھٹی تھی کھٹی رہی
- (۲) دربارِ رواں رہا خس و خاشاک بہر گئے
- (۳) بزمِ بستان میں ساغرِ توحید چل گیا
- (۴) تو نے عرب کے ذہن کو تبدیل کر دیا
- (۵) اسلام کے دیار میں صدیوں سے رات ہے

لیکن سترس میں کسی مصرعے یا شعر کی مستقل بالذات
 حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ پورے بند کا ایک جزو ہو کر تا
 ہے اور اصل بند بھی مستقل بالذات نہیں ہوتا بلکہ پوری
 نظم کا ایک حصہ ہوتا ہے جیسے نشین کا ایک پرزہ یا بدن کا
 ایک کھنڈ۔ لہذا نظم نگار کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ
 نظم کے بعض اجزاء سے نہیں اس کی مجموعی ہیئت اور درست
 ہی کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اعتراض ہے کہ
 بحیثیت مجموعی ہم شمیم صاحب کی اس پاکیزہ کاوش کو کامیاب
 محسوس نہیں کر سکے ہیں۔

تعجب یہ ہے کہ ذی علم ہونے کے باوجود اس ۵۳۲
 مصرعوں کی نظم میں شمیم صاحب کے زبان و لغت کی بھی
 متعدد غلطیاں ہوئی ہیں جنہیں نہ ہونا چاہیے تھا۔

پہلا ہی مصرعہ ہے:-

اے سردار زمانہ درویشان گرد ز میں
 ”درویشان گرد“ محاورے کے خلاف ہے۔ زمین یا مکان
 یا فصل کو جو جمع یا مقمّر روشن کہے نہ تو اسے ”درویشان گرد“
 کہا جاتا ہے نہ اس شخص کو جس نے شمع جلانی یا مقمّر روشن
 کیا۔ ہمارے محدود مطالعہ میں اردو ادب ”درویشان گرد“ کی
 ترکیب سے نا آشنا ہے۔

تو تھروں میں ڈھنگ بھی دیتا رہا بس
 ”ڈھنگ“ بے محل استعمال ہوا۔ اگر کوئی شخص تھروں
 سے مضروب و مجروح ہو تو کون اہل زبان یوں کہتا ہے کہ
 وہ ”تھروں سے ڈھنگ گیا“۔

کوئی موقعہ نہیں تھا۔ جس شخص کے مقابلہ میں کفارِ حسدِ حشر کا شکار ہیں وہ ابھی ”سردار سردار“ نہیں بنا ہے۔ ابھی تو وہ صرف مٹھی بھر غریبوں اور خستہ حالوں کا سردار ہے مگر صبرِ صبر اس کے خلاف تاثر دے رہا ہے۔

”مطلب کی جان“ بجائے خود حیرت ناک پھر ”جان“ کے لئے سر بلندی کی صفت اور بھی تعجب خیز۔

سہم جانتے ہیں کہ اہل زبان جانِ مادر۔ جان پدر جانِ برادر جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح کسی مناسب موقع پر حضورؐ کے لئے ”جانِ مطلب“ بھی استعمال کرنا ممکن ہے لیکن ”مطلب کی جان“ کہنا تو ناٹری پن ہے پھر جس سیاق میں کہا گیا وہ اہل ادب کے سامنے ہے۔ نیز ”نفرت“ کا نہیں رشک یا حسد جیسے کسی لفظ کے استعمال کا موقعہ تھا۔

کانٹوں سے ڈھانک دی گئی ہر ایک گنہگار
”ڈھانک“ کو یہاں شاید غلط تو نہ کہہ سکیں مگر صحیح ترین لفظ ”باٹ“ تھا۔ ”ڈھانکنا“ تو اس جگہ میوزوں پر مبنی ہے جہاں کسی شے کے پھیلنے جانے کا ذکر ہو۔ ”ڈھانکنا“ پردہ ڈالنے یا کسی بھی شے کو دوسری شے کی آڑ میں لے لینے کا نام ہے۔ راہوں میں کانٹے ڈالنے کا مقصد راہوں کو چھپانا نہیں ہوتا دشوار گزار بنانا ہوتا ہے۔

کعبہ تو ملکیت ہے بتانِ سیاہ کی
کیسی ندایہ اشہد اہل لائیکہ کی
اول تو ”بتانِ سیاہ“ کوئی خوش گوار ترکیب نہیں۔

پھر اس بند میں شمیم صاحب کفار کے خیالات بیان کر رہے ہیں۔ وہ جب اذان کی آواز پر بیچ دتاب کھاتے ہوئے اپنے ان تیوں کا ذکر کریں گے جو اب تک بیت اللہ میں شانِ خدائی سے نصب ہیں تو ان کے ساتھ ”سیاہ“ جیسی کوئی قبیح و مذموم صفت کیوں لگائیں گے۔ یہاں شمیم صاحب کافر کے دہن میں مسلمان کی زبان رکھ گئے

ہیں۔
ارضِ تم پہ شیوہ دختر کشی ہے عام
ہوتا ہے یہ مقابلہ دھرتی پہ تم و خام

اگر عربی الفاظ استعمال کرنے ہی تھے تو کاش شمیم صاحب نے کھوڑی سی عربی پڑھ لی ہوتی۔ ”مقابلہ“ جب تاک کے زیر سے ہو (مقابلہ) تو نام ہے لڑنے والی جماعت کا اور جب تاک کے زبر سے ہو تو دو فریقوں کی باہمی حربے ضرب کو کہتے ہیں۔ عرب زمانہ جاہلیت میں بھیڑوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اس کے لئے ”مقابلہ“ کا لفظ استعمال کرنا مضحکہ خیز حد تک غلط ہے۔

کردار ہے کہ آئینہ رحمتِ بشر
”رحمتِ بشر“ یہاں اہل ہے۔

تاباں شعور و حدتِ جذبات ہو گیا
اتحادِ اخوت کا جو جذبہ حضورؐ کی تعلیم نے صحابہؓ میں برکھ کر دیا تھا اسے ان الفاظ میں بیان کرنا ناقص و نکلانی کا مظاہرہ نہیں کہلا سکتا۔

باتیں روگری کی حیاتِ حکیم سے
حکیم کبیل یا گڈری وغیرہ کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کیرٹھ اکھائے ہوئے کبیل میں روکی خدمت انجام دے رہا ہے اور اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ برابر یہ خدمت انجام دیتا رہے گا تو کیا اس صورت حال کیوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص ”حیاتِ حکیم“ سے روگری کی باتیں کر رہا ہے۔

پھٹے ہوئے لباس کو سی اور کھانٹھ کر اس کی عمر میں
اضافہ کر دیا جائے تب بھی یوں تو نہیں کہا جاتا کہ ”حیاتِ لباس“ میں اضافہ کر دیا۔ مگر یہاں تو ایک اور بھی جھجکی ہے۔ مصرع میں یہ روگری ”حیاتِ حکیم“ ہی سے مخاطب ہوتا ہے کیا کہیں گے۔

درباں کی گفتگو دلِ چاکِ یتیم سے
”دلِ چاکِ یتیم“ کی آرزو کیجئے۔ یتیم کے چاک کا دل۔ آخر کیا معنی ہوئے۔ غالباً مخرم شاعر ”چاکِ دلِ یتیم“ کہنا چاہتے ہوں گے مگر وزن کی مجبوری نے دل اور چاک کو آگے پیچھے کر دیا۔

کیا ہر بانیان ہیں اسیرانِ دردِ پیر

یہ لطف ہو گیا۔ یہ اسلوب تو بتاتا ہے کہ غم و جور کا سیل اپنی جگہ موجود ہے مگر اب اس نے اپنا رخ "لطف" کی طرف پھیر دیا ہے۔

مصرعہ میں زندگی سے ملاقات ہو گئی
یہاں شاید تو اردو واقع ہوا۔ معلوم نہیں کس کا
مصرعہ ہے مگر ہے بہت شہور۔

کل رات زندگی سے ملاقات ہو گئی
غالباً کسی ریکارڈ میں "بجائے"۔

مٹی کو چھو لیا تو گہرین کے وہ گئی
پتی پہ کی نظر تو عمرین کے رہ گئی
دیکھا جورات کو تو عمرین کے رہ گئی
ظلمت سے بات کی تو عمرین کے رہ گئی

جہاں تک ہماری فہم ناقص کا تعلق ہے یہ انداز
بیان تحسین و توصیف کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ یوں تو
کہتے ہیں کہ — "فلاں شخص پے در پے ایسے حوادث کا
نشانہ بنا کہ تباہ ہو کر رہ گیا۔" مگر یوں نہیں کہتے کہ "فلاں
شخص کو پے در پے ایسے سنہری مواقع حاصل ہوتے چلے
گئے کہ وہ بے حد دولت مند ہو کر رہ گیا۔"

"ہو کر رہ جانا" بے بسی اور مجبوری کی ایک ایسی کیفیت
کو ظاہر کرتا ہے جو حسن کا نہیں قباحیت کا پہلو اپنے اندر
رکھتی ہے یا کم سے کم تعریف کا پہلو اس میں نہیں ہوتا۔

زید حیران ہو کر رہ گیا — بکر کی زندگی نمونہ
عجرت بن کر رہ گئی — فلاں شخص فلاں کا غلام بن کر رہ گیا
یہ فقرے صحیح ہیں مگر ذیل کے فقرے صحیح نہیں ہیں۔

زید کو ایسی اچھی بیوی ملی کہ خوش ہو کر رہ گیا۔ طلحہ
کو فلاں جگہ کی آب و ہوا ایسی سازگار آئی کہ تندرست بن
کر رہ گیا۔ نجمہ کو ایسا عمدہ شوہر ملا کہ خوش قسمت بن کر رہ گئی۔

نعمی اگر اس طرح بولیں کہ "زید کو دولت کیا ملی میرا
عیش بن کر رہ گیا۔" تو مقصود تعریف و تحسین نہیں ہوتی
تقصیر و تعریف نہیں ہوتی ہے۔ اور اگر یوں کہیں کہ "کھانا
میں سے دار تو تھا مگر اتنا کم تھا کہ ہم ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔"

"اسیران درد" جیسے خود غلط ترکیب نہیں۔ لیکن
بعثت رسول کے وقت اپنی عرب جن بے شمار برائیوں سے
ملوث تھے کیا ان کی تعمیر میں الفاظ کی جاسکتی ہے کہ وہ
لوگ اسیران درد تھے؟

دوسرا مصرعہ ہے۔

جیسے پھوار گرتی ہے گلہائے زرد پر

زرد صبرت قافیہ بپائی ہے در نہ تشبیہ میں اس کے
لئے کوئی گنجائش نہیں کہ ترخ نیلے، بنفشہ پھولوں کو
سینٹنی کر کے صرف زرد پھولوں پر پھوار گرانی جائے۔
ہاں یہ دور کی کوڑی ضرور لانی جاسکتی ہے کہ وہ لوگ چونکہ
اسیران درد تھے اور درد میں مبتلا آدمی کا چہرہ عموماً زرد
ہو جاتا ہے اس لئے زرد پھولوں کی تخصیص کی گئی۔

ظلمت شکن جو ہو گئی تنویر کی صدا

عالم میں گونجنے لگی تبسیر کی صدا

حیرت ہوتی ہے کہ محترم شاعر کس قسم کا طرزاظہار
پسند فرماتے ہیں۔ "تنویر کی صدا" بھلا کیا چیز ہوتی ہے
یہ بگڑے ہوئے ترقی پسندوں کی روش ہے کہ جس موصوف
کے ساتھ جو صفت چاہے چکا دو۔ مضمل دیوار، غلگین براڑہ
متفکر دھواں۔ دہاڑا، سونج۔ گانا چاند۔ بس اسی طرح
"تنویر کی صدا" بھی ہے۔

اور ظلمت مٹ جانے کا نتیجہ آخر یہ کیسے نکل آیا کہ
عالم میں تبسیر کی صدا گونجنے لگی حالانکہ پہلے مصرعہ کا لفظ
"جو" یہ بتاتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں جس نتیجے کا بیان ہے
اس کے لئے وہ واقعہ سبب بنا ہے جو پہلے مصرعہ میں بیان
ہوا ہے۔

ماں بہ لطف، سیل غم و جور ہو گئی

"سیل" کو مؤنث پہلی بار پڑھا۔ کیا واقعی مستند اہل
زبان کا کوئی حلقہ اس کی تائید کا بھی قائل ہے۔ اس
نحوی غلطی کے علاوہ انداز بیان قطعاً و شقوق جیسا ہے۔
غم اور جور مرط جائیں اور زندگی خوشی اور انصاف سے
ہلکا رہ جائے تو یوں کون بولتا ہے کہ غم و جور کا سیل ماں

— تو اس سے بھی بے بسی حسرت اور محدودی کے غم سے کو
الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اس وضاحت کی روشنی میں غور کیا جائے کہ کیسا
منقولہ بند زبان کے اعتبار سے معیاری ہے۔

تاتل جگہ لطف سے مقبول ہو گئے
سحر خلائ حسن سے معمول ہو گئے

دوسرے مصرعہ سے ناچنگی ہو رہا ہے۔ کوئی شخص
یا گردہ اگر حسن کے جادو سے سحر ہو جائے تو یوں نہیں بولا
جائے گا کہ — ”وہ حسن کے سحر سے معمول ہو گیا۔“

”سے“ کا تو جمل ہی نہیں۔ ویسے بھی ”معمول“ اس
شخص کو کہتے ہیں جو قسطنطین طور پر کسی عامل کے زیر اثر ہو اور
اس شخص کی جنبش و حرکت میں اس کے اپنے شعور و قصد کی
کارسرمائی نہ ہو۔ حالانکہ جو لوگ رسول اللہ کے حسن بہت
اور حسن تعلیم کے سحر سے سحر ہوئے ان کا تاثر قسطنطین اور محدود
نہیں تھا نہ ایسا تھا کہ ان کا اپنا شعور اور قوت ارادی نہ ہو
ہو کر رہ گئی ہو۔

پانی ہوا جو رحمت پروردگار کی
صبر کرنے بولے گل کی روشنی اختیار کی

”صبر“ آندھی یا جھکڑ کو کہتے ہیں۔ اول تو یہی عجیب
ہے کہ کسی قسم کی ہوا یا کہ صبر کی روش میں کوئی تبدیلی واقع
ہو۔ دوسرے صبر کی تبدیلی شدہ روش کو پسندیدگی کے
بوقعدہ پر سحر یا بادِ سبکِ روا یا بادِ بہاری کی رو سے تو
تعبیر کر سکتے ہیں بولے گل کی روش سے تعبیر کرنا کوئی معنی
نہیں رکھتا۔ بڑی اپنی کوئی روش نہیں وہ ہوا کے کانٹے
پر سفر کرتی ہے۔

ہر دل میں درد عشق کی خوشبو چل پڑی
یہ وہی ”ترنی پسندی“ ہے جس کی مثال ہم دے آئے۔
”درد کی خوشبو“ ایسی ہی بات ہے جیسے غم کی بدبو اور
صدے کا نفع۔ نیز خوشبو کے لئے چھلنے کی صفت بھی
کچھ زیادہ قرین اہم نہیں۔
محنت، بہار در بغل و کشت در جلو

جلو کے لام پر پیش ہونا چاہیے مگر اس لفظ کو تو
اور تو اور جو کا ہم قافیہ باندھا گیا ہے۔ اس بند کا
پہلا مصرعہ ہے۔

محنت، اہو کار نگ جبین عرق کی کو
”جبین عرق کی کو“ میں بھی وہی الٹ پلٹ ہے جو
”دل پاک نیم“ میں تھی۔ ”عرق جبین کی کو“ کہنا چاہیے تھا
مگر اس سے وزن خراب ہو جاتا۔

نان جو میں معیشت اقوام کا سرخ
کیا بات ہوئی؟

دولت، بہیم زندگی مجلس عوام
تو اری اضافات سے قطع نظر الفاظ بے محل ہیں۔
دیتے ہیں نور قصر صداقت کے جھاڑ کو
تجیر ہے کہ شاعر کے مذاق سلیم نے لفظ ”جھاڑ“ کو
یہاں کیسے گوارا کر لیا۔ ”جھاڑ فانوس“ ملا کر بولیں تو کھدرا
بن کم ہو جاتا ہے مگر تنہا جھاڑ تو وجدان کیلئے روٹے
سے کم نہیں۔

دھڑ زکوۃ کیا ہے دفتہ عیاں ہے
اس سے قطع نظر کہ زکوۃ کی مصدق و غایت صحت
نہیں کی گئی لفظ ”دفتہ“ کا یہ کوئی موقع نہیں تھا۔ ہر جگہ
ہوئے مال کو دفتہ نہیں کہتے بلکہ اس کا اطلاق صرف زمین
میں گڑے ہوئے مال پر ہوتا ہے۔

بنیادِ ربط ہے سبب انہماک ہے
زور ملکیت نہیں بدل اشتراک ہے
خیال بھی ناقص اور طرزِ اظہار بھی ناروا۔ ”سبب
انہماک“ تو کسی دوسری زبان کا ترجمہ محسوس ہوتا ہے۔

دولت حیات و حدتِ دل کا نفاذ ہے
معلوم ہوتا ہے کہ مافی الضمیر کی ادائیگی کیلئے موزوں
الفاظ کے انتخاب پر شاعر کو قدرت نہیں ہے۔ وہی
بتائیں کہ اس طرح کی زبان کسی کو کیا لے گی۔

سرمایہ دہر کے لئے ترسل آہی
تہذیب نفس خواہش تکمیل آہی

کے معنی میں سمجھ لیا ہے۔ شاید مخالف انھیں لفظ ”جگانہ“ سے ہو کہ جب جگانہ کے معنی غیر دشمن اجنبی وغیرہ کے ہیں تو جگانہ کے معنی اپنے اور خویش اور دوست وغیرہ کے ہوں گے۔

یہ بھی خبر نہیں کہ زمانہ ہے جا نگداز لفظ ”جا نگداز“ کا استعمال اس جگہ سراسر محل نظر ہے۔ قتال روشنی ہے اندھیروں کا ساز باز لفظ قتال یہاں کسی طرح بھی بر محل نہیں۔ اگر یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ ”قتال“ سے مبالغہ کا صیغہ قتل آتا ہے قتال نہیں مگر اور اگر باب فاعل سے اسے اسم فاعل قرار دیا گیا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ بال فعل سے قبل اس وقت لایا جاتا ہے جب بہت لوگ قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں شاعر کے بیان کے مطابق مقتول ”روشنی“ ہے یعنی نئی واحد پھر قتال کیا معنی۔

راہوں میں اشتراک نہ منزل پہ اتفاق یہاں سے شاعر امت کا موجودہ حال بیان کر رہے ہیں۔ یہ سلیس مصرعہ اس کے لئے بہت موزوں ہے لیکن سراسر مصرعہ پھر سلاست سے گر گیا۔

آئین زندگی ہے کہ فتنائے افتراق فتنار کا کوئی محل ہی نہیں تھا۔ تیسرا مصرعہ بھی سقم سے خالی نہیں۔

ملت کا حوصلہ نہ اخوت کا اشتیاق شاعر اتن بھی نہیں سمجھتے کہ ”اخوت“ ایک مصدری مفہوم ہے اور ملت ایک اسم ہے۔ ایثار و سخاوتی دوست داری جیسا کہ کوئی لفظ ملت کے بجائے آتا تو بات بنتی۔

اسی سلسلہ مضمون میں آگے کہا گیا ہے۔ توحید عشق، دین کا پیغام ہی نہ ہو دنیا میں کوئی مرکز اسلام ہی نہ ہو کوئی بتائے کہ پہلے مصرعہ کا کیا مفہوم ہے۔

رہتے ہیں جن میں چشمہ روغنِ رواں دواں یہ عربوں کی زمینوں کا ذکر ہے۔ پتا نہیں اس قدر مشکل پسندی

جدید حیات و جذبہ تحصیل پائی

شک جنوں کی راہ میں تبدیل آگئی

ایک بھی مصرعہ قدرتِ اظہار و بیان کا مظہر نہیں۔

”سرایہ یعنی دولت زمانہ کے لئے آگئی کی ترسیل ہے“

کیس قسم کا جملہ ہے۔ اول تو آگئی سے سرایہ کا تعلق

کیا۔ پھر ترسیل آگئی اور بھی معنی۔ آگے ”تہذیب نفس“ اور

خواہش تشکیل آگئی کی پہیلیاں بھی حل مانگ رہی ہیں۔

سرایہ ”تہذیب نفس“ ہو یہ تو جمل بات ہے۔ تہذیب نفس

کا ذریعہ ہو یہ بھی یا معنی بات نہیں ہوتی۔ تشکیل آگئی

کا مصداق کیا ہے اور اس کی خواہش کا ذکر کیوں۔ مزید

دونوں مصرعے بھی چیتاں ہیں۔

سارے مسافرانِ سحر مبتلائے شام

افسوس کہ محترم شاعر جس لفظ کو جہاں چاہے لے

آتے ہیں۔ مبتلائے فراق، مبتلائے رنج، مبتلائے درد تو سننے

آئے تھے مگر مبتلائے شرب، مبتلائے شام، مبتلائے ہمار جیسے

الفاظ اب سننے میں آتے۔

ہم سازشِ زمانہ سے حیراں ہیں صدفِ صدف

لوگوں کا باقاعدہ صدفِ صدف حیران ہونا بھی آج ہی

سننے میں آیا۔

خیموں میں قیدِ زہرہ و ہفتاب و کہکشاں

خیال نہیں فرمایا گیا کہ کہکشاں کا اطلاق کسی فرد واحد

پر نہیں ہوتا وہ تو ستاروں کے مجموعے کا نام ہے اور اپنی

عین وضع میں جمع کا مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں زہرہ اور ہفتاب

کے ساتھ اس کا عطف درست نہیں۔

چلنے لگے حیاتِ غریبانِ مستہام

ہیں اقرار ہے کہ یہاں لفظ ”مستہام“ ہماری قابلیت

کی سطح سے بلند رہا۔

رکھتے نہیں جگانہ و دشمن میں امتیاز

کاش شاعر محترم اشاعت سے قبل اپنی نظم کسی ذی علم

کو دکھا لیتے۔ ”مقالہ“ جیسی خوش غلطی یہاں بھی ہے۔ ”جگانہ“

تو کیت اور لا جواب کو کہتے ہیں مگر انھوں نے اسے ”دوست“

شاعر کے ذہن پر کیوں سوار ہے کہ جا ہے بندش خراب
ہو جائے مگر سہولت پیدا نہ ہو سکے۔ بخوبی اعتبار سے
”چشمہ روغن“ کا موقع تھا لیکن اس جھنجھٹ سے
بچ کر یوں بھی تو کہہ سکتے تھے۔

رہتے ہیں جن میں تیل کے چشمے رواں رواں
حالانکہ ”رواں رواں“ پھر بھی خشو سے خالی نہیں ضرورت
مہر ”رواں“ پر شتم ہو جاتی تھی۔ اہم ”چشمہ روغن“
کا بوجھ تو کچھ ہلکا ہوتا۔

بخشنا گیا تھا جن کو مذاق انا کبھی
آج کے بہتر شعراء ”انا“ کو بطور تحمین عرفان
ذات اور خود داری جیسے مفہوموں میں استعمال کرنے
لگے ہیں۔ تنہم حساب نے بھی یہاں ہی کیا ہے لیکن یہ ہے
ایک غلط روش۔ انا اور انایت کا مصداق ہے نوح
کبر، گھنڈ۔ ان اوصاف کا شمار ظاہر ہے ردائل میں
ہے فضائل میں نہیں۔

خوف نجات و خواہش دنیا سے ہلکار
”خوف نجات“ جمل ترکیب ہے۔ نجات ڈرنے
کی چیز نہیں تمنا کرنے کی چیز ہے۔
خوف آخرت اور خوف خدا تو درست مگر خوف
نجات اکرم نادرست۔

سینوں میں اک جہان غم و غم لئے ہوئے
افھڑ عربی میں بے شک غم کی بھی کہتے ہیں لیکن اردو
میں یہ لفظ نوس نہیں۔ اس کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے
شاعر مانوس الفاظ میں مصراعہ پورا کرنے سے عاجز آ گیا
ہے۔ کیا مشکل تھا اگر یوں کہہ دیا جاتا۔

سانسوں میں ایک سلسلہ غم لئے ہوئے
اس غم و الم کی اس کثرت و شدت کا اظہار ساہ
الفاظ میں ہو جاتا جسے اس بند میں ظاہر کیا گیا ہے۔

امید و ارجہم کرم آفریں ہیں ہم
”آفریں“ فضول ہے۔ اردو میں صدا ہا اشعار
ہوں گے جن میں تنہا ”چشم کرم“ نے وہی مفہوم ادا کیا

جسے اس مصرعہ میں ادا کیا گیا ہے۔

آخر گناہ گار میں کافر نہیں ہیں ہم
اس پر اگرچہ حاشیہ دے دیا گیا ہے کہ غالب سے
استفادہ۔ لیکن ایک بات قابل غور یہ ہے کہ غالب کے
یہاں بھی اور اس بند میں بھی لفظ کافر فائے زبر سے
استعمال ہوا ہے۔ زاوڑ اور سرور کا قافیہ جس بان
کا یہ لفظ ہے اس کے قواعد تو فائے مفتوح کی اجازت
نہیں دیتے۔ قرآن سے بڑھ کر کیا سند چاہیے۔ مومن کا
مقابل کافر جہاں بھی پائیں گے فائے کسور سے پائیں گے
(کافر) اس باب کا وزن فاعلی ہی یہ ہے۔ پھر کیا
غالب یا کسی بھی سیلف و خلف کی خطا سند قرار پاسکتی ہے
کیوں اس خطا کا متبع کیا جائے۔

زبان کی ان خامیوں اور سلوٹوں کے بعد کچھ اور
گوشے بھی قابل گفتگو ہیں۔

لیکن ثبات عزم سے فطرت بدل گئی
کہا یہ جارہا ہے کہ اہل عرب اگرچہ بہت سفاک اور
گم گشتہ راہ تھے لیکن رسول اللہؐ نے استقامت کے ساتھ
دعوت حق کو جاری رکھا تو ان لوگوں کا رنگ ہی بدل گیا۔
اس تبدیلی کو فطرت کی تبدیلی کہنا درست نہیں۔ خود رسول اللہؐ
نے یہ فرمایا ہے کہ اگر تم سونپاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے
تو یقین کرو لیکن یہ سنو کہ فلاں کی فطرت بدل گئی ہے تو
ہرگز مت یقین کرو۔

فطرت بدلنا کسی کے بس میں نہیں۔ حضورؐ کی دعوت
حق نے اہل عرب کے فطری خواص و خصائص کو صحیح سمت عطا
کی تھی ان کی پیدا شدہ صلاحیتوں پر سے وہ رنگ چھڑایا
تھا جو جاہلیت اور بعض خارجی عوامل نے ان پر چڑھا دیا تھا۔

رحمت کا پھول، غیب کی تائید ہی تو ہے
جان بہار، نغمہ توحید ہی تو ہے
کہا یہ جارہا ہے کہ ہر شخص تو دل میں بغض اور ہاتھ میں
پتھر لئے پھر رہا ہے مگر۔

رحمت کا ایک پھول ہمیر لئے ہوئے

استقامت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ گالیوں نے عزم و ہمت میں تزلزل پیدا نہیں کیا۔

قدیم عرب کی رسم دختر کشی کا ذکر کر کے کہا گیا ہے۔

لیکن ترا پیام ہے کیا دل نشیں پیام

بیٹی کے در پر آ کے جو تو نے کیا سلام

نبت نبی کا مرتبہ پہچاننے لگے

بیٹی کو لوگ ماں کی طرح ماننے لگے

موٹی سی بات ہے کہ لفظ ”پیام“ کا اطلاق کسی ایک

مجوری نصیحت یا دعوت پر ہو کر تا ہے۔ اس پیام کے ذیل

میں تفصیلی تعلیم و تربیت کا جو کام کیا جائے اسے تعلیمات یا

ہدایات جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضور کا پیام عالم

انسانیت کو یہ تھا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کے رسول کی

حیثیت سے خبر دے رہا ہوں کہ نہاد وہی بنی گئی کے لائق ہے۔

یہ پیام نہ تو دختر کشی جیسی کسی ناپاک رسم پر براہ راست اثر

انداز ملتا ہے نہ چوری اور نہ نا اور شراب نوشی اور سود

خواری جیسی لغتوں سے اس کا راست تعلق ہے اس لئے یہ

کہنا کہ ”تیرے پیام نے دختر کشی کی ملعون رسم کا خاتمہ کر دیا۔“

امروا قعہ کے بیان کا ناموزوں اور غیر منطقی اسلوب ہے۔

پھر شاعر نے پیام والا مصرعہ تشنہ چھوڑ کر دفعۃً ایک اور

بات شروع کر دی۔ یہ بات بجمائے خود محتاج تشریح تھی۔

حضور متعدد بیٹیوں کے باپ ہوئے ہیں۔ بند سے نہیں پتا

چلا کہ آپ کون سی بیٹی کے در پر آ کے سلام کیا تھا۔ مزید یہ

کہ ایک باپ اگر بیٹی کے گھر میں داخل ہو کر اسے سلام کرے

تو کوئی جہذب آدمی اسے اس طرح بیان نہیں کر سکتا جس

طرح شاعر نے کیا ہے۔ خصوصاً باپ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رفیع الشان باپ ہو۔ یہ طرز بیان تو اس وقت اختیار کیا

جاتا ہے جب کوئی کم درجہ انسان کسی بلند مرتبہ انسان کے

دیر دولت پر نیاز مندانہ حاضری دے۔ جب شاعر لوگ

”در محبوب“ پر جبرسانی اور حاضری کا ذکر کرتے ہیں اس وقت

بھی ذہنی پس منظر ہی ہوتا ہے کہ محبوب کا درجہ کہیں بلند ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر محترم شمیم صاحب کذب میں کوئی ایسا واقعہ

ہمارے خیال میں حضور کی وسیع شان رحمت و رافت

کا اندازہ ”ایک پھول“ کے الفاظ سے بہت کم ہوتا ہے۔

حضور تو رحمت و رافت کے چمن تھے بلکہ چمن اندر چمن۔

تاہم یہ کہنا کہ ”رحمت کا پھول غیب کی تائید ہی تو

ہے“ کوئی موزوں طرز اظہار نہیں۔ پھر دوسرے مصرعہ

میں ”نغمۂ توحید“ کا کیا موقعہ تھا پھول جان بہار ہو سکتا

ہے مگر نغمہ اس کی صفت کہاں۔ ”رحمت کا پھول نغمہ

توحید ہے“ یہ ایک لے تنکی بات ہوئی۔

عرفاں سے دور غیظ و غضب سے قریب تر

عرفاں کا مقابل غیظ و غضب نہیں جہل ہے اور غیظ و

غضب کا مقابل عرفاں نہیں حکم و ضبط اور نرمی و رافت

ہے۔ یہاں دو مقابل چیزیں درکار تھیں جو نہیں سراہم

ہو سکتیں۔

جس کی طرف جبین ملائک جھکی ہوئی

اگر تلخ حضرت آدمؑ والے قصے کی ہے کہ انھیں ملائک

نے حکم خداوندی سجدہ کیا تو اس میں حضورؐ کی کوئی خصوصیت

نہیں تمام ہی ابنائے آدم صلی اللہ علیہ وسلم ملائک کہے جاسکتے

ہیں۔ جیسے اقبال نے تعریضاً کہا تھا۔

تھا جو سجدہ ملائک آدمؑ سے

لیکن اگر کوئی اور مقنا ہے تو اس کا سراغ نہیں لگا۔

ملائکہ کسی کے آگے نہیں جھکتے الا یہ کہ خدا انھیں حکم دے۔

حضرت آدمؑ کے بعد بھی کسی کے لئے اللہ نے فرشتوں کو

سجدے کا حکم نہیں دیا چنانچہ حضرت جبریل رضی اللہ عنہ کے پاس

آتے تھے تو فرط تعظیم میں رکوع و سجدہ کرتے نہیں آتے

تھے۔

”اں جبین ملائک جھکنے“ سے اگر کچھ اور مطلب لیا گیا

ہے تو محترم شاعر جانیں۔

دشنام جاہلاں سے نہ خاطر موٹی لٹول

یہ درست نہیں، جاہلوں کی بد زبانیاں اور ہرزہ ہارنیاں

سے بارہا حضورؐ کو بہت ملال ہوا کرتا تھا۔ خوشی یا غم تو

نظری جذبے ہیں۔ ان سے حضورؐ بالاتر نہیں تھے ہاں تباہ

عیش چاہتے ہو تو ہم تمہارے لئے عرب کی حسین ترین عورتیں
ہمارا کر دیں گے۔ اس پیشکش کے بیان میں پہلا مصرعہ تو مناسب
ہے لیکن دوسرا مصرعہ غیر مناسب۔ یہ دوسرا مصرعہ اس وقت
مناسب ہوتا جب کفار کسی تعین حینہ کو ساتھ لاکر یا اس کا
نام لے کر یہ کہتے ہیں کہ اے محمد! یہ جانہ ہے آپ کا اور بیگی
کے لئے۔ لیکن جب ان کی پیشکش ایکس کہیں زیادہ غیر
معین حسیناؤں کی تھی تو واحد لفظ "بنت" آخر کیے مفردوں
پر لگتا ہے۔ صحیحاً "بنات" کا موقوف تھا۔

اس بنیادی تقسیم کے بعد جزئیات پر بھی غور کر لیجئے۔
"بنت زہرہ" تو قابل فہم استعارہ ہے لیکن "دش" کا اھٹا
کیا معنی۔ اسے یہاں حشو کے خانے میں رکھنا ہو گا۔ اور
"کہکشاں نگاہ" بھی ہمارے خیال میں محل نظر ہے۔ اردو ادب
میں ترنگہ اور تسنگہ اور انجم نگاہ جیسی ترانگیہ کی نظر
سے نہیں گذریں۔ "نگاہ" کوئی آنکھوں سے نظر آنے والی
چیز ہے ہی نہیں جو اس کے لئے بطور تعریف ایسی چیزوں کا
حوالہ دیا جائے جن کا حسن آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ "کہکشاں
ستاروں کے جھنڈ کو کہتے ہیں۔ کوئی بتائے "کہکشاں نگاہ"
کا کیا مطلب لیا جائے۔

دوبول میں جو چین لیا دل غنیم کا

اعجاز ہے یہ سب ترے خلق عظیم کا

اس طرح کا شعر کسی ایسے موقع پر کہا جاسکتا ہے جب
رسول اللہ کو کئی تعین غنیم سے سابقہ پیش آیا ہو اور آپ
نے بہت مختصر گفتگو کر کے اسے حلقہ بگوش کر لیا ہو۔ لیکن
ایسی کوئی بات شاعر کے پیش نظر نہیں۔ وہ اس عام واقعہ
کا ذکر کر رہے ہیں کہ طرح طرح کے اشیاء اور حسن اخلاق کے
ذریعہ رسول اللہ نے کفار کے دلوں کو فتح کیا اور وہ حلقہ
بگوش ہو گئے۔ اس سیاق میں نہ تو دوبول کا کوئی مطلب
ہے نہ لفظ غنیم کا۔ زبان کی سلیوٹ یہ ہے کہ "دل چین لیا
کہا گیا حالانکہ دل جیت لیا" کا محل تھا۔

کب رزم گاہ زیت میں وجہ محس ہوئی

نابن جویں تو دہر میں خیر شکن ہوئی

ہو جس میں رسول اللہ نے اپنی کسی بیٹی کے گھر پہنچ کر اسے سلام
کیا ہو تو اس کے ذکر و بیان میں وہ سلیقہ نہیں برت سکے
ہیں۔ علاوہ ازیں رسم دختر کشی کے خاتمے کے لئے اس
منفرد اور نجی واقعے کو بطور سبب بیان کرنا بہت ہی
بھول پن ہے۔ مناسبت اور معقولیت سے اسے کوئی واسطہ
نہیں۔ مستزاد یہ کہ مجر دیہ واقعہ اس کی وجہ نہیں بن سکتا
کہ لوگ بنت نبی کا مرتبہ بھاننے لگیں۔

ان گوشوں سے قطع نظر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ
یہاں بنت نبی کا آخر ذکر ہی کیا تھا۔ گفتگو تو ہو رہی تھی
لوگوں کی اس سفاکانہ جاہلیت پر کہ وہ بیٹیوں کو زندہ
گٹاؤ دیتے ہیں۔ شاعر کو کہنا چاہیے تھا کہ رسول اللہ کی تعلیم
نے انھیں اس جاہلیت سے نکالا اور وہ محسوس کرنے لگے
کہ بیٹیاں بھی تحفظ اور محبت کی مستحق ہیں۔ ان کا بھی قتل
شعیدہ مجرمانہ فعل ہے۔ انھیں بھی اولاد کی طرح سینے سے
لگا کر رکھنا چاہیے۔ یہاں مرتبہ شناسی کے بجائے محبت
اور رحم اور خدا ترسی جیسے جذبات کے ذکر کی ضرورت تھی۔
تذریعہ حقیقت ثابتہ بھی شاعر نے ملحوظ نہیں رکھی کہ صحابہ رض
نے باوجود مسلمانوں نے بنت نبی کو ماں کی طرح نہیں مانا
ہے بلکہ ازواج رسول کو ماں کی طرح مانا ہے۔ یہاں سے مانا
کہ اللہ نے ہر اہل حقہ اس کا حکم دیا تھا۔ اہل ایمان کا
لقب ازواج رسول ہی کو ملا اور رسول اللہ کی بیٹیاں
امت کے لئے خواہ کتنی ہی عظیم اور عقیدت کا مرجع رہی
ہوں مگر ان کے "ماں" ہونے کا تصور کبھی نہیں پایا گیا۔
قیاس کہتا ہے کہ یہاں "بنت نبی" سے مراد حضرت
فاطمہ ہیں۔ حضرت فاطمہ کو لوگ ماں کی طرح معظّم مانتے تھے
یا نہیں مانتے تھے اس کی آخر بحث ہی رسم دختر کشی کے سلسلہ
میں کیا تھی۔ کاش کچھ تو غور کر لیا گیا ہوتا۔

کہتے ہیں لوگ پیش ہے دنیا کا مال و جاہ

حاضر ہے بنت زہرہ دش کہکشاں نگاہ

یہ اس واقعہ کا ذکر ہے جب کفار نے کہا تھا کہ اے محمد!
تم اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیں گے۔

یہ اسی سلسلہ کا ایک شاعر ہے اور پیش لفظ سے قبل
سمرنا کے طور پر پورا ایک صفحہ دیکر درج کیا گیا ہے۔ ہم
نہیں سمجھتے بیان کی صفت ضو اور روشنی کب سے ہو گئی۔
پالہ گھٹیل گئے تو ساغر یا جام کہہ لیجئے۔ ایسا ہر حال پہلے
ہی کو کہتے ہیں۔ ایسا غے سستی، لٹے، خمار، سرخوشی وغیرہ کا
تو چور ہے مگر ضو کا کیا چور۔ دوسرا مصرعہ معیار بلاغت اور
صنعت شعری کے اعتبار سے ٹھیک ہے۔ چراغ اور آندھی
کا تقابل بہت خوب۔ اور یہ بھی درست کہ چیراغ اور
ضو کا ربط باہم محتاج وضاحت نہیں لیکن ضو اور ایسا
کے غیر مربوط ہونے کا کام بگاڑ دیا۔

نفاقت کی اتنی مفصل نشاندہی ہے تو ہمارے لئے
باعث رسوائی۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ایڈیٹر تجلی تبصرے
کی آڑ میں لوگوں کی پگڑیاں اچھالتا ہے، ان کے جوصلے
پست کرتا ہے، خود رہ گیری اور نکتہ چینی کے مرض میں مبتلا
ہے۔ اس پر خدا کی پھٹکار۔

ہم دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ بندہ وں کی پھٹکار
تو بجا مگر خدا کی پھٹکار والی بات شاید درست نہیں۔
خدا کا حکم ہے کہ علم کو مت چھو۔ کتمان علم گناہ ہے۔
پھر اسی نے یہ بھی بتلایا کہ تعلیم و تعلم کا سب سے بڑا ذریعہ
قلم ہے۔ (عَلِّمُوا بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانُ مَا لَمْ يَعْلَمْ)
تو آخر ہم کف قلم کیوں کریں اور اپنی بساط کے مطابق علم و
تحقیق کی خدمت کیوں نہ کریں۔ بہتر ہے دوستوں کو ہم نے
تبصرے کر کے ایسا دشمن بنالیا۔ مر جائیں گے تو یہ سب
خوشی کا نعرہ لگائیں گے کہ جس کم جہاں پاک!

الحرف الآخر

پورا نام :- الحرف الآخر فی البطلان تدفین

الشیخ عبد القادر

صفحات ۱۱ سو۔ سائز متوسطہ۔ لکھائی چھپائی معمولی۔

• کاغذ اچھا۔ قیمت پانچ روپے۔

خیر شکی کی تلمیح قوت و صلابت کے لئے آتی ہے۔ اس کا
متقابل ہے ضعف و ناتوانی۔ "مح" کے لفظ نے یہ ثبوت
ہم کیا کہ شاعر کے نزدیک اہمیت بس قافیہ پیمانی کی ہے
حسن معنی کی نہیں۔

صفحہ ۲۸ پر شاعر نے اس مبالغہ کا ذکر کیا ہے جس
میں حضورؐ اپنے مخصوص اہل بیت کو ساتھ لئے ہوئے تھے۔

کیا شوکتِ جمال تھی روزِ مبالغہ

دینا گو یا ہے تر ا معصوم قافلہ

اس بند کے باقی چار مصرعوں میں حضرت فاطمہ اور
حضرت علیؑ کا ذکر ہے۔ پھر اگلے بند یوں شروع ہوتا ہے۔

اس قافلے سے ہر کوہِ انانیوں میں

دل کو نشاطِ دین کو رعنائیاں ملیں

گو یا شاعر نے یہاں قدرے مرموز انداز میں اس عقیدے
کا اظہار کیا ہے جو شیعہ حضرات کا معروف عقیدہ ہے۔

یعنی خدمتِ دین اور فروغِ ملت کا تمام کردار صرف
اہل بیت کے لئے اور باقی صحابہؓ اس سے محروم۔ گو کہ شاعر

نے تحقیق کا کوئی لفظ کسی کے لئے نہیں کہا، لیکن یہ تاثر
وہ بہر حال دے گئے کہ ان کا تاریخی مطالعہ ناقص ہے۔

"اس قافلے" کا اشارہ الیہ عا حالات میں تمام ہی صحابہؓ
کی جمعیت کو مانا جاسکتا تھا لیکن پہلے بند میں صرف چند

اور مخصوص اہل بیت ہی کے لئے "تر ا معصوم قافلہ" کے
الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس لئے اشارہ الیہ بھی فقط یہی

اہل بیت بن جاتے ہیں۔

الفاظ و اسلوب کی فروعی لغزشوں سے ہٹ کر دیکھئے
تب بھی نظم میں نہ تو شایان شان داخلی ربط ہے نہ معانی

میں گٹھاؤں نہ الفاظ اور دروہست میں بے ساختگی اور آمد
کی کیفیت۔ آورد ہی آورد کا مزہ آتا ہے۔ یہ الگ بات

ہے کہ متعدد دے چند مقامات پر آمد کی بھی کوئی جھلک
نظر آ جاتی ہو۔

کم ہوگی ضوئے دین میں کے ایسا غی

آندھی کرے گی آپ حفاظتِ چرخ کی

• مصنفہ: حضرت مولانا سید عبد الرحیم دہلوی۔
• شائع کردہ: ادارہ دعوت و تبلیغ - ۱۹۸۴ء - صدر بازار
بارہ ٹوٹی - دہلی ۷۷۔

کتاب کا موضوع اپنی جگہ منجملہ عجائبات ہے۔
تفصیل جس کی یہ ہے کہ معروف شیخ طریقت شاہ عبدالغفار
راپوری نے ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال
فرمایا۔ ان کی تنہا اور وصیت تھی کہ اگر میرا انتقال پاکستان
میں ہو جائے تو میری میت کو راپوری منتقل کر دیا جائے
- تاکہ میں اپنے شیخ شاہ عبدالرحیم علیہ الرحمۃ کے قدموں میں
دفن ہو سکوں - مشیت ایزدی کہ انتقال لاہور میں ہو گیا
مگر ان کی وصیت پر عمل نہ کیا جاسکا بلکہ جنازہ ایک مقام
”ڈھڑیاں“ لیجا لیا گیا اور وہاں دفن میت کی شکل کچھ
ایسی بنی کہ اس پر دفن کا اطلاق ہی مشکل - بہ الفاظ
مصنف شاہ علیہ الرحمۃ کی نعش ابھی تک تدفین شرعی
سے محروم ایک تابوت میں رکھی ہے اور تابوت سمینٹ
کے ایک کمرے میں محبوس و مقید ہے۔

یہ سب کیسے ہوا، کیوں ہوا، ٹھیک ہوا یا غلط ہوا۔
یہ بڑی دلچسپ بحث ہے۔ جب واقعہ تازہ تھا تو اس بحث
میں بڑی بڑی معروف شخصیتوں نے داد کلام دی ہے،
مثلاً مولانا علی میاں، مولانا منظور نعمانی، مولانا محمد یوسف
بنوری، مولانا قاری محمد طیب، مولانا زکریا مفتی فلاں
اور مولوی فلاں۔ ان حضرات کے خیالات کا مقدمہ حصہ
زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف مولانا عبد الرحیم نے شامل
کتاب کر دیا ہے۔ ان کا اپنا موقف یہ ہے کہ شیخ راپوری
کی نعش کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ ایک دنیا پرستانہ منصوبے
کا حصہ ہے اور تدفین کی جس شکل کو ”تدفین“ قرار دیا گیا ہے
وہ ہرگز تدفین نہیں۔ اس موقف کے اثبات میں موصوف
نے بڑے قوی دلائل پیش کیے ہیں اور جب تک کوئی ان
دلائل کا رد نہیں کر سکتے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ تدفین محقق نہیں
ہوئی۔ کم سے کم ہم تو موصوف کے موقف کی صحت کے

قابل ہو گئے ہیں اور ہمیں اس پر تحیر بھی نہیں کہ بعض
مردین اپنے شیخ کی نعش کو مفاد پرستانہ سیاست
میدان کی گیند بھی بنا سکتے ہیں۔ اس دنیا میں سبھی طرح کے
عجائبات ایسے جاتے ہیں اور دنیا کے تصوف و طریقت
عجائبات تو شمار سے باہر ہیں۔

ہمارے لئے نہ یہی لیکن بہترے قارئین کے لئے اس
کتاب کے بعض مشکلات جو نکادینے والے ہوں گے مثلاً
مدیر الفرقان مولانا منظور نعمانی اس ڈرامے کا ایک ٹکایا
کر دار ہیں ”ان پر گفتگو کرتے ہوئے فاضل مصنف -
ان کی تلون مزاحی اور انتہا پسندی اور ”ہندو عجز“ کی
تصور کشی کی بڑی پہلو دے رہا ہے۔ مولانا نعمانی کا درج ذیل
فرمودہ جی پھر پرکندہ کر لیا جائے تو اُسے والے مورخ
کے لئے شاید مفید ہو گا۔ وہ فرماتے ہیں:-

”میں تو دنیا سے اسلام میں صرف چار ہی خصوصیات کو
عالم سمجھتا ہوں۔ ایک تو مصر میں ہیں۔ ایک پاکستان
میں مولانا محمد یوسف بنوری اور دو ہندوستان
میں۔ ایک مولانا حبیب الرحمن الاظمی اور ایک
میں!“

اگر واقعی مولانا نعمانی نے ایسا ہی فرمایا تو ہم کہیں
کہ انھوں نے کفر کی حقیقت شاید یہ ہو کہ انکی صحت
اور درجے کا ایک بھی عالم خاک در ان عالم میں نہیں پایا جا
مولانا نعمانی نے شیخ الحدیث مولانا زکریا کے متعلق
یہ فرمایا:-

”میری چند تہہ ان سے ملے گفتگو ہوئی لیکن وہ
مجھے مطمئن نہ کر سکے اور میں ان کو عالم نہیں سمجھتا
ہوں۔“

مولانا محمد طیب صاحب کے بارے میں ان کی رائے
”میں ان کو بھی عالم نہیں مانتا بلکہ وہ ایک شاعر
ہیں۔ سیرت کے حلقوں میں قہر میں کہہ کے لوگوں
کو جنت کا راستہ دکھلائے ہیں اور وہ دس آنے
بھر دیوبندی ہیں۔“

ایک اور موقع پر مولانا ذکر یا کے بارے میں ان کا یہ ریاک نقل ہوا۔
 ”شیخ الحدیث صاحب کی علمیت کا قائل نہیں ہوں۔“

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ انتسابات کس حد تک درست ہیں فیاض مصنف نے کوشش تو کی ہے یقین دلانے کی کہ وہ الزام تراشی نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہی بایں پیش فرما رہے ہیں جن کے شاہد موجود ہیں مگر یہ کہنا بہر حال مشکل ہے کہ یہ انکشافات دستاویزی ہیں۔ یہ بات کسی طرح حلق سے نہیں اترتی کہ مولانا نعمانی نے بسلاستی ہوش و حواس اپنے آپ کو دنیا کے چار اعلیٰ ترین علماء میں گنوا دیا ہو۔ ہاں مولانا ذکر یا یا مولانا محمد طیب کے سلسلے میں ان کی طرف جو اقوال منسوب ہیں وہ نہ صرف حلق سے اتر گئے بلکہ معدے نے انھیں ہضم بھی کر لیا۔ اس معنی میں نہیں کہ ان دونوں ہستیوں کے بارے میں انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ سراسر برحق ہے بلکہ اس معنی میں کہ انھوں نے ایسا فرمایا بہر حال ہوگا۔

جن شیخ الحدیث مولانا ذکر یا کے بارے میں مولانا نعمانی کے مذکورہ خیالات منکشف ہوئے وہ خود بھی اس پورے ڈرائے کا ایک نمایاں کردار ہیں۔ ان کا اس کتاب میں نہ صرف اچھا خاصہ تذکرہ ہے بلکہ ان پر مستقل باب بھی ہے۔ جو حضرات محترم شیخ الحدیث کے زہد و عبادت و رعب و تقویٰ اور کمال تصوف پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے زیر تبصرہ کتاب بڑی تکلیف دہ ہوگی کیونکہ اس کے آئینے میں شیخ موصوف کے دامن صدق و امانت اور روئے خالص و دیانت پر سیاست کاری اور تالیس و تلبیس اور فنکاری کے داغ دھبے نظر آتے ہیں۔

حال تبصرہ یہ ہے کہ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ مسائل تصوف اور اسرار و انفا ہی اور ولایت و طہیت کے غوامض پر نالائق تبصرہ و نگار کی رائے زنی ایک عامی اور طفل مکتب کی رائے زنی ہوگی اس لئے اس باب میں تو فضل خاموشی ہی بہتر لیکن ایک جزئی مسئلہ میں ہم فیاض

مصنف کی خدمت میں خود بانہ کچھ عرض کرنا ہے۔
 ذیلاً آپ حضرت شیخ الحدیث کے ایک مکتوب ہے با نقل کی ہے کہ حدیث میں انبیاء علیہم السلام کے بارگاہ میں وارد ہے کہ ان کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی مگر اولیاء عظام کے متعلق احادیث میں کوئی نص وارد نہیں جہاں تک حلف وود حسن عقیدت کا تعلق ہے امید یہی ہے کہ انشاء اللہ کوئی تغیر نہیں پیدا ہوگا لیکن یہ کوئی قطعی چیز نہیں۔

اس ارشاد گرامی سے حضرت شیخ الحدیث کا منشاء یہ تھا کہ حضرات رائے پوری کی زیر بحث تہذیب کو آٹھ دس برس گزر چکے ہیں ناخن نہیں ہے کہ ان کی نعش بگڑ چکی ہو اور اس کا بہت ساحصہ خاک میں بدل چکا ہو لہذا اب اس نعش کا اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کرنا مناسب نہیں۔

اس پر آنجناب کا اصولی نقد تو درست ہے لیکن دوسری بات کہہ کر آپ نے علامہ عینی کے حوالے سے یہ جو فرمایا ہے کہ انبیاء کی طرح علماء و شہداء و مؤذنین کو بھی یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کے اجسام بھی محفوظ رہتے ہیں اس سے ہرگز انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ عینی نے قیل کہہ کر ایک جھول کی حیثیت سے یہ رائے ذکر کی ہے جو غیر معقول اور بے حقیقت رائے ہے۔ نیز ہمارے شیخ الشیوخ اور امتداد الاساتذہ حضرت گنگوہی نے اگر یہ فرمادیا کہ اولیاء کرام بھی حکم شہداء ہیں اور اس آیت کے مصداق میں شامل ہیں جس میں اللہ نے فرمایا ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور انھیں رزق دیا جاتا ہے۔ تو اسے جسموں کے محفوظ رہنے اور نہ رہنے کی بحث میں لانا مناسب نہیں ہے۔

بڑے ادب کے گذارش ہے کہ موت کے بعد اولیاء کا زندہ رہنا یا ان کے جسموں کا قبروں میں محفوظ رہنا طرا فتنہ انگیز اور مغالطہ پرور عقیدہ ہے جس سے حامیان دین تین اور خادمان شریعت کو دور ہی رہنا چاہیے۔ ولی کا اطلاق قرآن حدیث کی روشنی میں ہر اس مرد مومن پر ہوتا ہے جو شریعت کا پیرو اور اعمال صالحہ کا حامل ہو۔ ولایت تصوف طریقت کا کوئی عہدہ ہو تو ہو تو شریعت نے اسے عہدہ قرار نہیں

دیا جب کہ نبوت ایک عہد ہے۔

یہاں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ تبصرہ ان الفاظ پر ختم ہے کہ فاضل مصنف اپنے موضوع کا حق ادا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اعراف

عبدالرحیم نشتر کا مجموعہ فکر و صفات ۱۱۲

• قیمت مجلد چار روپے پچاس پیسے۔

• ناشر: بی۔ بی۔ کے پبلیکیشنز ۳۰۷۲۔ پرنٹاپ سٹریٹ۔
دہلی ۷۱۔

ہے تو طرے واہی تباہی شہر کا رجم لیتے ہیں۔
عزیزی نشتر ایسے ہی تجربات سے متاثر نظر آئے۔ اور ظاہر ہے یہ تاثر شعوری و ارادی نہ ہوگا اسی لئے ان کا فی الحال یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم ان کے مجموعے سے چند اشعار نمونہ نقل کر کے پیش کرتے ہیں کہ وہ کچھ محسوس کر سکیں۔

(۱) پورھی اور کزدر ہوا میں لاتی ہیں آواز لہجے
سینے میں چٹکھاڑنا سورج بھڑوں چٹائیں روتی

(۲) میر بھی ہاتھوں چاند اور سوکھ کے دو ٹوٹے ہیں
مجھ کو بہر کمانے آئے ہو میں بھی تو بغیر ہوں

(۳) وہ اجنبی تری باہوں میں جو رہا شب بھر
کے خبر کہ وہ دن بھر کہاں رہا ہو گا

(۴) رات کیا جانے کیسے مینے گی
جا چکی اب تو آخری بس بھی

(۵) اچھا تو اس نے آپ کو یاد کیا ہے آج
پھر کیا ہے موج اڑائیے اچھی ہوا ہے آج

(۶) رنگوں میں قد کے مجھے شوخ چشم نے
اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنالیا

(۷) ذرت افکار میں سوکھے ہوئے پھولوں سے
کل تری یاد کے معنوب سولوں سے ملے

(۸) ایک حبشی کی طرح کالی سوچ
راتے میں بنی ہوئی ہے ارار

(۹) پان سے ٹھیلے ہو مل لوگوں کا جھگڑ
اپنے تنہا ہونے کا احساس بھی کیا

آغاز ہی میں شاعر کی تصویر یہی ہے لیکن وہ نہ ہوتی تب بھی کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نو عمر ہی ہوں گے۔ اگر انھیں کوئی سمجھ دار مشیر مل جاتا تو قینادہ شعورہ دیتا کہ ابھی صاحب دیوان بننے کا ارادہ نہ کریں بلکہ کسی سخن فہم رہنما سے وابستہ ہو کر اپنے اشعار کے خوب و محاسن کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کریں تاکہ یوں بے بجا جائے اور محاسن کو فروغ دیا جائے۔

کوئی شبہ نہیں کہ عزیزی نشتر کو خدائے ذہانت ملی ہے اور شعر کہنے کی استعداد بھی لیکن شاید غلط قسم کے ماحول اور خارجی محرکات نے انھیں صحیح رخ پر نشوونما کا موقعہ نہیں دیا اس لئے ان کی صلاحیتیں اپنا حقیقی سن نمایاں نہیں کر پا رہی ہیں۔ ویسے بھی چالیس سال سے بل شعور میں پختگی آتی ہی کہاں ہے۔

ترقی پسند شاعروں کی جدت پسندوں اور طباعوں نے دنیا کے شعروادب میں جو افراط و تفریط پھیلائی ہے وہ کی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نئے پن کا شوق پر آزادی کا ہیضہ جس طرح پپی ازم کو جنم دیتا ہے اسی طرح شعروادب میں جدت و بدعت اور نئے تجربات کا نون جب اعتماد سے گزر کر خلاؤں میں کود پھانڈ کرنا

گھنگھو کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کسی اجنبی کی بانہوں میں رات گزارنے والی فاحشہ ہی ہو سکتی ہے۔ پھر بھلا اسے اس سے کیا دلچسپی کہ اس کی رات کا ساتھی دن بھر کہاں رہا۔ ایسے شعر شاعر اور سامع دونوں کے ذہن و قلب کو تاریک کرتے ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے۔

۲۷۔ آخری بس چلی گئی تو اب صبح تک یا تو اسٹینڈر پکھڑے رہنے یا کسی ہوٹل میں جا سونے۔ آخر شاعری غریب کو بس اسٹینڈوں کی سیر کرانے سے کیا فائدہ۔ بس دل نے یوں کہا کہ ”بس“ کا قافیہ مزید اربے کا ہو جائے ایک شعر۔

۵۔ یہ بھی شعر نہیں ہے دل ٹلے ہے۔

۶۔ یہ شعر نہیں ہے چٹکلا ہے۔

۷۔ اس کا مطلب آپ خود ہی لوگوں کو بتائیں تو شاید دماغ میں اترے۔

۸۔ حیرت ہے ”ارار“ جیسا لفظ نظم کرتے ہوئے آپ کو ذرا محسوس نہ ہوا کہ یہ ار باب ذوق کے وجدان پر کیسا کاری زخم لگائے گا۔ ”کالی سوچ“ بھی خرافاتِ ذہنی میں سے ہے۔

۹۔ اس سے تو بہتر ہے کہ لطیفے گھڑے جائیں۔ شاعری کا ان بازیات سے کیا سروکار۔

۱۰۔ شعر بن سکتا تھا اگر دماغ پر جطرانزی کا سوڈا سوار نہ ہوتا۔

۱۱۔ یعنی ؟

۱۲۔ بری بات۔ خدا نسخے پن کا موضوع نہیں ہے!

۱۳۔ جو منہ میں آیا اگل دیا۔

مجموعے میں کچھ اچھے شعر بھی ہوں گے لیکن اعلیٰ درجے کی دیگ میں دس پانچ جو بے بھی بال دینے جائیں تو سوچ لیجئے کون کتنے نوالے کھائے گا۔

عزیزم شاعر کو ہمارا اخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ مزید چھپنے سے پہلے کسی متین اور ذی علم استاد کا دامن پکڑیں۔
والسلام۔

(۱۰) نیکے گناہوں کی سٹرکوں پہ گھوما کرو
شلتی جھم گناہوں سے جو ماکرو

(۱۱) جھلتی ہواؤں کے نيزوں سے حملہ کرو
سیہ پرتوں کے بدن کو برہنہ کرو

(۱۲) آواز دے رہا ہے اکیلا خدا مجھے
میں اسکو سن رہا ہوں ہواؤں کے کان سے

(۱۳) مرے کیا مجھے نیک بد سب برابر ہی ہیں
جو تم کو خداؤں کا ڈر ہو تو سوچا کرو

یہ بس صفحہ ۳۲ تک کے نمونے ہیں۔ آگے بڑھنے سے وجدان نہ نکار کر دیا۔ یہ فی الحقیقت اشعار نہیں ہیں بلکہ کوئی ایسی چیز ہیں جن کا مناسب نام اب تک کی کسی ذخیرہ میں نہیں پایا جاتا۔ ذوقِ لطیف اور وجدانِ سلیم کے لئے ان کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے چھت پر پڑے ہوئے بین پر جلی کے بچے روٹے پھر پھینک رہے ہوں۔ فن اور تواضع زبان کے اعتبار سے فرداً فرداً ایک سرسری نظر ڈالنے۔
دہارا خطاب عزیزی شاعر سے ہے)

صفت اور موصوف میں کوئی فکری یا مشاہداتی مناسبت نہ ہو تو کم سے کم قیاسی اور تصوراتی مناسبت ہو۔ ہواؤں کو بوڑھا پے اور کمزوری کا موصوف بنانا بس مسخرہ پن ہے۔ ادب سے اس کا کیا تعلق۔ چٹکھڑنا آواز کی اقسام میں سے ہے۔ سوچ کا آواز سے کیا واسطہ۔ پھر یہ سوائے فضول گوئی کے اور کیا ہے کہ سوچ سینے میں بھریں۔ مزید فضول گوئی یہ کہ چٹائیں تو روں۔ ان باتوں میں کیا ربط اور کیا سنجیدگی ہے۔

۲۔ دوسرے شعر میں مفہوم ہی غائب ہے۔ ”یہ میرے“ کون ذات شریف ہیں جن کے ہاتھوں میں چاند اور سورج کے دو ٹکڑے ہیں۔ کون بہکانے آیا ہے کیوں آیا ہے۔

۳۔ تیسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کسی طوائف سے

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

• تالیف :- اقبال حسن خاں ایم۔ اے۔ ایم۔ ٹی۔
 ایچ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) لکچرار شعبہ شریعتی دینیات
 • بڑے ۴۷۵ صفحات • لکھائی چھپائی معمولی •
 قیمت درج نہیں • شائع کردہ :- علی ٹھکرہ مسلم یونیورسٹی

جنگ آزادی کے ابتدائی دور میں دہلی کے ایک درویش صفت عالم اور مجدد مجاہد محمود الحسنؒ نے جو غیر معمولی شہرت پائی اس سے پچھلی نسل کے بچے کچھ لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ قوم نے اس فرد فرید کو شیخ الہند کا خطاب دیا اور یہ خطاب اس کی شخصیت پر ایسا چسپاں ہو گیا کہ نام سے بڑھ کر خطاب کی دلوں میں جگہ دی گئی۔ متعدد کتابیں اس تاریخی شخصیت پر پہلے سے موجود ہیں لیکن اقبال حسن صاحب نے تنویر سے زائد کتابوں اور جریڈوں میں دیدہ ریزی کرنے کے بعد یہ بڑا جامع تذکرہ مرتب فرمایا ہے جس پر انھیں علی ٹھکرہ مسلم یونیورسٹی نے بجا طور پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔

موصوف کا طرزِ تحریر سلیس و دلکش ہے مضامین کا درجہ برت بھی خوب ہے۔ ترتیب یوں ہے کہ داستان انگریزوں کی ہند میں آمد سے شروع کی گئی پھر تحریک دلی الہی کے ضروری گوشوں کو روشنی میں لاتے ہوئے شیخ الہندؒ کے تذکرے کا آغاز ہوا۔ ان کے خانہ دانی احوال۔ ان کی علمی خدمات۔ ان کے افکار و خیالات۔ ان کی خاموش سیاسی سرگرمیاں۔ ان کی قید و بند کی جھلکیاں اور پھر رہائی کے بعد ان کی مختصر لیکن ستیزہ کار زندگی کی تصویر کشی۔ جو تحریک عام طور پر ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہے اس کی تفصیلات اس کتاب سے زیادہ شاید کہیں کیجائے نہیں۔ اندازِ بیان اور دروہت اتنا اچھا ہے کہ شرف سے آخر تک دل چسپی

کیاں طور پر قائم رہتی ہے۔ ہم فیاض مصنف کو ان کی کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

البتہ تفہیم پر کچھ اور توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ کتابی غلطیاں بہت ہیں جن میں بعض بڑی بے ڈھب ہیں۔ جیسے ص ۲۳ پر العلم حجاب اللہ شخصیں آیہ امانہ حجاب الکبر ہو نا چاہیے تھا۔ یا مثلاً حضرت شیخ الہندؒ کے نواسے سمنوں کا نام سمنون چھپا۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی قاری اس غلطی کی تفہیم نہ کر سکے گا۔

حضرت مغفور کے حلقہ بگوشوں میں ایک مولانا تھے عزیز گل۔ ان کا نام کتاب میں دیوین جگہ آیا ہے لیکن فقط دو جگہ شیخ الہندؒ کے خطوط میں تو صحیح کتابت ہوا باقی تمام مقامات پر عزیز گل طبع ہوا۔ اسے کتابت کی غلطی کہنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے فیاض مصنف ہی کو غلط فہمی ہوئی ہے چنانچہ جہاں یہ نام باقاعدہ جلی عنوان پہلے وہاں بھی عزیز ہی لکھا گیا ہے۔

ایک اور سہو وہاں محسوس ہوا جہاں شیخ الہندؒ کے ممتاز شاگردوں کے حالات مختصر بیان ہوئے ہیں۔ خاتم المحدثین مولانا انور شاہ کا شمیرتی بھی ان ہی کے شاگرد تھے۔ ان کے اوصاف میں ذہانت و فطانت، شوقِ تعلیم اور نقاہت کا تذکرہ آیا لیکن اس مخصوص وصف کا ذکر نہیں آیا جس میں وہ اپنے زمانے کے فرد فرید تھے یعنی حفظہ ضبط۔ روایات ثابت کرتی ہیں کہ یادداشت کے معاملہ میں وہ قرنِ اولیٰ کے محدثین رحمہم اللہ کا نمونہ تھے اور مبالغہ نہ ہو گا اگر یہ کہا جائے کہ کیا شیخ الہندؒ اور کیا مولانا محمد قاسم کوئی بھی اس خداداد صلاحیت میں ان کا ہم صف نہ ہوا۔ مولانا محمد قاسمؒ کی انفرادیت ان کی بے پناہ ژرف نگاہی، دراکی اور باریک بینی میں ہے۔ فہم و فراست کا ہمالیائی پیکر۔ حضرت شیخ الہندؒ کی انفرادیت ان کی اولو العزمی میں ہے۔ ضعیف و لاغر جسم کے اندر بہارِ حیات و صبر و ضبط اور عزم و حوصلہ کا حیرتناک نمونہ۔ حضرت شاہ صاحب کم و بیش ٹیپ ریکارڈ حیا حفظ و

جس کے حوالے سے یہ حکایت آئی ہے۔ اگرچہ مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے متقی عالم اور وسیع المطالعہ استاد کی تالیف ہے لیکن رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ ممدوح مولف کی سادہ دلی اور نیک طبعی نے بہتیری ایسی روایات کو قابل اعتماد مان لیا ہے جن کی ثقاہت شدید طور پر مشتبہ ہے۔

بہر حال داغ توجانہ میں بھی ہیں۔ انسانی کارنامہ بھلا خامی سے پاک کب ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال حسن صاحب کی یہ کتاب ہر لائبریری کی زینت بننے کی مستحق ہے خاتمے پر کتابیات کے عنوان سے انھوں نے آخذ کی کجائی فہرست بھی دیدی ہے اور ہر صفحے پر خرا دی خرا دی بھی حوالے دیتے چلے گئے ہیں۔

منظر رکھتے تھے۔ اس صفت خاص کو ان کے تذکرے میں ضرور آنا چاہیے تھا۔ باقی اس میں کوئی شک نہیں کہ تفقہ نقوی، ذہانت و فطانت اور علوم دینیہ سے یہ تمام حضرات بفرق مراتب مرصع تھے۔ طاب اللہ سر اہم۔

صفحہ ۱۲ پر ایک جہاد کے تذکرے میں مولانا محمد تاج کے بارے میں یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

”کنڈی پر ایک گولی بھی لگی مگر عجیب بات ہے کہ گولی گنے سے کپڑے تو خون سے تر ہو گئے لیکن چند لمحوں بعد عمامہ اتار کر دیکھا تو ہمیں گولی کا نشان تک نہ تھا۔“

دوسرے تمام وقائع اور حکایات کی طرح فاضل مولف نے حاشیہ میں اس کا بھی ماخذ اگرچہ بتا دیا ہے لیکن اچھا ہوتا اگر وہ اس حکایت کو شامل کتاب نہ کرتے۔ سوارخ خامی۔

ہندوستان کے گوشے گوشے میں مقبول، اور انتہائی پابندی وقت سے شائع ہونے والا
آپ کا پسندیدہ ماہنامہ ”ذکرِ رام پور پرنے دو سو سال کے اعتبار پر“

دعوتِ اسلامی کی تاریخ

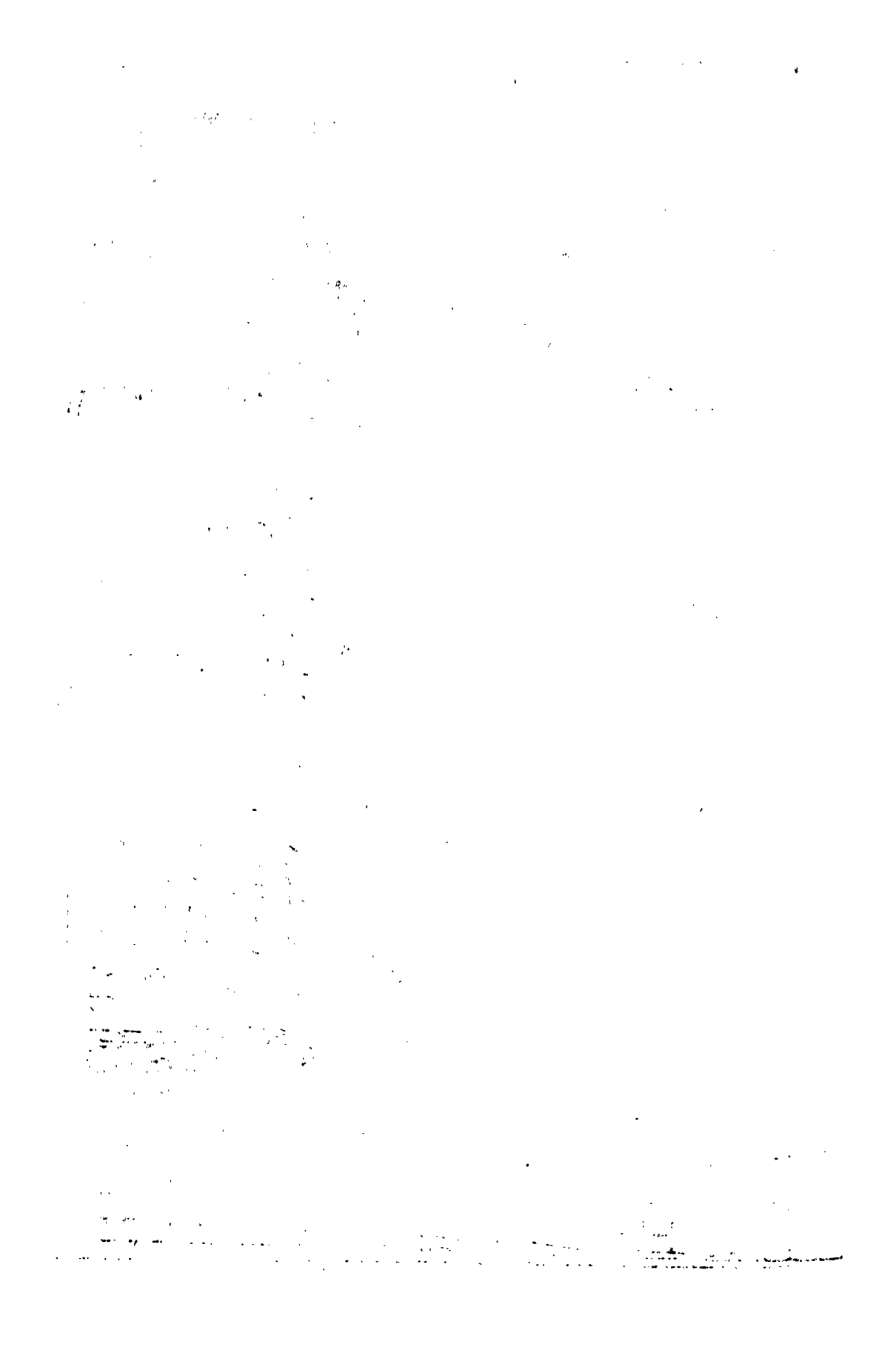
نمبر نمبر میں منظر عام پر آ رہا ہے
۱ دعوتِ اسلامی کے مختلف گوشوں کی دل نشیں وضاحت ۲ دعوتِ اسلامی کی ایمان انسر و تاریخ
۳ ایمان حق کی پاکیزہ زندگیوں کی جھلکیاں اور ولولہ انگیز کارنامے۔ رنگارنگ دلچسپ پرسوز اور انتہائی مفید مضامین

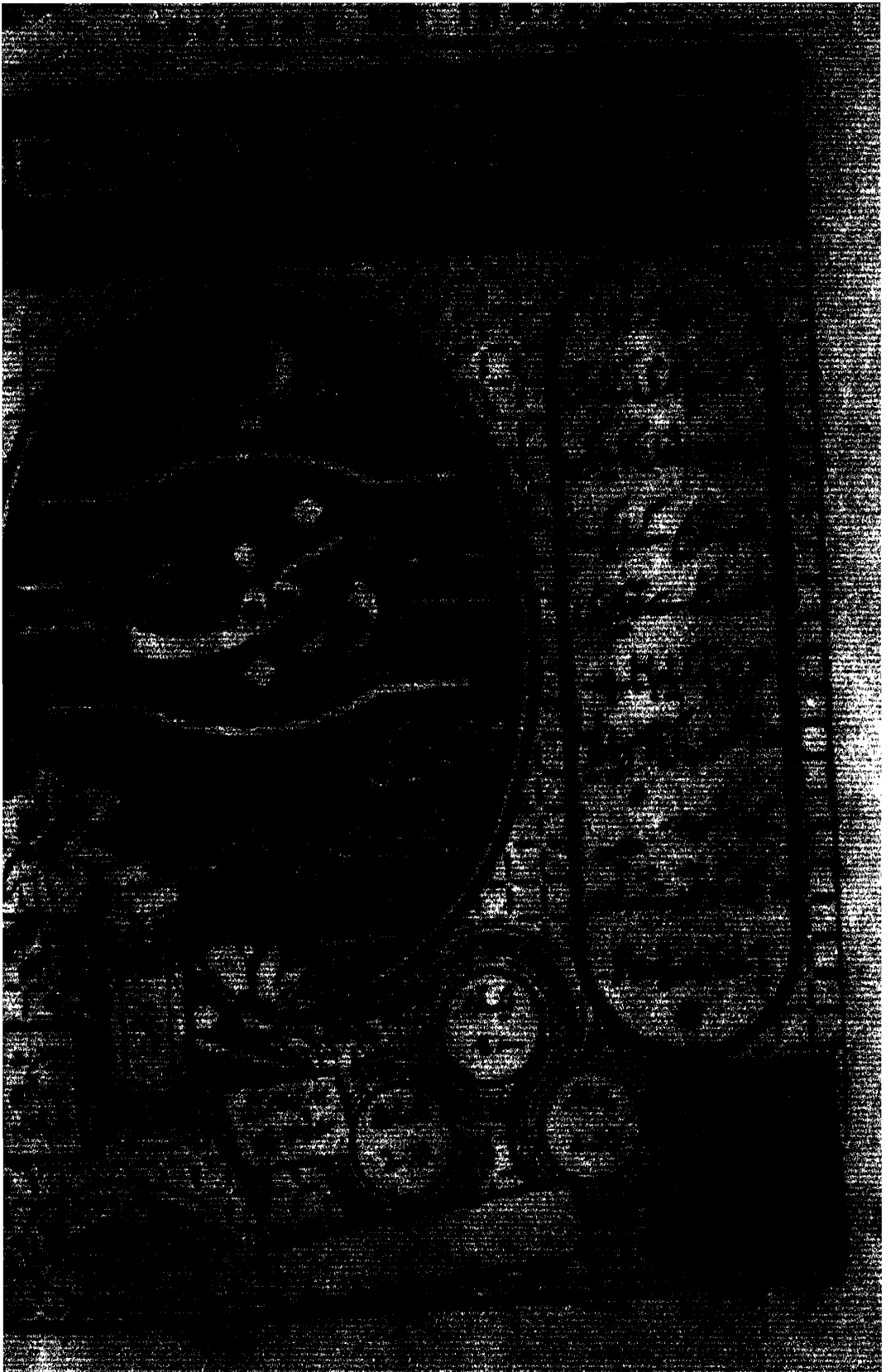
شہرِ اہلِ تسلیم کی محاورات۔ لکھ نذر۔ گادآؤ بزمِ رخ۔ آپس میں کس کے کد مت دن کا جذبہ رکھنے والے ہر کارکن کے ہاتھ میں اس کا پورا نذر ہے جس میں دل کش فائیل، سیاری طبابت و نباتات، تیرت صحت چار روپے۔ سالانہ خریداروں کو یہ عظیم نذرانہ کے سالانہ چھپنے میں مدد ملے گا اور یوں فرصت میں اپنے توبہ کی ایکٹ کے یہاں اسی کو اپنی تحفہ کو لیں یا بڑا دوست بہت شغریں سالانہ نذر تحفہ صحت پندرہ روپے (Rs. 15/-)

(244901)

پتہ: ماہنامہ ذکرِ رام پور پرنے

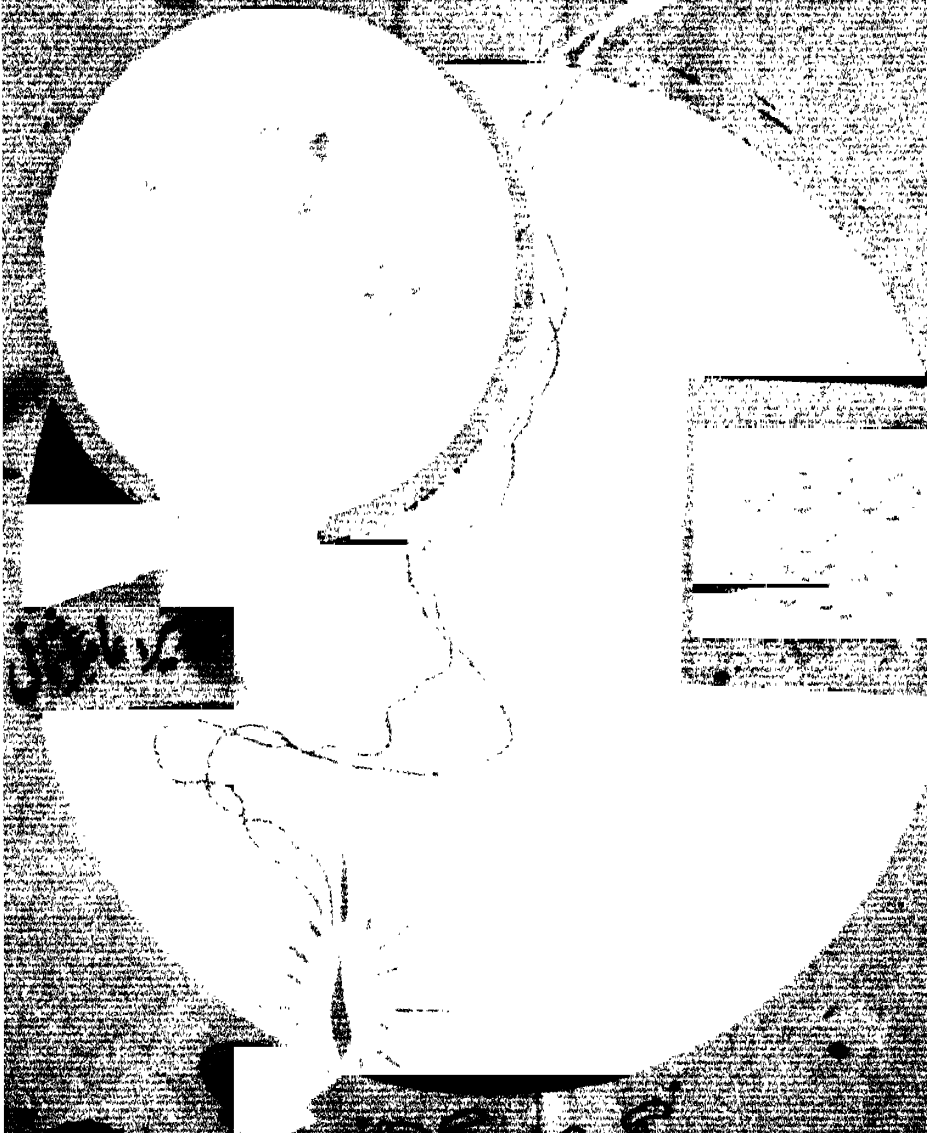
دی لی سے منگوائیں تو دی پی پی پی مع مصارف
کل سولہ روپے پچیس (16/25) روپے کی ہوگی







25 NOV 1945



10-4-2



10-4-2

17021



بسم اللہ الرحمن الرحیم

امریکہ - انگلینڈ - ناہیریا - کینڈا - جس -
انڈونیشیا اور ملیشیا سے بذریعہ بحرہ ادک
ڈیوٹنڈ - بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پلڈ -
بحرین افریقہ - سعودی عرب قطر بحرہ سے
بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ و سٹنگ -
بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ

فہرست ماہ نومبر ۱۹۷۷ء

۲	ادارہ	احوال و اتعی
۵	عام عثمانی	آغاز سخن
۱۵	مولانا ابوالاعلیٰ موددی	تفسیر القرآن
۱۹	عام عثمانی	تجلی کی ڈاک
۲۳	عام عثمانی	تفسیر امجدی
۳۷	دعوت الہدایہ (حیدرآباد)	پردہ اور حدود حجاب
۳۳	حبیب ریحان ندیم	دین و شریعت کے تقاضاں
۳۳	(دلیلیا)	پہچان دے چار گروہ
۵۳	عام عثمانی	خندہ یا خود رو؟
۵۷	(دارالعلوم دیوبند) - ندوۃ العلماء کتب خانہ	قادیانیت
۵۹	ملا ابن العرب کی	سجدہ سے مختلف تک
۷۴	عام عثمانی	کھرب کھوٹ

اگر

اس دائرہ میں سرخ
نشان ہے تو کچھ لہجے اس پر چہرہ پر آب کی
خریداری ختم ہے - یا تو منی آرڈر سے سائنٹ
بھیجیں یا دیوبند کی اجازت دیں اسندہ
خریداری جاری نہ کھنی ہو تب بھی مصلح
دیں - فائوٹھی کی صورت میں اگلا چہ
دیوبند سے بھیجا جائے گا جسے وصول کر آپکا
اخلاقی نسخہ ہوگا -
دیوبند میں رہنے کا ہو گا منی آرڈر
بھیج کر آپ دیوبند میں جج ہوں گے -

تجلی دیوبند

چھبیسویں سال کا ساتواں شمارہ

ایڈیٹر
عام عثمانی

سالانہ قیمت

پینس روپے

اس شمارے کی قیمت - دو روپے

اسلامی پریس - دیوبند

جواب میں ایک شائع کی جا رہی ہے۔ اس اطلاع سے خوشی ہوئی ہم نے شوق سے اس کتاب کے منتظر رہیں گے۔

اگلے شمارے میں

(۱) "قادیان" کے سلسلے میں روزنامہ الجمعیتہ کے سابق ایڈیٹر جناب محمدان فاروقی کا ایک مضمون ماہنامہ شریعتان میں شائع ہوا ہے۔ یہ امرت کے اجماعی اور قطعی موقف کے خلاف ایک جہانہ اور غیر عالمانہ نقطہ نظر پر مشتمل ہے لہذا اس پر نقد کیا جائے گا۔

(۲) مولانا الاعلیٰ مودودی کا ایک تازہ مضمون "قادیانی مسئلہ اور اس کا محکم حل" ابھی ان کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے اسے ہم ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔
تجلی منتقل کالم اپنی جگہ بدستور۔

ڈاک کا نظم

کچھ دن سے ڈاک کا نظم عجیب طرح کی برہی کا شکار نظر آرہا ہے۔ دایہاں سے پورے سوا میل بھی دور نہیں لیکن ہاں کے بعض خطا یہاں دس بارہ دن میں پہنچے اور یہاں کے دہاں پندرہ دن میں۔ جو تھے روز پہنچا تو اکثر ڈیڑھ گھنٹہ کی قسمت لگ گیا ہے۔ حالانکہ ٹرین صرف پانچ گھنٹے میں یہ فاصلہ کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب راجدھانی کا حال یہ ہے تو ملک کے دوسرے شہر و دیار کا حال زیادہ بہتر کیا ہوگا۔ پرچہ بعض لوگوں کو بہت دیر میں پہنچتا ہے یا نہیں بھی پہنچتا اور اور وہ دفاتر کا اتنی خطوط لکھتے ہیں تو ان کی تعمیل بروقت نہیں ہوتی کیونکہ وہ معمول کے مطابق پہنچتے ہی نہیں مگر خطوط لکھنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بہت جلد ہی کا نشانہ بنے۔ اس ناپسندیدہ صورت حال سے ادارہ در و درمیان میں مبتلا ہے یہ سطور ہی مقصد سے لکھی گئی ہیں کہ شائقین ہماری معذرتوں سے آگاہ رہیں۔ وہ خود انصاف فرمائیں کہ ادارہ کس حد تک قصور وار ہے۔

احوال واقعی

پچھلا شمارہ جمع وقت پر شائع ہوا لیکن یہ شمارہ پھر کچھ لیٹ ہو گیا ہے۔ وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بجلی کا حال پہلے سے بھی کچھ ابتر رہا اور چھاپائی پر وگرم سے مطابقت نہ ہو سکی۔ لہذا اگر سے حال مزید ابتر نہ ہو تو امید ہے کہ اگلی اشاعتوں کا نظم درست چل سکے گا۔

چوہاری ایک بھول

تجلی طلاق نمبر میں ۱۳۸۷ھ پر ہم نے مولانا شمس ریزادہ پر اعتراض کیا تھا کہ سرفلسفۃ القرطبی والی روایت مسلم شریف میں موجود ہی نہیں ہے جب کہ آپ نے حوالہ مسلم کی کا دیا ہے۔ چند روز ہوئے مولانا موصوف کا ایک مراسلہ میں ڈاک سے موصول ہو جس میں انھوں نے وضاحت کی ہے اعتراض درست نہیں۔ یہ روایت مسلم میں موجود ہے البتہ ایک ان سے یہ ہوتی ہے کہ حوالہ "مسلم کتاب الطلاق" کا ہے لہذا میں حالانکہ یہ روایت "کتاب النکاح" میں آئی ہے۔

ہم ان کا پورا مراسلہ ہی شائع کر دیتے لیکن پرچہ مرتب و چکا بس یہی صغیر زیر تکمیل ہے لہذا بات اگلے ماہ پر اٹھا لکھنے کے بجائے ہم نے اپنے الفاظ میں ہمیں ان کے مراسلہ کا لاصہ بیان کر دیا۔ کون جانے اگلے ماہ تک ہم زندہ بھی رہیں نہ رہیں۔ اپنے کسی تصور سے آگاہ ہو جانے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جلد از جلد اس کا اعلان کر دیا جائے۔ مولانا موصوف کو جو تکلیف اس تصور سے پہنچی ہے اس کے لئے ہم معذرت ادا ہیں لیکن یہ بہر حال ظاہر ہے کہ تصور کا باعث ان کا غلط الذہن بنا ہے۔ ویسے نفس بحث پر اس تصور کا کوئی اثر نہیں۔ اس روایت پر ہم نے ہر پہلو سے بحث کی ہے جو چوہاری نسبت میں کافی شافی ہے۔ مراسلہ میں یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ جو معارضہ تجلی نے موصوف کے مقالہ پر کیا تھا اس

آغازِ سخن

لیکن تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ اہل حدیث بزرگوں کی تنقید و تعقب کو ذوق و شوق سے پڑھنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ یہ حضرات علمائے اہل حدیث ہیں اور گالی دیتے ہیں پہلے۔ کم سے کم ہم ناچیز کے معاملہ میں تو بارہا ان کا یہی ٹیکہ رو دیتے رہا ہے چنانچہ ان کی پاکیزہ گل افشانیوں کا جواب تو ہم کیا دیتے صرف پڑھنے ہی پڑھنے میں دماغ کی کیفیت ہو جاتی ہے جیسے گردن پر سر کی جگہ پتھر رکھ دیا گیا ہو۔ حالانکہ تجلی کے قارئین خوب واقف ہیں کہ خشک موضوعات سے ہم بھاگتے نہیں۔ تحقیق و تائید سے گھبراتے نہیں، مگر بے ٹرمی قسم کا لہو اور بے ہنگم قسم کی صلید آوازوں سے دلچسپی لینا ہمارے لئے اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی بھدی آواز والے قوال سے قوالی سنانا۔

پھر بھی دل پر چہرہ اور دھواں پر رو بہ دستی کر کے مذکورہ مضمون ہم نے پڑھ ہی ڈالا۔ مضمون سے قبل

تجلی ”طلاقِ نسب“ کی اشاعت سے قبل ہی ہمیں اندازہ تھا کہ اور کوئی ہمارے بالمقابل سن بچت سچائے یا نہ سچائے مگر اہل حدیث میں سے کوئی بزرگ یقیناً یہ خیریت انجام دیں گے اور یہ بھی یقین تھا کہ ان کا علم کلام اور انداز گفتگو اور لب و لہجہ ان کی گہری اور مسلکی روایات کے مطابق ہی ہو گا۔

اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا اور ۱۱ ستمبر کے ترجمان (دہلی) میں یہ جلی عین ان نظر آ ہی گیا۔ ”مدیرِ تجلی اور ایک مجلس کی تین طلاقیں“

ہم ان لوگوں میں ہیں جو اپنے خلاف شائع ہونے والے مضامین بھی پڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور یہ نیت رکھتے ہیں کہ معترض نے جو بھی بات حق و صواب اور عدل و معقولیت کے مطابق کہی اسے بلا تامل مان لیں گے اور اپنی اس غلطی سے رجوع کا اعلان کر دیں گے جسے دلنشین دلائل سے واضح کر دیا گیا ہو۔

سرپرست جھاڑ دیں۔ یا اس کے ہال پر کہہ کر بھیج لیں۔
بہر حال جس اعلیٰ معیار کی شائستگی اور شیریں
کلامی سے فاضل مدیر نے کام لیا ہے اس کے کچھ
نمونے یہ خدمت ہیں تاکہ عام عثمانی کی دہات
تحریریں پڑھنے والوں کو پتا چلے کہ پاکیزہ و فائز
اور شریفانہ نگارشات کتنی چھوٹی ہیں۔

فرمایا گیا:۔

” زبان و قلم کہ آداب صحافت و انشاء
کے تقاضوں سے بالکل آزاد رکھنے والے
مولانا عامر عثمانی صاحب نے اس مسئلہ پر
اپنے مجلہ تجلی کا ایک ضخیم نمبر شائع کر دیا جو
زبان و بیان کے ایسے ایسے ”شاہکار“ بھی
اپنے آثار سمونے ہوئے ہے جن کے سامنے علامہ
دربار ادبی، مولانا محمد میاں وغیرہ برابر
تجلی کے بازاری فقرے بھی بیچ ہیں“

مولانا محمد میاں کی کتاب ”شواہد نقایس“
پر جو تنقید ہم نے کی تھی وہ تو ایرانی بات ہوئی۔ تاہم
بات یہ ہے کہ مولانا دریا با دی شکی ”تفسیر ماجاری“
پر تبصرہ مستقل مضمون کی شکل میں جہینوں سے تجلی
میں چل رہا ہے اور زیر دست شہلے میں بھی اسکی
قسط موجود ہے۔ اس میں کہاں کہاں بازاریت
پائی جا رہی ہے اس کی بھی نشان دہی ہمارے کرم فرما
فرما دیتے تو بہنوں کا بھلا ہوتا۔ نہیں فرامانی تو قارئین
تجلی خود ہی ایک باز تکلیف کر کے اس تبصرے کی
تمام قسطوں کا جائزہ لیں اور بلا در عایت فیصلہ
دیں کہ اگر یہ انرا نہ تحریر ”بازاری“ ہے تو ”غیر بازاری“
تحریریں دنیا کے کس خطے اور گوشے میں پائی جاتی ہیں۔
ہمارے علم کی حد تک نالائق عامر عثمانی کی

بازاریت اور بد تمیزی اور نالائقی شاید یہ ہے
کہ وہ نہ تو گول مول باتیں کرتا ہے نہ اجمال و اختراعت
کا عادی ہے۔ صاف کہتا ہے، دیکھ کی چوٹ کہتا ہے

جہان کے بہت ہی لائق مدیر جناب عبدالحمید رحمانی
بخلہ لعلی نے ایک طویل نوٹ بھی دیا ہے جو بچائے
دائیک مضمون ہے۔ اسے بھی کسی نہ کسی طرح چھلے سو
را۔ اس پر افس مضمون پر تنقید ہمارا مقصود
میں آج کی صحبت میں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے
ہیں کہ نالائق مدیر تجلی کو بد زبان، ہرزہ سرا، بغیر
اری، سیاہ قلب اور ادب و شائستگی سے
روم قرار دینے والے محترم اساتذہ کی اپنی تہمت
تسلکی کیا ہے۔

تجلی نقاد و نظر تیز۔ تجلی طلاق نمبر اور اس سے
شمارہ۔۔۔ تینوں میں طلاق ثالث کی بحث پھیلی
تی ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہم نے کوئی بات
بیل نہیں کہی۔ کوئی دعویٰ بے ثبوت پیش نہیں کیا
ہو جاہل یا خائن کہا تو اس کی جہالت و خیانت
نورے بھی سامنے لائے۔ کوئی گوشہ مجل نہیں چھوڑا
شق کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔

اگر ترجمان کے کثیر المناقب مضمون نگار جناب
انارمیس الاحرار راوی اپنے مضمون میں مدیر تجلی
نام علم کلام کا معقول رد پیش فرما دیتے تو اس کے
بے شک انھیں حق تھا کہ اسے نالائق، ہرزہ سرا
بان اور بے عقل جو چاہے کہہ گزریں، اور مدیر
بان کو بھی حق تھا کہ اسی طرح کے خطا بات و
اب پر مشتمل ایک پورا مضمون زیب زطاس
دیں۔ لیکن کرم یہ کیا گیا ہے کہ مضمون کے آغاز
بیل ہی مدیر ترجمان نے عامر عثمانی کے لئے لے

لئے لے ڈالنے کا مطلب شاید نئی نسل کی سمجھ میں
نہ لے لینا کہتے ہیں آڑے ہاتھوں لینے کو اور
بے ہاتھوں لینے کا مطلب سمجھ ایسا ہے جیسے کوئی
فی آدمی چلا جا رہا ہو اور آپ پیچھے سے اس کے

جو غیر ذمہ دار اور بے سلیقہ لوگوں کے سوا کسی گزیر نہیں دے سکتا۔ تجلی کے رسولؐ نے نانہ کالم ”مسبحہ میخانے تک“ پر اگر عام عثمانی کا نام ہوا کرتا تب تو اس مسخ کا کوئی سر نہ پڑھتا لیکن سب جانتے ہیں کہ اس پر بحیثیت کالم نگار ملّا ابن العربی کا نام ہوتا ہے۔ موصوف نے کسی ثبوت و ثبوت ہادت کے بغیر یہ قطعی فیصلہ کر دیا کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی ہیں۔ حالانکہ سنجیہ اور با سلیقہ لوگ محض اپنے ظن و تخمین کو قطعیت کے ساتھ ظاہر نہیں کیا کرتے۔

علاوہ ازیں بحث ایک سنجیہ علمی مسئلے کی تھی — یعنی طلاق ثلاث کی۔ اس ریل کشائی کرتے ہوئے خواہ مخواہ ”مسبحہ میخانے تک“ کا ذکر دیمان میں لانا کیا اس بات کا قرینہ نہیں ہے کہ اصل مسئلے سے زیادہ محترم مکرم کو نالائق عام عثمانی کی ٹانگ ٹھیسٹنے سے دلچسپی ہے اور موقعہ ہونہ ہودہ اسے ہدفِ ملامت ضرور بنانا چاہتے ہیں۔ شاید ان کے یہاں اسی رویہ کا مقایس نام شائستگی اور متانت ہوگا۔ آگے ارشاد ہوا:-

”طلاق نمبر شائع ہونے کے بعد کئی دوستوں

نے مجھ سے کہا کہ اس کا جائزہ لینا ضروری

ہے مگر میں اس کی لاٹائل بحثوں کے پیچھے اپنا

وقت ضائع کرنا فضول سمجھتا تھا“

یعنی کہاں عام حمیال غورنگار طفل مکتب ادب کہاں درجہ علیا کے استاد اور ترجمان جیسے عظیم المرتبت جریہ کے، یہ جو خوش تہا بیر! — واقعی بات تو انھوں نے درست کہی۔ وہ علم، تقویٰ، بردباری سب میں ہم سے بڑھ چڑھ کر ہیں اور وہی کیا ہم تو ان کے شاگردوں سے بھی اپنا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم عالم نہیں بلکہ علماء کے خوشہ جبین ہیں۔ ہمیں تقویٰ سے کیا نسبت جب کہ دامانِ عمل گناہوں اور بے توقیروں کے کچھڑے سے

اتہام نہیں تراشا تاہم الزام کے دلائل و شواہد بھی پیش کرنا چاہیے۔ جاہل کچھ کا تو جہل کا نمونہ بھی سامنے رکھ دے گا اس کا یہی جرم بہتر سے بزرگوں کو بہت کھلتا ہے اور اہل حدیث کم فرما بھی غالباً اسی پر چارغ پائیں۔ مزید سنئے۔ کہا گیا:-

”بیچائے عام صاحب اپنی طبیعت سے

مجبور نہیں۔ وہ ایک طرف تو حکومت الہیہ

قائم کرنے کے لئے ”مسبحہ میخانے تک“

کا چکر لگانے رہتے ہیں اور اس راہ میں اتحاد

ملت کا ایسا بلیغ و عطر فرماتے ہیں کہ سادہ

روح اہل حریث عوام تک سر دھننے لگتے ہیں

اور جب اپنی فطرت و عادت سے مجبور ہو کر

وہ تقلید و عجز کی حمایت پر اترتے ہیں تو

کڑی اور شوقِ نیمبوی سے آگے بڑھ

جاتے ہیں“

دیکھ رہے ہیں آپ۔ یہ ان محترم مدیرِ ترجمان کی نگارش ہے جو عام عثمانی پر باز اربیت کی پھٹی کتے ہیرا دار دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم اہل حریث کی تحریریں نہایت متین، عالمانہ اور شائستہ ہیں۔

انصاف کیا جائے ”حکومت الہیہ“ کی اصطلاح کبھی جماعتِ اسلامی نے اختیار کی تھی۔ اس سے اسکی مراد وہ حکومت تھی جو اپنے حیطہ اقتدار میں اسلامی قیامین رائج کرے۔ عام عثمانی کا قصور یہ ہے کہ اس نے اس ”مراد“ کی تحسین و تائید کی۔ یہ قصور کم سے کم دینداروں کے نزدیک تو ایسا نہ ہونا چاہئے کہ وہ محکمہ اڑائیں۔ ہمارے نزدیک تو ہر سچے مسلمان کے عین ایمان کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ وہ غیر اسلامی قوانین سے گریز کرے اور تمنا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کا یوں بالاکردے۔ اس تمنا کو مسخ کا نشانہ بنانا کیا واقعی متانت اور ثقاہت سے کوئی واسطہ رکھتا ہے پھر مسخ میں بھی مدیرِ مکرم ایسا انداز اختیار کر گئے

ہم تو اس صورت حال پر اعتبار کر لیں کیونکہ
احسن ہیں لیکن کوئی عقل والا بھی اسے خفیہ استہزاء
سے زیادہ کسی شے کا مستحق سمجھ کر بہت مشکل ہے
ترجمان جیسے سیکڑوں پرچے ہندوستان جنت نشان
کے گلی کوچوں سے نکلتے ہیں۔ یہ سب بھی ایک دوسرے
کے حامد معاون ہو جائیں تب بھی ایسے کسی سیکڑے ٹیٹ
کی عمارت نہ بن سکے گی جس میں مختلف مکاتب فکر
والے ہمہ وقت من میں سما کر بیٹھیں اور آمد مسودا
کا مطالعہ فرما کر فیصلے دیا کریں کہ فلاں کو شائع
کرنا اور فلاں کو ردی کر دو۔

جس مقالہ کو، بریکرم انتہائی ذبیح اور علمی و تحقیقی
قرار دے رہے ہیں اس کی بھی کچھ جھلکیاں دیکھی جائیں
تو کچھ حیرت نہیں۔ بسم اللہ یوں ہوتی ہے۔
”یہ معلوم ہے کہ احادیث نبویہ اور مسلک
اہل حدیث کے خلاف منکرین حدیث کے ملحق
جلی ہوتی ہر زہ سہرائی و لغو طرازی ماری
تجلی دیوبند کا شیعہ و شعار ہے۔ وہ احادیث
نبویہ و علمائے حدیث و مسلک حدیث کی خلاف
زہرافاشی کے بے حد شائق بلکہ عادی
ہیں۔“

دیکھ لیجئے کیا ہم نہ کہتے تھے کہ یہ حضرات گالی
پہلے دیتے ہیں بات بعد میں کرتے ہیں۔
ہرزہ سہرا۔ لغو طراز۔ زہرافاش۔ کتنی بڑبڑاری
اور پاکیزگی ٹپک رہی ہے ان خطابات سے۔ پھر مزید
لطف و کرم یہ کہ مامر عثمانی کی منکرین حدیث سے بھی
مشابہت دے ڈالی۔ جزاک اللہ عطا لے تو یہ بھائے تو
اب ہم کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ ایک ایسے عجیب و غریب
زمانے میں جبکہ قبروں کی بوجا اور دعویٰ کو حد تک
میں مفاہمت و مصالحت کر لی گئی ہے۔ کوئی انہونی
انہونی نہیں کہی جاسکتی۔

لت پت ہے۔
لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تجلی کا طلاق
نمبر لا طائل بحثوں کی پوٹ تھا اور اس کے پیچھے پڑتا
ممدوح کی مانگت میں وقت ضائع کرنے کے مراد
تھا تو آخر یہ کیا ہوا کہ مولانا نہیں الا حرار کا مضمون
آتے ہی اسے بڑے ذوق و شوق اور طرراق سے فوراً
شائع کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ احساس کہاں گیا
کہ لا طائل بحثوں کے پیچھے کیوں وقت ضائع کیا
جائے۔

احساس شایہ موصوف کو بھی ہوا کہ اس تضاد
کو محسوس کر لیا جائے گا چنانچہ اس کا دفیہہ روح ذیل
عبارات سے کیا گیا ہے۔

”اسی اثنار میں ہمارے دوست مولانا نہیں الا
ندوی مدرس مرکزی دارالعلوم بنارس کا
درج ذیل مقالہ اشاعت کے لئے آگیا جو
علمی اور تحقیقی اعتبار سے انتہائی ذبیح
ہے، ہم اسے احباب و مخلصین و مختلف
مکاتب فکر کے روشن ضمیر دوستوں کے
اصرار پر بالاقساط شائع کر رہے ہیں۔“

سمجھ آپ، بریکرم اپنے قارئین کو کیا بتانا
چاہتے ہیں۔ بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ تجلی کی بحثیں
محض بکواس ہیں اور ان پر متوجہ ہونا وقت کا ضائع
کرنا ہے لیکن ہمارے ادارہ ترجمان میں ہر وقت مختلف
مکاتب فکر والوں کی بھڑکنی رہتی ہے۔ ادھر کوئی مقالہ
ڈاک سے آیا اور ادھر ان حضرات نے اسے پڑھ کر
اپنی رائے ظاہر کی۔ اس مقالہ کا مسودہ جب ان
حضرات نے پڑھا تو وہ جھوم اٹھے، دبا میں آگئے کہنے
لگے کہ اسے ضرور چھاپو۔ اب ہم ان سے کیا کہتے کہ
تجلی کی بکواس پر التفات کرنا بوالغضوبی ہے قیمتی
وقت کی بربادی ہے۔ مجبوراً چھاپنے ہی کا فیصلہ
کر ڈالا۔

اور فرمایا گیا :-

”یہ تجلی بظاہر ایک تقلیدی پسند خفی المذہب صاحب قلم دیوبندی مولوی ہیں۔ موصوف اپنے تقلیدی مذہب کے سرگرم داعی و مبلغ بھی ہیں۔ اسی بنا پر خفی و اہل حدیث کے مابین اختلافی مسائل و مباحث میں اپنے تقلیدی موقف کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے زور قلم صرف کرنے کے عادی ہیں موصوف اپنے تقلیدی پرست ہونے کا پُر سبوتہ کرنے کے باوجود ہمیشہ بادہ تحقیق اور ہر انصاف و اعتدال اور اصول پرستی کی پائی دیتے ہوئے میدان بحث و نظر میں نمودار ہوتے ہیں اور اظہار و افصح و انکساری کے باوجود اپنی ہمہ دانی و تحقیق پسندی کا زبردست پُر سبوتہ کرتے ہیں۔“

اہل قلم ملاحظہ فرمائیں اس عبارت میں دو بار لفظ پُر سبوتہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا نے معظم کے قلب صافی میں نالائق عامر عثمانی کے لئے حیران اور خیال نیک کی کوئی گنجائش نہیں وہ شاید اپنی بہریت اور دوامی لطافت کے برابر اثر طے کر چکے ہیں کہ عامر عثمانی محض پُر سبوتہ سٹ ہے یعنی کورا بہر ویا!

ظاہر ہے جب یہ طے کر لیا گیا تو عامر عثمانی کی کوئی بھی ادائیں زہر سے کم کیا لگے گی۔

عامر نالائق کی مزید تشریف آستانہ محرم کے قلم سے یوں نکلی :

”دعویٰ دیانتداری و امانت شکاری کیا ہو؟

تبلیس و تہلبیس کے تمام مقلد انہ ہتھکنڈوں کا

استعمال پوری آزادی سے کرتے ہیں۔“

دیکھا آپ نے۔ پُر سبوتہ کا قافیہ ہتھکنڈہ !

یہ ان بزرگوار عالم کی زبان ہے جو ہم جیسے بد مذہب

اطفال مکتب کو ادب و شائستگی اور خیریں زبانی سکھاتے چلے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بحث و استدلال کا ہفت جوی طے کرنے سے پہلے ہی محترم رئیس الاحرار نے فیصلہ فرمایا کہ جس طفل مکتب کا وہ تعقب کرنے چلے ہیں وہ پُر سبوتہ بھی ہے اور ہتھکنڈہ باز بھی۔

کاش وہ محسوس کرتے کہ یہ فیصلہ سنا دینے کے بعد وہ خود کس مقام پر جا کھڑے ہوئے۔ ایک استاد حدیث اور ایسے کھٹیا لوگوں سے اس کچھ !

مزید سنئے۔ بار نصیب عامر ہی کا کہ محل رہا ہے۔ ”لطف یہ کہ ان کے تقلیدی مذہب کا کوئی شخص اگر کسی خاص مسئلہ میں تقلید کے تیرہ و تار یک اور متعین ظلمت کردہ سے نکل کر کتاب و سنت کی پاکیزہ فضا میں سانس لینا چاہے تو اسے بھی اپنی نیش زنی اور دشنام طرازی سے نہیں بچنے۔“

کیا تیرہ رہیں۔ کیا طنطنہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پوری امرت مسلمہ ہی شہر و دیہات سے اب تک بدبودار اندھیرن میں کھو کر رہی کھائی رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسیری صدی ہجری کے فاتحے تک فقہ کے چاروں معروف مکاتب فکر دنیائے اسلام میں مشہور و مقبول ہو چکے تھے اور امت کے گرد و دوزان ان ہی مکاتب سے وابستہ ہو گئے۔ پھر نسلاً بولاً آج تک یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ فقہ و مجتہد کسی بھی قوم اور امت میں بہت زیادہ نہیں ہوا کرتے۔ غالب اکثریت عوام ہی کی ہوا کرتی ہے۔ پھر یہاں تو یہ ہوا کہ عوام ہی نے نہیں بے شمار فقہاء اور مجتہدین اور شیوخ اور ائمہ حق نے اپنا رشتہ کسی نہ کسی مکتب فقہ سے جوڑا اور تقلید کا قلاہ گردن میں ڈالا۔ اگر بے تقلیدی کا وہی مذہب و مسلک و احادیث مسلک ہو جیسے مقالہ رنگار اختیار کئے ہوئے ہیں تو پھر موصوف ہی کے

لاف و گناہ اور فضول گوئی کا تذکرہ کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ ہاں اگر ایک دوا ایسے حج مقرر کر دیں جو انہیں جن کے علم و فہم اور غیر جانبداری اور انصاف پسندی مسلم ہو تو ہم اللہ کے بھروسہ پر بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ تنہا مقالہ نگار ہی نہیں ان کے جملہ اعیان و انصار بھی ایک دوسرے کے حماد و معاون بن جائیں تو یہ مقدمہ دہ جیت نہیں سکتے۔ اپنے نام کے ساتھ ”اہل حادیث“ لکھ دینا یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ اب حادیث پر آپ ہی کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ اور کوئی حادیث سمجھ ہی نہیں سکتا۔

نا انصافی ہوگی اگر موصوف محترم کی خوش گنجائی کا ایک اور نمونہ سامنے نہ لایا جائے۔ ”میر تجلی کی دشنام طرازی، ہندوستانی اور تقلید پرستی کی مدح سرائی میں مبالغہ آرائی سے قطع نظر اصل بحث پر موصوف کی (یعنی میر تجلی کی) علمت آڑیں حالت طرانیوں کو ہم حقائق و معارف کی روشنی میں لانا چاہتے ہیں“

سبحان اللہ کیا گھریلو زبان ہے۔ کیا مقارن لب و لہجہ ہے۔ کیا سپا پر حملہ رہا ہے ایک ایک لفظ سے۔ کتنی عالمانہ متانت، کیسی صالحانہ شیریں بیانی کس قدر نفوذی شعاری سمائی ہوئی ہے فقرے کے حرف حرف میں۔

آگے کچھ حوصلہ نفس بحث سے بھی متعلق ہے، یعنی تین طلاقوں کے مسئلہ سے۔ اسے پڑھتا تو سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہ آ سکا کہ استاد محترم نے حادیث کی کچھ کت میں پڑھی ضرور ہیں مگر شاید وہ انھیں ہضم نہیں کر سکے اور ان کا دماغ بھی شاید اس فن و فن کی سہارہ نہیں کر سکا۔

الفاظ میں یہ کہنا پڑے گا کہ جنہارا کچھ اور اگر اریوں مسلمان شروع سے اب تک قرآن و سنت کی آزاد فقہان سے محروم اور تیرہ و تاریک متعین ظلمت کی دہلیز میں سرگردا چلا رہے ہیں۔

اگر واقعی یہی بات ہے تو بریلویوں کی کیا خطا ہے اگر وہ اپنے حماد و گمراہ کے سوا سارے عالم کو بد دین تصور کر رہے ہیں اور فادیانیوں کا کیا تصور اگر وہ کہتے ہیں کہ جو شخص مرزا غلام احمد کو نبی نہ مانے وہ کافر ہے۔

منہ میں جماگ بھر کر اور یا چھوں پر کف لا کر تعقیب اور نقل دین پر سنگباری کرنا شاید بہت ہی شائستہ اور عالمانہ مشغلہ ہے لہذا عام عثمانی جیسے چھوٹوں کی آڑ لے کر ساری امت کو گالیوں و تہمتوں کا نشانہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔ مبارک ہو اسے خسران مملکت حادیث! کچھ لو بھلے خوش رہو۔

آگے محترم استاد کا پارہ کچھ اور بڑھا۔ تہذیب و شائستگی کے اسرار نے کچھ اور زور بان بھاڑا عام بیچارے کو بایں طواریاں بلیں نعلین سے تشبیہ دیدی کہ جس طرح ابلین تلبیس کا امام اعظم تھا اور باغی حق ہونے کے باوجود ناصح مشفق بن بیٹھا تھا ایسا ہی دیکھو عام عثمانی کا بھی ہے۔

ہمیں رنج نہیں ہوا اور نہ کہتے کہ اشکوا بیتی و خفی الی اللہ۔ رنج اس لئے نہیں ہوا کہ محترم مقالہ نگار معاذ و رہیں۔ معاذ و رہ اس لئے ہیں کہ تجلی طلاق تلبیس انھیں بڑی ضیق میں ڈال رہا ہے۔ ضیق میں اس لئے ڈال رہا ہے کہ گالی باز اور ہرزہ سرا عامر نے اس خبر میں ایجابی و سلبی ہر طرح کے دلائل اتنی مقدار میں جمع کر دیئے ہیں کہ وہ نہ تو کی بھر بھی ہاتھ پیرا رہیں گے تو ان سے بھرہ برآ نہ ہو سکیں گے۔

کام ہے کہ حریف کے خلاف غولہ فحواہ اشتعال پھیلاؤ
ہم نے اہل حدیث اس پہاڑ جیسی غلط فہمی بلکہ نادانی
میں مبتلا ہیں کہ حدیث و قرآن سے مسائل تو بس وہی
زکالتے ہیں اور نقل حضرات فقط تقلیدی ہیرا پھیری
کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض مغالطہ ہے جس کے جال میں
وہ اپنے کوتاہ فہم شاگردوں کو پھانستے ہیں۔

ہمارے تعویذ میں جو مقالے اب لکھے جا رہے ہیں
یا آئندہ لکھے جائیں گے ان سے انشاء اللہ فقط ایسے
ہی لوگ دھوکہ کھا سکیں گے جو تجلی طلاق نمبر کو سامنے
نہ رکھیں۔ یا جن میں اتنی استغناء دہی نہ ہو کہ معقول اور
نامعقول میں تمیز کر سکیں ورنہ ہمیں یگ تو تقابلی مقابلے
سے خود ہی جان لیں گے کہ جواب و تعصب کے نام پر
لفاطی اور خامہ تنسگانی کا کو نسا کار نامہ انجام دیا
جا رہا ہے۔

مذہبی تجلی کی خوب خوب بیگڑی اچھالنے کے بعد استاد
مکرم نے جو مقالہ شروع فرمایا ہے اس کا بس تھوڑا
ساحصہ پیش نظر شمارے میں آسکتا ہے۔ اسکے مطالعہ
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے تجلی کا طلاق نمبر
یا تو پڑھا ہی نہیں یا پڑھا ہے تو اس سے نظرس جبرانا
چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو وہ اس حدیث کو
اپنے مسلک کے لئے نص قاطع نہ کہتے جس پر ہم پہلو سے
تجلی بحث کر چکے ہیں اور قطعی دلائل کے ساتھ ثابت
کر چکے ہیں کہ کسی فعل کا گناہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ
مؤثر بھی نہ ہو۔ اللہ کے رسول اگر کسی شخص پر اس لئے
غصہ ہوئے کہ اس نے بیک وقت تین طلاقیں دے دیں
ڈالی تھیں تو اس کا یہ مطلب آخر کہاں سے نکل آیا کہ
یہ طلاقیں واقع بھی نہیں ہوئیں۔ اللہ کے رسول تو یقیناً
اس شخص پر بھی غصہ ہوئے یقیناً ناحق کا مرتکب
ہو گیا ہوتا مگر کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ فعل قتل واقع
ہی نہیں ہوا اور مقتول کو زندوں میں شمار کیا جاتا ہے

تاہم ایک قابل نقل بات اس میں بھی مل ہی
گئی۔ مذہبی کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاقیں اگر
مترجع الفاظ میں بیک وقت دی گئی ہیں تو وہ بین ہی
واقع ہوں گی۔ اسی کے تعلق سے فرماتے ہیں۔

”مذہبی کے اس تقلیدی مذہب کو چاروں

تقلیدی مذاہب کی حمایت حاصل ہے اس لئے

اپنے تقلیدی موقف کو صریح ثابت کر کے لکھ دیتے

کہ مذاہب اربعہ کی کتابوں سے بھی فی ہر معاملہ ہرگز

اس رہنما رک کو نوٹ کر لیا جائے۔

اب تو ہر شخص مانے گا کہ تین طلاقیں پڑنے والا

مسلک تنہا احناف کا نہیں چاروں ائمہ کا ہے اور

سوائے تو زانیہ اہل حدیث کے کوئی جماعت کبھی

ایسی نہیں رہی جو اس کے خلاف رائے رکھتی ہو۔

یہ آپ دیکھ چکے کہ اس مسلک کی نائیب حمایت

کو محترم مقالہ نگار نے ظاہر کر آؤں جہالت طرازی کہا

ہے۔ اس کا واضح مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے

کہ وہ چاروں ائمہ ادران کے کہ روڑوں پیروں کا لیاں

دے رہے ہیں۔

ایک بات اور انصاف طلب ہے۔ تجلی کے طلاق

میں ہم نے جو دلائل استعمال کئے ہیں ان کا تقلید سے

مطلق کوئی تعلق نہیں۔ تقلید تو کہتے ہیں کسی امام فقہ

کی رائے کو دلیل دینا وقت کے بغیر مان لینے کو۔ ہم نے

اگر یہ کہا ہوتا کہ چونکہ چاروں مذاہب فقہ تین طلاق کا

ذوہ ماننے میں اس لئے ہم بھی اس کے حامی ہیں تب

تو یہ لازم دیا جاسکتا تھا کہ عامر نے مفید بہ رخ اختیار

کیا تب تک ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہم نے قرآن، حدیث

اور صحابہ کے فتاویٰ کو مستدل بنایا ہے۔ اس کے باوجود

اگر ہمارا تعاقب کرتے ہوئے اہل حدیث بزرگ تقلید

تقلید کی رٹ لگاتے جاتے ہیں تو خود سوچ بیٹھے کہ ان

مراہمہ فہم دیا نبیت کیا ہے۔ یہ تو سیاسی بازیگریوں کا

منطق اس میں حاکم ہو سکتی ہے۔ تجلی میں اس پہلو سے بھی مفصل بحث کی جا چکی ہے مگر جب کچھ لوگ طے ہی کر لیں کہ اپنی رائے کے خلاف کسی معقول سے معقول بات کو نہیں مانیں گے اور برابر اپنی کہے جائیں گے تو ہم کیا لازمی اور غرض الی بھی ان سے کچھ نہیں منوا سکتے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اجمال مذکورہ مفاد پر نظر ہمارا مقصود نہیں۔ پورا مقالہ شائع ہو جانے کے بعد اگر ہم نے دیکھا کہ اس میں کوئی ایسا استدلال آگیا ہے جس پر گفتگو تجلی میں نہیں آئی تو بے شک کچھ عرض کریں گے۔ اہل دینت ہندوؤں سے دردمندانہ گزارش ہے کہ اگر وہ فضیلت و قدر حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ سنجیدہ اہل علم کا اسلوب اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اس کا بطریقہ ہرگز نہیں ہے کہ جو مواد ہم نے پیش کر دیا اسے نظر انداز کر کے ہماری تحریروں سے صرف وہ سطریں نکال لی جائیں جو محض ضمنی ہیں۔ اگر کہیں کہیں ہمارا طرز تحریر واقعی جارحانہ اور اشتعال انگیز ہو گیا ہے تو اسے نظر انداز کر کے آپ صرف دلائل و شواہد پر گفتگو کیجئے۔ ہم نے آپ کے لئے آسانی یہ بیان کر دی ہے کہ طلاق نمبر سے اگلے شمارے میں اپنے اصلی اور مینا دی مثبت دلائل کی بجائے کر دیا ہے اور یہ دلائل تقلیدی نہیں بلکہ تحقیقی ہیں ان کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ہم نے وہ آیات لی ہیں جن سے ہمارے نزدیک تین یکجائی طلاقوں پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد ہم نے اٹھ حدیثیں حوالوں کے ساتھ پیش کی ہیں جن سے بدایہ ثابت ہوتا ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تین یکجائی طلاقوں کو واقع مانتے تھے جب کہ وہ صریح و غیر متہم ہیں۔ اس کے بعد صحابہ رضوان اللہ علیہم کے جودہ آثار پیش کر گئے ہیں جن کا رشتہ قول سے بھی ہے اور عمل سے بھی۔

زمانے کیا استدلال کی اس تکنک اور استنباط کے اس مواد کو بھی آپ تقلیدی کہہ سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر

اللہ کے رسول تو اس شخص پر بھی غصہ ہوتے جو زمانہ کا نمبر ہوا ہوتا لیکن کیا اس غصہ کا مطلب یہ ہوتا کہ اس زنا سے نطفہ کا منتظر انا ممکن ہے۔ یہ فعل جنسی واقع ہی نہیں ہوا۔

غفل کو معیہ میں آتا کہ مدت سوچئے۔ استاد محترم نے منطق یا استعمال زمانی ہے کہ بیک وقت تین طلاقوں کا اختیار شریعت نے دیا ہی نہیں اور جس چیز کا اختیار نہیں دیا وہ مرد و عورت پر چنانچہ جن غیروں سے نکاح حرام ٹھہرایا ان سے نکاح کیا جائے تو وہ ہرگز گاہی نہیں۔ ہم کہتے ہیں اول تو یہ بات سراسر خلاف واقعہ ہے کہ شریعت نے کبھی تین طلاقوں کا اختیار دیا ہی نہیں قرآن کی جس آیت میں تین طلاقوں کا حکم بیان ہوا ہے اسے نظر انداز کر کے ادھر ادھر کی آیات کو اس لئے طریقے پر جوڑنا قرآن سے کھیل کر ہے۔ موصوف نے قرآن سے بحث کا آغاز کر کے بعض ادبیات لے لی ہیں مگر اس آیت کا مطلق ذکر نہیں کیا حالانکہ یہی آیت اس موضوع پر صریح ہے۔ اس میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شہرہ و تین طلاقوں کا اختیار دے رہا ہے۔ رہا یہ کہ شہرہ اس اختیار کو اکیم استعمال کر ڈالے یا قسط وار کرے اس سے قرآن بحث نہیں کرتا۔ ہم طلاق نمبر میں بڑی مفصل گفتگو اس آیت پر کر چکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ استاد محترم معاملات کی دو قسموں کا فرق نہیں سمجھتے۔ ایک ہوتا ہے کسی شے پر اپنا حق قائم کرنا اور ایک ہوتا ہے کسی حق سے دستبرداری دینا۔ کبھی کسی مذہب قانون نے ان دونوں طرح کے معاملات کو ایک صف میں نہیں رکھا۔ نکاح ایک مرد کو ایک عورت کے جسم پر منصرف ہونے کا حق دیتا ہے لہذا ضروری ہے کہ یہ حق مردانہ روابط کے مطابق حاصل کرے جو صاف صاف مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن طلاق دینا اپنے حق سے دستبرداری دینے کا نام ہے۔ کوئی شخص اگر یہین کرے کہ اپنے کسی حق سے دستبرداری دیا ہے تو آخر کو تہی ثانی

بحوالہ نقل کر چکے ہیں۔

لیکن مولانا آزاد رحمانی اپنے مضمون کے قارئین کو بلا تکلف یہ یاد کرنا رہے ہیں کہ ابن حجر کے نزدیک چاروں صحابہ کے بارے میں مذکورہ نقل صحیح ہے۔ اسے علمی بددیانتی کے سوا کیا کہیں گے۔

پھر چلیے ایک منٹ کو مان لیا کہ ابن حجر اس نقل کو درست لسنے میںوں بلکہ یہی مان لیجئے کہ خود ابن حجر نے ایسا دعویٰ کیا ہو لیکن مولانا آزاد تو اشارۃ اللہ تعالیٰ کے دشمن اور تحقیق کے علمبردار ہیں۔ ان کی دیانت کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ابن حجر کے مجرد دعویٰ کو یوں ہی نہ مان لیں بلکہ تلاش کریں کہ مذکورہ صحابہ کا یہ قول کہاں کس سند صحیح سے پایا جاتا ہے۔ تلاش کے بعد اگر انھیں قابل اعتماد سند میں مل جائیں تب تو اس قول کو ذریعہ مضمون فرمائیں، نہ ملیں تو ردی سمجھ کر دیوار پر مار دیں۔ یہ تھا احتیقا نہ طریق مگر انھیں ایسے موقر بر تحقیق کی یاد کیوں آئے گی جب کہ ایک بے سند اور بے مبنی قول سے انھیں کمک مل رہی ہو۔

دوسرا نمونہ بھی اسی حکم ہے۔ علامہ نظام الدین غمی نے "غرائب القرآن" میں کچھ صحابہ کا نام دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ ان میں بعض وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں دو یا تین طلاقیں دیں تو ایک ہی شمار ہوگی علاوہ ازیں مولانا صاحب الحی لکھنوی بھی اپنی عمۃ الرعاہ میں یہی بات لکھ گئے ہیں۔

اب ہمارے قلم مولانا آزاد رحمانی بالکل بھول گئے کہ ہم نے تحقیق میں متقل نہیں۔ مجتہدوں میں متبیح نہیں۔ تو ان دونوں بندہ گوں کے اقوال کو اس طرح نقل کر دیا گیا ان کا کہنا بنا دلیل قطعی ہے اور اب کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ بعض صحابہ کا مذکورہ قول آخر کہاں ہے اور اس کی سن کہاں ہے۔ ظاہر ہے علامہ نظام الدین یا مولانا صاحب الحی تابعی تھے نہیں کہ فرمایا تحقیق کی ضرورت ہی نہ ہو۔ قول رسولؐ کی تسلیم نہ

یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ آپ بار بار تقلید اور مقلدین کی پھر کر کے خواہ مخواہ ایک غلط تاثر دے رہے ہیں۔ حق پسند ہیں تو دنیا کو متین دلائل کے ساتھ بتائیے کہ اتنی احادیث اور اتنے آثار صحیحہ کیا آپ کیوں نظر انداز کر رہے ہیں اور چاروں ائمہ جس مسلک پر متفق ہیں اسے محض تقلیدی مسلک کیوں کہہ چلے جا رہے ہیں۔

ایک درس عبرت! اہل حادیث کے مرکزی اہل العلم (بنارس) سے ایک جریدہ نکلتا ہے "صوت الجماعۃ" اس کے اگست ۱۹۷۷ء کے شمارے میں اس کے ادارے کے ایک رکن مولانا نجم الدین آزاد رحمانی نے مدیر زنگی کے اس مقالہ پر سخت تنقید کی ہے جو انھوں نے مسلم کی ایک حادیث کے متعلق لکھا تھا اور زنگی کے طلاق منبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اس پر زری تنقید سے ہمیں فی الحال تعرض نہیں کہ اس کا نوٹ لینا تو مدیر زنگی کے ذمہ ہے البتہ اس میں سے ایک دو نمونہ ہم ایسا آپ کے سامنے رکھتے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ ہم پر تقلید کی بھٹی کسے والے اور خود کو محقق کہنے والے اپنی بات کی بیخ میں کتنے کورے اور نامعقول مقلدین جاتے ہیں۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح بخاری میں تین طلاقیں کے مسئلہ پر طویل بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران ایک جگہ وہ صبیحہ جمہول کے ساتھ بعض نامعلوم افراد کا یہ دعویٰ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت علی حضرت ابن مسعود حضرت عمر الرحمن بن عوف اور حضرت زبیر رضوان اللہ علیہم سے بھی یہی منقول ہے کہ تین کجائی طلاقیں دو در رسالت اور دو در حدیث میں ایک ہو کر تین تھیں۔

ابن حجر نے یہ دعویٰ تصدیق و تائید کے طور پر بیان نہیں کیا۔ اگر ان کے نزدیک یہ دعویٰ درست ہوتا تو ایسے حکم تھا کہ وہ یہ فیصلہ صادر فرمادیتے کہ تین طلاقیں کے پڑنے پر اجماع ہے اور کسی صحابی نے اس اجماع کخلاف قول نہیں کیا۔ ابن حجر کا فیصلہ ہم طلاق منبر کے ص ۱ پر

حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اذا قال انت طالق ثلاثا بھم

واحد فی واحدۃ“

لیکن جس کا جی چاہے ابو داؤد شریف اٹھا کر دیکھ لے۔ اور مولانا موصوف کے شاگرد تو خصوصیت سے دیکھیں کہ امام ابو داؤد نے عین اسی جگہ پر تنبیہ بھی کر دی ہے کہ عکرمہ نے یہ قول ابن عباس کا قول کہہ کر نقل نہیں کیا (ابو داؤد کی پوری عبارت اور خیانت کی مکمل تفصیل تجلی طلاق نمبر ۳۷ دہ ۱۹۷۱ء پر ملاحظہ فرمائی جائے)

حالانکہ یہ قول اگر حضرت ابن عباس کا بھی ہو تب بھی اس کا کوئی تعلق زیر بحث تین طلاقیں سے نہیں ہے جس کی قطعی دلیل ہم طلاق نمبر کے صفحات ۱۳۹ تا ۱۵۳ پر بیان کرتے ہیں: تاہم کم عقلی یا خود رانی یا کم علمی کی بنا پر کسی حدیث کا صحیح مطلب نہ سمجھ پانا تو محض ایک فکری خطا ہے جیسا کہ امام ابو داؤد کی صحیح سے ایک ایسی روایت کاٹ کر نقل کر دینا جسکی تردید اسی جگہ امام موصوف کر رہے ہیں خیانت کے سوا اور کیا کہلائے گا۔

مارگ دیپ (ہندی)

اسلام کی بنیادی تعلیمات کو غیر مسلموں تک پہنچانے والا خالص تبلیغی ماہنامہ جیسے پڑھ لکھ غیر مسلم حلقوں میں وقعت اور پسندیدگی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ سالانہ چندہ صرف پانچ روپے لیکن اعزازی حیثیت سے آپ جاس اور سہ روپے بھی دے سکتے ہیں۔ تبلیغ دین کے روشن کی اہمیت کا احساس کرنے والے حضرات اپنے زیادہ سے زیادہ مالی تعاون کے ذریعہ دل کے کا ہاتھ بٹائیں۔

ہندی ماہنامہ ”مارگ دیپ“ روشنی پبلشنگ ڈس۔ کے بی۔ زیڈ سے امپور (روپی)۔

کے لئے اگر مولانا آزاد رحمانی ایسی من ضروری سمجھتے ہیں جس کا ہر ہر راوی جانچا پرکھا ہو تو آخر بعض صحابہ کا ذکر وہ قول انھوں نے بلا سند کیسے مان لیا۔

مزید سنئے۔ مولانا عبیدالحی نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ امام مالک کے دونوں میں سے ایک قول ہی ہے اور امام احمد کے بعض اصحاب بھی اسی کے قائل ہیں۔ اسے بھی مولانا نے برملا نقل کر دیا اور اس طرح فارغ ہو بیٹھے جیسے مکمل طور پر حق تحقیق ادا کر دیا ہو۔ حالانکہ تحقیق کے لئے یہ وہ غلطی نہیں ہے کہ مولانا عبیدالحی کی تحریر کو ہرگز ہرگز درجہ دہی میں نہ رکھ دیتے بلکہ خود تحقیق کرتے کہ امام مالک کا مضمومہ قول کس سند سے ثابت ہے اور بعض اصحاب احمد کی رائے کہاں کن ذرائع سے درجہ ثبوت کو پہنچی ہے۔ ہم طلاق نمبر میں ثابت کرائے ہیں کہ اس طرح کے دعوے پر دوپگٹے اور افواہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر ہمارا خیال غلط ہے تو بدعیان تحقیق عوام الناس کو خواہ مخواہ دھوکا دینے کے عوض دستاویزی دلائل سے ثابت فرمائیں کہ واقعی امام مالک نے بھی مذکورہ قول کیا تھا اور بعض اصحاب احمد نے یہ رائے رکھی تھی۔

ایک اور غضب۔ طلاق نمبر میں ہم نے مذکورہ مولانا محفوظ الرحمن کی ایک علی خیانت کو منسوخ کیا تھا۔ خدا کی شان ہے کہ مولانا آزاد رحمانی کے یہاں بھی وہی خیانت دن کی روشنی میں نظر آ رہی ہے۔ صورت یہ ہے کہ ابو داؤد میں ایک روایت یوں بیان ہوئی ہے۔

”ابو ب نے عکرمہ سے اور عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا کہ جب تم اپنی بیوی کو ایک ہی

منہ میں تین طلاق دو تو یہ ایک طلاق ہوگی“

اگر روایت ابو داؤد بس اتنی ہی ہوئی تو مولانا موصوف کا یہ لکھنا صحیح ہو تا کہ

”امام ابو داؤد نے خود حضرت ابن عباس کے

ایک شاگرد عکرمہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ

تفہیم القرآن

(القیامۃ)

اے نبی! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کر ادینا اور پڑھوا دینا ہمارے

اللہ یہاں سے لے کر پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، "تیک کی پوری عبارت ایک جملہ معترضہ ہے جو سلسلہ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اور شاد فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم دیباچہ میں بیان کر آئے ہیں، نبوت کے ابتدائی دور میں، جب کہ تھنور کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق پوری طرح نہیں ہوتی تھی، آپ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ جبریل علیہ السلام جو کلام الہی آپ کو سنارہے ہیں وہ آپ کو ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں، اس لئے آپ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ ایسی ہی صورت اُس وقت پیش آئی جب حضرت خیریل سورۃ قیامہ کی یہ آیات آپ کو سنارہے تھے۔ چنانچہ سلسلہ کلام توڑ کر آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں، اسے یاد کر ادینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک اسے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ آپ مطمئن رہیں کہ اس کلام کا ایک لفظ بھی آپ نہ بھولیں گے نہ بھی اسے ادا کرنے میں غلطی نہ کریں گے۔ یہ ہدایت فرمانے کے بعد پھر اصل سلسلہ کلام "ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے" سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ اس مقام پر ان نفروں کو دیکھ کر یہ عجیب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔ لیکن اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک استاد درس دیتے دیتے یکایک یہ دیکھے کہ طالب علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ توڑ کر طالب علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے بعد آگے پھر اپنی تقریر شروع کر دے۔ یہ درس اگرچہ جوں کا توں نقل کر کے شائع کر دیا جائے تو جو لوگ اس واقعہ سے واقف نہ ہوں گے وہ اس سلسلہ تقریر میں اس فقرے کو بے جوڑ محسوس کریں گے۔ لیکن جو شخص اُس اصل واقعہ سے واقف ہو گا جس کی بنا پر یہ فقرہ درمیان میں آیا ہے وہ مطمئن ہو جائے گا کہ درس فی الحقیقت جوں کا توں نقل کیا گیا ہے، اُسے نقل کرنے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

اوپر ان آیات کے درمیان یہ فقرہ بطور جملہ معترضہ آنے کی وجوہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے۔

ذمہ، لہذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت تم اسکی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اسکا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارا ہی ذمہ ہے۔

بلکہ معبر روایات میں اس کی بھی وجہ بیان ہوئی ہے مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضور پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپ اس وقت سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں، جب وہ صلی اللہ علیہ السلام کے ساتھ تھے وحی کے الفاظ دہرانے لگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ لا تحزبک یہ لسانک نہ تنحل بہ۔ یہی بات شعبی، ابن زبیر، ضحاک، ابن بصری، قتادہ، مجاہد اور دوسرے اکابر مفسرین سے منقول ہے۔

ﷺ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وہ قرآن پڑھ کر سنا تے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑھتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں۔“

ﷺ اس سے گمان ہوتا ہے اور بعض اکابر مفسرین نے بھی اس گمان کا اظہار کیا ہے کہ غالباً ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے دوران ہی میں قرآن کی کسی آیت یا کسی لفظ یا کسی حکم کا مفہوم بھی جب وہ صلی اللہ علیہ السلام سے دریافت کر لیتے تھے، اس لئے حضور کو نہ صرف یہ ہدایت کی گئی کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت آپ خاموشی سے اسکو سنیں، اور نہ صرف یہ اطمینان دلا یا گیا کہ اُس کا لفظ لفظ ٹھیک ٹھیک آپ کے حافظے میں محفوظ کر دیا جائے گا اور قرآن کو آپ ٹھیک اُسی طرح پڑھ سکیں گے جس طرح وہ نازل ہوا ہے بلکہ ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور ہر ارشاد کا افشاء اور اور مدعا بھی پوری طرح آپ کو سمجھا دیا جائے گا۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو ان گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ، پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اولاً، اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لئے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اُس کے اشارات، اُس کے الفاظ اور اُس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضور کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالب قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ ہر حال الفاظ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحی غیبی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے منسلک درآن مجید سے اس کے معرینہ ثبوت ہم نے اپنی کتاب ”سنت کی آئینی حیثیت“ میں صفحات ۹۴-۹۵-۹۶ اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵ میں پیش کر دیے ہیں۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کے احکام کی تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی آخر اسی لئے تو بتائی گئی تھی کہ آپ اسے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپ کو صرف اس لئے بتائی گئی تھی کہ آپ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فراتر ثبوت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لئے صرف ایک بے وقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریحی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود سورہ نحل آیت ۶۴ میں فرمایا ہے وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ يُذَكِّرُ الْبَشَرَ لِيَتَّقُوا اللَّهَ وَيَتَذَكَّرُوا أَلْفَاظِهِمْ، ”اور اے نبی! یہ ذکر ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لئے اتاری گئی ہے“ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو

تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰۔ اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنادینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آل عمران، ۱۶۴۔ الحجہ، ۲۔ ان سب آیات کی تشریح ہم ”سنت کی آئینی حیثیت“ میں صفحہ ۴۷ سے ۷۷ تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔ اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو ماننا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرمادی ہے کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ فی حقیقت کفر ہے جو کافر تکلیف کوئی صاحب ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت تین ایسی ہیں جنہیں ایک عربی داں آدمی جنس قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیسے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجئے۔ قرآن مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سر سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے لیکن جنس عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعین نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہل ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی داں یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور اس طرح اسے ادا کیا جائے سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کو سمجھنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہو تا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھادیا ہو تا تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکم صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح چرناڑ پڑھتے چلے آ رہے ہیں اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائی تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا اور اسی مطلب کی تعلیم آپ ان سب لوگوں کو دے دیتے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسول کو بتائی اور رسول نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضور کے اقوال و افعال سے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پھیلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضور کی قوی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا، جس کی تفصیلات معتبر روایات سے بھی بد کی نسلیں کو اگلی نسلیں سے ملیں اور بعد کی نسلیں نے اگلی نسلیں میں اس پر عمل درآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اس ذریعہ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شَمْرَ اِنْ عَلَیْہِا بَیِّنَاتٌ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کر کے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمہ داری محض رسول کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لئے نہیں لی گئی تھی بلکہ اس غرض کے لئے لی گئی تھی کہ رسول کے ذریعہ سے امت کو کتاب الہی کا مطلب سمجھا یا جائے اور حدیث و سنت کے ماخذ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ کے آپ یہ لازم آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتا ہے۔ اعادنا اللہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تولی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اُغلاز اسلام میں پوری امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی۔ ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی؟ جعل ساز لوگ وہی سکے جو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن لوگوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انھیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ اس امت نے اول بذر سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذات پاک کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اُس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا اتنا ہی اس امت کے خیر خواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے تمیز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بد نصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کئے بغیر مغربی مستشرقین کے ہتھکنڈے میں آکر حدیث و سنت کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

۲/۲۵	اسلام کا روشنی مستقبل۔ سید قطب شہیدؒ	۲۵/-	محبت فاتح عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی
۱/-	دھرتی پر انسان عبدالغادر عودہ شہیدؒ	۲/-	پاجا شریارغ زندگی
۹۰/-	روح توحید حسن البنا شہیدؒ	۳۱/-	ڈاکٹر خمیر
۹۰/-	خطبات حرم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	۱/۲۵	باب رحمت
۲/۵۰	فضائل القرآن (درس حدیث)	۵/-	مشعل راہ مولانا عبدالرؤف عاالی
۶/-	کتاب القوم	۱/-	جمال مصطفیٰ (مجموعہ نعت) درد قریشی
۲۰/-	تہذیب کی جدید تشکیل جلد مولانا تقی امینی	۶۰/-	عقیدت یکموں مختلف شعراء
۱۰/-	اساس تہذیب ڈاکٹر سید عبداللطیف	۱۰/-	انصارِ حق عکس جلد مع کور
۱۰/-	اساس تہذیب اسلامی	۸/-	کلیات تشکیل بدایونی مجموعہ کلام
۵/۵۰	بنیادی تصورات قرآن ابوالکلام آزادؒ	۶/-	صہبائے خیال مجموعہ کلام عالم بریلوی
۲/۵۰	محمد بن عبدالوہاب نجدی۔ مرتبہ صفی الرحمن	۶/-	لفظوں کا سفر جمیل احمد آبادی
۱/۶۰	ہیر نبوت قاضی سلیمان منصور پوری	۶/-	انکشاف کجواب زلزلہ
۲/۵۰	پیام انسانیت مولانا عبدالحمید علی ندوی	۵/-	تاریخ ادب اردو ڈاکٹر نذیر احمد
۲/-	مقار انسانیت	۱/۲۵	مذہب ایم ہے؟ (اردو) سید قطب شہیدؒ
		۲/۳۰	اقلیتوں کے حقوق اسلامی ریاست میں

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (دیوبند)

مولانا مودودی اور مسئلہ طلاق • جنت کا محل وقوع اور نقطۂ ارتقاء • مسجد میں کسی اور کی زمین • جماعت تبلیغی • آپس کی باتیں • جاہل کی امامت • بریلو یوں کی فتنہ گری • نئے درود • شریعت حقیقت طریقت معرفت • درانت کا اہم ترین مسئلہ • دارھی کا مسئلہ۔

تجلی کی ڈاک

مولانا مودودی اور مسئلہ طلاق

سوال :- از - نظام محمد صالح -

”طلاق ثلاثہ در مجلس واحدہ“ کے مسئلے میں تجلی کے ”نقد و نظر نمبر“ اور ”طلاق نمبر“ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے۔ آپ نے جہاں جماعت اسلامی والوں مثلاً مولانا شمس پیرزادہ اور مولانا حامد علی صاحب کو ان کے امیر مولانا مودودی کی ”تفہیم القرآن“ نہ دیکھنے کی شکایت کی وہیں آپ مولانا مودودی کی کتاب ”حقوق الزوجین“ کے مطالعہ کی رائے دیتے اور خود بھی ایک نظر ڈال لیتے تو مذکورہ شماروں میں آپ کو مزید تبدیلیات مل جاتے۔ بہر حال مجھے ”حقوق الزوجین“ سے جو خلش پیدا ہوئی ہے ایسا ہے اس کو دور کریں گے۔

مولانا مودودی نے ”حقوق الزوجین“ میں ”تطلاق ثلاثہ در مجلس واحدہ“ کا عنوان دے کر جو کچھ لکھا ہے اس کے تحت ذیل کی باتیں تو صیح طلب ہیں :-

(۱) مذکورہ مضمون میں ایک روایت آئی ہے کہ حضرت عمرؓ تین بيماني طلاق دینے والے کو دترے مارے تھے۔

یہ روایت فن کے اعتبار سے کیسی ہے ؟

اور اگر مذکورہ روایت صحیح ہے تو کیا ایک وقت میں تین طلاق دینے والے کو دترے لگانا بدعت نہ ہو ؟

(۲) مولانا مودودی کی رائے کے مطابق ایک وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کرنے پر پابندیاں نہ کرنا (جب کہ حضورؐ نے ایسا نہ کیا) اور عدالت میں عورت کا جانا اور ہر جانہ کی مقدار کم از کم ہر کی نصف مقدار تک مقرر کرنا وغیرہ بدعت نہ ہوا ؟

جواب :-

آپ کے لکھے پریس ”حقوق الزوجین“ دیکھی۔ جو ان میں مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی) نے جو اس کا ایڈیشن چھاپا ہے وہی میرے سامنے ہے۔ اس میں ”تطلاق ثلاثہ در مجلس واحدہ“ کے زیر عنوان بھی اور شروع میں

للاق کے زیر عنوان بھی دی سب کچھ لکھا گیا ہے جسے
بقی نامی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ مولانا محمود دی
تے فکر اسلام سے یہی توقع کی بھی جاسکتی تھی کہ وہ اجماع
ت کے ساتھ چلیں گے۔ البتہ ذیلاً ایک معمولی سی
س ان سے ضرور ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے تحریر
ایا۔ ”بیک وقت تین طلاقیں کے بدعت و معصیت
رنے میں کسی کو اختلاف نہیں۔“

یہ بات مطابق واقعہ نہیں ہے۔ امام شافعی اسے
عت و معصیت نہیں مانتے بلکہ صرف خلاف اولیٰ
ال کرتے ہیں اور ابن حزم تو خلاف اولیٰ بھی نہیں مانتے
ہ اسے عین طلاقِ سنت کہتے ہیں۔

اس تہید کے بعد ہم آپ کے سوالوں کا جواب
ن کرتے ہیں۔
۱) یہ روایت صحیح ہے۔

۲) ”بدعت“ کا اصطلاحی مفہیم سمجھ لیجئے۔ بدعت
س نے کام کو کہتے ہیں جو دین و شریعت میں نکالا
بے اور اس سے ثواب کی توقع کی جائے۔ حضرت عمرؓ
ای فعل (یعنی درے مارنا) عبادتی نوع کا فعل نہیں تھا
س پر سنت و بدعت کی بحث کھڑی ہو، بلکہ حاکمانہ فعل
اجس کا تعلق انتظامی اور تربیتی مصلح سے ہوتا ہے۔
مادہ اس کے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا کہ حضرت عمرؓ
ن کیجانی طلاقیں دینے کو گناہ کا کام سمجھتے تھے لہذا کسی
یک گناہ کو بطور تادیب تنبیہ چند کوڑے وہ مار دیں تو
س پر اعتراض کیا۔ ہاں یہ وہ بھی جانتے تھے کہ باوجود
ماہ ہونے کے تین کیجانی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اس
نے یہ ان کے بس میں نہیں تھا کہ مطلقہ کو پھر سے شوہر کے
اتھ چڑکا دیں۔

۳) قتل یا چوری یا رشوت ستانی جبرائیم اور معاصی
داخل ہیں۔ ان کی روک تھام کے لئے آخرو دین اور
یادہ لوگوں کے کچھ نہ کچھ قوانین موجود ہیں اور ان قوانین
ہ باوجود لوگ ان کے مرتکب ہو جاتیں تو انھیں سزا نہیں

بھی دی جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ تین کیجانی طلاقیں کا سمجھئے۔
قتل ناحق اگر جرم ہے مگر وہ واقع ہر حال ہو جاتا ہے ہی
طرح بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالنا گناہ ہے مگر ہر حال
اس گناہ کا ارتکاب تین طلاقیں ڈال دیتے ہیں لہذا کیا
الجنھن ہے اگر مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد کچھ ایسی پابندیوں
کی تجویز پیش کریں جن کی موجودگی میں یہ گناہ کم سے کم واقع ہو
اور واقع ہو ہی جائے تو گناہ گار کو تھوڑی سی سزا بھی ملے
حضو نے ایسا نہیں کیا اس کا ذکر اس موقع پر محل
ہے۔ وہ اس مسئلہ میں خدا کی پسند و ناپسند کی وضاحت فرما
گئے اب امت اپنے اپنے زمانوں اور حالات کی مطابقت
سے اس وضاحت کو رد و بکار لانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ
ایسا ہی ہے جیسے انتظامی اور عسکری معاملات میں بے شمار
ایسے کام حضرت عمرؓ نے انجام دیے جنھیں حضو نے انجام
نہیں دیا تھا۔ فلاں مقام سے فلاں مقام تک حضو نے
تکی سڑک نہیں بنوائی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی امتی
بھی اس سڑک کو بچختہ نہ کرے۔

حضو کے زمانے میں شافعی نادر ہی کوئی مسلمان یا سیا
ہو سکتا تھا جو کسی بھی مسئلے میں اللہ اور رسولؐ کی پسند سے
واقف ہو جانے کے بعد اس کے خلاف روش اختیار کرتا
حضرت عمرؓ کے صاحب زادے نے اپنی زوجہ کو حالت حیض
میں ایک طلاق دی تو اس کی وجہ مسئلہ کے بارے میں غلط
فہمی تھی۔ پھر جب حضو نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا تو کیا
محال کہ ابن عمرؓ بھی نافرمانی کے مرتکب ہوں۔ اسی طرح اور
بھی کسی صحابی نے بیک وقت تین طلاقیں حضو کے زمانے
میں دی ہیں تو ازراہ غلط فہمی دی ہیں۔ جب حضو نے خلاف
زیاد کیا کہ ایسا کرنا بری بات ہے تو یہ اظہار ہی اس کے لئے
کافی ہو گیا کہ مسلمان رگ جائیں۔ حضو خود ہی قاضی بھی
تھے، حاکم بھی۔ خدا کے رسولؐ بھی اور بیک وقت تین طلاقیں
دے ڈالنا ان کے زمانے میں کوئی مستقل مسئلہ اور فقہ نہیں
بنا تھا۔ اب بعد میں جب یہ مسئلہ اور فتنہ بن گیا ہے تو علماء
حق کے لئے یہ فکر بھی روا ہے کہ دائرہ شریعت میں رہتے

پر اونچی پہاڑی کے سرے پر واقع تھی۔ آپ اس سلسلے میں صحیح معاملہ بنائے۔

”نظریہ ارتقاء“ سے متعلق عرض ہے کہ جہاں نوزائیدہ صاحب مسلمانوں کے نام نہاد نظریہ ارتقاء کو ماننے سے متعلق عالموں کی فہرست دی تھی وہیں ہم نے ترقی کی کتاب ”دوران“ کا حوالہ دے کر سوال پوچھا تھا جسے آپ نے بذریعہ خط جواب دیا تھا کہ ترقی صاحب خرافات کہتے ہیں۔ اب مزید مطالعہ سے پتا چلا ہے کہ مولانا رومؒ نے بھی کہیں شاعری میں نظریہ ارتقاء کے متعلق کہلے ملاحظہ ہو ”گیتا اور قرآن“ (از پبلیکیشن سندھ لال) کیا مولانا رومؒ بھی نظریہ ارتقاء کو مانتے تھے؟

جواب:-

مولانا مودودی کی کتاب ”سائل و سائل“ مارکیٹ میں موجود ہے۔ اس کے تمام حصوں کا مطالعہ کر کے آپ اطلاع دیتے کہ انھوں نے کہاں کیا لکھا ہے تب ہاں بنتی۔ ہم اس مسئلہ کو کوئی قابل ذکر مسئلہ ہی نہیں سمجھتے۔ وہ تو نظریہ ارتقاء کی بحث کے ضمن میں مجبوراً ہمیں اس پر گفتگو کرنی پڑی ورنہ اس طرح کے مسائل میں وقت بیکھنا ہمارے نزدیک وقت کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ مولانا مودودی کی یا نلاں اور فلاں کی جو بھی رائے ہو ہو کرے۔ وہ اپنی رائے میں خوش ہم اپنی رائے میں خوش ہاں ”نظریہ ارتقاء“ کا یہ معاملہ نہیں۔ وہ ایک ذہنی گمراہی اور صریح بد عقیدگی ہے۔ اسی لئے اس پر ہم نے شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔

شاعری عموماً عقائد کا مظہر نہیں ہو کر تھی کوئی بھی شاعر خواہ کتنا ہی بڑا ہو اسے کم سے کم شاعری کے دائرے میں تقید اور منہی کا درجہ نہیں دیدینا چاہئے مولانا رومؒ نے نظریہ ارتقاء کے متعلق کیا کہا ہے اس کا تیا اس وقت چلتا ہے آپ ان کے متعلقہ اشعار بھی نقل فرمادیتے۔ آپ کے تو محض ”گیتا اور قرآن“ کا حوالہ

ہوتا ہے نہ اسے تجویز کر سکتے ہیں جو اس باب میں فیہرست ثابت ہیں۔ علمائے امت اگر یہ کہتے ہیں کہ میں کیمائی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس روش سے پرہیز کرنا چاہئے اور ایک وقت میں ایک ہی طلاق دینی چاہئے لہذا مولانا مودودی نے اپنی صواب دید کے مطابق جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بے محل نہیں ہیں۔

(۴) خلع کے تعلق سے آپ نے جو متعدد سوالات کئے ہیں ان میں ہم نے ازراہ اختصار حذف کر دیا۔ ”خلع“ طلاق ہی کی ایک قسم ہے۔ عورت کی طلب پر جو طلاق دی جائے اسے ”خلع“ کہتے ہیں۔ مرد اگر طلاق دینے پر راضی نہ ہو اور قاضی یہ سمجھتا ہو کہ عورت طلاق طلب کرنے میں حق بجانب ہے تو خود قاضی فیصلہ نافذ کرے گا کہ عورت کو آزاد کر دیا جائے۔ اس فیصلے سے طلاق بائن واقع ہوگی۔ یعنی شوہر رجوع نہیں کر سکتا البتہ موسمی راضی ہو تو دوبارہ اس سے نکاح کر سکتا۔ قاضی کے کہنے پر اگر مرد ایک طلاق دے گا تو وہ بھی طلاق رجعی نہ ہوگی۔ تین طلاقیں دینے پر اسے قاضی مجبور نہیں کر سکتا نہ اس کی ضرورت ہے۔ ایک ہی طلاق اس مقصد کو پورا کر دیتی ہے جس کی خاطر عورت مقدمہ لاتی ہے۔ ہاں اگر عام حالات کی طرح یہاں بھی ایک طلاق سے رجوع کی اجازت مرد کو مل جاتی تو مقصد فوت ہو جاتا اس لئے یہ ایک ہی طلاق شریعت نے بائن قرار دی ہے۔

جنت کا محل وقوع اور نظریہ ارتقاء

سوال:- (ایضاً)

ایک سوال یہ ہے کہ ”جنت کا محل وقوع“ سے متعلق تجلی دہند کے ”نظریہ ارتقاء“ نمبر میں آپ نے کیا جنت زمیں پر اونچی چوٹی پر نہیں بلکہ حضرت آدمؑ اسی جنت میں تھے جسے جنت باؤسی کہتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی نے ”رسائل و مسائل“ حصہ اول تا چہارم کے کسی حصے میں یہ بتایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس جنت میں تھے وہ وہیں

شمارے میں جگہ دے کر ہم لوگوں کی پریشانی کو دور کر رہا
شکر یہ کامو فیع دیں۔

جواب :-

اس ہندو بھائی سے اس زمین کا باقاعدہ ہمہ نام
لکھوایا جائے۔ باقاعدہ سے مراد ہے پختہ کاغذ پر قانو
وقت کا پور الحاطہ کرتے ہوئے۔ الفاظ ایسے ہوں جن
بعد کسی کے لئے قانوناً نہ گنجائش نہ رہ جائے کہ اس حق
زمین پر دعویٰ کر سکے۔ اگر یہ ہندو بھائی ایسا کاغذ لکھ
دیتے ہیں تب تو مسجد کو چوں کا توں رکھا جائے۔ کوئی قبضہ
اس میں باقی نہیں رہتی ہے۔

لیکن اگر یہ ایسا کاغذ لکھنے سے گریز کریں اور فنا
زبانی اطمینان دہانی سرنائیں تو اس کا اعتبار نہیں ہے
کا اتنا حصہ تو کر زمین خالی کر دیں چاہئے اور دیوار
بنائی چاہئے جہاں زمین کا کوئی نزاع نہ ہو ہمیشہ عی حکم
ہے کہ کسی کی زمین میں اگر بلا اجازت مسجد بنائی ہے تو اسے
ڈھادینا چاہئے۔ مالک زمین اپنی رضامندی اور ہمہ نام
لکھ دے تب اسے قائم رکھنے کا جواز ہے۔

اور یاد رکھئے یہ حکم غیر مسلم ہی کی زمین میں منحصر نہیں
مسلمان کی زمین پر بھی اس کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا
بنائی جاسکتی۔ اگر بنائی گئی اور اس نے اعتراض کیا تو اسے
توڑنا ہوگا۔

جماعت تبلیغی

سوال :- از۔ وارث ریاضی مغربی چیمارڈ
میرے علاقہ کے ایک صاحب جن کا تعلق موجود
جماعت تبلیغ سے ہے وہ اپنی جماعت کے اکابرین کے
حوالہ سے فرماتے ہیں کہ :-

”جو علماء عملی طور پر جماعت تبلیغ سے وابستہ
یا اس جماعت کی ”مجلس شوریٰ“ میں شریک ہو کر مجتہد
کے انسداد کو نیک مشورے دیتے ہیں یا کم از کم اس جہاں

دیدیا۔ ہم کہاں تک حوالے کی کتابیں پڑھا کرتے پھرتے ہیں۔
اس کتاب میں اگر اس کے مصنف پندت سند رلال نے
یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا روم بھی نظریۂ ارتقاء کے قائل
تھے تو ضروری نہیں کہ وہ مولانا روم کو سمجھے بھی ہوں۔
بہتر ہے فکر دوسروں کے شعروں سے ایسے ایسے
مطالب اخذ کر لیتے ہیں کہ خود شاعر کے حاشیہ خیال
تک میں ان کا وہیم نہیں گذرنا۔ مولانا روم سے یہ توقع
نہیں کی جاسکتی کہ وہ قرآن کو نظر انداز کر کے ایک
پوگس اور دواپی نظریہ کو سینے سے لگا لیں گے لیکن اگر کسی کو
اصرار ہی ہو کہ انھوں نے ایسا کیا ہے تو بہر حال ان کا
کوئی قول و فعل دین میں حجت تو ہے نہیں۔ وہ بھی ایک
انسان ہی تھے غلطیاں کر سکتے تھے۔ حجت صرف خداؤ
رسول کے ارشادات ہیں یا پھر علمائے امت کے
اجماعی فیصلے۔ اجماعی فیصلے بھی اسی لئے حجت ہیں کہ
ان سے اللہ اور رسول کی مرضی کا سراغ لگتا ہے ورنہ
انسانوں کی کوئی بھیر محدود اپنی ذاتی حیثیت میں حجت نہیں

مسجد میں کسی اور کی زمین

سوال :- از۔ عماد قس جیلانی۔ در بھنگہ (دہار)
میری بستی کے قریب ایک دوسرے گاؤں میں
ایک مسجد بنائی گئی ہے جس کا تھوڑا سا حصہ غلطی سے
ایک ہندو کی زمین آ گیا ہے۔ بعد میں جب زمین کی
پیمائش ہوئی تو یہ بات معلوم ہوئی۔ اب اس ہندو
نے کہا جاتا ہے کہ تم اس زمین کی قیمت لے لو کہ نہ تمھاری
زمین میں مسجد بنائی جائز نہیں۔ مگر وہ نہیں لیتا۔ کہتا ہے
جیسا بھگوان آپ کا ویسا میرا۔ جیسا مندر ویسی مسجد۔
پھر میں کیوں قیمت لوں۔ میں نے وہ زمین مسجد کو دیدی
لوگ اسے دواتے ہیں۔ مقدمہ کرنے کی دھمکی دیتے ہیں
تب بھی نہیں مانتا بلکہ مقدمہ لڑنے کو تیار ہے۔ بتائیے
اب کیا کیا جائے کیا مسجد توڑ دی جائے؟
براہ کرم اس اچھے ہوئے مسئلے کو کسی نزدیک کے

کے طریق کار سے اتفاق رکھتے ہیں اور جماعت کی کامیابی کے لئے دعائیں کرتے ہیں وہی علماء حق ہیں۔“

استنباط کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جماعت اسلامی دایوبند اور ندوہ کے علماء و اکابر کو جماعت تبلیغ کے طریق کار سے کلیتہً اتفاق ہے چونکہ اس جماعت کا طریق کار عین سنت کے مطابق ہے اور امت مسلمہ کی اصلاح کے لئے مفید و موثر ہے۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں تفصیل سے جواب دیا جائے کہ کیا واقعی جو علماء عملاً جماعت تبلیغ سے وابستہ ہیں یا اس کے طریق کار سے اتفاق رکھتے ہیں وہی علماء حق ہیں اور جو علماء اس جماعت سے وابستگی نہیں رکھتے یا اس کے طریق کار سے ان کو اتفاق نہیں وہ علماء سواد ہیں؟

نکسا گھر بار کو اللہ کے حوالے کر کے قریہ، شہر، شہر گھوم گھوم کر اسلام کے چند مخصوص احکام یعنی چھ باتوں کی دعوت دینا ہی اصل تبلیغ ہے؟ کیا یہ طریق تبلیغ عین سنت کے مطابق ہے؟ اور کیا اس طریق تبلیغ سے اکابر علماء حق کو کلیتہً اتفاق ہے؟

جواب:-

جماعت تبلیغ کے بارے میں ہم وقتاً فوقتاً اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

کسی صاحب کے جو فقرے آپ نے نقل فرمائے ان پر کچھ کہنا تو ایک فضول و لا یعنی بحث میں وقت ضائع کرنا ہے۔ یہ فقرے کوئی ذمہ دار عالم تو کہہ نہیں سکتا البتہ ایسے لوگ یقیناً کہہ سکتے ہیں جن کا علم براۓ نام اور عقل برائے بریت ہو۔

ہمیں جہاں تک معلوم ہے جماعت اسلامی اور ندوہ و دایوبند کے بہترے علماء کو جماعت تبلیغ کے طریق کار سے بنیادی اختلاف ہے۔ وہ برسر عام چلے سکی مخالفت نہ کریں لیکن اس کی تائید و حمایت بھی کبھی

نہیں کرتے اور اس کے طریقے پر کام کرتے ہوئے بھی انھیں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

بہر حال صحیح تر نقطہ نظر یہ ہے کہ جماعت اسلامی جماعت تبلیغی اور ندوہ و دایوبند کے علماء بھی اپنے اپنے طور پر دین و ملت کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ ان میں کوئی نہیں جو اخلاص اور حسن نیت سے خالی ہو۔ یہ سب قرآن و سنت پر ایمان رکھتے ہیں، اسلام کے بنیادی عقائد کی حد تک یہ ایک دوسرے سے متفق ہیں اور ایسی کوئی بات ان میں نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر کسی ایک کو ہدایت یافتہ اور دوسرے کو گمراہ قرار دیا جاسکے۔ البتہ سوچنے کا انداز سب کا یکساں نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا اللہ تعالیٰ نے انسانی شکلوں کی طرح انسانی ذہنوں میں بھی رنگارنگی پیدا کی ہے۔

ہر دماغ کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جیسے کہ ہر تجربہ کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں۔ ہر ذہن کا الگ سا محل ہے۔ اس فسرق کی بنا پر قدرتی بات ہے کہ غور و فکر کا اسلوب اور استدلال کا طریق بھی جدا جدا ہو۔ پھر علم و فہم کا یکساں نہ ہونا بھی مزید رنگارنگی پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص قصہ حافظ قرآن ہے اور تھوڑی سی آرد و فارسی کے سوا اس نے کچھ نہیں پڑھا۔ اس کی نظر بھلا ان گہرائیوں تک کہاں جا سکتی ہے جن گہرائیوں تک کسی ایسے شخص کی نظر جاسکتی ہے جس نے قرآن کو سمجھا بھی ہو، حدیث کے معانی و مطالب تک بھی رسائی حاصل کی ہو اور فقہاء کے کرام کے فرمودات بھی اس کے مطالعے میں آئے ہوں۔ ان دونوں کے طریق فکر، طریق استدلال اور صلاحیتوں میں یکساں کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر جمالت اور علم دونوں کے بے شمار درجے ہیں اور اسی طرح فہم و دراست اور سوجھ بوجھ کے بھی بے شمار درجے ہیں اسی لئے ازل سے آج تک یہی ہوتا آیا ہے اور قیامت تک یہی ہوتا رہے گا حسن نیت اور اخلاص و دلہیت کے باوجود لوگ بہترے معاملات و مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف آراء قائم کریں اور

طریق کار ہی میں نہیں اصول و مبانی میں بھی ان کے مابین
اچھا خاصا اختلاف ہے۔

جب فطری اور قدرتی صورت حال یہ ہے تو کس
طرح یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ کوئی بھی جماعت یہ تصور کرے
گئے کہ حق صرف ہمارے اندر منحصر ہے اور جو لوگ ہمارے
دائرے سے باہر ہیں یا ہم سے متعدد امور میں اتفاق رائے
نہیں رکھتے وہ گمراہ ہو چکے ہیں۔ یہ تصور دراصل ایک
بیماری ہے جسے کینسر اور تپ دق جیسا ہلک بھٹکا چاہیے۔
جماعت تبلیغی ہو، جماعت اسلامی ہو، علماء دیوبند ہوں،
علمائے اہل حدیث ہوں۔ ان سب کے دلوں اور ذہنوں میں
توسیع ہونا چاہیے۔ رواداری اور تسامح ہونی چاہیے۔
احساس دمداری اور سنجیدگی ہونی چاہیے۔ اختلافی
مسائل میں یہ جتنا چاہے زور باندھیں۔ اپنے اپنے ممالک
کے لئے دلائل کا انبار لگائیں، دوسرے ممالک کے رد میں
سرگرمی دکھائیں لیکن اس علمی جنگ کو بغض و عناد اور منافرت
کے حدود میں داخل نہیں ہونا چاہیے اور مجبوراً کسی کے خلاف
بددینی اور گمراہی کے فیصلے صادر نہیں کرنے چاہئیں۔

ہمارے نزدیک تبلیغی جماعت کا طریق کامفاسر سے
خالی نہیں ہے اور اس کے طرز فکر میں بھی ضرور سارا اجزاً
ملے ہوئے ہیں مگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ جماعت دائرہ
حق سے باہر ہو گئی اور حق پرستی کا سارا اٹھیکہ ہمارے حصے
میں آگیا۔ ہم جماعت اسلامی کے پرانے حامیوں میں ہیں
لیکن یہ سمجھیں کہ ہم نے نہیں کہا اور جماعت اسلامی والے بھی
ہرگز یہ نہیں کہتے کہ حق پرست صرف وہ ہے جو جماعت
اسلامی میں داخل ہو گیا اور جماعت اسلامی سے باہر رہنے
والے یا اس کی مخالفت کرنے والے گمراہ ہیں۔ باطل پسند
ہیں بددین ہیں۔

اپس کی باتیں

سوال: سزا دے۔ اے سعید۔ ابو ذہبی
حجلی کا طلاق نمبر ملا۔ بہت خشک ہے۔ مگر آپ کو

اس کے لئے کافی سخت کر لی گئی ہے۔ انہی حیرت
خیز دے۔ خشک حلق کے اس طلاق نمبر میں تراویح کی آیت
نے پوری تلاش ضرور کی ہے مگر آپ برائے نامیں لو کہہ
کہ آپ نے جہاں بھی موقع ملا ان مقالہ نگاروں کی وہ
درگت بنائی ہے کہ بے چارے زندگی بھر آپ کے الفاظ
کی جھن بھول نہ سکیں گے۔ میں آپ پر یہ الزام لگانے
کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ آپ نے دراصل اپنے پرچہ کی
خشکی کو ختم کرنے کے لئے اس انداز کو اختیار کیا ہے۔

پہلے ہی دین اور دینی تعلیم سے ملت دور ہو رہی ہے
اور ہماری باوجود قوم میں بہت کم قومی، ملی، اور دینی ورد
رکھنے والے اصحاب باقی رہ گئے ہیں۔ اگر ان کے تعلق
سے بھی آپ ہم نوجوانوں کے اذہان میں شکوک پیدا
کریں تو پھر ساری مایوسی میں اضافہ ہی ہوگا۔

جواب:-

اگر ہمارے نزدیک کاروباری منفعت کو اولین
اہمیت حاصل ہوتی تو یقین کیجئے کہ ایسا خشک نمبر بھی نہ
نکلنے کو نہ عام برادران ملت کے لئے اس طرح کی
علمی دینی بحثوں کا خشک ہونا مسلمات میں سے ہے۔
پھر آپ تو ماشاء اللہ جوان آدمی ہیں۔ جوانی میں اس
طرح کی شخصیں اور بھی غیر دلچسپ محسوس ہوتی ہیں لیکن
ہم اپنے اس فریضے کو کیا کریں جسے ہم نے ہر دوسری
شے پر ترجیح اور اہمیت دے رکھی ہے۔ یہ فریضہ ہے
نقد و نظر کی وہ کاوش جسے ہمارے ہم عصروں میں دوسرے
اہل حضرت عموماً نظر انداز ہی کرتے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی
گفتگو طلب مسئلہ ہمارے سامنے آئے اور اس کا تعلق
علوم دینیہ سے ہو تو ہم پر واجب ہو جاتا ہے کہ جس بات
کو حق سمجھیں اسے دلائل و براہین کے ساتھ کہہ ڈالیں۔
یہ خیال آپ کا درست نہیں کہ ہم نے خشکی دور
کرنے کی خاطر مقالہ نگاروں کی درگت بنائی ہے۔
اگر واقعی درگت جیسی کوئی چیز ہماری موشگافیوں میں

جسارت نہ کرنی چاہئے کہ انھیں ٹوکے۔ ان کی فاسد آراء کا فساد ظاہر کرے اور ان کے افکار پر نقد و نظر کا رنگ بکھریں۔ اگر وہ ایسی جسارت کرے گا تو اس کے خلاف یہ فرد جرم عائد کی جائے گی کہ اس نے نوجوانوں کے اذہان میں شکوک پیدا کئے ہیں اور باوقار لوگوں کے دتار کو دکھایا ہے۔

معلوم ہوتا ہے تجلی کا اطلاق نمبر آٹھ کی خشکی کی بنا پر پڑھا ہی نہیں۔ بس ادھر ادھر سے چند سطریں یا چند کالم لکھ کر مبتد کر دیا۔ اگر واقعی ایسا ہی ہوا ہے تو زیادہ بہتر تھا کہ اس کے تعلق سے آپ کوئی اظہار خیال نہ فرماتے۔ اٹکل پتو بتائیں مفید نہیں ہو اگر تمہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں بلکہ نمبر کا مقدمہ حصہ آٹھ کے پڑھ ڈالا ہے تو بڑی عجیب بات ہے کہ ملزم آپ اس شخص کو گردان رہے ہیں جس نے اجماع امت کی تائید میں دلائل فراہم کئے اور ان لوگوں کے خیالات خام کا پردہ فاش کیا جو اجماع امت کی پورا کئے بغیر جو چاہے کہے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کا شمار یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے کچھ شہرت یافتہ علماء جو کچھ بھی کہیں اس پر ہر شخص کو خاموش ہی رہنا چاہئے اور کسی پہاڑ جیسی غلطی پر بھی انھیں ٹوکنا نہیں چاہئے ورنہ نوجوانوں کے اذہان میں شکوک پیدا ہوں گے اور ان کی یالوسیاں بڑھ جائیں گی۔

داو لہ۔ یہ کیا طرز فکر ہے۔ یہ کس کمر و طلیٹ کمر آپ اس طرح کی عجیب باتیں سوچ رہے ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ کسی بھی مصلحت کی کوئی قیمت تھی و صد اقت کے مقابلے پر نہیں ہے۔ قوم کی عزت اور شہرت کا بیڑا تو مدت ہوئی غرق ہو ہی چکا۔ سیاست و اجتماع کے دائرہ سے خود مسلمان اپنے دین کو مدت ہوئی جلا وطن کر چکے۔ اب جو کچھ بانی رہ گیا ہے وہ شریعت کا تحریری سرمایہ ہے۔ وہ عقائد و افکار میں جو کم سے کم کتاب کے صفحات پر اور اصحاب علم کے اذہان و قلوب میں آج بھی موجود ہیں۔ اب کیا انھیں بھی مسخ و تحریف کی دلدل میں دھنسنے

بانی جا رہے ہیں تو اسے ارادی و اختیار سے تصور نہ کر لیتے۔ ہمارا دستور اور عام طرز تحریر یہ ہے ہی ہے تجلی کے قائل آپ دیکھیں تو اسی قسم کی درگست کے بے شمار نمونے آپ کو ملتے چلے جائیں گے۔ بات کو چٹا چٹا کر کہنے کا فن ہمیں نہیں آتا۔ باطل و فاسد افکار سے مفاہمت و مصالحت ہمارے بس کا روگ نہیں۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے سچ کر کہتے ہیں بے کم و کاست کہتے ہیں زور و قوت کے ساتھ کہتے ہیں۔ یہ صفات گوئی اگر صحیح و سنجیدہ اور کھلے الفاظ کے چلنے میں رو نہا ہوتی ہے تو اس پر ہمیں خیر نہیں گھنٹہ نہیں اسے ہم ہنر اور کمال نہیں سمجھتے بلکہ اپنی خامی اور بے سلیقگی ظہور کرتے ہیں۔ مگر ضروری تو نہیں کہ آدمی اپنی ہر خامی کو دور کرنے پر قادر ہی ہو۔ یہ خامی ہم قبر میں ساتھ لے کر جائیں گے اور باری تعالیٰ کے نزدیک بھی اگر یہ واقعہ خامی ہوئی تو اس پر ہم سے باز پرس بھی ہوگی۔ واللہ عفو و غفور۔

جب ہمارے احساسات کا یہ عالم ہے تو آپ یا کوئی بھی ہمیں اس رخ سے جو چاہے کہہ رہے ہیں برا ماننے کی کیا ضرورت۔ بہ حقوق آپ اس سے بھی زیادہ کچھ کہیں جتنا آپ نے کہلے ہم جو آبا یہ مصرعہ پڑھیں گے کہ ہر چہ از دوست می رسد نیکو است۔

البتہ اپنے دو صدمے میرے میں آپ کے بڑا کہلے وہ لائق شکایت ہے۔ اس میں آپ کے بعض ان حاکموں اور "شہزادوں" کا طرز فکر اختیار کیا ہے جو رعایا پر ستم کرتے ہیں لیکن یہ رعایا جب اس ستم پر داو لہ کرے تو اسیر و مقہورہ جلا دیتے ہیں کہ تم نے حکومت کو بدنام کیا ہے۔ گویا قصور وار ستم کو کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اس ستم کی نشان دہی کرنے والے ہیں۔

میرے عزیز! کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ قوم ملت کی خیر خواہی کے عنوان سے بعض مظلما نا اور عالم فاضل حضرات جو چاہے کہتے رہیں جیسی چاہے خلاف دین و آراء کا اظہار و اعلان کریں مگر کسی درد مند کو یہ

جائزہ دیا جائے اور ہم جیسے لوگ ہونٹوں پر قفل چسکا کر بیٹھ رہیں۔

جاہل کی امامت

سوال :- اے آر قریبی۔ احمد آباد۔

خدمت عالی میں گزارش ہے کہ اہدئہ ترمذی کے جریدہ تجلی میں صفحہ ۱۰ پر مرزا عبد القادر بیگ صاحب نظام آبادی کے سوال "نماز جنازہ" کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "نماز جنازہ ہو یا کوئی اور نماز، اماں کے اصطلاحی عالم ہو یا ضروری نہیں۔ بس اتنا علم ضروری ہے کہ جس کی روشنی میں نماز صحیح طور پر پڑھائی جاسکے۔"

اکثر مساجد میں احادیث نبویؐ لکھ کر کلینڈر ہوتا ہے اس میں سلسلے اردو میں احادیث کا ترجمہ ہوتا ہے کہ جس سے عام مسلمان احادیث نبویؐ اور ہر گز کان دین متین کے زترین اقوال پڑھ کر نصیحت حاصل کریں۔

ہمارے ایک محترم دوست جو کہ موصوف ہیں موصوف نے اس میں ایک ہدایت کا اور اضافہ کر دیا وہ ہے :- "جاہل کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ جاہل کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوا کرتا۔ اس کی عاقبت جہنم ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

سہ انجام جاہل جہنم بود

کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

اسی لئے جاہلوں کے پیچھے یعنی جاہلوں کی امامت میں سب کی نماز خراب ہو جائے گی۔

موصوف محترم نے یہ اس لئے ہدایت کا اضافہ کر دیا ہے کہ اکثر اوقات مسجد میں اماں کی غیرووجودگی میں آپے لوگ جٹ سے اماں بن جاتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر بھی قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ صرف نماز کے لئے چند سورتیں یاد کر لی ہیں۔ نماز کے مسائل سے نااہل ہوتے ہیں۔ احادیث نبویؐ میں سے ایک یا دو بھی حدیث یاد نہیں۔ ان لوگوں کے علمی معیار کا یہ عالم ہے کہ اردو کا جریدہ تجلی ممکن ہے کہ

بچے کے گڑھے میں گرے۔ لیکن جریدہ کیا کہہ رہا ہے بچے یا بھانے کی قابلیت نہیں ہے اور قرہ یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ہفتہ سینا بغیر قضا ہو جائے اور بادل ناخواستہ قضا بھی ہو گیا تو شاید اس کا کھٹا رہ تو ضرور ادا کر ہی دیتے ہوں گے۔ روزانہ کے فرضوں میں سے ایک پر بھی فرض ہے کہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے قریب گزرتے ہیں مگر عام مسلمانوں کی دعائے مغفرت کے لئے اس قبرستان میں نہیں جاتے لیکن پیر صاحب کے زوار اقدس پر جو دوسرے قبرستان میں ہے افتتاح کی نماز کے بعد بلا ناغہ سجدہ غلطی کے لئے آچوک حاضری دی جاتی ہے۔ والدین کی قبروں پر کھڑے ہو کر دعائے مغفرت نہ کریں تو چل جاتا ہے لیکن پیر صاحب کی قبر پر نہ جائیں تو شاید جہنم کے انگارے سارے کے سارے انھیں حضرات پر الٹ پڑیں گے اتنے پابند پیر ہیں۔ امتیازی طبقہ ہے کہ یا غوث الثقلین کریم الطہین اختی و امدادی فی قضاء حاجتی یا قاضی الحاجات کی نماز کے دلدادہ ہیں۔ گو یا ایسے سخت قسم کے بدعتی اور چل مرکب لوگ بلا کسی کے کہے سے جٹ سے امام بن کر نماز پڑھانے لگ جاتے ہیں۔ جن کی ترمیم کھوٹری میں بدعت کی یا جہالت کی یا دونوں مرکب غلطت کی کھاد بھری پڑی ہو ایسے جاہلوں کی امامت میں تو تمام مقتدیوں کی نماز خراب ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ہمارے محترم دوست نے ایک مزید ہدایت لکھ کر کلینڈر میں اضافہ کر دیا ہے۔

آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ تجلی کی ڈاک

میں جواب تحریر فرمائیں کہ ہمارے محترم نے جو ہدایت لکھ کر اضافہ کر دیا ہے یہ درست ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

جواب :-

"اصطلاحی عالم" اس شخص کو کہتے ہیں جو باقاعدہ علمی مدرسے میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کر چکا ہو۔ ایسا ہی

عالم امامت کے لئے کا یہ شرط کبھی کسی فقہ نے نہیں لگائی اور
قرآن وحدیث سے بھی ثابت نہیں ہمارے جواب کے
اس جزو میں تو کوئی بحث ہی نہیں۔ برادر سے اجتناب تو وہ
بھی بلاشبہ درست ہے البتہ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے
جو شرک پسند ہوں بدعتی ہوں۔ یا فاسق و فاجر ہوں۔ ہر
قول میں ان چیزوں کا استثنیٰ آپ ہو جاتا ہے جن کا استثنیٰ
ہونا معلوم و معروف ہو مثلاً نہ یہ کہتا ہے کہ فلاں ٹانگ
بے حد مفید ہے تو اس سے ان لوگوں کا استثناء خود بخود
ہو جائے گا جو اس درجہ مریض ہوں کہ ٹانگ اور مرقیات
ہضم ہی نہ کر سکیں یا جیسے قرآن میں ایک جگہ کہا گیا کہ
اللہ تمام گناہ بخش دیتا ہے تو اس سے کفر و شرک اور الحاد
ارتداد کا استثناء خود بخود ہو گیا کہ یہ استثناء معروف و مشہور ہے
لہذا ہماری عبارت کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ
ایسے جہلاء اور مبتدعین اور فساق بھی امامت کے مستحق ہیں
جن کا نقشہ آنجناب نے کھینچا ہے۔ انھیں امام بنانا بدترین
نفس کی بدعتی ہے۔ یہ لوگ تو کئے بدعتی ہیں۔
اس کے باوجود آپ کے دوست کی لٹکائی ہوئی ہدایت
تشہار اور مغالطہ انگیز ہے۔ اصطلاح میں وہ بھی لوگ
جاہل کہلاتے ہیں جنھوں نے باقاعدہ علم دین حاصل نہ
کیا ہو لیکن ان میں بہترے بزرگانِ خدا ایسے نیکو کار اور
اتنے باخبر ہوتے ہیں کہ اچھی نماز پڑھا سکتے ہیں اور ان کے
چھپے سناڑ میں کوئی مضائقہ نہیں۔

وہ جوابات جن کے سوالات حذف کر دیئے گئے

بریلویوں کی فتنہ گری

پروفیسر سید محمد خلیل الرحمن۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ۔
(ناپور) متوجہ ہوں۔

آمنجانبے دونوں اسکپ صفحات پر جو کچھ لکھا ہے وہ
سرفہرہ کرنے کے لئے صفحات کہاں سے لائے جائیں۔
بریلوی حضرات کا علم کلام کوئی نئی چیز نہیں بیسیوں برس

سے یہ حضرات اسی طرح کی خرافات پھیلاتے چلے آ رہے ہیں
جماعت اسلامی کو، علماء دیوبند کو، علماء حرمین کو،
شاہ اسماعیل شہید کو غرض اپنے سوا سب کو گمراہ بردین
وہابی کہنا اور اپنے منہ میاں ٹھونکنا ان کی کہنہ روش
ہے۔ ان کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ جھوٹ بولتے خلاف
واقفہ دعویٰ کر دے اور ڈنکے کی چٹ کر دے۔ اب مثلاً آپ
کی نقل کردہ عبارت کے خاتمہ پر بریلوی بریلوی صلیب
نے کس بے تکلفی سے یہ جھگ انشائی کی ہے کہ اعلیٰ حضرت
احمد رضا خاں صاحب کو اللہ نے محمد بن کر پیدا کیا
اور انھوں نے گمراہی و بدعت کی مثال کرسنتوں کو زندہ
کیا اور طوفان کا سرخ موڑ دیا اور دین اسلام کو بدعتوں
کے گرد و خبار سے پاک کر دیا۔

گویا ایک طرف تو یہ حضرات یہ روٹا روتے ہیں کہ
ان کے سرور و طبقہ اور حلقے کے سوا سب لمان گمراہ اور بد
دین ہو گئے مگر دوسری طرف یہ بھی خوش فکری ہے کہ دین
اسلام بدعت ہوں گے گرد و خبار سے پاک ہو گیا!

حماقت، عبادت اور سفاہت کی صنی اقسام ہیں ب
کی سب بریلوی علم کلام میں افراط سے پائی جاتی ہیں۔ علم
حدیث کی انھیں ہوا انھیں لگی۔ قرآن کی آیات میں یہ لگ
ایجاد ہیں پڑھتے ہیں۔ عرس و توالی جیسے خرافات ان کی
محبوب ترین متاع ہیں۔ مردوں کو انھوں نے ذیلی اور ظلی
خدا بنا رکھا ہے۔ اولادوں کا نام خواجہ بخش معین بخش عبد
اگر کسی درگاہ کے صاحب مزار کا نام بھوند شاہ ہو تو یہ
اپنے صاحب زانے کا نام بھوند بخش رکھنے میں بھی مضائقہ
تصور نہیں کرتے ان کا ذوق و مذاق اور وجدان و احساس
سب کچھ اوہام و وساوس نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ انھیں
زبان و ادب اور محاورات لسانی کا بھی کوئی سلیقہ نہیں۔
مولانا اسماعیل شہید اور مولانا اشرف علی اور مولانا محمد قاسم
جیسے علماء کی اردو عبارتوں میں طرح طرح کے کڑے و لٹاؤ و
بات ہے یہ سحرے قرآن کے الفاظ و عبارات تک سے کھیل
کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مشرکانہ

جھاپیں اور لاگت کی لاگت بچیں یا ممکن ہو تو مفت بھی تقسیم کر آئیں۔

کسی کو کافر و مشرک یا بدعتی کہنا

کوئی شخص ایسے کسی عقیدے کا حامل یا فعل کا مرتکب ہو جس کا کفر یا مشرک یا بدعت ہو نا دلائل معتبرہ کے لحاظ سے بالکل مسلم ہو تو ایسے شخص کو متعین طور پر بھی کافر یا مشرک یا بدعتی کہہ دینا بالکل جائز ہے بلکہ بعض حالتوں میں تو واجب بھی ہے مثلاً کوئی شخص صفات صفات عقیدے کا اظہار کرتا ہے کہ اولیاء و انبیاء کی روحیں حاضر و ناظر ہیں یا فلاں نبی یا ولی کو اللہ نے کائنات میں تصرف کا حق عطا کر رکھا ہے یا فلاں مزار پر دعا مانگی جائے تو لازماً قبول ہوتی ہے یا فلاں مرحوم ہماری پیکار کو ہر جگہ سے سن لیتے ہیں تو اسے مشرک کہنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ کیونکہ یہاں تاویل اور حسن ظن کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اگر یہ شخص یہ تاویل کرے کہ مذکورہ صفات کو میں اولیاء و انبیاء کی ذاتی صفات نہیں مانتا بلکہ یہ صفات اللہ نے انھیں عطا کی ہیں تب بھی یہ مشرک ہی ہے کیونکہ یہ یقیناً بت پرستیوں والا عقیدہ ہے۔ بت پرست بھی اس پتھر کو خدا نہیں مانتے جسے انھوں نے تراشا ہے۔ یہ تراشیدہ بت تو جھن نشان او منظر ہیں بعض بت کسی گدڑی ہوئی ہستی کی شبیہ ہوتے ہیں اور بعض بت ان اوصاف کی نمائندگی کرتے ہیں جو بجا ربوں کے ذہنوں میں مرتسم ہیں۔ یہ دونوں ہی شکلیں انکارِ خدا پر مبنی نہیں ہیں۔ آپ کسی پڑھے لکھے ہندو سے پوچھ دیکھتے وہ بھگوان کا انکار نہ کرے گا۔ یہ نہیں کہے گا کہ رام یا کرشن یا فلاں اور فلاں الٰہ تبارک۔ یہ بھی نہیں کہے گا کہ جن بتوں کو تراش کر مندر میں رکھا گیا ہے وہی عین بھگوان ہیں۔ اسی طرح مشرکین عرب بھی پتھر یا لکڑی یا مٹی کے بتوں کو عین خدا سمجھ کر نہیں پوجتے تھے بلکہ انھیں خدا کا منظر یا کسی مرحوم عابد و زاہد کا پیکر خیالی تصور کرتے تھے اور اسی قسم کا ذہن ان کا بھی تھا کہ فلاں فلاں بتیوں کو رب

مبالغہ نہ کرنا اور صالحین کے بارے میں اساطیری اور دیوانائی تخیلات کو اشاعت دینا ان کے دین و مذہب کا ثبوت لباب ہے۔ جسے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا بھی دہا برت اور گرا ہی تصور کرتے ہیں۔ ایسے توحید و یمنوں اور قرآن و احادیث کی واہی و شریک فیوں سے کون سہارے۔ ان کا حال یہ ہے کہ بجا س باران کے کسی اعتراض کا شافی جواب دے دو مگر یہ جواب کو نظر انداز کر کے برابر اعتراض کی جگہ کی کرتے چلے جائیں گے اور بیس سال بعد بھی یہی معلوم ہو گا کہ گویا کوئی تازہ اعتراض وضع کر کے لارہے ہیں۔ یہ جتنے اعتراضات و الزامات آپ کی نقل کردہ عبارت میں شاہ اسماعیل شہیدؒ اور اکابرین دین پر نظر آ رہے ہیں ان کی لغویت اور بے اعتباری سیکڑوں بار مفسح کی جا چکی مگر کیا محال کہ ان کے کانوں پر جوں تک رسائی ہو۔

مذکورہ کتاب کو اگر ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے ہمارے مشرک اور اندھرا پردیش میں تقسیم کیا جا رہا ہے تو اس کا توڑ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ نہایت سست ہے اور جس قسم کے نکات ارشاد ہوئے ہیں ان کا کوئی تعلق علم و تفقہ اور متانت و ثقافت سے نہیں لہذا ہم ان پر کچھ نہیں لکھیں گے۔ ہم پڑھے لکھے حضرات سے مباحثہ کر سکتے ہیں مگر دماغی خلل میں مبتلا بد مذہبوں سے بحث کی قدرت نہیں رکھتے۔ مذکورہ کتاب کے مصنف کا تو کیا ذکر ہے ہیں پورے بریلوی طبقے میں بھی کوئی ایک فرد ایسا نظر نہیں آ رہا ہے جو علوم تفسیر اور اصول حدیث میں جہارت رکھتا ہو۔ جسے متین علم کلام اور وایح مخفی میں تمیز کا سلیقہ ہو، پھر گفتگو ہو تو کس سے اور بحث ہو تو کیسے۔ قے آنے لگی ہے ان لوگوں کی ہفتا سے۔ آپ اگر ان کے جابلانہ پروپیگنڈے کا توڑ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے کہ تجلی کے صفحات سیر کرنا بلکہ یہ ہے کہ جو کتابیں بریلوی افکار کے رد میں شائع ہو چکی ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں۔ صحیح العقیدہ حضرات کے تعاون سے انھیں بار بار

البتہ جن عقائد و اعمال میں ذرا بھی حسن ظن اور بہتر تاویل کی گنجائش ہو ان کے حاملین و متکببین پر فتویٰ سنی جھڑپے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ زیادہ محتاط طریقہ یہ ہے کہ کسی تعین فرد یا گروہ کو کافر و مشرک یا بدعتی کہنے کے عوض کفر و مشرک اور بدعت پر نکیر یا لے دے کرنی چاہیے مثلاً آپ بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ شریعت قبوری سوسے پیر تک بدعت ہے اور اس میں مشرک کے عناصر بھی شامل ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کو عالم الغیب و راحض و ناظر مانتا ذہنی مانیو لیا کے سوا کچھ نہیں اور اس طرح کے عقائد اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

نئے درود

درود نام ہے ان کلمات کا جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ سے سلام و صلوات کی دعا کی گئی ہو۔ اس کے لئے قرآن میں بھی اور احادیث میں بھی خاصا مواد ہے۔ نماز ہی میں ہم روزانہ جو درود پڑھتے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلقین فرمایا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی بزرگ رسول اللہ کی محبت میں کچھ اور کلمات ایسے وضع کرتے ہیں جن میں حضور کی تعریف کی گئی ہو تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں بلکہ دیکھنا صرف یہ ہوگا کہ جو تعریف انھوں نے کی ہے وہ مبالغہ اور غلو سے پاک ہے یا نہیں۔ اگر پاک ہے تو اس کی تعریف و تحسین کریں گے۔ پاک نہیں ہے تو اس سے دور بھاگیں گے۔

دیے حقیقت میں جو نور، برکت اور معنوی افادیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم فرمودہ الفاظ و کلمات میں ہو سکتی ہے وہ قرآن کے سوا کسی بھی کلام میں نہیں ہو سکتی الفاظ و حروف کے بھی اپنے خواص و اثرات ہیں۔ وظائف و عملیات کا سارا مدار ہی ان خواص و اثرات پر ہے لہذا ہمارے نزدیک تو احتیاط اور عافیت اور حسن ادب کا تقاضا یہی ہے کہ درود میں بھی ان الفاظ و کلمات ہی کو اختیار کیا جائے جو اللہ کے آخری رسول کی زبان مبارک سے نکلے

الارباب نے فلاں فلاں اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ اس طرز فکر کو قرآن نے بامناہ دہل شرک قرار دیا۔ اس پر سخت نکیر کی۔ اسے کھلی گمراہی پھیرایا اور حضور نے بھی اس طرز فکر کو دفن کرنے کی جدوجہد میں کوئی تساہل نہیں برتا لہذا آج بجائے پتھر کے ثبوتوں کے کوئی شخص کسی قبر کو یا کسی مرحوم کے خیالی وجود کو یا کسی روح کو بھی حیثیت دے لیتا ہے تو اسے مشرک کے سوا آخر کیا کہیں گے۔

یہ عقیدے کا معاملہ ہوا عمل کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کسی قبر کا طواف کرنا دکھائی دے یا اس پر سجدہ کرے نظر آئے تو اسے مشرک کہنا ہو گا چاہے وہ کسی ہی تاویل کیوں نہ کرے کیونکہ طواف صرف بیت اللہ کے لئے مخصوص ہے اور سجدہ ذات باری کے لئے۔ یہ افعال کسی بھی نیت اور ارادے سے کئے جائیں آدمی کو مشرکین کے زمرے میں لے جاتے ہیں اور مفتیان دین کا فرض ہے کہ ایسے افعال کے مرتکب کو بلا خوف مشرک کہیں۔

بدعت کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص رحیم یا کلیر یا کسی بھی درگاہ کے عرس میں یہ سمجھ کر شریک ہوتا ہے کہ یہ شرکت خیر و برکت اور ثواب کا ذریعہ ہے گی تو وہ یقیناً بدعتی ہے۔ ہاں اگر وہ محض تفریحاً مشرک ہوتا ہے تو بدعتی نہیں فقط گناہ گار ہے اور گناہ کے بھی مختلف اسبج ہیں۔ کچھ لوگ میلے ٹھیلے کی ذہنیت سے شریک ہوتے ہیں جیسے کہ تماشوں میں شریک ہوا جاتا ہے۔ یہ کم درجے کے گناہ گار ہوں گے۔ کچھ لوگ آوارگی اور اوباشی کے ذہن سے شریک ہوتے ہیں یہ بڑے گناہ گار ہیں لیکن بدعت ہر گناہ سے بڑھ کر گناہ ہے اس لئے خوش عقیدگی اور ثواب اور کسب فیض کے ارادے سے شرکت کرنے والوں کو ان سب سے بڑھ کر گناہ گار تصور کرنا چاہیے۔ یہ بدعتی ہیں انھوں نے دین میں اضافہ کیا ہے۔ یہ خلق خدا کے لئے شرک کا وسیلہ بن رہے ہیں۔ ان کا عمل ہزار فتنوں کی جڑ ہے۔ ان سے کہیں بہتر وہ شخص ہے جو دنیا دیکھتا ہے اور احسا رکھتا ہے کہ میں کوئی اچھا کام نہیں کر رہا ہوں۔

مطہن ہونا ایمان کا خلاصہ ہے۔ اور شریعت ان ذیلی اصول و احکام سے عبارت ہے جو قبول ایمان کے نتیجے میں واجب القبول ہو جاتے ہیں۔

طریقت کوئی قرآنی اصطلاح نہیں بلکہ ایک خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وضع کی گئی ہے۔ یہ مفہوم ہے ایسے طریقے ڈھونڈنا جن سے زیادہ سے زیادہ رمضان کی اور قرب خداوندی نصیب ہو۔ حدیث میں جس چیز کو ”احسان“ کہا گیا ہے یعنی اللہ اور رسولؐ کے تمام احکام کی تعمیل نہایت درجہ خلوص اور شوق و شغف کے ساتھ کرنا اور شریعت نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے پوری طرح ترک کرنا۔ اسی منزل کی طرف لے جانے والے طور طریقے ”طریقت“ کہلاتے ہیں۔

معرفت کہتے ہیں پہچان کو۔ ہر شے کی ایک سطح ہوتی ہے اور سطح کے نیچے بہت سے پرت ہوتے ہیں۔ گہرائیاں ہوتی ہیں۔ سطح تک محدود رہنا معرفت نہیں، گہرائیوں تک پہنچنا معرفت ہے۔ اللہ ایک ہے یہ صرف ایک عقیدہ ہو لیکن اسے اللہ کی معرفت کا نام نہیں دیں گے معرفت یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کا نقش دل و دماغ میں گہرا ہوتا چلا جائے۔ اس کے بہت درجے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام سب سے اونچے درجے پر فائز ہیں اسکے بعد صحابہ، مفسرین، محدثین، اولیاء و اقیاء اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس نعمت سے بہرہ یاب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

حقیقت کسی بھی شے کی اصلیت کو کہتے ہیں۔ اس کا مقابل ”مجاز“ ہے۔ اس سے زیادہ باریکیوں میں آپ نہ پڑیں۔

وراثت کا اہم ترین مسئلہ

مسلمانوں میں اعمال و عقائد کے جہاں اور بے شمار مفسدے گھس گئے ہیں وہیں ایک یہ مفسدہ بھی نفوذ حاصل کرتا جا رہا ہے کہ جن ائمہ کیوں کی شادی ہو چکی وہ اب اپنے

ہیں جنہیں صحابہ کرامؓ نے غالب گمان کے طور پر حضورؐ سے منسوب کیا ہے۔

رہے صوفیاء کے تعلیم فرمودہ وظائف و اوراد تو انھیں حکیم کے نسخے جیسا سمجھے۔ اگر صوفی واقعی صوفی ہے تو وہ بجا طور پر اس کا حق رکھتا ہے کہ امراض روحانی کے معالجے میں جب جس دوا یا وظیفے یا تسبیح کو مفید سمجھے اسکی تعلیم دے۔ اس تعلیم میں خلاف شرع کوئی عنصر نہ ہو تو یہ وظیفہ اس کی تعمیل کرنی چاہیے۔ حضورؐ نے جو وظائف امت کو دیئے ہیں وہ ہمہ گیر نوع کے ہیں۔ جیسے شلا سید اور انکوں کی ذاتہ افادیت سے لبریز ہیں اور ہر شخص کے لئے انھیں مفید کہا جاسکتا ہے لیکن بیماری کی بہت سی حالتوں میں ان سے پرہیز بھی کرایا جاتا ہے اور ان کے بجائے دوسری غذاؤں کی تجویز کی جاتی ہیں اسی طرح ایک صاحب نظر صوفی اور مرشد کسی مرتضیٰ روحانی کو یہ تعلیم بھی دے سکتا ہے کہ بعد نماز صبح فلاں وظیفہ پڑھو اور فلاں نہ پڑھو۔ تہجد میں اتنی رکعات پڑھو اور اتنی صلیت پڑھو۔ تلاوت قرآن میں اتنا وقت دو اور اتنا صلیت دو۔

ہاں یہ بہر حال طے ہے کہ کوئی بھی تعلیم اور ہدایت خلاف شرع نہ ہونی چاہیے۔ نیز جن اوراد و کلمات کو اللہ یا رسولؐ نے وقت اور محل سے مخصوص کر دیا ہے ان میں تبدیلی کی اجازت کسی کو نہیں۔ جیسے نماز میں دو درود۔ یہ درود تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔ یا جیسے سمع اللہ لمن حمدہ یا سبنا للک الحمد کے فقرے۔ یہ اصل اور غیر تبدیل ہیں۔

شریعت حقیقت طریقت معرفت

شریعت نام ہے قوانین کے مجموعے کا۔ ایمان اور شریعت میں فرق یہ ہے کہ ایمان تو نام ہے چند بنیادی نقائد کو تہید دل سے قبول کر لینے کا۔ خدایہ پر اس کی نازل شدہ کتابوں پر انبیاء پر ملائکہ پر تقدیر پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر قلب و ذہن کا

محض اس لئے یکمشت دار بھی سے اجتناب کرنا کہ لکھی نہیں لگتی ہے گناہ کی بات ہے۔

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم ترین بستی ہے۔ اسکی سرزمین نے انقلابات کی بے شمار کردہیں بھی ہیں۔ اور اب دارالعلوم کی وجہ سے یہ بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔ اس بستی کی دلچسپ اور تحقیقانہ تاریخ جناب سید محبوب سرحدوی کے قلم سے ملا حظہ فرمائیے۔ تاریخ نگاری میں مصنف بیہوش کی بصیرت ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہو گیا، اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ صفحات ۱۵۷۔ قیمت مجلد دس روپے

بریلوی فتنے کا نیا روپ

بریلوی مکتب فکر کے اہل قلم جناب ارشد قادری کی تصنیف ”زلزلہ“ کا تنقیدی جائزہ۔ تحریف و تبلیغ کی نشاندہی۔ دلچسپ علمی و منطقی بحثیں۔ دستاویزی حقائق۔ کتاب کے فاضل مصنف جناب محمد عارف بھٹی نے بڑے دلکش اور فرہماند انداز میں نقد و تعقب کا فرض ادا کیا ہے۔ قیمت — پانچ روپے

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (پ۔)

والدین کی وراثت میں حق دار نہیں رہیں۔ حتیٰ کہ بعض لائق باب خود اپنی شادی شدہ بیویوں کو محروم ہی کر دینے کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور اس کے لئے طرح طرح کے کرتب کھیلے ہیں۔

کان کھول کر سن لیا جائے۔ لڑکیوں کا شرعی حصہ ہر حال میں قائم رہتا ہے خواہ ان کی شادی ہو چکی ہو اور خواہ دولت مند مسرال نے انھیں کتنا ہی دولت مند بنادیا ہو۔ نیز یہ بھی نوٹ کر لیا جائے کہ کوئی باپ ہزار وصیت کرے کہ میرے ترکے میں فلاں بیٹی کو حصہ دیا جائے مگر ایسی وصیتیں شریعت کی نگاہ میں ردی کاغذ سے زیادہ نہیں۔ خدا کے بنائے ہوئے داروں کو کوئی محروم نہیں کر سکتا اور جس گھرانے میں ایسی ناپاک کوششیں کی جائیں گی اسے آخرت کے سخت عذاب کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

دار بھی کا مسئلہ

دار بھی اگر اس لئے رکھنی ہے کہ حکم رسول کی تعمیل ہو اور آخرت کی باز پرس کا خطرہ نہ رہے تو پھر زیادتیں کے نقطہ نظر کو پس پشت ڈالئے۔ فقہاء نے حدیث رسول پر غور کر کے یک مشت مقدار کو ضروری قرار دیا ہے۔ اگر شک مشت نکلی ہی نہیں تب تو جتنی نکلی ہے اتنی ہی رکھی جائے۔ یک مشت سے زیادہ نکلی ہے تو بڑھے ہوئے حصے کو کٹوایا جاسکتا ہے۔ چہرہ چھوٹا ہو بڑا ہو، دُبل ہو موٹا ہو، اس سے کوئی بحث نہیں۔ نہ اس سے بحث ہے کہ کیسے چہرے پر کتنی دار بھی لکھی گئی ہے۔ اگر تعمیل شریعت کے لئے کوئی کام کرنا ہے تو اس طرح کی بحثوں سے دور رہنا ہو گا۔

یک مشت کی مقدار سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناپ احادیث میں نہیں آیا بلکہ فقہاء نے احادیث کے مصداق کا تعین اپنے طور پر کیا ہے لہذا اس سے اختلاف کرنا حدیث سے اختلاف کرنے کے ہم معنی نہ ہو گا لیکن

قرآن اور تفسیر | تعلیمات قرآنی کا خوب تصدیق اور ادب صالح کا دلکش مجموعہ

ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ قیمت — چھ روپے۔

جائزہ ترجمہ قرآنی | دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے۔ اسکی

تحقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ بہت عمدہ اور ملومات افزا کتاب ہے۔ قیمت — چھ روپے۔

فتیۃ الطالبین | مصنفہ: شیخ عبدالقادر جیلانی۔ قیمت مجلد تیس روپے۔

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات | قاہرہ کے ایک ناضل پیرسٹر

عبداللہ غنان کی تالیف نئے اسلوب میں۔ تاریخ اسلام کے بعض واقعات پر علم و تحقیق کی روشنی۔ قیمت — ساڑھے ساڑھے روپے۔

اسلام اور ترقی | مولانا اشرف علی کے افادیت سے لبریز ارشادات۔ قیمت — ۶۰ پیسے

تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانی | ملک و ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا

عبد اللطیف نعمانی شیخ الحدیث مفتاح العلمین مولانا ۳۹۲ھ کی نئی علمی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندہ جاوید کارنامے

ور اہل علم و رہنمایان ملک و ملت کے خراجِ حائے عقیدت۔ قیمت — پانچ روپے

تاریخ الفخری | تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اردو فارسی اور سرسبز

بانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو ترجمہ ماضی ہے۔ قیمت — گیارہ روپے۔

کتوبات خواجہ معصوم سہروردی | معارف و اسرار ہدایت و نصائح و کلمات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں معالہ

ی بہترین چیز۔ قیمت — چھ روپے۔

مناجات مقبولہ (کسیسی) | مولانا اشرف علی کی مقبول عام اور مفید سیر

کتاب پرانے اور نئے اظہاروں کے ساتھ۔

قیمت — چھ روپے۔ (مجلد سات روپے)

سنگھوں کی ٹھنڈ | اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں جو مسلمان اس غلط خیال

کا شکار ہیں کہ رسول اللہ بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل۔

فقہاء و مجتہدین کے مستند حوالے۔ قیمت مجلد — آٹھ روپے

رمضان کیسے ہے؟ | مولانا محمد عبداللہ دہلوی کے رشحات قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوب تر کتاب۔ قیمت مجلد — تین روپے۔

تبلیغی و علمی سرگرمیاں | جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں

عہد سلف میں دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے بازار کہیں بھی ہوں مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے

غافل نہیں کیا۔

التشرف | افسر۔ قاضی اطہر مبارک پوری۔ قیمت — ڈیڑھ روپے۔ احادیث کی معرفت مولانا اشرف علی کی معروف کتاب۔ قیمت — سو روپے۔

امت مسلمہ کی رہنمائی | مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت

عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات، دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت — دو روپے۔

سفر مصر و حجاز | امیر شریعت مولانا امت الشہبازی کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افزا سفر نامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے۔

سفر نامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (دیوبند)

روح کو تَرْهَقَ کا فاعل بنایا گیا ہے جب کہ ممدوح مفسر کے ترجمے میں اسے مفعول مالم تسم فاعل کی حیثیت دیدی گئی ہے (یعنی ایسا مفعول جس کا فاعل مذکور نہ ہو) حالانکہ آگے آیت ۸۵ میں یہی جملہ ٹوٹا ہے تو وہاں ممدوح نے درست ترجمہ کیا ہے۔

(۵) آیت ۵۷: - وَتَرْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ لَكِرًا وَنَ - ترجمہ: یہ اگر کوئی سی بھی بناہ کی جگہ پاتے یا کوئی غار یا کوڑے (اور) جگہ گھس بیٹھے کی تو یہ ضرور منہ اٹھا کر اوپر چل پڑتے ہمارا خیال ہے ”اور“ کتابت کی غلطی ہے۔ ممدوح نے ”ادھر“ لکھا ہو گا۔ مگر گزارش یہ کرنی ہے کہ گستاخی معاف کبھی کبھی تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جلد سے جلد تفسیر مکمل کر دینے کے خیال میں ممدوح فکر و حق کے بغیر بڑی تیز رفتاری سے قلم چلا رہے ہیں اور بہتر مقامات پر محاورہ گھاس کاٹنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ مقام بھی منجھا ان کے ایک ہے۔

ذکر قرآن میں ان منافقین مدنیہ کا ہور ہا ہے جو مسلمانوں کے آگے جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا بھرم رکھنا چاہتے ہیں۔ جو اصلاً کافر ہوتے ہوئے بھی خود کو مومن پونہ کرتے ہیں جو انتہا بزدل ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ نے رسولؐ اور اس کے صحابہؓ کو بتا دیا ہے کہ یہ انجنت بحالت خجوری یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ کہیں بھاگے جا نہیں سکتے۔ تمہارے زور و قوت پر غلبہ نہیں پاسکتے۔ اگر تمیں کوئی جائے پناہ نظر آجائے کوڑے سے چھیلنے کی جگہ معلوم ہو جائے، کوئی بل ایسا دکھائی دے جائے جس میں یہ چڑھوں کی طرح چھپ کر بیٹھ جائیں تو یہ اس بل اور جائے پناہ کی طرف دوڑ پڑنے میں ایک بل کی بھی ذ نہیں لگائیں گے۔ وہم و جمجمہ کے تھوڑے الفاظ نکال دیا کہ کھنے کے قابل ہیں۔ فرماں الجہوجہ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو بے تماشہ دوڑ چلا جا رہا ہو اور کتنی ہی لگام میں چھوڑ دئے نام نہ لے۔ گویا جمجمہ کہہ کہہ کہ اللہ نے یہ نقشہ کھینچا ہے جائے پناہ کی طرف یہ لوگ اس طرح سرسری دوڑیں گے کہ کوئی بھی تیز اٹھیں دوڑنے سے باز نہ رکھ سکے گی۔

تفسیر ماجدی

(۱۰۱)

(۴) آیت ۵۶: - وَتَرْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ لَكِرًا وَنَ -

مولانا کا ترجمہ: ”اور ان کی جانیں ایسی حالت میں نکلیں

جائیں کہ وہ کافر ہوں۔“

یہاں جو چوک ہوئی ہے وہ ایسی لغزشوں میں ہے کہ اگر مولانا محترم بغور نظر ثانی فرماتے تو اس کی اصلاح خود ہی فرمائیے۔ تَرْهَقَ صیغہ معروف ہے لیکن مولانا ترجمہ مجہول کر گئے ہیں۔ حالانکہ مولانا اشرف علیؒ کا جو ترجمہ اور تفسیر برابر ان کے آگے کھلی رہی ہے اس پر اگر نظر سے یہ جملے رکھتے تو یہ چوک نہ ہوتی۔ مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔

”اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جائے۔“

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ یہ ہے:۔ ”اور باہر نکلیں“

ان کے بدلوں سے دور حالیکہ وہ کافر ہوں۔“

شیخ الہند کا ترجمہ یہ ہے:۔ ”اور نکلے ان کی جان اور

وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں۔“

ان تمام تراجم میں صیغہ قرآنی کی مطابقت سے جان یا

اس کیفیت کو بہترین طور پر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے میں پیش کیا۔

”اگر وہ بائیں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سرگھاسے

کو جگہ تو اٹھ بھاگیں اسی طرف رستیاں تڑاتے۔“

”رستیاں تڑانا“ محاورہ اسی وقت بولا جاتا ہے جب

کوئی ہر قیمت پر بھاگ پڑنے کا تہیہ کر چکا ہو اور ہر بندش کو توڑ دینا چاہتا ہو۔

مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ یہ ہے۔۔۔ ”تو یہ ضرور

مٹھا اٹھا کر اُدھر چلیے۔“

خدا ان کی قبر کو زور سے بھردے یہاں ان سے دھم مجھ چون نظر انداز ہو گیا ہے۔ مولانا مودودی نے بھی یہاں ترجمے میں اس لفظ کا حق ادا نہیں کیا۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔۔۔

”تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔“

یہ مفہوم ہے ترجمہ نہیں ہے۔ ”چھپنے“ کا مرادف کوئی

لفظ آیت میں موجود نہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بھی

یہاں اتنا غمازہ نہیں ہے جتنا شیخ الہندؒ کا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں۔۔۔ ”البتہ متوجہ ہو دیں طرف اس کے

تھارے ڈر سے۔“

صرف ”توجہ کرنے“ میں وہ بات کہاں تو رستیاں تڑا کر

بھاگ پڑنے میں ہے۔ شاہ صاحبؒ کا ایک تفسر بھی یہاں

ہے انھوں نے دھم مجھ چون کے الفاظ اسباق سے مربوط

کرنے کے عوض مستقل فقرے کی حیثیت سے لے لیا ہے۔ یہ ایک

لطیف و دقیق بحث ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

خلاصہ یہ کہ ممدوح مفسر کا ترجمہ شایان شان نہیں معلوم ہوا۔

(۶) آیت ۵۹ کے ترجمے میں کاتبؒ کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے

(۷) آیت ۶۰۔۔۔ اِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالدُّعَاءِ

وَاعْلَامِیْنِ عَلَیْہَا۔ ترجمہ۔۔۔ ”صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں کا اور محتاجوں

اور کارکنوں کا حق ہیں اور جو ان پر مقرر ہیں۔“

ابن نظر قارئین اور خود ممدوح مفسر انصاف فرمائیں

کیا اس طرح کا ترجمہ پڑھ کر کوئی بھی ہوشمند قاری جھلاہٹ

محسوس کئے بغیر ہو سکے گا تصور یہاں ممدوح کا نہیں معلوم ہوتا

کا اضافہ کاتب کی کار گیری ہے۔ اس کا ریکی نے ایک

کو دو مصارف میں بدل دیا ہے۔ گویا کارکن تو کوئی او

ہیں اور جو ان پر مقرر ہیں وہ کوئی اور ہیں۔ صحیح کی ایسے

فروغداشتیں قرآن کے ترجمہ میں قابل درگزر نہیں۔

(۸) آیت ۶۲۔۔۔ یَحْلِفُونَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لَیْمِزْنَکُمْ

وَ اِنَّکُمْ لَکَاذِبٌ۔ اَحَقُّ اَنْ یَّیْمِزْکُمْ اِنْ کَانَ اَمْرٌ

تَرْجُمَہ۔ ”یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ

تم کو خوش کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ مستحق ہیں

کہ خوش اللہ کو کر لیں اگر (واقعی) یہ لوگ ایمان والے ہیں

جس فقرے پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس پر توجہ فرماؤ

جائے۔ یہ آخر کیا زبان ہے۔

صحیح ترجمے کی دو نکلیں تھیں۔ یا تو یوں لکھا جاتا۔۔۔

”اللہ اور اس کا رسولؐ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ

یہ لوگ انھیں خوش کر لیں۔“

یا پھر یوں لکھا جاتا۔۔۔ ”اللہ اور اس کا رسولؐ اس کا

زیادہ مستحق ہے کہ اسے یہ لوگ خوش کر لیں۔“

مولانا مودودی نے پہلی شکل اختیار کی۔ شاہ عبدالقادرؒ

اور مولانا اشرف علیؒ نے دوسری۔ حضرت شیخ الہندؒ نے دونوں

صورتوں کو چھوڑ کر نہایت باعبارہ اور دل نشیں ترجمہ کیا۔۔۔

”اللہ اور اس کے رسولؐ کو بہت ضرور ہے راضی کرنا۔“

خدا جانے ممدوح یہ فقرہ کیسے لکھ گئے ”کہ خوش اللہ کو

کر لیں۔“

(۹) آیت ۶۹۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا فروغ سے خطاب کر کے کہہ رہے

ہیں کہ تمہاری حالت بھی پچھلے لوگوں جیسی ہے جو زور و قوت اور

مال و اولاد کی کثرت میں تم سے بڑھ کر تھے۔ انھوں نے اپنے

ذنیوی حصے سے فائدہ اٹھایا تم نے بھی اپنے حصے سے فائدہ

اٹھایا۔ اور تم نے بھی اسی طرح وہی رنگ و ڈھنگ اختیار کئے

جو انھوں نے اختیار کئے تھے۔

جس فقرے پر ہم نے خط کھینچا ہے اس کے لئے قرآن میں

یہ فقرہ استعمال ہوا ہے۔۔۔

وَحُصِّنَتْ كَالَّذِي خَاصُّوا۔

اس کا ترجمہ ممدوح نے یہ فرمایا ہے: "اور تم لوگ بھی گھسے جیسا کہ وہ لوگ گھسے تھے۔"

یہ لفظی ترجمہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی درج ذیل فقرہ پڑھے۔

"زید کے ہاتھوں کے ٹوٹے اڑ گئے۔"

اور عربی میں اس کا ترجمہ یہ کرے۔ "طاسر بیغوات

من یبدا فریسا۔"

ظاہر ہے اس عربی ترجمے کو پڑھ کر ایک عرب بچھاڑ کھا جائے گا حالانکہ بظاہر یہ "مناسب" لفظی ترجمہ ہے!

کاش ممدوح غور فرماتے کہ خاص مخصوص (باب ن) کے معنی گھسنے کے آتے تو ہیں مگر اس وقت جبکہ کوئی

گھسنے کے قابل نہ لفظاً مذکور ہو۔ جیسے خاص الماع۔ پانی میں گھسا۔ خاص الغیر انت مشکلات کی گھاٹوں

میں گھس پڑا۔ کوڑ پڑا۔ زید المخص اللیل۔ زید تاریکیوں سے لاپرواہ ہو کر گھس پڑتا ہے۔

یہاں آیت میں مفعول مذکور نہیں پھر "گھسنے" کا ترجمہ کیسا۔ اگر محاورے کو نظر انداز کر کے لغت ہی کی پیروی

کرنی تھی تو کم سے کم اتنا کرے کہ لفظ "باطل" فقرے میں رکھ دیتے جیسے کہ علامہ آلوسی نے رکھا ہے یا جیسے کہ شاہ

عبد القادرؒ نے ترجمہ کیا ہے۔ "اور بیٹھے تھے وہ بیچ ہال کے مانند اس کے کہ بیٹھے ہو تم باطل میں" (حالاں کہ

یہ ترجمہ بھی مفیول ہے۔ لکھنا یوں چاہیے تھا کہ بیٹھے ہو تم ہال میں مانند اس کے کہ بیٹھے تھے وہ بیچ ہال کے)

مولانا اشرف علیؒ نے ترجمہ فرمایا ہے۔ "اور تم بھی بری باتوں میں ایسے ہی گھسے جیسا وہ لوگ گھسے تھے۔"

مولانا مودودی نے با محاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی

"اور ایسی ہی باتوں میں تم بھی پڑے جیسی باتوں میں

وہ پڑے تھے۔"

ہماری ناچیز رائے میں یہ ترجمہ بھی نہجی نظر ہے۔

عمدہ بالمحاورہ ترجمہ شیخ الہندؒ کا ہے۔ "اور تم بھی چلتے

ہو انھی کی ہی چال۔"

گھسنا سننا کچھ نہیں۔ مقصد قرآن ٹھیک وہی ہے جو شیخ الہندؒ کے ترجمے سے ظاہر ہے۔ زبان قرآن نے با محاورہ

استعمال کی ہے۔ جب یوں کہا جائے کہ حصن ابن تشاع تو یہ ترجمہ نہیں ہو سکا کہ گھس جہاں تمہارا دل چاہے۔ بلکہ یوں

ترجمہ کیا جائے گا۔

"جہاں چاہے گھسنا پھر د"

"گھسنا مانتے پھر جہاں چاہے"

"خاک جاؤ جس جگہ کی جگہ ہے"

قرآن کی تمثیل کا تعلق نہ تو صرف کچھ بحثوں سے نہ کمی مخصوص بے راہ روی سے بلکہ وہ عام روئیں ہال ہی پھلوں نے

اختیار کی تھی مجموعاً اسی کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے پھلوں کے تھے ویسے ہی تمہارے بھی ہیں۔ جو دطیرے انھوں نے

اختیار کئے دی تم بھی کر رہے ہو۔

تطویل کی معافی۔ یہ قرآن ہے۔ اس کی زبان عربی میں ہے۔ ترجمہ بھی اردو میں ہی کی شان کا ہوتی ہے

ہے در نہ زبان تو بھی کے منہ میں اور قلم بھی کے ہاتھ میں ہے۔ آیت (۵)۔ کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ آج مسلمانوں کا

غذا اڑا رہے ہیں اللہ خود ان کا مذاق اڑائے گا اور انھیں دردناک عذاب دے گا۔ آیت کے الفاظ ہیں۔

سَنُخْرِجُكَ مِنَ الدُّنْيَا مَذْمُومًا۔ ممدوح نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ "انہوں کا تسخیر انھیں پر اڑ رہا ہے۔"

اس ترجمے میں ایک لطیف خامی ہے۔ قرآن کا مقصد یہ بتانا ہے کہ آج جو لوگ مسلمانوں سے تسخیر اور استہزا کر رہے

ہیں انھیں کل ان کے اس جرم مانہ روئیں کا بدلہ عذاب الیم کی صورت میں دیا جائے گا۔ خود ممدوح نے تفسیری نوٹ میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"یعنی ان کے تسخیر کی وجہ سے انھیں دے کر برے جگا۔"

گویا جس طرح عذاب الیم فوری طور پر نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ آئندہ دیا جائے گا اسی طرح اس فقرے کا مطلب بھی

یہی ہے کہ تسخیر کی سزا آئندہ ملے گی۔ نہ یہ کہ فی الحال انھوں

مولانا مودودی کا یہ ہے۔ اور ان کے دلوں پر ٹھہرا لگا دیا گیا۔

گویا یہ سب حضرات صیغہ قرآنی کے مطابق جھول ہی ترجمہ کرتے ہیں۔

دوسرا جھول یہ کہ ”میں“ کا محل نہیں۔ قرآن نے فی قلوبہم نہیں کہا علی قلوبہم کہا۔ اردو میں بھی محاورہ ”دلوں پر چڑھ“ بولتے ہیں ”دلوں میں نہر“ نہیں۔

تیسرا یہ کہ قصہ کی فاکا ترجمہ نظر انداز ہو گیا حالانکہ اس صہر و ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔ فایہا صرف تعقیب ہی کے لئے نہیں سمیت کے لئے بھی ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ”پس“ کیا۔ مولانا اشرف علیؒ نے ”جس سے“ اور حضرت شیخ الہندؒ نے ”سو“۔ بہر حال فاکا ترجمہ ہونا چاہئے تھا۔ لطف یہ ہے کہ چند ہی آیات بعد جب یہ آیت معمولی تغیر کے ساتھ لوتی ہے تو مدوح کے ترجمے میں کوئی جھول نہیں پایا جاتا۔ وہاں ”میں“ کی جگہ ”یہ“ ہی ہے اور فاکا ترجمہ ”سو“ موجود ہے۔ صیغہ بھی ہم آہنگ ہیں۔

تفسیر ماجدی کی زیر تبصرہ دوسری جلد سورہ توبہ پر تمام ہو گئی ہے۔ التوبہ کے ترجمے پر ہم نے نظر ڈال لی اب اس کے تفسیری نوٹوں کا جائزہ باقی رہ گیا ہے تو انشاء اللہ وہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

۳/۵۰

قرآن مجید کا چلیخ مجلد

۲۱-

آپ تقریر کیسے کریں

-۱۵۰

مستراں پر ظلم

۱۱-

رحمت اللعالمین ایک نظریں

۴۱-

تفسیر ضیاء القرآن ہفت طیں تیار فی قسط

۱۰۰-

مکتوبات حضرت علیؒ اردو مع عربی

۱۲۱-

حدیث دفاع جنرل اکبر خاں

۱۰۰-

توضیح البیان شرح حفظ الامان

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

ہاتھ مل رہی ہے۔ جب یہ مطلب ہے اور فاضل مفسر بھی اس سے متفق ہیں تو ترجمے میں حالیہ فقرہ کیوں استعمال کیا گیا۔ الٹ رہا ہے۔ ”کا مصداق تو یہ ہو کہ جس وقت یہ لوگ تسخیر کر رہے ہیں اسی وقت ان کا تسخیران پر الٹا جا رہا ہے۔“
مولانا اشرف علیؒ نے یہ ترجمہ کیا:۔ ”اللہ تعالیٰ ان کو تسخیر کا بدلہ دے گا۔“

شاہ عبدالقادرؒ نے یہ ترجمہ کیا:۔ ”اللہ تعالیٰ ان کو جزا عطا کی دے گا۔“

حضرت شیخ الہندؒ نے یہاں خالصۃ الفاظ کی پیروی کرتے ہوئے یہ ترجمہ فرمایا:۔ ”اللہ نے ان سے عطا کیا ہے۔“
یہ فقرہ نحوی اعتبار سے ماضی کا بیان ہے۔ مگر ان کا لفظ تسخیر چونکہ ماضی ہی کا صیغہ ہے اس لئے لفظی اتباع میں ترجمہ بھی اسی کے مطابق کر دیا جائے تو اعتراض کی بجائش نہیں لیکن ”الٹ رہا ہے“ ماضی نہیں حال ہے اور حال کے لئے عربی میں مضارع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ لہذا یہ ترجمہ لفظی رمایت کا حامل ہونا نہ معنوی رعایت کا۔
دعا آیت ۸۷:۔ ”وَطَبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ“
مدوح کا ترجمہ:۔ ”اور ان کے دلوں میں نہر لگ گئی وہ سمجھتے ہی نہیں۔“

اس میں کئی جھول ہیں۔
ایک یہ کہ طبع صیغہ جھول ہے مگر ترجمہ صیغہ معطو کیا گیا۔ جھول سے معطو کی طرف یا معطو سے جھول کی طرف گرنے کسی معقول بنابر تو مناسب کہا جاسکتا ہے لیکن یہاں کوئی وجہ موجود نہیں۔ ”لگ گئی“ کی جگہ ”لگا دی گئی“ ہونا چاہئے تھا۔ مدوح نے اتباع رسولنا اشرف علیؒ کا کیا ہے اور ان کے بھی الفاظ ایہ ہیں مگر اتباع ہنرمندی میں ہونا چاہئے جھول چوک میں نہیں۔

شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ یہ ہے۔ ”اور نہر کی گئی ہے اور دلوں میں ان کے“

شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے۔ ”اور نہر کر دی گئی ان کے دلوں پر۔“

از:- وحید الدین سلیم - حیدر آباد

پردہ اور حدود حجاب پر ایک فیصلہ کن بحث

آج سے کوئی دس سال قبل ماہنامہ "رفقہ زمانہ" میں ایک مقامی اور جدید تعلیم یافتہ مسلم رہنما کا ایک نہایت مفصل انٹرویو شائع ہوا تھا اور اس میں دین و ملت کے اہم ترین مسائل پر گفتگو کی گئی تھی۔ اسی زمانہ میں حیدر آباد سے مولوی ابوسعید صاحب (سابق امیر جماعت اسلامی شہر حیدر آباد) کی ادارت میں "صادق" نام کا ایک ہفتہ وار اخبار شائع ہو کر نکلتا تھا۔ راقم الحروف نے اس انٹرویو پر "خواب میں ہنوز....." کے عنوان سے ۳۵ فلکی صفحات پر مشتمل ایک طویل تنقیدی مضمون لکھا تھا اور طے یہ ہوا تھا کہ یہ سچ قسطوں میں شائع ہوئے۔ لیکن "صادق" میں صرف پہلی ہی قسط چھپی تھی کہ یہ اخبار بند ہو گیا اور مضمون کا بڑا حصہ چھپنے سے رہ گیا۔

مذکورہ انٹرویو میں پردہ اور حدود حجاب سے متعلق مولانا مودودی مدظلہ العالی کے انکار و آراء پر بھی اعتراض کئے گئے تھے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ مولانا اس معاملہ میں انتہا پسند واقع ہوئے ہیں اور ان کے مقابلے میں مولانا عبدالمجید دریابادی راہ اعتدال پر گامزن نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس دعویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ قارئین اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔ (سلیم)

چار دیواری کا پردہ قطعی طور پر کتاب و سنت سے
توثیق ثابت نہیں ہے۔ (مضامین عبدالمجید)
یہ سمجھنا کہ احکام شرع شریف سخت پردہ کی
حمایت میں ہیں ایک نقطہ نظر ہے اس سے زیادہ
نہیں۔ شرع شریف میں گنجائش ہے کہ خواتین وقت
مآبی کے ساتھ ضروریات کی تکمیل کے لئے باہر نکلیں۔
(رفقہ زمانہ، جنوری ۱۹۶۲ء ص ۲۵)

لے فی الواقع شریعت اسلامی کا نشانہ کیسا ہے پہلے اس کی
وضاحت کر دینی چاہئے تھی۔

۱۰۔ سخت اور لچکدار نقطہ نظر تو حجاب صدر کا صر
طبع زاد نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے چھ

پردہ کے متعلق "۱۰" کی وہی پالیسی ہے جو منشا ہے
شرع شریف ہے۔ لیکن مسئلہ قابل توجہ ہے کہ آیا
شرع شریف میں پردہ کا وہی تصور ہے جو ہم طور پر
سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں شرع ہی سے ہمارے
پاس دو نقاط نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ
جو پردے کے بارے میں ایک سخت نقطہ نظر
رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو کس قدر لچک دار
نقطہ نظر رکھتے ہیں، جیسے موجودہ دور میں مولانا
مودودی اس نقطہ نظر کے حامی ہیں کہ پردہ کو
شدت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ اس لئے کہ برخلاف
مولانا عبدالمجید دریابادی لکھتے ہیں کہ ہر پردہ اور

۱۰ یہاں اس مجلس کے نام کو حذف کر دیا گیا ہے جس کے وہ صدر ہیں۔ کیونکہ یہ تحریر صرف افادہ فائدہ کے لئے شائع کی جا رہی ہے۔

تبصرہ کے ختم ہر مولانا نے کتاب کے مطالعہ کی کسی پُر زور سفارش کی ہے، مثلاً حظم ہو۔

”موجودہ دور میں تو اس کتاب کو ہر بڑھے لکھے گھر میں ہونا چاہیے۔ خصوصاً نو تعلیم یافتہ گروہ کے حق میں تو اس کا مطالعہ اکسیر ہے۔ پوشش کر کے اس کے نسخے ہر بیک لائبریری میں کاجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں پہنچانے چاہئے اور اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ایک ایک مغرب زدہ بہن سے منت ساجت کر کے اسے ایک بار تو شروع سے آخر تک پڑھوایا جائے۔“

اپنی تحریر کے تسلسل میں مولانا عبد الماجد صاحب نے جگہ جگہ اصل کتاب پر ”برہ“ کے اقتباسات بھی نوشتا دیئے ہیں جنہیں بخوف طوالت یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔ اس پورے تبصرے کو پڑھ جلیے۔ اس فاضل حلیل کے قلم صدقہ نواز سے کتاب ”برہ“ پر تفصیل و اختلاف کا ایک لفظ بھی نہ ملے گا۔ شروع سے آخر تک تعریف ہی تعریف اوروں تحسین کی تحسین کے کلمات پر یہ تبصرہ مشتمل ہے۔ اس مستند رائے کے بعد جناب صدقہ کے اس ارشاد عالی ”مولانا مودودی اس نقطہ نظر کے حامی ہیں کہ پردے کو شدت کے ساتھ نافذ کیا جائے گا۔“ کا کیا ذہن باقی رہ جاتا ہے؟ ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے!

لے لچکدار نقطہ نظر کی تائید میں، مولانا عبد الماجد دیا بادی کے جواظ انٹرویو میں پیش کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں اُن کے ربط مضمون کا اندازہ نہ ہو سکا تھا لیکن خیال تھا کہ مولانا کی یہ رائے کتاب ”برہ“ سے پہلے کی ہے۔ اس کے باوجود احکام پردہ سے متعلق مولانا عبد الماجد کے انکار کی تلاش تھی اور خود اُنہی کے مرتب کردہ مجموعہ مضامین ”انشائے ماجد“ کی دو جلدوں میں بھی اس موضوع پر کچھ نہیں ملا۔ اسی انشاء میں اتفاقية طور پر مولانا غلام رسول دستگیر رشیدی کی مرتب کردہ کتاب ”مضامین عبد الماجد“ ہاتھ لگی اس میں ”برہ کے حدود“ کے مزید عنوان ایک مفصل مضمون

دئی اہول کار فرما نہیں ہے۔
یہ رائے مولانا مودودی کی تالیف ”پردہ“ پڑھے بغیر نہ ہی اعتماد کے ساتھ دے دی گئی ہے حالانکہ ”برہ“ اسلامی شریعہ میں ایک شاہکار کتاب ہے۔ اس پر مفصل تبصرہ مولانا عبد الماجد دیا بادی کے قلم سے ۱۳ اگست ۱۹۷۱ء کے ”صدق“ میں نکل چکا ہے۔ اس کی چند عبارتیں ہاں نقل کی جاتی ہیں:-

”شریعت اسلامی کے مسائل جناب، صنفی عدم اختلاط و مسائل متعلقہ کے خلاف جو سلسل اور پُر زور پروپیگنڈا مخالفین کی طرف سے عرصہ دراز سے جاری ہے وہ یہاں کامیاب ہو گیا ہے کہ غیر تو غیر انہوں کو لفظ ”برہ“ سے شرم آنے لگی ہے۔ اور اب اگر کوئی پردہ اس ”علم“، ”آزادی“، ”نور“ خیالی کے زمانہ میں بھی اختیار کے ہوئے ہے تو گویا وہ کسی شدید جرم کا مجرم ہے اور اُس کے ساتھ نہایت زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُس پر ترس کھا کر اُسے چھوڑ دیا جائے۔ متفرق طور پر ضرورت پر پردہ پر اور حمایت پر پردہ میں اچھے اچھے رسالے اور مقالے لکھے جائیں ہیں لیکن ضرورت اس کی تھی کہ کوئی مرد حق اٹھائے اور اس سلسلے کے سارے مسائل متعلقہ کو لیکر اُن پر ایک جامع و مفصل بحث کرنا اور متعلقہ مسائل کے باب میں شریعت کے پورے نظام کو جزئیات اور اطراف و احوال کی فلسفیانہ تشریح کے ساتھ واضح کرنا۔“

”اللہ نے اس خدمت کے لئے وقت کے دوسرے مسائل و دورِ حاضرہ کے دوسرے تقنین کی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جن لیا اور مولانا کے قلم سے اس بحث پر ایک جامع و مبسوط تصنیف شائع کر دی۔“
”کتاب کی اصل خوبیاں تو کتاب ہی کے مطالعہ سے نظر آسکتی ہیں مصنف کے استدلالی حکم کا علم تو جی ہو سکتا ہے۔ جب خود تصنیف کو آں سے استخراج ایک بار پڑھ لیا جائے۔“

شامل ہے۔ یہ مضمون اندازے کے مطابق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ”پردہ“ والی کتاب سے بہت پہلے ہی کا نکلا۔ اور شاید اس بناء پر ”انشائے مجدد“ میں اس کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھا گیا ہو۔

یہاں اگر حدود و حجاب اور حدودِ مہتر کے خاص فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ بحث ہی ختم ہو جاسکتی ہے۔ مولانا عبدالمجید نے حدودِ پردہ پر اپنی تحقیق سے جو کچھ لکھا تھا اور اب اس کا درجہ خواہ کچھ ہی ہو، مولانا نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے اور ”چہرہ“ کی تعریف یوں کی ہے:-

”چہرے سے مراد صرف چہرہ ہی ہے نہ کہ چہرے کے خواتی و اطراف اور جس شے کے کھلے رہنے کی اجازت ملے وہ صرف آنکھیں، ناک، منہ اور زخاروں کا ایک حصہ ہے جسے ٹھیکہ اردو میں ”چہرہ کی ٹیکھا“ کہتے ہیں۔ کان، گلا، کینٹی، سر، پیشانی کا اوپر کا حصہ ان میں سے کسی شے کے کھلے رکھنے کی اجازت نہیں“ (صفحہ ۱۱)

پھر اختتام مضمون پر یہ لکھتے ہیں کہ:-

”چہرہ کا پردہ اور چادر دیوار کا پردہ میری ناقص فہم و محدود بصیرت میں لازمی اور قطعی طور پر کتاب و سنت سے نہیں نکلا۔ البتہ جہاں فتنہ کا امکان قوی یا احتمال ہو وہاں یہ فیودا دران کے علاوہ دوسری پابندیاں بھی ضروری ہو

جائیں گی۔ اسلام نے ان پابندیوں سے روکا ہے۔ مگر نہیں ہے۔“ (مضامین عبدالمجید، مرتبہ علامہ محمد رفیع)

مولانا کی ان عبارتوں پر غور کیا جائے تو کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے؟ چہرہ کے ایک متعین مفہوم کے ساتھ اور جس زمانہ میں چہرہ دکھانے کی اجازت دی گئی تھی، کیا آج کے فتنہ پرور حالات اور ایسی سماج میں اس اجازت کو استعمال کر کے شرم و حیا اور طہارتِ جسم و روح کے وہ ثمرات حاصل کئے جاسکتے ہیں جو اسلام کا مطلوب ہیں؟ — چنانچہ

چہرے کے حکم اور نقاب کے مسئلے پر مولانا مودودی نے علمی و عقلی تمام پہلوؤں سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عورتوں کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو چہرے کا کھلا رکھنا صحیح نہیں ہے۔

یہ خواتین کی عقبتِ مآبی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے کی صورت کو یہاں جس غیر محتاط طریقے پر بیان کیا گیا ہے اسکے برعکس اسی مضمون کو مولانا مودودی نے کس قدر احتیاط و توازن کے ساتھ اپنی کتاب ”پردہ“ میں ”حاجات کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت“ کے تحت لکھا ہے۔ ملاحظہ کیا جائے۔

”..... وَ تَرَىٰ فِي مَنَاجِلِكُنَّ كَمُحَرَّمَاتٍ

کا انشاء یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے حدود سے کبھی قدم باہر نکالیں ہی نہیں۔ حاجات و ضروریات کے لئے ان کو نکلنے کی پوری اجازت ہے۔ مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے نہ غیر محدود۔ عورتیں اس کی غمازی نہیں

لے اوردو کے مشہور ادیب اور مشرقیات کے اسکالر جناب ملک رام حنا نے جس زمانے میں ”عورت اور اسلامی تعلیم“ والی کتاب لکھی تھی تو پہلی مرتبہ اپنے مسودے کو مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس روانہ کرتے ہوئے خواہش کی تھی کہ وہ اس کو ملاحظہ فرمائیں اور اس پر مقدمہ بھی لکھیں۔ مولانا مرحوم نے اس کے بعض مقامات سے اختلاف کیا۔ اور اس پر مقدمہ لکھے بغیر ہی مسودہ واپس کر دیا۔ اس کے بعد اس کتاب کی اشاعت میں تاخیر کا تذکرہ کرتے ہوئے مالک رام حنا لکھتے ہیں کہ:-

”اس دوران خود مجھے غور و فکر کا موقع ملا، پہلے میں پردہ کی بحث میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ منہ چھپانا اسلامی پردے میں شامل نہیں لیکن بعد میں مزید مطالعہ اور قرآن و حدیث پر زیادہ دقتِ نظر سے غور کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ منہ بھی اس حکم میں شامل ہے اور یہ بھی دو ایک جگہ حقیقت میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ میں نے نہ صرف (اشاعت صفحہ ۱۱)

سامان فراہم کرنا یا کوئی صحیح رہنمائی ہے؟ بعض لوگ جدید ضروریات کا سہارا لے کر عورتوں کی آزادی کا بیڑا کھینچتے ہیں کہ اسلام لاکھوں غریب اور مزدور عورتوں کا بڑا بہت ہے لہذا انھیں چہرہ دکھانے اور گھر سے باہر نکلنے کی آزادی ہونی چاہیے تاکہ وہ فیکٹریوں اور دکانوں کا کام کر کے اپنا روزگار نہرہا کر سکیں۔

بظاہر یہ مطالبہ بڑا اوجھ اور درد مندی سے معمور ہوا ہو گا لیکن اسلامی معاشرت کے اصولوں اور ان کی حکمت پر غور کیا جائے اور اسلامی معاشرے میں عورت کے مقام مرتبہ کو سمجھا جائے تو یہ مطالبہ ایک منطق سے زیادہ نہیں رہتا بلکہ یہ ایک مطالبہ ظلم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر مذکورہ خیال منظور ہو تو مولانا عبدالمجید دریا بادی کے یہ قلم سے نکلی ہوئی یہ عبارت پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔

”اسلام نے چونکہ عورت کے سرگھر کی ذمہ داریاں خانہ داری کا انتظام اور نسل انسانی کی پرورش و تربیت کا بار ڈالا ہے، اس لئے کسب معیشت سے اسے بالکل آزاد رکھا ہے۔ کما کر لانا اور گھر والوں کو کھانا فاضل کر کے۔ یعنی شوہر کا باپ کا بھائی کا بیٹے کا یا کسی اور ولی جائز اور افسر خاندان کا۔ اور جن شرائط و اصولوں میں عورت

ان ساری نعمتوں محروم ہو، وہاں اسلامی حکومت میں تو خود حکومت کی طرف سے اس کی خبر گیری کی جائے گی اور بد قسمتی سے جہاں اسلامی حکومت نہیں وہاں بھی ایسی باغی ضرب عورت حملہ کی پڑوس کی شریف زادیوں کے واسطے سنگینی وغیرہ کا کوئی ہلکا کام ہر اوقات کیلئے اہتمام کر سکتی ہے۔“ (ایک سوشلسٹ سے از مولانا جانا)

جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں اسلامی معاشرہ کی ذمہ داریاں خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں مسلمان اپنے معاشرہ کے توازن کو برقرار رکھنے اور اس کو تباہی سے

ہیں کہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں پھریں اور مردانہ اجتماعات میں گھل مل جائیں۔ حاجات و ضروریات سے شریعت کی مراد ایسی واقعی حاجات و ضروریات ہیں جن میں درحقیقت نکلنا اور باہر کا کام کرنا عورتوں کے لئے ناگزیر ہو۔ اب ظاہر ہے کہ تمام عورتوں کے لئے تمام زمانوں میں نکلنے اور نہ نکلنے کی ایک ایک صورت بیان کرنا اور ہر موقع کے لئے رخصت کے علیحدہ علیحدہ حدود مقرر کر دینا ممکن نہیں ہے۔ البتہ شائع شدہ زندگی کے عام حالات میں عورتوں کے لئے نکلنے کے جو قاعدے مقرر کئے گئے اور حجاب کے حدود میں جس طرح کی پیشی کی تھی اس سے قانون اسلامی کی اسپرٹ اور اس کے رجحان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اس کو سمجھ کر انفرادی حالات اور جزئی معاملات میں حجاب کے حدود اور موقع و محل کے لحاظ سے ان کی کمی و بیشی کے اصول ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے۔“ (پروردہ صفحہ ۲۳۹ پہلا ایڈیشن)

مولانا نے اس عبارت کے اگلے حصہ میں ضروری مثالیں دے کر حدود و مواقع کے سمجھنے میں بھی مدد پہنچائی ہے۔ اب اس سچے تلے نقطہ نظر کو ترک کر کے ذوق غریبانی کا

دگن شدہ صفحہ کا بقیہ) یہ مقام ہی بدل ڈالے بلکہ پورا مضمون نئے سرے سے دوبارہ لکھ کر اسے شائع کر دیا۔ جب یہ مطبوعہ نسخہ ان کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے اس کی تعریف فرمائی۔“

(علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم۔ انوار کلام معارف۔ سلیمان نمبر مئی ۱۹۵۷ء ص ۲۵۹)

اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خود مولانا سلیمان ندوی بھی حدود و حجاب میں چہرہ دکھانے کے قائل نہیں تھے۔ اور مقلدین ہیں کہ مسلمانوں کے ایسے بھی رہتا موجود ہیں جن کا مطالعہ قرآن و حدیث مالک رام صاحب کے درجہ پر بھی نہیں۔ (وحید الدین)

کو تباہ نہ کیجئے۔ آپ اس مقام پر رہتے جہاں آپ کو رکھا گیا ہے۔ آپ کی گود میں ہمدی اہل کھیل رہی ہے۔ آپ فرمائیے کہ آپ کو ایسا مقام حاصل ہے کہ آپ مرد کو صحیح معنی میں مرد بنا سکتی ہیں۔“

”اسلام نے عورت کو عورت اس لئے کہا ہے کہ وہ چھپائے جانے کے قابل چیز ہے۔ چنانچہ ہاتھ کے پونچوں تک پاؤں کے ٹخنوں تک، ادھر گردن تک عام جسم کو مخفی رکھنے کا حکم ہے۔ اگر اس میں سے کوئی حصہ نہ چھپا ہو تو عورت عورت نہیں رہے گی۔ لہذا کم پوشی جائز نہیں۔ بد قسمتی سے ہماری بہنوں کا لباس آد پر سے نیچے اور بعض حالتوں میں نیچے سے اوپر آ رہا ہے۔“ (صدق، ۲۰ مئی ۱۹۳۲ء)

یہ حالت تقریباً نصف صدی پہلے کی تھی تو یہ بتانے کی مزید ضرورت نہیں کہ اب وہ ملت کہاں پہنچ چکی ہے جس کا غم نواب صاحب جیسے مخلص انسان کو تھا۔ ناچ، گلے، ڈرائے، سنیما کے برق آسا شوق نے اسکو کس درجہ تباہی پر پہنچا دیا ہو گا؟ اس کا اندازہ مشکل ہے۔ مخلوط تعلیم کے رواج اور محض لٹریچر کی بڑھتی ہوئی اشتہار نے جذباتی ہیجان برپا کر کے ایک آنکھ سی لگا دی ہے اور لڑکیوں میں اعلیٰ تعلیم کا شوق تو اپنے غلط نتائج کے لحاظ سے ایک طوفان بے حیائی ہے جو مسلم معاشرے کی دھجیاں بکھیر رہا ہے اور آج عام صورت حال اس درجہ نازک ہو گئی اور تمام ترکوشش یہ کی جا رہی ہے کہ شرع و حیا کی ردایات ہی اپنی تہذیب کے اڑا دی جائیں۔ اور ان تمام آثار کے رونما ہو جانے کے بعد ضرورت پڑے کہ کو ایک سخت نقطہ نظر سے اس صورتحال کو دیکھیں۔ بہت گھروں میں بھی ہوئی شریف زادوں کے حوصلے بڑھا چڑھا کر انھیں باہر لانے کی ہے یا نواب بہادر یار جنگ، مولانا عبدالمجید دیوبادی اور مولانا مودودی سے زیادہ شدید ہو کر، جملہ مسائل شہر کو

پانے کے لئے خود اپنے طور پر اس مسئلہ کا حل نکال سکتے ہیں اور اگر مسلمان اس طرح کی کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے نہ صرف مسلم خواتین ہی کی مشکلات آسان ہو جائیں گی بلکہ بیسویں صدی کی ہیب مآذہ پرست تہذیب میں عورت جو ایک چھلونا بن کر رہ گئی ہے اس کے صحیح انسانی اور سماجی مرتبہ کا تحفظ ہو جائے گا اور اس تجربہ سے دوسری قومیں بھی فائدہ اٹھانے کی طرف مائل ہونگی۔ دوسری عید کے جیسا سو فتنوں سے مسلم معاشرہ کی فضا حد درجہ مسموم ہوئی جا رہی ہے۔ اگرچہ کابریکت ایک عرصہ سے اس طوفان کے مقابلے میں مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ابھی تک ہمارا عمومی ذہن ہوا نہ ہو سکا۔ نواب بہادر یار جنگ علیہ رحمۃ نے آج سے کوئی چونتیس برس قبل زمانہ اسلامیہ کالج لاہور میں اپنی ایک تقریر کے دوران حقانیت اسلامی کا اظہار کرتے ہوئے ملت کو اس طرح چونکا یا تھا۔

”انسو کہ اب ہمارا چراغ خانہ شمع محفل بننے کی طرف مائل ہے اور یہ تمناؤں بدن زیادہ ہو رہی ہے شاید گھر کی رعیتیں ہماری ماؤں بہنوں کو تنگ معلوم ہونے لگی ہیں اور اپنے دماغ و جسم کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہیں لیکن دنیا کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ مشرق اور اسلام نے آپ کو کچھ دیا ہے وہ کافی ہے آپ گھر میں اولاد پیدا کر کے اور ان کی تربیت کر کے اس سے کہیں زیادہ خدمت انجام دے سکتے ہیں جتنی آپ باہر آ کر دنیا چاہتی ہیں۔ وہ ممالک جہاں یہ آزادی موجود ہے ان کا نظام معاشرت دہم برہم ہو چکا ہے اور وہاں کے مفکرین اس فکر میں ہیں کہ عورتوں کو ان کی اصلی جگہ پر دوبارہ کس طرح لایا جائے۔ میں اپنی بہنوں سے بددعوت کروں گا کہ خدا کے لئے اپنی سوسائٹی اور معاشرہ

صفائی معاملات | جیسا کہ نام کے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں مولانا اشرف علی نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ طبع کا کام کارساز ہے۔ قیمت صرف ۶۰ پیسے۔

معجزہ کیسے؟ | مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ دیوبند کی ایک فکر انگیز تصنیف۔ معجزے کے تمام پہلوؤں پر علم و تفقہ کی روشنی میں۔ قیمت مجلد — ڈھائی روپے۔

شہدائے بدر | شہدائے بدر کے مختصر حالات و کوائف۔ ایک روپیہ۔

فن اسماۃ الرجال | مولانا تقی الدین مظاہری علم الیہ بیت کا مدار اور اویوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فن اسماۃ الرجال پر منحصر ہے۔ لہذا حدیث رسول سے دلچسپی رکھنے والے تمام ہی مسلمانوں کے لئے یہ کتاب بنیادی فوائد کی حامل ہے۔ قیمت — ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

مکتوبات مجدد الفتن | حضرت شیخ احمد سرمدی کے خطوط تمام اہل علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا گنجینہ سمجھے گئے ہیں۔ سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے۔ مجلد جلد اول — پندرہ روپے۔

فضائل منار | شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مشہور کتاب۔ عکسی طباعت کیساتھ قیمت — ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

حدیث دفع (جزل اکبر خاں) مجلد — ۱۲/۱۶
مکتوبات حضرت علی (مع اردو ترجمہ) — ۱۶/۵
تصوف کی حقیقت (دشنام ولی اللہ) — ۵/۷
مولانا عبد اللہ سندھی اور ان ناقد — ۷/۷

مکتبہ تجلی - دیوبند دہلی

استعمال کر کے انھیں اسلامی تعلیم کو سمجھانے اور ہدایت کا باب دیکھنے کی ہے؟ — یہ ایک اہم ترین سوال ہے اور اس کے دونوں پہلو تعمیر و تخریب، اسلام و جاہلیت سامنے آچکے ہیں۔ چنانچہ اس کا جواب اب ملت کے اجتماعی فیصلہ پر منحصر ہے کہ وہ اپنی اصلاح و بقا اور تہذیبی تحفظ و برتری کے لئے کون سی راہ اختیار کرتی ہے؟

ہفت روزہ عزائم (لکھنؤ) کا خاص نمبر

جدوجہد آزادی کی تاریخ۔ نتائج کیا نکلے۔ ہم کہاں پہنچے۔ تمام امور پر نہایت دقیق و دلچسپ اور مبصرانہ مضامین۔ نظم و نثر دونوں معیاری اور دلکش۔ یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ کی چیز ہے۔ قیمت — پانچ روپے ۲۵ پیسے۔ پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے۔

ترغیبات اسلام محمد بن عبد الوہاب تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ عتیق حضرت اپنے سوا تمام مسلمانوں کو دہائی کے تلبے یاد کرتے ہیں۔ یہ اصل محمد بن عبد الوہاب کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو کالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ چاہتی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر اس حقیقت کا گاہ وں کہ محمد بن عبد الوہاب کے قدر و منزلت کے شہدائی بدعت کے دشمن اور دین کے عزیز خواہ تھے۔ انگریزوں انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں اس نامی میں جان بوجھ کر لگائے۔ اس کتاب کے مصنف قطب سرحدی کے تفسیر احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے لافہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔ نت۔ ساڑھے چار روپے۔

مسائل مصطفیٰ | درد قریشی کی لغتوں کا دل کش مجموعہ قیمت — ایک روپیہ

دین و شریعت | اردو ایڈیشن۔ قیمت جلد ۲۵/۱۵۷
انگریزی ایڈیشن

رحیب ریحان ندوی، لکچرار اسلامک سٹڈی سوسائٹی
المنیہ، لبنان

دین شریعت کو نقصان پہنچانے والے چار گروہ

شریعت کے احکام واجب الاتباع ہیں

شریعت کے منصوص اوامر و احکام اور مقرر کردہ حدود چلے وہ عبادات سے متعلق ہیں یا معاملات اجتماعیات اور سوسائٹی کی دوسری چیزوں سے ہر مسلمان کے لئے واجب الاتباع ہیں، ان کی مشروعیت کا منکر کافر ہے اور مرتد ہو جانے کے جرم میں اگر شروط تو بہ مرتد کے ماتحت تو بہ نہ کرے اور اسلام کے دائرہ میں واپس نہ آئے تو واجباً قتل ہے۔ اس کو جان بوجھ کر مسلسل چھوڑنے والا بھی فقہاء کے آسان سے آسان اقوال کے مطابق لائق تعزیر ہے۔ یہ حکم ان غیر مختلف فیہ احکام کے بارے میں ہے جس میں واضح نص موجود ہے کہ نص کے بعد اجتہاد و قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن فروعی، جزوی اور فقہی وہ احکام جن میں واضح نص نہیں ہے یا انصوص میں تعدد ہے یا کسی توجہات دار امر ممکن ہیں یا اجتہاد و قیاس کی گنجائش ہے وہ اس سے خارج ہیں بلکہ ان میں اجتہاد و فقہ، بحث و مباحثہ، صحیح طریقہ پر شریعت کی حکمت معلوم کرنا اور علمی اختلاف کے ذریعے صحیح حل تک پہنچانہ صرف یہ گناہ نہیں ہے بلکہ حسن نیت اور اجتہاد کی شرط کی موجودگی میں اور ضرورت کے وقت واجب اور ضروری ہے اور شریعت کی حکمت سے قریب تر صحیح حل پیش کرنے والا خوش قسمت دو توالیوں کا مستحق ہوگا اور اجتہادی غلطی کرنے والے کو بھی ایک اجر اس کے حسن نیت اور سعی و جہد کا ضرور ملے گا۔

کہ اسلام سب سے آخری پیغام ہے۔ یعنی کمال دین اور اتہام نعمت کی شکل میں اس طرح مکمل و محیط ہو چکا ہے کہ اب کسی دوسرے دین کے آنے کا امکان بھی نہیں ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں جن پر آخری شریعت نازل ہو چکی ہے۔ اس لئے اب کسی حقیقی یا تجازی، ظلی یا بروری ظاہری یا باطنی نبی کے آنے کا امکان کسی مسلمان کے عقیدے میں شرعی و عقلی دونوں طریقوں پر ختم ہو گیا ہے۔ اور کیونکہ یہ شریعت دائمی ہے اور اس کی نصوص سے تمام پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد و قیاس و استنباط کے شرعی طریقہ سے مناسب حل نکالنے ضروری ہیں کیونکہ زندہ و پائیدار شریعت کی یہی علامت ہے کہ وہ کسی بھی زمانے میں کسی بھی مشکل کا حل پیش کرنے سے قاصر و عاجز نہ ہو۔

حفاظتین اسلام کی فوج ظفر مرج

ابتداءً اسلام سے آج تک جہاں شمار مفسرین، محدثین اور فقہاء و مجتہدین اسلامی عقیدہ و شریعت اور احکام کی حفاظت کرتے رہے۔ اس کے منصوص اوامر کی پابندی کرتے رہے، اسلام کے دائرہ اعتقاد و عمل سے انھوں نے سرمو تجاوز نہیں کیا اور جلدی مسائل کے لئے نص کی عدم موجودگی میں اجتہاد و قیاس کو کام میں لا کر نصوص شریعت کی روشنی میں شریعت کی حکمت کے مطابق احکام نکالتے رہے۔

بالکل اسی طرح شروع ہی سے بعض وہ افراد امد کردہ تھے جو اسلام کے خلاف تھے۔

ضرور ہوگا، لیکن اگر مسلمان اس کی حرمت اور وجوب کا قائل ہے تو وہ باوجود گناہ کے اسلام کے دائرے میں رہتا ہے، لیکن خدا کی نازل کردہ حرمت و حلالیت یا فرائض کا عقیدہ انکار کر دینے والا بھی پہلے گمراہ کی طرح فوری طور پر اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

(۳) دل سے نظام اسلامی کے محاسن کا منکر گروہ

تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو دل سے اسلامی نظام کا قائل ہی نہیں ہوتا اور اسلامی نظام حیات میں اسے نقص نظر آتا ہے، اسلامی عبادات اسے مذاق معلوم ہوتی ہیں اسلامی نظام مالی ستم، نظام میراث ظلم اور نظام اقتصاد غلط بنیادوں پر قائم نظر آتا ہے کہ وہ بھلا سود کو کیوں حرام کرتا ہے جب کہ تہذیب حاضر کے رگ و ریشے میں سود سرایت کے ہوئے ہے۔ اسلام کا نظام حدود و جنایات تو اسے سب سے بڑی دزدگی اور وحشت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عہد حاضر کے فریب خوردہ تمدن نے اسے چوری، دہشت، قتل، غارت، حرام کاری، حرام خوری اور شراب نوشی کا اس طرح عادی اور گرویدہ بنا دیا ہے کہ سو سائشی سے ان گند گوں کے ختم کرنے کا ارادہ ہی بدلنے یا لپیٹے بلکہ قدریں بدل دی جاتی ہیں، جھوٹ اور فریب کا نام سیاست پر گیا ہے، چوری اور دہشتی جو انگریزی اور بہادری کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ حرام کاری اور فواحش کا نام فن اور آرٹ ہو گیا ہے۔ الغرض یہ گروہ دل سے نظام اسلامی، قانون اسلامی اور تفکیر اسلامی کو قرون وسطیٰ کا نظام یا رینے تصور کرتا ہے۔ لیکن زبان و قلم سے ان چیزوں کا انکار نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو اسلام کا شیدائی اور دوست ثابت کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی گمشدہ اس لئے ہیں کہ اسلام کا نام روشن ہو، اسلام کے وہ مسائل جن پر اغیار ہنستے ہیں اور مضحکہ اڑاتے ہیں ان کو ہم اسلام کی محبت و عظمت کی خاطر اور نیک نامی کی خاطر عہد حاضر سے قریب کرنے کیلئے ان میں تاویلات کریں اور مصلحت اور عرف و عجم کے نام پر

تشریحی عبادات اور مخصوص احکام سے بیجا چھڑانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اختصار کے ساتھ ان گروہوں کو چار نسروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) مدعیان نبوت و ران کے متبع

ایک وہ گروہ جو زیادہ جرأت مند اور باغی ہوتا ہے اور وہ مکمل طور پر دین سے انحراف کر لیتا ہے اور نبوت کا دعویٰ کر دیتا ہے اور کذاب کہلاتا ہے اور اس کے پیرو اسے کسی بھی صورت میں نبی مانتے ہیں۔ مدعیان نبوت میں بھی دو فرقے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو رسول اللہ کی نبوت کا انکار کر دیتا ہے۔ دوسرے جو آپ کی نبوت کے انکار کے ساتھ اپنی نبوت کا اعلان بھی کرتا ہے۔ شرعی و فہمی اصطلاح اور حکم میں ان دونوں میں مطلق کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ گروہ درحقیقت کمال دین، اتمام نعمت، ابدیت اسلام اور محمد رسول اللہ کی رسالت کے دائمی اور قیامت تک ساری انسانیت کے لئے شامل و کامل و محیط اور آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا منکر ہے کسی زیادہ عقلی ریاضت کی ضرورت نہیں یہ بات واضح ہے کہ کسی دوسرے نبی کے آنے کا امکان ہی اسلام اور رسول اسلام کی ان تمام خصوصیات، امتیازات اور کمال و دوام کے جملہ نظریات و اعتقادات کا بطلان ہے۔

(۲) معطلین شریعت

دوسرا وہ گروہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو دین کے دائرے میں ثابت کرتے ہوئے دین میں ثابت شدہ شعائر، فرائض اور واجبات اور قوانین اسلام کا منکر ہو جاتا ہے۔ جیسے نماز یا کسی ایک فرض نماز کی عدم شریعت کا اعلان، زکوٰۃ کے وجوب کا انکار، روزہ اور حج کا انکار یا سود، خنزیر، شراب، زنا اور دوسرے محرمات کے جواز کا اقرار، شادی، بیاہ، طلاق اور میراث وغیرہ میں سے کسی بھی شرعی حکم کی عدم شریعت کا اعلان یہ خیال ہے کہ کسی واجب عمل کو چھوڑ دینے یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنے پر گناہ

علوم کے ساتھ فنِ حدیث کی اصطلاحوں سے باخبر ہونا فقہ کے تمام مذاہب اور اقوال فقہاء وغیرہ پر عبور ہونا وغیرہ اور یہ بات کوئی اسلامی اجتہاد ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے نہ یہ کوئی ایسی بدعت ہے جسے علماء حق جدیدہ سرچ اسکالرز کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ بلکہ دنیا کے ہر علم و فن کے قواعد اس سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ کیا انتہائی حسرت کے ساتھ کوئی شہرہ آفاق، ماہر اور قابل ترین انجینیر کسی سرجن کی خدمات انجام دینے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ اور اگر داعی خلل یا عوام کی دو ٹوٹنگ اور اسے شہاری میں اکثریت حاصل کرنے کے بعد (یعنی آپریشن کرنے کے لئے اگر کوئی گروہ اس کا نام پیش کر دے اور اکثریت سے وہ منظور بھی ہو جائے) کسی آپریشن کی جسارت کرنا چاہے تو کیا دنیا کا کوئی مائڈرن ترقی یافتہ حریت رائے کا دلدادہ اور عوامی پاپسٹ اسے اس غیر مناسب کام کے کرنے کی اجازت دے دیکھا؟ اگرچہ اس نے اپنے شوق سے سرجری کی کچھ کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ بھی لی ہوں۔ یا کیا کسی ماہر اور بین الاقوامی خوشنیں سے کسی ملک کی وزارت تعمیر ایک پل ڈیم یا عمارت کا نقشہ بنوانے سے متعلق سوچ بھی سکتی ہے؟ جب کہ وہ یورپ و امریکہ کی ساری معاری ترقی دیکھ بھی چکا ہو اور ملک میں عمارتوں کے اندر وہ بھی چکا ہو۔

اس گروہ پر بھی ہم غور و تأمل کرنا ضروری ہے کہ اس نے فسق کا حکم بھی نہیں لگا سکتا، اند نہ بے ادبی اور گستاخی اور توہین کے جملے استعمال کر سکتے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص تعلیم دین کی شروط کے بغیر تعلیم و تبلیغ کیلئے نہ صرف یہ کہ تیار ہو جائے بلکہ علمائے دین مفتیان شریعہ متین اور مجتہدین امت سے بھی زیادہ اپنے آپ کو دس کا مستحق سمجھنے لگے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ان سے زیادہ دین کی صحیح فہم، مصحفیوں، حکمتوں اور شریعت کے تقاضوں کو سمجھنے کا بھی مدعی ہو جائے اور آخری مرحلہ یہاں تک پہنچ جائے کہ علماء، فضلاء، فقہاء، مکتبہ حینی، حبیب الرحمن توہین اور دین کی صحیح فہم نہ رکھنے اور حقیقی اسلام کی ترویج

ان میں توافقی پیدا کرنے یا متبادل ملنے کی کوشش کریں، پھر اس کوشش کے لئے یہ گروہ اجتہادی شرطوں کے فقدان عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم شریعت میں کامل معلومات نہ ہونے کے باوجود خود کو بزرگم خود مجتہد کے منصب پر فائز کر لیتا ہے اور پھر خود ساختہ مسائل و مسائل کی گروہ کشائی کے لئے اجتہاد و قیاس کی کھڑائی چلائی شروع کر دیتا ہے اور اکثر مواقع پر اسے اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ "اجتہاد مع النص" حکم کی موجودگی میں اجتہاد نہیں ہے۔ اسی طرح قیاس کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ گروہ نئے مسائل نہیں بلکہ پرانے اور شریعت میں منصوص مسائل کو اجتہاد و قیاس کا تختہ مشق بناتا ہے اور غلط نتیجے نکالتا ہے۔ اس گروہ کو جب تک کہ وہ مراحت کے ساتھ نظام اسلامی کو باطل، ناقص، غیر کامل اور عصر موجود کا ساتھ نہ دینے والا زبان و قلم سے ثابت نہ کہے ہم دین کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتے نہ اس کے لئے سزائے ارتداد کا مطالبہ کر سکتے نہ اس کے خلاف جہاد واجب کر سکتے ہیں کیونکہ ہم ظاہری قول و فعل پر عمل کرنے کے مکلف ہیں باطل کے احوال اور نیتوں کے حسن و قبح پر فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

(۴) اخلاص کے ساتھ غلط نتیجے نکالنے والا گروہ

ایک چوتھا گروہ وہ بھی ہوتا ہے جو واقعی انتہائی حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ اسلامی شریعت، قانون اور نظام حیات کے بارے میں جدید مسائل و مسائل وغیرہ سے متعلق آراء کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں اس لئے غلط ہوتے ہیں اور نقصان دہ بھی کہ وہ شرعی عقلی اور علمی شرطوں کا حامل نہیں ہوتا۔ اجتہاد کی جو شرطیں ہیں ان میں اخلاص و حسن نیت صرف ایک شرط ہے۔ اسکے بعد بہت سی ایسی شرطیں ہیں جن کا موجود ہونا از حد ضروری ہے مثال کے طور پر عربی زبان کو اس کے اصول و قواعد کے ساتھ جاننا، جملہ علوم تفسیر پر دسترس ہونا، حدیث کے

بھی وہی ہے جس نے نماز فرض کی ہے اسی نے زکوٰۃ مقرر کی ہے جس نے شادی بیاہ کے احکام نازل کئے ہیں اسی نے میراث کے حصے مقرر کئے ہیں جس نے تجارت کو حلال کیا ہے اسی نے سود کو حرام کیا ہے جس نے شہد کو حلال کیا ہے اسی نے خمر کو حرام کیا ہے جس نے قصاص و حدود و تعزیرات نافذ کی ہیں اسی نے اقتصادی پریشانیوں کا نفسیاتی انجمن اور ذہنی نا اُسود گسوں کا علاج اور حل بھی بتایا ہے جس نے ماں باپ یا بیٹا بیٹی سے شادی کرنے کی ممانعت کی ہے اسی نے مشرک یا مشرکہ سے شادی حرام کی ہے۔ الغرض جس ذات ستودہ صفات نے طبیات کو حلال کیا ہے اسی ذات بے ہمتانے تمام اشیاء خبیثہ کو حرام فرمایا ہے اس کے کسی منصوص حرام چیز کے حلال ہونے یا اس کے برعکس کسی منصوص حلال چیز کے حرام ہونے کا عقیدہ اسلام سے خروج کیلئے کافی ہے کیونکہ اس سے خدا کی شریعت میں تفریق اور خدا کی حاکمیت کا انکار لازم آتا ہے۔

اسلامی حکومت ان دونوں گروہوں کو دین سے خارج کرنے میں کسی قسم کی تفسیق نہیں کرتی اور ان کے ساتھ وہی طریقہ کار استعمال کرتی ہے جو خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبرؓ نے اختیار کیا تھا، آپؐ نے صحابہ کرام کے مشورے سے مدعیان نبوت، معطلین شریعت اور مانعین زکوٰۃ سب کو مرتدین کی فہرست میں شامل کر کے سب سے جہاد کا اعلان کیا تھا اور اس جہاد ہر حق میں آپ کا مایاب ہوئے تھے اور یہی سب سے بڑی دلیل صدیق اکبرؓ کے فیصلے کی صحت اور آپ کی خلافت کی حقانیت کی تھی کیونکہ قرآن کے معجزانہ بیان میں صاف طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ عَنْكُمْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا يُجَاهِدُونَ لَوْنِهِمْ لَا يَوْمَ دَلِيلٍ فَغُلَّ اللَّهُ لِيُوتِيَهُ مِنْ نَحْنُ أَدَلُّهُ“ (اسم علیہ السلام) (مائدہ- ۵۴) ترجمہ: ”اے ایمان والو

جو کفر کی تہمت بھی شریعہ کر دے۔ یا دوسری مثال یہ کہ وعظ و تقریر کی شرعی ملاحیت و اجازت کے بغیر قرآن حدیث و فقہ میں عبور حاصل کرنے سے پہلے وعظ اور تقریریں شریعہ کر دے اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ جو کچھ ان وعظوں میں کہا جا رہا ہے وہی حق ہے اور اس کے سوا سب باطل ہے۔ تعلیم دین وقت کا ضیاع ہے۔ تالیف و تصنیف علمی غرور ہے وغیرہ۔

بہر حال چوتھے گروہ یعنی اخلاص کے ساتھ، لیکن اجتہاد علم کی شرائط کے بغیر اجتہاد کرنے والوں کے اخلاص کی ہم قدر کریں گے لیکن ان کے افعال و اقوال، تقریر و تحریر اور افراط و تفریط کو دین کا جزوہرگز نہیں سمجھیں گے۔ ان حضرات کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا، اس کی تفصیل چند سطر بعد پیش کی جائے گی۔

اول الذکر دو گروہوں کے ساتھ اسلامی حکومت کا طریقہ کار

مدعی نبوت دین میں معلوم بالضرورہ اور واجب حتمی عقیدے کے انکار کی وجہ سے دین سے خارج ہو جاتا ہے، اس لئے مرتد کی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ محل الہدم اور وجاہ اجتہاد ہوتا ہے اور اس کے اس دعوے پر یقین کرنے والے بھی گو یا اسلام سے پھر جاتے ہیں اور غیر اسلامی نظریے کو قبول کرتے ہیں اس لئے وہ بھی اسلام سے خروج کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح دین میں واجب کسی منصوص فریضے کا انکار کرنے والے عیسے نماز کا منکر۔ یا کسی ایک نماز کی شریعت کا منکر یا زکوٰۃ کے وجوب کا منکر یا اسلامی عائلی قوانین کی شریعت کا منکر یا اسلامی حدود کے وجوب کا منکر مختصر یہ کہ شریعت کی حرام کی ہوئی کسی چیز کی حلت کا مقرر یا شریعت کی حلال کی ہوئی کسی چیز کی حرمت کا مدعی بھی دین سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ دین میں معلوم منصوص حکم ہے کیونکہ جس طرح شریعت کے ایک فریضے کو فرض کرنے والا خدا ہے بالکل اسی طرح دوسرے فریضے کو فرض کرنا والا

فقہی مذہب یہی ہے کہ مرتد کی توبہ قبول کی جائے گی اور اسے سوچنے اور رجوع کرنے کی مہلت بھی دی جائے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَنْ يَتُودَّ مِّنْكُمْ هُنَّ دِينَ فِيمَنْ وَهَّوْكَ اِفْرَاقًا وَلَكِنَّكَ حَبِطْتَ اَعْمَالُكُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَ اُوْذِنْتَ اَصْحَابُ النَّارِ اَنْ يَّخْرُجُوا مِنْهَا لَدُنْ (بقرہ - ۲۱۷)

ترجمہ :- ”اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر گیا اور اس حالت میں مرا کہ وہ کافر ہو تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے اور وہ آگ دالے ہونگے اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

آیت میں یہ تصریح کہ ”اس حالت میں مرے کہ وہ کافر ہو“ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اگر وہ کفر سے توبہ کر لے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی اور وہ کفر سے اصلاح میں داخل ہو سکتا ہے اور آگ سے بچ سکتا ہے۔ اس آیت کی روشنی میں فقہائے اہل سنت نے بحثیں کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ اکثریت کے نزدیک مرتد کی توبہ قبول ہوگی اور اس کو مہلت بھی دی جائے گی اور یہ قول اسلام کی عدالت اور جہنم سے بچا کر سلامتی میں داخل کرنے کی اسکی صلاحیت اور قرآن میں توبہ و مغفرت کے عام اصولوں کے موافق بھی ہے اور صدیق اکبرؓ کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ آپ نے مرتدین کے تمام گروہوں کے پاس جب فوج بھیجی تھی تو توبہ کی شروط اس طرح واضح طور پر لکھ کر ارسال کی تھیں۔

”میں تمہارے پاس یہ فوج رہا ہوں اور میں نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی سے جنگ اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اس کو خدا کی دعوت نہ دی جائے جس نے اس دعوت کو قبول کیا، اسلام کا اقرار کیا اور ارتداد سے باز آیا اور عمل صالح کیا اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس کی مدد کی جائے گی۔“ (تاریخ طبری ۳ - ۲۵۱)

اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب کسی نے بھی توبہ کی اور دین کی طرف رجوع کیا صدیق اکبرؓ نے

جو تم میں سے پھر جائے (مرتد ہو جائے) اپنے دین سے توبہ کر لی (جماعت) کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ مومنوں کے لئے وہ نرم کافروں کے لئے سخت ہوں گے۔ راہ خدا میں جہاد کریں گے اور ملالت کرنے والے کی ملالت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اللہ شاکش والا جاننے والا ہے۔“

اس آیت کی روشنی میں صاف پتہ چلتا ہے کہ صدیق اکبرؓ اور صحابہؓ نے مرتدین سے جو جہاد کیا وہ صحیح تھا اور آپ حق پر تھے اور شریعت کے کسی جزو کے منکر کے خلاف جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ایک دلیل ان لوگوں کے خلاف بھی موجود ہے جو نعوذ باللہ صدیق اکبرؓ کی مرتد قرار دیتے ہیں عقلی و شرعی دونوں صورتوں میں اگر ایسا ممکن ہو تا تو پھر یقیناً کسی ایسے مومن گروہ یا جماعت کا آنا نص قرآنی کی رو سے ضروری تھا جو غلبہ حاصل کرتی اور حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر اور ان سے جہاد کر کے اسلام و ایمان کا پرچم بلند کرتی۔ لیکن تاریخ کا بیان اس کے بالکل برعکس ہے اور کسی مومن گروہ نے آپ کے خلاف جہاد نہیں کیا اور جن بھی مرتدین اور مانعین سے آپ نے جنگ کی اس میں غلبہ حاصل کیا۔ اور محض خدا کی مدد کے ذریعے بے سروسامانی کے باوجود انہی کامیابی کے یقین کے ساتھ آپ کے تمام مخالف طاقتوں کا مقابلہ کیا اور سال بھر کی قلیل مدت میں آپ نے جزیرہ عرب کو تمام مرتدین، مانعین، معتلین شریعت اور مانعین زکوٰۃ کے فتنوں سے پاک کر دیا۔ یہ بات یقیناً نص قرآنی اور تاریخ کی روشنی میں صحیح ہے اور خلیفہ رسول اللہؐ کی خلافت پر اجماع امت کے بعد ایک اور زندہ و متحرک دلیل ہے۔

مرتدین سے جہاد کی شرطیں بھی وہی ہیں جو صدیق اکبرؓ نے واضح کی ہیں اور جن کا اشارہ قرآن پاک میں ملتا ہے۔ یعنی یہ کہ مرتد کو توبہ کی مہلت دی جائے گی۔ صحیح ترین

آخر الذکر دو گروہوں کے ساتھ اسلامی حکومت اور علماء کا رویہ

اگر اسلامی حکومت قائم ہو اور اسلامی حاکم (خلیفہ) اسلامی اصولوں کی بنیاد پر حکومت کرتا ہو اور اسلامی شوریٰ کا نظام قائم ہو تو آخر الذکر دونوں گروہوں کا وجود ہی نہ ہو کیونکہ اسلامی نظام میں اسلامی تفکیر اور خصوصاً اسلامی قانون سے متعلق امور قرآن وحدیث وفقہ کے (افاضل) مجتہدین امت اور قاضی (رجح) ہی بیان کریں گے اور جب تک ان میں شروط اجتہاد نہ پائی جائیں یا کم از کم وہ اسلامی علوم سے خاطر خواہ آراستہ نہ ہوں ان سے خالص اسلامی قانونی مسائل میں کوئی مشورہ ہی نہ لیا جائے گا۔ چاہے وہ بدیتی اور عدم اخلاص سے یہ کام کرنا چاہیں اور چاہے حسن نیت اور اخلاص سے — اور یہ کوئی ظلم و ستم نہ ہو گا اور نہ اسلام تفکیر کو علماء وفقہاء کے گروہ میں مخصوص کر دینے والی تہمت اس پر صادق آئے گی بلکہ یہ خالص ایک علمی عقلی بات ہوگی۔ آج بھی دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوری اور عوامی حکومتیں جو عوام کے نام اور حریت کے اقدار پر قائم ہیں جب کوئی قانونی مسئلہ سوچتی ہیں تو سب سے پہلے قانون کے ماہرین، ججوں اور وکیلوں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ آپ نے کبھی یہ نہ سنا ہو گا کہ کسی جمہوری ملک میں جب قانونی فوجداری بننے لگا تو عوامی حقوق اور فہم انسانی میں برابری وغیرہ کے نعروں اور دعوؤں کے پیش نظر ججوں اور وکیلوں کے بجائے شاعروں سے مدد لی گئی خواہ وہ غالب میر، اقبال، بیگم، شکسپیر، ورجل، ہمت، ہوگو اور فردوسی جیسے استادان سخن ہی کیوں نہ ہوں یا جب قانون دیوانی کی تشکیل کا وقت آیا تو ڈاکٹروں کو اس کام کی دعوت دی گئی چلے وہ ہسپتال، جالینوس، ابن سینا اور ابن نفیس جیسے حکماء ہی کیوں نہ ہوں یا اقتصادیات نظریات اور مسائل کیلئے کوئی شخص آدم سمٹھ، مل، کینئر وغیرہ کی کتا میں چاہے وہ تنقیدی حیثیت ہی سے ہوں پڑھنے کے بجائے سائنسدانوں

اور آپ کے سپہ سالاروں نے اس کی توبہ قبول کی اور اسلام کا دروازہ اس کے لئے کھولے رکھا، بلکہ یوں کہتے کہ اسلام کی دعوت ہی کے لئے آپ نے جہاد کیا تاکہ وہ لوگ دوبارہ اسلام کے کلی نظام میں داخل ہو جائیں۔ صدیق اکبرؓ کے اکثر خطوط اور احکام میں یہ جملہ بھی ملتا ہے کہ ”اسلام کے سولان سے اور کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی“ جو صاف اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف اس حقیقت کا اعلان بھی ہے کہ دین میں تجزیہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک کل ہے جو ایک سرے کے ساتھ مضبوط طریقے پر مربوط ہے، اور یہ ناممکن ہے کہ دھواں اسلام قبول کیا جائے۔ نماز قبول کر لی جائے اور زکوٰۃ نہیں توبہ کی قبولیت اور اسلام میں داخل ہو جانے کی دعوت اتنی عام تھی کہ غیر کیچے مشہور مدعیہ نبوت سجاد بن ابی العباس بن سوید بن عفان السعیمی نے جب دعوائے نبوت چھوڑ کر دوبارہ اسلام قبول کر لیا تو طبری کی روایت میں ہے کہ ”اس کا اسلام اچھا ہو گیا تھا“ (تاریخ طبری ۳-۲۷۵) ابن اثیر نے اپنی ایک روایت میں مزید یہ تصریح بھی کی ہے کہ ”وہ تغلب میں تھی تا آنکہ حضرت معاویہؓ نے عام الجملۃ میں اسے بصرہ منتقل کیا، بنی تغلب کا اسلام اچھا ہو گیا تھا۔ اور سجاد بھی مسلمان ہو کر اچھی مسلمان بن گئی تھی۔ بصرہ میں اس کا انتقال ہوا اور سرعہ بن جندب والی رگوں بصرہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی“ (الکامل فی التصریح کہ کئی علوم بالضرورہ اور خصوصاً اسلامی عقیدے کا انکار یا دعویٰ جیسے خدا یا نبی کا انکار یا الوہیت نبوت کا دعویٰ کرنے والا یا شریعت کے جملہ احکام کو معطل کرنے اور نہ ماننے والا یا شریعت کے کسی واجب یا حرام چیز کی حرمت یا حلت کا دعویٰ اور اسلام سے خارج ہو جانا ہے اور اسلامی حکومت وقت پر اس کے خلاف جہاد اس صورت میں واجب ہو جاتا ہے جب کہ وہ جہلت کے باوجود اسلام کی طرف رجوع نہ کرے اور توبہ نہ کرے۔

فقہاء کی میراث نہیں ہے۔ اکثر سنیوں میں آتے ہیں اور یہ ایک حقیقت سے صحیح بھی ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں یہ تفریق نہیں کہ خواص کے لئے کچھ خاص احکام ہوں اور عوام کے لئے کچھ دوسرے احکام یا علماء و فقہاء اور بزرگ خدا اور بندوں کے درمیان ایسا واسطہ ہوں کہ ان کے بغیر انسان دعا نہ کر سکتا ہو اور جنت کا ٹکٹ نہ حاصل کر سکتا ہو۔ خدا بھلا کرے فقہاء کا ان میں سے ایک شہرہ آفاق فقیہ امام سرخسیؒ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جن لوگوں کی گواہی قبول نہ ہوگی ان میں ایک ”وہ شخص بھی ہے جو الہام کو علم میں حجت مانتا ہو کیونکہ وہ اس بنیاد پر کسی کے خلاف گواہی دے سکتا ہے“ (المبسوط - سرخسی) جہاں انہی یعنی اسلام میں الہام باطن وغیرہ کے نام پر علماء کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں ہے اور حجت صرف کتاب و سنت کے ظاہری اقوال ہیں جن کی روشنی میں استنباط و اجتہاد کرنے کے وہ لوگ مجاز ہیں جو اسکی صلاحت رکھتے ہوں اور جب اس کی ضرورت ہو۔ اسی لئے اسلام میں یہ نہیں ہے کہ عوام کے لئے پانچ نمازیں ہوں اور علماء کے لئے تین یا عوام شریعت پر چلنے کے مکلف ہوں اور خواص اس کے مکلف نہ ہوں بلکہ شریعت کے نام پر شریعت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی انھیں اجازت ہو۔ یا دینی تعلیم اور علوم سے کسی کو یہ کہہ کر باز رکھا جائے کہ تم عالم کے بیٹے نہیں ہو یا تم فلاں ذات سے تعلق رکھتے ہو اور علم شریعت نہیں سیکھ سکتے۔ مطلب یہ ہوا کہ عمل کا دائرہ اسلام میں سب کے لئے برابر ہے اور علم حاصل کرنے کی ترغیب ہر ایک کو دی گئی ہے اور اس کا دروازہ ہر ذات اور ہر طبقے اور ہر قوم کے لئے کھلا ہوا ہے۔ لیکن اگر اس کا مطلب کوئی یہ نکالنا چاہے کہ علماء و فقہاء کے علاوہ سب کو اسلام کی ترجمانی، اجتہاد فقہوی اور تعلیم و تدریس کا حق ہے اور غیر عربی زبان جاننے اور بلا علم حاصل کئے وہ متفق علیہ مسائل کو چھوڑ کر مختلف فیہ اور علمی مسائل میں شہدہ دینے اور لوگوں کو ورغلائے کا حق رکھتا ہے تو یہ ایک غلط اور

علوم پر مبنی شریعت شروع کر دے چاہے وہ گلیلو، کوپر نیک، نیوٹن، رائنشاؤن ہی کیوں نہ ہوں۔

مختصر یہ کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر علم و فن کے کچھ شرطیں ہوتی ہیں اور طویل عرصہ ان علوم میں گزارنے بعد بھی انسان ان پر پوری طرح قادر نہیں ہوتا تو یہ کیسے ان سے کہ کوئی شخص کسی بھی علم میں بغیر صحیح معلومات کے دخل رازی کرے یا یہ دعویٰ کرے کہ جنھوں نے اپنی عمریں کسی ضروع یا علم میں گزاری ہیں وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے اور میں اس کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس قسم کا دعویٰ کسی بھی علمی اور تحقیقی ضروع میں کرنے والے کو باطل ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ نیت نہیں ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر انجینئرنگ میں سارے انیسویں سے زیادہ یا اس کے برعکس کوئی انجینئر ڈاکٹری سارے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے زیادہ معلومات اور نچ نتیجے، نقشے اور امراض کی تشخیص کا مدعی ہو جائے تو یقیناً مل دعو اس کی موجودگی میں کوئی شخص اس کے اس دعوے کو صحیح مانتا تو دُور کی بات ہے سنا بھی گوارا نہیں کرے گا۔

بہر حال کیا نہ خلیفہ اسلامی خود بھی مجتہد ہوتا ہے اور مار و فقہاء اس کی مجلس شورعی میں ہوتے ہیں اس لئے یہ بھی فقہی اور قانونی مسئلے میں انھیں کی رائے اور شورہ اجائے گا اور جن کے پاس ان موضوعات میں اجتہاد کی صلاحیت نہ ہوگی یا غیر متعلق ہوں گے ان سے کسی قسم کا نہ پیرہ کیا جائے گا اور نہ ان کو دین کے بارے میں اندازہ دینے سے گفتگو کرنے کی اجازت ہوگی اور اس طرح یہ زبوں گروہ صحیح اسلامی حکومت کی موجودگی میں پائے ہی میں جائیں گے۔

سلام علماء و فقہاء کے طبقہ کے لئے مخصوص نہیں

مناصب علوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اہم نقطہ واضح رہے۔ وہ یہ کہ اس قسم کے جملے ”اسلام کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں“ یا ”اسلام صرف علماء و

اور اگر کسی طرح پیدا ہو بھی جائیں تو بہت جلد ان کا انشراح ہو جائے لیکن جب خلیفہ موجود نہ ہو، یا صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہو یا جہان اسلامی اکثریت ہی نہ ہو۔ الغرض یہ کہ کسی بھی وجہ سے دین و شریعت کو نقصان پہنچانے والے یہ گروہ نمودار ہوں تو اس صورت حال میں امت کے علماء، فقہاء، اور شریعت کے محققین کا یہ فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح اسلامی عقیدے کی اشاعت کریں اور دین میں اصولی اور بنیادی عقائد، توحید، نبوت وغیرہ کی واضح تشریح کریں اور شریعت کے کلی احکام اور دائمی ضرورت اور شریعت کے کسی حکم کے انکار سے پوری شریعت کے انکار کی کیفیت کو کھول کر بیان کریں تاکہ امت اول الذکر دو گروہوں کے شر سے محفوظ ہو جائے اور یہ بات اس پر عقلاً اور شرعاً علم الیقین کے درجہ تک واضح ہو جائے کہ اسلام آخری دین ہے اور کمال دین اور اتنا نعمت کے بعد اب نہ کوئی دوسرا دین نازل ہو سکتا ہے نہ کوئی دوسرا رسول اور نہ کوئی دوسری شریعت۔

نیز علماء کو آخر الذکر دو گروہوں کے نقصان سے امت کو بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کے نئے سے نئے مسائل کے حل اور علاج کے لئے شریعت کے منہ میں احکام کی عدم موجودگی میں قیاس و استنباط و اجتہاد کے ذریعے شریعت کی حفاظت و بقا اور جدت، تازگی اور اتقان کا سامان بہم پہنچائیں جو الحمد للہ اہل علم و اجتہاد پوری کوشش و محنت کے ساتھ تمام دنیا میں کر رہے ہیں۔ جس کے لئے وہ یقیناً امت کی طرف سے مشکور اور خدا کی طرف سے عاجز ہونگے۔ کیونکہ کسی بھی زندہ اور پائندہ شریعت کی علامت یہی ہے کہ تا قیامت کسی بھی موجودہ یا متوقع ضرورت، مشکل یا مسئلہ کا حل پیش کرنے سے وہ عاجز نہ ہو۔ اگر خدا نخواستہ کسی مشکل کا حل شریعت کی روشنی میں کوئی نہ کر سکے تو شریعت کے عجز و قصور کی دلیل نہیں بلکہ اس شخص کے جمود و رجعت یا بے قید آزادی کی دلیل ہے۔ شریعت مطہرہ زندہ اور دینور شریعت ہے اور خالق انسان و کائنات کی اتاری ہوئی ہے اس لئے تا قیامت انسان کی ہر ترقی اور کائنات کی ہر تبدیلی کا ساتھ

قصبان وہ اور نامعقول بات ہے اور اس سے فائدہ معدوم و رفتہ منتفق ہیں۔ ہر مسلمان کو دین پر عمل کرنے کا نہ صرف حق ہے بلکہ یہ اس پر فرض ہے اور اگر حقیقی علم نہیں رکھتا تو علماء سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد وہ شریعت پر عمل کرنے کا مکلف ہے۔ لیکن اسلام کی ترجمانی، تدریس، افتاء، نظارہ سب وہ مناصب ہیں جن کے لئے کچھ شروط اصولی، ضوابط اور قواعد ہیں جب تک انسان ان کا حامل نہ ہو شرعی و عقلی طور پر اسے ان پر فائز نہیں کیا جاسکتا مثال کے طور پر کسی شخص کو سور کا فاتحہ اچھی طرح یاد نہ ہو تو اسکو امامت کے لئے کیسے آگے بڑھایا جاسکتا ہے؟ یا کسی کو فقہ پر عبور نہ ہو اور فتویٰ دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز سمجھنے لگے حدیث کی صحت، حسن، قبح اور ضعیف و موضوع کا سینر قرآن کے نسخ و تفسیر، خاص و عام، مطلق و مقید اور ذکر فنی پہلوؤں کا مطلق علم نہ ہو اور بلا تکلف تھریں کرنے لگے اور وعظ کی خدمات انجام دینے لگے، یا تفقہ فی الدین کی بنیادی شرط نہ ہو اور دین میں صرف اپنے آپ کو حق سپر اور دوسروں کو باطل پر تصور کرنے لگے تو ان سب متذکرہ بالا صورتوں میں صرف اس کی عقل کا فتور تصور ثابت ہوگا۔ علماء و فقہاء و محققین و مجتہدین کی اس طرح نہ نمان گھٹ سکتی ہے اور نہ ان کے علمی و تحقیقی کارناموں اور اسلام کی حفاظت و دفاع اور تبلیغ و اشاعت کی عظیم اہمیتوں اور شاندار کوششوں پر پانی پھیرا جاسکتا ہے اور نہ اسلام کی ترجمانی کا شرعی و فقہی حق ان سے چھینا جاسکتا اور نہ کسی دوسرے کو دیا جاسکتا ہے۔

علمائے امت کا کام

جیسا کہ بیان کیا جا چکا اگر صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اول الذکر دونوں گروہوں کو حق کی طرف واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور زبان و قلم سے آگے بڑھ کر اس معاملے میں تشہیر و سنان استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ لیا جائے اور آخر الذکر دونوں گروہ وجود ہی میں نہ آئیں۔

انسانی قوانین پر فوقیت کا اندازہ خود صرف عقائدی اور
تعبدی طور پر ہی نہیں بلکہ عقلی و علمی طور پر بھی کر لیں گے
اور بیسویں صدی کی سائنسی دنیا میں اور علم و تحقیق کے
ماحول میں شاید دین اسلامی اور شریعت الہیہ کی بے برب
سے بڑی، پامیدار اور نفع بخش خدمت ہو۔ (آخر دعوانا
(ان الحمد للہ) سب العالمین -

دین کی صلاحیت رکھتی ہے اور جس طرح سورج کی روشنی
اور حرارت کی اہمیت اور ضرورت کسی بھی سائنسی دوا
میں کم نہیں ہو سکتی، اسی طرح شریعت کی روشنی و تائید
ہر دود میں انسانیت کی صحیح رہنمائی کرتی رہے گی اور
اس کی حیثیت مینارہ نور کی رہے گی جو دوسروں کو راہ
مستقیم دکھاتا ہے۔ علماء فقہ و شریعت کا کام یہ ہے کہ
شریعت و فقہ کے اسلامی اصولوں اور عصر حاضر کے
علمی طریقوں کے امتزاج کے ساتھ ان گرد ہوں پر نصو
الہیہ کی قطعیت، احکام الہیہ کی فرضیت، حدود الہیہ
کا وجوب اور شریعت الہیہ کی فوقیت ثابت کر دیں۔
متشککین کے اعتراض و اقوال اگر حسن نیت اور اخلاص
کے ساتھ ہوں گے تو وہ عقل و منطق اور دین و شریعت
کی اس حجت بالغہ کو سن کر دو رہو جائیں گے اور ساتھ
ہی ساتھ حیران و پریشان عوام بھی شریعت حقہ کی تمام
خوبیوں، ہرز منے کا ساتھ دینے والی صلاحیت، عدل و
عدالت دونوں سے متصف ہونے کی خصوصیت اور تمام

- حقیقت سماع مولانا تھانویؒ ۷۶-
خدا کا وجود مولانا ادیس کا ندھلوی ۷۸۰-
خدا کی صفات ۷۸۵-
حکایات لطیف فارسی مع فرہنگ ۷۵۰-
اجہا فاعده مولوی مقبول سیوہاروی ۷۴۰-
اللہ میاں کی کہانی ۷۶۰-
بی بی خدیجہؒ ۷۵۰-
مکتبہ تجلی - دیوبند (دیوبند)

آپ کے بچے کے لیے پیٹ کی خرابیوں سے بچ رہے کا
آسان ذریعہ

ہمدرد گمراہ آپٹر

ہمدرد گمراہ آپٹر، باغ قادیان میں ایک نئے
بچے کے ہنگامہ کو دیکھ کر کہتے ہیں اور
پینٹ کی گائی، ہمدرد گمراہ آپٹر کی طبیعت میں
آگام رہے ہیں۔

ہمدرد



HMDARD GUMRAH APIR

حیات عبدالحی مولانا علی میاں کے خامہ زر جیگر سے ایک ممتاز عالم دین اور خادم ملت کی ایک ایمان افروز سوانح - قیمت مجلد - گیارہ روپے۔
مکتوبات مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرمدی کے خطوط تمام اہل علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا تجلیہ سمجھے گئے ہیں۔ سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے۔ قیمت مجلد اول - پندرہ روپے۔
 جلد دوم - اٹھارہ روپے۔
 جلد سوم - پندرہ روپے۔

احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت از: مولانا تقی امینی عیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بشریت کے احکام زمانہ کے تقاضوں اور تغیر پذیر حالتوں کا لحاظ رکھتے ہیں تمام مواد حوالوں سے اداستہ قیمت غیر مجلد - سات روپے۔

مارسج دیوبند ایضاً یہ کتاب اب عمدہ اضافوں کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔ دیوبند کی مکمل تاریخ - تحقیق اور دلچسپ - قیمت - آٹھ روپے۔
تفسیر رشیدی مولانا رشید احمد گنگوہی کے قلم سے تفسیر عارفانہ اور محققانہ - قیمت - ڈھائی روپے۔

انفاس عیسیٰ حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانی کی تصنیفات سے تصوف و شریعت و اخلاق و اصلاح معاشرہ اور دیگر بیشتر موضوعات پر مدنی دانش کی روشنی میں دلچسپ اور روح پرور - اٹھارہ روپے۔
تجارتی سود تاریخی اور فقہی نقطہ نظر سے جدید و قدیم کی روشنی میں تجارتی سود پر گفتگو - زبان سلیس - اسلوب شگفتہ - لائل قوی - مواد محققانہ - قیمت - آٹھ روپے۔

مدارج سلوک ڈاکٹر میر ولی الدین کی مفید کتاب - موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کے لئے مفید ہوگا۔ قیمت - ساڑھے چھ روپے۔
وعدۃ الوجود اہل معرفت کے مشہور مسلک و حقۃ الوجود پر حقائق گفتگو - حضرت مجدد الف ثانی کا بیان اور اس کے اسرار - قیمت مجلد - ڈھائی روپے۔
مکاتیب گیلانی مولانا مناظر حسن گیلانی کے قابل قدر خطوط کا مجموعہ معقول منقول کا خزانہ - قیمت مجلد ہلکا شک - دس روپے۔

فضائل نماز شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مشہور کتاب - عکسی طباعت کے ساتھ۔ قیمت - ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔
فتاویٰ عبدالحی مولانا عبدالحی کا مشہور مجموعہ فتاویٰ فتاویٰ ایک جلد میں مکمل نظر ثانی کے بعد - قیمت - بیس روپے۔

قرآن آپ کے کیا کہتا ہے؟ مولانا منظور نعمانی کی وہ عام فہم زبان میں قرآنی مطالب بیان کرتے ہیں۔ قیمت - چھ روپے۔
آداب زیارت قبور شاہ اسماعیل شہید اور مولانا محمد سلطان کے فرمودات - قیمت - ۶۵ پیسے۔

معارف سلیمان نمبر مولانا سید سلیمان ندوی کے احوال و کوائف اور تذکرہ و تعارف پر بہتر بہت شاندار ہے۔ قیمت - پانچ روپے۔
الحج مولانا اشرف علی کے خلیفہ شاہ مسیح اللہ کی یاد تصنیف - موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قیمت - ڈیڑھ روپیہ۔
 (ہر کتاب اس پتہ سے طلب فرمائیں)

مکتبہ تجلی - دیوبند دیوبند (پی)

خود رویا خود رو؟

ایک لغوی ولسانی بحث

سے یہ بھی ہے کہ اس کے حوا سے آپ کو بھی اور دوسرے حضرات کو بھی یہ محسوس ہو جائے کہ اعتراض کرنے سے قبل مسئلہ کی واقعی تحقیق کر لینا ضروری ہے۔ واقعی تحقیق کے بغیر محض اٹکل سے اعتراض کرنا عموماً اپنے ہی دماغ کا داغ بن جاتا ہے۔ نیز خط یا مضمون لکھنے میں ذہن کو جاکر جو بند رکھنا چاہئے تاکہ اسے ربط جملے قلم سے نہ نکلیں اور پھر دماغ والا انتقاض کا خفا کار نہ ہو۔

آج غائب ہے اگر یہ تصور فرمایا تھا کہ خود رو (بفتح ساء) غلط ہے اور خود رو (بضم ساء) درست ہے تو اس کے لئے پہلے مناسب تحقیق کر لیتے پھر اپنے خیال کی تائید میں دلیلیں لگاتی ہوتی تو بے تکلف اعتراض کر ڈالتے مگر آج کے تحقیق نہیں کی اور محض قیاسی گھڑے دورا دے حالانکہ زبان و لغت میں کوہ اتباس کام نہیں دیتا سند شہادت کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور بعض اور نزاکتیں بھی ملحوظ رکھنی ہوتی ہیں۔

آپ کی یہ عادت اچھی ہے کہ کسی مسئلے میں تردد ہو تو دوسروں سے پوچھ کر اپنی تشفی کر لیں مگر میرے معاملہ میں آپ کے سوال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اعتراض کر ڈالا اور قطعی فیصلہ دیدیا کہ ”خود رو“ صحیح نہیں ہے حالانکہ قطعی فیصلہ دینے اور طالب علمانہ استفسار کرنے میں فرق ہے۔ بھلا ایسے طالب علم کو کون پسند کرے گا جو اچانک استاذ کی سند پر جا بیٹھے اور بجائے سوال کے فیصلہ دینے لگے۔

میں ایک چھوٹا اردو خواں ہوں شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ کسی لفظ اور کسی مسئلے میں اگر تردد ہوتا ہے تو طبیعت میں الجھن ہوتی ہے اور کئی لغتیں اور کئی آدمیوں سے پوچھتے بغیر آرام نہیں ملتا۔ تجلی دیکھتا ہوں اور آپ کی کاوشیں زیر مطالعہ رہتی ہیں (برائے استفادہ) بعضی کی تنقید میں ایک بہت عام لفظ ”خود رو“ کو آپ نے ”خود رو“ بھیجے رہا بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ اس کا امر ”رو“ ہے۔ خود کے ساتھ رو لگانے سے فاعل بنتا ہے۔ خود رو خود لگنے والا رو کا قرینہ سمجھ میں نہیں آیا۔

روستنی۔ زمین سے اُگنے والی چیزیں۔ گھاس وغیرہ اردو کا کوئی لغت جامع نہیں۔ بیان التیان المصنفہ سجاد میر بھی دا بھی مال گھاؤں آئے تھے، مشہور عربی الفاظ سے محروم ہے۔ معبر۔ لٹانے والا۔ حالانکہ معبر پر لکھنے والا بھی ہے۔ جسے نظیری نے باندھا ہے۔ باشد سخن سیم و گہر نزد معبر پاک بر۔ مرکوز کا لفظ نہیں۔ الغرض یہ کہی ہے۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

جواب:-

آپ نے جوابی خط نہیں بھیجا دو نہ ڈاک سے جواب عرض کر دیتا۔ غالباً آپ خود یہ چاہتے ہوں گے خط شائع ہو اور جواب تجلی ہی میں لے۔ میں آپ کی خواہش پوری کر رہا ہوں۔ میرا ایک مقصد آپ کے خط کی اشاعت

اور سرائیکی فہرست دیکھیں تو لفظ سرائیکی اور سرائیکی دونوں مل جائیں گے۔ ان میں ہی سے کسی مصدر سے آپ لفظ ”مرکوز“ بنائیں گے اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ لفظ مرکوز چونکہ بیان اللسان میں نہیں اس لئے یہ لغت ناقص ہے۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ لفظ ”مُعیر“ کے معاملہ میں بھی آپ کو ایسے ہی مغالطے کا شکار ہونا پڑا ہے۔ بیان اللسان میں حرف عین کی فہرست ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں آپ کو لفظ عیاس لے گا جس کے متعدد معانی دیئے گئے ہیں۔

”بجاء۔ گمیز۔ ناپ یا وزن کے چانچے کا معیار۔

کسوٹی۔ درآہم و دناہم میں چاندی سونے کا جوڑ۔“

اسی سے ”مُعیر“ اسم فاعل ہے۔ آپ دیکھ لیجئے ”لُغْنِ“ کے معنی تو نہیں دیئے گئے۔ پتا نہیں آپ کے معنی کہاں سے نقل کیے۔ ہاں چانچے پر کھنے کے معنی ضرور دیئے گئے جن پر خود انتخاب کے زور دیا ہے۔ یہ وہی ”مرکوز“ والی بات ہوئی کہ یہ لفظ بے شک لغت کے صفحات میں نہیں آیا لیکن اس کا مصدر اور مادہ شامل لغت ہے۔ اسی طرح ”مُعیر“ کا مصدر آپ کے سامنے ہے۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ”مُعیر“ کا سراغ بیان اللسان میں نہیں ملتا۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ بیان اللسان یا دوسری ڈکشنریاں ہی اور خامی سے پاک ہیں۔ جی نہیں۔ میرا تو خیال ہے دنیا میں کسی بھی زبان کی کوئی ڈکشنری ایسی نہ ہوگی جس میں کوئی نہ کوئی لفظ شامل ہونے سے وہ نہ گیا ہو لیکن اس خامی اور کمی کا اطلاق مشتقات پر نہیں کرنا چاہیے۔ اسم فاعل، اسم مفعول، اسم ظرف، اسم آلہ ان سب کو کوئی بھی لغت نویس جمع نہیں کرے تا کیونکہ یہ ایک لاتناہی سلسلہ ہے جس کا جوڑ صرف فی قواعد سے ہے نہ کہ قواعد لغت سے۔ اصل چیز ہے فعل کا مصدر یا مادہ یا پھر اشیاء کے نام۔ مثلاً جڈا غم درخت کے تنے کو کہتے ہیں یا المانیا کا مطلب ہے جرمین۔ یا کپڑے کے معنی ہیں جگر

اعتراض کے معاند آپ نے بلا کسی تقریر کے اردو ڈکشنری کی بات شروع کر دی ہے حالانکہ جس لفظ پر گفتگو ہے اس کا تعلق اردو سے نہیں فارسی سے۔ پھر فوراً ہی بلا فصل آپ نے بیان اللسان کا تذکرہ چھیڑ دیا حالانکہ یہ نہ اردو لغت ہے نہ فارسی بلکہ تمہری زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا تذکرہ چھیڑتے ہی آپ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تمہارے عربی الفاظ سے خود ہے۔ یہ اظہار خیال آپ کے اصل موضوع خط سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ حالانکہ خط کو مربوط ہونا چاہیے۔ خیر اس کے متصل بعد آپ نے تحریر فرمایا:۔

”مُعیر۔ لوٹانے والا۔ حالانکہ ”مُعیر“ پر کھنے والا لکھی ہے۔“

آپ کے خط میں اس فقرے کو بڑھنے والا آپ کا مفہوم میرے کلمہ کا بیان اللسان میں لفظ ”مُعیر“ آیا تو ہے مگر اسکے بس ایک ہی معنی لکھے ہیں۔ ”لوٹانے والا“ دوسرے معنی نہیں لکھے یعنی پر کھنے والا۔

حالانکہ بیان اللسان میں لفظ ”مُعیر“ صرف سے آیا ہی نہیں ہے۔ کم سے کم چھوٹے نظر نہیں آیا۔ مزید یہ کہ نظیر میں آپ نے نظیری کا فارسی کلام پیش کیا حالانکہ بحث عربی لفظ کی ہے۔ نظیر بھی کلام عرب ہی سے موزوں ہوتی۔ اور میں کہتا ہوں نظیر کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ضرورت تو اس وقت ہوتی جب ہمارے باہین لفظ ”مُعیر“ کے معنی زیر بحث ہوتے۔ بحالت موجودہ آپ کے بالکل بے محل اور غیر ضروری طور پر یہ سطور حوالہ قلم کر دیں۔

مزید آپ نے تحریر فرمایا کہ ”مرکوز کا لفظ نہیں۔“

حالانکہ ”مرکوز“ مشتقات میں سے ہے اور مصادر کے جملہ مشتقات لغت میں نہیں ہوا کرتے۔ دنیا کا کوئی کسی جگہ زبان کا لغت ایسا نہیں جو تمام مصادر کے ساتھ اس کے تمام مشتقات کو بھی سمیٹے ہوئے ہو۔ اشتقاق تو علم الصرف کا موضوع ہے نہ کہ علم اللغات کا۔ بیان اللسان میں آپ سیم کی فہرست دیکھیں تو لفظ ”مرکوز“ مل جائے گا

نہ رستن کا کوئی صیغہ حال ہے نہ امر۔ نہ
فاعل۔ اس کے برخلاف روئیدگی اور صیغہ حال ہی رویا
اور مفعول روئیدہ اور اسم فاعل قیاسی روئیدہ اور اسم
فاعل سامعی خود رو بھی مستعمل ہیں۔ آپ کے آخر کس دلیل یا
قرینے سے یہ تصور فرمایا کہ خود رو کا رو رستن سے صیغہ امر
ہے۔ مزید یہ کہ فارسی میں ہمیشہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ
مصدر کے پہلے حرف پر جو حرکت ہو وہی اس کے صیغہ
امر اور اسم فاعل کے پہلے حرف پر ہو۔ دیکھ لیجئے نشد
کے پہلے حرف شین پر پیش ہے لیکن اس کے امر شو کے ح
اول پر فتح آئے ہے اور اس کے اسم فاعل شونده کا شہ
بھی مفتوح ہے۔ لہذا یہ بھی ایک کمزور قیاس ہو کہ رو
رستن کا امر ہو تو اس کی رائ پر پیش ہی ہونا چاہئے۔
ان گویہوں کے علاوہ آپ یہ بھی فراموش کر گئے

عربی فارسی میں سامعی الفاظ بہت ہیں جن کا تعلق قیا
سے بالکل نہیں ہوتا۔ گفتگو فارسی میں ہے اس لئے میں
امثلہ دوں گا۔ درخشیدن کا اسم فاعل قیاسی تو درخش
ہے لیکن اسم فاعل سامعی درخشاں۔ دانستن کا اسم ف
قیاسی دانندہ ہے مگر اسم فاعل سامعی داننا۔ چکید
اسم فاعل قیاسی چکندہ ہے مگر اسم فاعل سامعی چکا
طیاں۔ بخنداں۔ چھاں۔ خاموش۔ خواہاں۔ جواں
جنباں یہ سب اسم فاعل سامعی ہیں۔ اسی طرح روئید
خود رو اسم فاعل سامعی ہے۔ بہتر ہے فارسی مہ
ایسے ہیں جن کا صیغہ امر اہل زبان میں مستعمل نہیں
تر اویدن۔ ترکیدن۔ توانستن۔ خلیدن۔ رستن
رستن۔ رشتن۔ زاریدن۔ زولیدن وغیرہ۔ پھرا
بعض وہ ہیں جن کا اسم فاعل بھی مستعمل نہیں جیسے
ترکیدن۔ خلیدن۔ اور بعض کا اسم فاعل مستعمل
جیسے توانستن سے اسم فاعل قیاسی توانندہ اور آ
فاعل سامعی تواننا اور رستن سے اسم فاعل سامعی
اور زاریدن سے اسم فاعل سامعی زار۔ گویا میں
ہوں میں۔ ایک وہ کہ مصدر کا نہ امر مستعمل ہے نہ اسم

اس میں سے کوئی لفظ اگر عربی لغت میں وہ گیا ہے تو یہ کمی
ہے۔ یہ اسباب کی مثال ہوئی۔ افعال کے مشتقات میں سے
کبھی کوئی مشتق اسم کی حیثیت لیتا ہے۔ جیسے حفظ سے
حفظہ۔ اس کے معنی ہیں جزدان۔ اگر لغت میں صرف
حفظ شامل ہو لیکن حفظہ شامل نہیں ہوا تو اسے کمی کہیں
کیونکہ بغیر تصریح کے طالب علم کی پہنچ اس بات تک نہیں ہوتی
کہ حفظہ جزدان کو کہتے ہیں۔ یا جیسے لفظ حفظہ۔ اس
کے معنی ہیں ایسا معاملہ جو اشتغال انگیز ہو۔ لغت نگار کا
فرض ہے کہ وہ لفظ حفظ کے بعد یہ وضاحت بھی کرے
کہ یہی مصدر جب باب افعال سے آتا ہے (احفاظ)
تو اس کے معنی تاؤ دلانے کے آتے ہیں اور اسی سے حفظہ
ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس وضاحت کے بغیر کوئی طالب علم
احفاظ اور حفظہ کے معانی نہ جان سکے گا۔

اس کے برخلاف کوئی لغت نگار لفظ استکانہ تو
دیدے مگر مرتکز نہ دے یا عیار دیدے مگر معیار نہ دے
یا تراز دیدے مگر کوز نہ دے یا طاعلہ دیدے مگر مطیع
نہ دے تو اسے کمی اور خامی نہیں کہیں گے کیونکہ ہر طالب علم
خود یہ مشتقات نکال لے گا اور ان کا صحیح و مستعمل مفہوم بھی
سمجھ جائے گا۔

یہ معروضات بظاہر طوالت اختیار کر گئیں لیکن انکا
مقصود یہ احساس دلانا ہے کہ علوم و فنون بچوں کا تھیل
نہیں۔ ان کے معاملہ میں بیدار مغزی احتیاط اور بالغ نظری
کا دامن پکڑے رہنا چاہئے۔ جہاں تک اصل بحث کا
تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ بحث نہ لیجئے۔

فارسی میں "رستن" کے لئے صرف رستن ہی نہیں آتا
روئیدن بھی آتا ہے اور اسی کا چلن نسبتاً زیادہ ہے۔ کلا
ظہیری کی مثال پیش کر کے آپ نے تاؤ دیا کہ فارسی میں آپ کو
اچھی خاصی نظر ہے لیکن حیرت ہوئی کہ آپ "روئیدن" سے
نئے مشتق مان رہے ہیں حالانکہ یہ روئیدن سے مشتق ہے۔
رستن سے کلام فارسی میں ماضی مطلق رستہ اور اسم
مفعول رستہ تو مستعمل ہے باقی مشتقات مستعمل نہیں ہیں۔

قائمانی فرقہ دائرہ اسلام سے قطعاً خارج ہو

دلائل علیٰ عدم توبہ بنیکہ اعلان

مولانا قاری محمد طیب صاحب ہتم دارالعلوم دیوبند نے ایک بیان میں کہا ہے کہ تقسیم ملک سے برسہا برس پہلے باتفاق علماء بزرگ صغیر غمخ نبوت کے بنیادی اور قطعی اسلامی عقیدے سے انکار پر قادیانی فرقہ کفر منہ اور خارج از اسلام قرار دے چکا ہے۔ انگریز کے پیدا کردہ اس جھوٹے نبی اور اس کے ذریعہ مذہب حق اسلام کے برخلاف مذہبی رنگ کو اس ذلیل ترین اور خطرناک بین الاقوامی سازش کا آج بھی اللہ بھلائی کے ساتھ اسلام نے طویل جہالت اصلاح دینے کے بعد پردہ چاک کر دیا ہے اور ممالک اسلامیہ کی ۳۲ اسلامی تنظیموں کے سربراہوں کی کانفرنس (منعقدہ اپریل ۱۹۷۸ء) نے بالانفاتی یہ صحیح ترین اور تاریخی اعلان کیا کہ قادیانی فرقہ غیر مشروط طور پر باخاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ پر غمخ نبوت کو نہ ماننے اور انبیاء علیہم السلام کی توہین کرنے کی وجہ سے قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ عالم اسلام کے اس متفقہ اور تاریخی اعلان حق نے اہل حق کو نہ صرف قوت بخشی ہے بلکہ قادیانیوں کے مرتد ہونے کے بارے میں قرآن و حدیث پر مبنی اہل حق کے دینی موقف کو عظیم مضبوطی عطا کی ہے۔ عالم اسلام کے اس متفقہ فیصلے کے بعد پاکستان کے علماء حق اور عامۃ المسلمین مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے قادیانی فرقہ کے ازداد کے بارے میں اپنے اور تمام مسلمانان عالم کے موقف حق کی حکومتی سطح پر تائید و توثیق حاصل کرنے میں پہل کی ہے تو قی ہے کہ دیگر ممالک اسلامیہ کے علماء و عامۃ المسلمین بھی فتنہ قادیانیت کے بالکلیہ الیاد کو اسلامی حیمت کے تحت ہر ممکن نفوذیت و تائید ہم پہنچانے میں دریغ نہ کر کے عن اللہ بما جودا و عن المسلمین مشکور ہوں۔

بلاشبہ عالم اسلام کا یہ کلیہ فیصلہ اور اس کی تائید و توثیق قادیانی فرقہ کی تلبیس کاریوں سے مسلمانان عالم کو بچانے کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہو گا اس لئے عمومائے تمام علماء اور مسلمانان ہند اور خصوصاً علماء دیوبند اسلام کے تحفظ کے اس بین الاقوامی فیصلہ اور افاقہ ام کرنے والوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ خاتم الانبیاء کے لئے ہوئے اس آخری دین کو زیادہ سے زیادہ غلبی نصرت و تائید مرحمت فرمائے۔ آمین (دعوتِ اسلامیہ)

ایک مبارک اقدام : ایک صحیح فیصلہ
رَبَّنَا وَرَبُّ الْعَالَمِیْنَ (لَا تُکَفِّرْهُنَّ) کَا اَعْلَانُ

قادیانیت کا مسئلہ گزشتہ نوے سال سے ملت اسلامیہ اور اُمت محمدی کے لئے ایک تشویشناک اور پریشان کن مسئلہ بنا رہا تھا۔ مدعی نبوت مرزا غلام احمد کی تحریک کے خطرناک رجحانات اور اسلام و نبوت محمدی کے خلاف بغاوت اور برہمنہ ساز مشنوں کی گرفت گزشتہ پون صدی میں امت کے سواد اعظم کے فتنہ زار علماء اور مفکرین کرتے رہے اس میں سرفہرست مولانا محمد علی مونگیری، مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا ثناء اللہ صاحب افراسیابی و اکثر محققین، مولانا محمد علی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ ہیں۔

قادیانیت نے جس نقاب کے ساتھ ملت اسلامیہ میں نفوذ کیا تھا اور جس حکمت کے ساتھ اپنے آپ کو ملت اسلامیہ کا جزو بنایا تھا اس نے ان کے بارے میں عام مسلمانوں میں شبہ یا غلط فہمی پیدا کر دی تھی۔ قادیانیت ان کے پس پشت وہ سامراجی طاقتیں کام کر رہی تھیں جو مسلمانوں اور عالم اسلام کو منتشر و پراگندہ کر دے یا بال کرنا چاہتی تھیں) نے اس طرح پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ اور یورپ و افریقہ میں اشاعت اسلام کی ایک سرگرم و فعال تنظیم ہے۔ ان کے اس غلط پروپیگنڈہ کا شکار ملک و بیرون ملک کی بڑی تعداد ہوئی۔ مگر اس مسئلہ نے پاکستان میں دہائے ۳۰ میں اور ۴۰ سال ۳۰ء میں جو رخ اختیار کیا اس نے پورے عالم اسلام کو چونکا دیا۔ قادیانیت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے والوں نے اس تحریک کے خطرناک فہمات کو فہم کر کے اس بات کا اعلان کیا کہ قادیانی حضرات ان ہی کے عقیدہ اور لٹریچر کی بنیاد پر ملت اسلامیہ کا جزو نہیں ہیں بلکہ ایک مستقل ملت ہیں جس کا کوئی رشتہ اسلام اور نبوت محمدی سے نہیں ہے۔ ان کی ملت کے سواد اعظم سے وابستگی صرف دہنوی مفاد حاصل کرنے کے لئے ہے۔ عالم اسلام کی نمائندہ تنظیم رابطہ عالم اسلامی نے بھی اپنی ایک قرارداد کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ پاکستانی میں اس سلسلہ میں بڑے فحاش طریقہ سے اور قوم کی منتخب مقننہ کے اراکین پر حملہ ایک کمیشن کے ذریعہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ تحریک قادیانیت کے موجودہ سربراہ کا بیان لیا اور جمہوری طریقہ سے اپنی نیشنل اسمبلی کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ یہ فیصلہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔ اسے نہ تو غیر اسلامی کہا جاسکتا ہے اور نہ غیر اخلاقی۔ جن حضرات کی قادیانی تحریک کے قیام اور اس کے موجودہ ہیئت اور آئندہ عزائم پر گہری نظر نہیں وہ اپنی کم علمی یا لاعلمی کی بنا پر جو اس پر تنقید کر رہے ہیں انھیں چاہئے کہ وہ قادیانیت کا تفصیلی مطالعہ کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ قادیانیت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ انھیں اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کرے گا۔

ہم اس ملک کی دینی، تعلیمی، سماجی تنظیموں اور اداروں سے کبھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس فیصلہ کی تائید اور اسے عین انصاف و رواداری قرار دینے میں، اہل بیانات شائع کریں تاکہ برصغیر اور دنیا کے عوام و خواص کو یہ بات واضح ہو جائے کہ مشرق و مغرب اور دنیا کے ہر خطہ کے مسلمانوں کی بینفقہ آواز تھی اور اسے وہ عین حق و صواب سمجھتے ہیں: (تعمیر جات لکھنؤ ۲۰۰۵ء راکٹ و ۲۰ ستمبر ۲۰۰۵ء)

حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی، مظلّم اور کثیر المناقب جناب محمد عثمان فاروقیٹ سابق ایڈیٹر الجمعہ سے ادارہ منجلی کی فاروبانہ اور دردمندانہ التجاہ کے کہ وہ قادیانیت کے لئے نرم گوشے کو بالائے طاق رکھیں اور یقین فرمائیں کہ قادیانیوں کا خارج از اسلام ہونا دورائے کا منحل نہیں۔

مَلّا ابن العرب مکی

مسکے سے منجائے تک

یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں تو رمضان کے لیے ہی پہنچ رہا ہے مگر مرتبہ رمضان ہی میں ہوا تھا اور رمضان میں ملا عموماً جنس نایاب بن کر رہ جاتا ہے۔ اب کی بھی وہ ہاتھ نہیں آیا اور مجبوراً اب تیرہ سال پرانا "غذائے نامہ" بذریعہ خیریت کیا جا رہا ہے اس کی اشاعت اپریل ۱۹۸۷ء میں ہوئی تھی۔ آپ پڑھ بھی چکے ہوں تو یاد کیا دھرا ہے۔ یاد بھی ہو تو قراب کی نیت سے پھر پڑھ ڈالئے (ادارہ)

تاریخ نوشت ۳۱ مارچ یعنی کہ ۲۶ رمضان المبارک

ایڈیٹر تجلی اپنی بہن یعنی عاجز کی زوجہ — نسیم پر غرار ہے کھفہ۔

”آخر یہ مردود ہے کہاں؟ — جب بلال کے بھتیجا ہوں تم کہا بتی ہوئے نہیں“

”سچ بھیا، بیگم نے ڈرے سپریم لہجے میں یقین دلایا۔
”ایسا ہی اتفاق ہو رہا ہے کہ جب بھی آپ کے دفتر سے آؤں
بھیجاؤ گھر میں تھے ہی نہیں“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ روزے بھی نہیں رکھ رہا
روئے رکھنے والا کوئی آدمی صبح آٹھ بجے لستر کے سوا اور
کہیں نہیں مل سکتا۔“

”روزے تو رکھ رہے ہیں اسی لئے لکھا بھی بنا کر رکھا
ہے۔ دن میں ظم لے لے کے بیٹھتے ہیں مگر کئی کئی کاغذ کاٹ

پیمانٹ کے اٹھ جاتے ہیں۔ سحری کے بعد کبھی تو سو جاتے
ہیں اور کبھی باہر چلے جاتے ہیں پھر دوبارہ سو جاتے ہیں“

”مت بکو —“ بہن کے بھیا جھلائے۔ وہ شاید

بہن کے چہرے سے بھانپ گئے تھے کہ ٹیب ریکارڈ بچا ہو

— ”مارچ آدھا ہونے کو آیا پہلے بھی اسی کی وجہ سے

کئی بار پرچہ لیٹ ہوا ہے۔ اب کی بھی اسی کی بکو اس باقی ہو

درز پرچہ مکمل ہو چکا ہے — تمہاری بھی مت ماری گئی ہے

اسے بجائے سمجھانے کی طرح دیتی ہو“

”ہائے بھیا آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے وہ میرے

بس میں ہوں — بہت سمجھاتی ہوں، مگر وہ... وہ آپ

جانتے ہی ہیں ایران طوران کی ہانک دیتے ہیں“

”بہرہ کہیں کا — سفید بال مینے کو آئے مگر

لو کہیں نہیں گپ“

”اس فقے پر بھیا کی بہن کا چہرہ ذرا کشیدہ ہو گیا۔

”جنم میں گیا اخبار — روزے آخرادرلوگ بھی تو رکھتے ہیں، تمہارا ہی روزہ دنیا سے نرالا کیوں ہے کہ چار روز قلی بھی نہیں لکھ سکتے۔“

”آگئیں آپ سے تم پر.... کیا کہا در قلی....“

”ارے اور کیا..... چہیز میں ساتھ آٹھ صفحہ ہی تو لکھتے ہو۔“

”اُف.... یہ تم کہہ رہی ہو.... میرے اللہ زمین بھٹ کیوں نہیں جاتی — لودہ بھی کہتے ہیں کہ رب بے تنگ و نام ہے.... دوسرا مصرعہ کیا تھا؟“

”اُن کے ہونٹوں پر تبسم آیا مگر پی گئیں۔“

”مصرعے کسی اور سے پوچھا۔ آخر لکھ لکھا کے جان کیوں نہیں چھڑاتے۔“

”ایسے کہہ رہی ہو جیسے مضمون لکھنا ہرناک نہ ہو کوئی فرق ہی نہیں۔ کبھی کرک مرغی دیکھی ہے تم نے؟“

”اس نے جواب نہیں دیا۔ بس ناخوش گوارا انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔“

”رض کر دم کسی کرک مرغی سے ایک لاکھ مرتبہ کہو کہ نیک بخت اندر دیدے۔ خدا کے لئے دیدے — تو کیا وہ دیدے گی؟“

”یہ گنری مثالیں اپنے پاس رکھو۔ کو نسا ادا مضمون لکھنا ہے۔ آلا بلا کچھ ٹھسٹ ڈالو۔“

”غوب داد دے رہی ہو۔ آلا بلا کیا کوڑا کہا کر کہو۔“

”بیت پھر کہو۔ واہ رے واہ۔ تہی رقی میں گنگی کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ کہ ساری کی میں تیا بھی.... تو بہ....“

”آپ تو کہتے تھے بھیا سوکھ کے چھو واہ بن گیا ہے پھر یہ شعر کہاں سے آ رہے ہیں؟“

”شترگر بہ — یہ کبھی تم بھی آپ آ کر کیا مذاق ہے؟“

”مذاق و مذاق میں نہیں جانتی۔ تمہاری وجہ سے مجھے بھیا کی جلی کٹی سننی پڑتی ہیں۔ یا تو ڈھنگ سے کام کر دیا استعفا دیدے۔“

”ساتھ بیٹا کر لولی۔“

”بھیا خیال تو ابھی تک ان کا ایک بھی سفی نہیں ہوا۔“

”ہاں ہاں وہ تو دودھ پیتا بچہ ہے۔ آئے تو کھینا یا تو تک اپنا کوا اس نامہ کا تب کے حوالے کر دے ورنہ ت بہری طرح پیش آؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بیر بچتے چلے گئے۔ اب میں غسل خانے سے اہو ا اور دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ واقعی وہ چلے گئے ہیں یا پھر کراہٹ لے رہے ہیں۔ ویسے ان جیسے آدمی اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن جو رکاد دل کتنا دور سرک پر افتاں و خیراں چلے جا رہے تھے۔ افتاں براں اس لئے کہ روزوں میں ان کا بھی حال کچھ کم بتلا میں ہوتا۔ ایک دفعہ کو تو دس بھی آیا اور جی چاہا کہ دیکھا کہ ان موقعہ کا شعر پڑھوں، مگر شعر کہاں دھر رہے ہیں۔ رول کے فیض سے، ان شعری کا یہ عالم ہے کہ نظم و نثر کا ابھی سمجھ سے بالا ہو گیا ہے۔

کچھ بھی بچ اپنی بیگم آجکل بہت ابھی جا رہی تھیں۔ ہری برگرتے ہوئے میں نے حوصلہ افزائی کی :-

”ہزاروں برس جیو بیگم تم اللہ قسم اب تو بہت حسین تی جا رہی ہو۔“

”آپ کو شرم آتی چاہئے۔ وہ برے سے لمحے میں لولی۔“

”فرد رائے گی.... سچ کہتا ہوں جب تم آپ جناب رولتی ہو تو بہت شرم آتی ہے۔“

”بس رہنے دو.... آخر یہ بچتا کب جائے گا۔“

”ہائیں.... کیا کہا بچینا“ مجھے تادا گیا۔ ”تم تو ایسے رہی ہو جیسے شوہر میں نہیں تم ہو؟“

”ختم کیجئے“ ان کی بیزاری عروج پر پہنچ گئی اب آپ کے لئے اپنی عاقبت برباد نہیں کر دوں گی۔ بھیتا ہ صاف صاف کہہ دوں گی کہ یہ گھر ہی میں ہوتے ہیں مگر ترکے آدمی سے جھوٹ کہہ لو ادیتے ہیں۔“

”بس بس“ میں نے ٹوکا ”کیا آج کے اخبار میں تی دنگ کی خبریں زیادہ ہیں؟“

”درِ گمراہ ہو جاتا ہے۔ بس تم چپ جاؤ۔ آج تم نے اپنے شوہر کی غیرت کو لٹکا دیا ہے۔ دیکھا اب کیسا ڈٹ کے سامنا کرتا ہوں“

پھر میں چادر سے منہ لپیٹ کے سو گیا۔ لیکن شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک سر کی طرف سے ایک بھونچال نما خواب بڑے زور و شور سے طلوع ہوا۔ رمضان کے خواب عموماً سوہا ضمہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ صوفی قہتاب علی کا مقولہ ہے کہ سحری میں کم سے کم آٹا تو کھا کہ حق کے دھوئیں کو حلق سے نیچے اترنے کا راستہ نہ مل سکے۔ صوفی زمر علی کا تو معمول ہے کہ سحری میں دو خوراک یک مشت کھاتے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ جب تک ظہر کے وقت تک کھٹی ذکاریں نہ آئی رہیں سحری کا مفہوم ہی پورا نہیں ہوتا۔

لیکن عاجز کا معاملہ جدا لگانا ہے۔ عاجز نے تو فقہی ترتیب یوں دے رکھی ہے کہ حقہ فرض۔ پان واجب۔ چائے مستحب اور کھانا مباح۔ پوری سحری خلائی راکٹ کی رفتار سے حقہ بیٹا ہوں اور مولانا ردیم کا یہ بر محل مصرعہ بر زبان رہتا ہے

بشنو از نے چوں حکایت می کمت۔

پھر بھلا خواب پریشاں کہاں سے آتا۔ وہ دراصل خواب نہیں تھا، بلکہ ایڈیٹر تجلی کی سنجیدگی قلابازی کھا گئی تھی۔ انھیں شاید کسی سے معلوم ہو گیا تھا کہ ملا علی تانے پڑا ہے۔ بس خود ہی اٹھے چلے آئے اور شریفیوں کی طرح بیدار کرنے کے عوض بھراوٹا مجھ خستہ حال کے سر پر اندوہ سوخ لیجئے کیا حال ہوا ہوگا۔ نہ ہی زیادہ جاڑا انگیر افتاد نوگرہ میں بھی پڑے تو طبیعت صاف کر دینے کے لئے از بسکہ کافی ہے۔

”ک ک کون ہے.... کیا ہے۔“ میں ہڑبٹا کے اٹھا اور سبکیاں لیتے ہوئے دھاڑا۔ خواب میں بریلی قسم کی نوکدار آواز آئی :-
”اٹھو“

”تو یوں کہو آج اڑنے ہی کا تہیہ ہے۔“ سچ کہتا ہوں مگر اگر اتفاقی شوہر ہو گئی ہو میں تو مجھے عدت ہی میں خود کشی کر لینی پڑتی۔ اچھا مجھے تو لکچر ملائی ہو اپنے بھیا سے کیوں نہیں کہتیں ایک فتویٰ میرے لئے بھی سہی“

”کیسا فتویٰ؟“

”سفید رنگ کا فتویٰ۔ خوب بھولی بن رہی ہو، کیا میں نے پچھلے جمعہ کو نہیں کہا تھا کہ اپنے بھیا کو فتویٰ دلو اگر ایک دو روزہ معاف کر دو دفتر کا دفتر لکھ مار لگا“

”تمہیں تو خدا کی بھی شرم نہیں“ وہ ہنسنے لگا
”ہی ہونٹوں میں گھونٹ کر بولی“

”ارے وا۔ تمہارے بھائی صاحب ہر چیز سے سو سو گز کے فوٹے لکھتے ہیں تو کوئی شرم کی بات نہیں اور میرے لئے ایک سطر ہی فتویٰ بھی گویا کہ.... جی ہاں.... گویا کہ....“

”ہنتر تم سے کون مغز مارے۔“ اچھا دن ہیں نہیں لکھ سکتے تو رات میں کیوں نہیں لکھتے۔ تراویح کے بعد ایک دو دن مگر گشتی نہ سہی“

”ہوں تو اب آئی ہو مطلب پر۔ یوں کہو نامیری رات کی تقریر تمہیں کھنگ رہی ہے۔ زہر دید مجھے۔ دن بھر روزہ رکھوں اور رات کو کاغذ قلم سے سراو دوں۔ یہی منشاء ہے نا تمہارا؟“

”ارے تو تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے رات کو کھانا پہاڑ کا ٹنڈے کے مرادف ہے۔ خیر تم سو جاؤ۔ میں تو صاف صاف کہہ دوں گی بھیا سے کہ یہ تراویح کے بعد سے سحری تک گھر سے باہر رہتے ہیں معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں“

”ٹھیک ہے یہ بھی کہا کہ چوری کرنے جاتے ہیں۔“

ناج دیکھنے جاتے ہیں۔ حاد ہو گئی گویا سالے نہ ہوئے جلا دہو گئے کہ بھانسی چڑھا دیں گے“

”پچھ تو خوب تیزی دکھاتے ہو۔ سامنے کیا ہو جاتا ہے“

”ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔ میں پوچھتا ہوں فلا سے سوئی تک کہاں رہتے ہو؟“

”جی.... پرسوں جو بری کی مسجد میں شہید تھا... کل مرزا چیراغ حسن کے یہاں ختم خواجگان کی محفل تھی۔“

”اور آج کی رات تمہارے فرار پر عرس ہو گا؟۔“

”مالا لاق کہیں کے۔ مجھے معلوم ہوا ہے تم مولوی رحیم اللہ کے لڑکے کو رات رات بھر شطرنج کھلا رہے ہو۔“

”تو کیا وہ دزدہ بیتا بچہ ہے“ میں نے ساختہ ترغا ”خبیث خود تو مجھے کھینچ کھاؤں گے لے جاتا ہے۔۔۔۔۔“

”مگر حوالہ لاؤ شطرنج کون مرد دیکھتا ہے۔“

”انھوں نے بڑی ناخوشگوار نظروں سے گھورا پھر مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ بعض مرتبہ بڑی بڑی تھی جو ایسے مسکرائیگے جیسے کھا جائیگے۔ کروڑوں میں جتنے لگے۔“

”صوفی درمیں شکایت کر رہے تھے کہ ان کی درگاہ سے برا بھلا درس چوری ہو رہی ہیں۔“

”چادریں۔ یعنی کچادریں۔ کیا مطلب؟“

”تم چادریں کا مطلب نہیں سمجھتے؟“

”اس وقت تو میں اپنا بھی مطلب نہیں سمجھتا۔ قسم ہے جناب آپ کو تو کبھی چڑھا دیتا ہے پس چڑھائے ہیں آجائے ہیں۔ صوفی درمیں کی درگاہ سے اگر مردوں کے کفن بھی چوری ہو جائیں تو آخر تجھ پر نصیب کا اس سے کیا واسطہ؟“

”ہو سکتا ہے چور کوئی اور رہا ہو مگر اسکیم تمہارے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ بڑی ذلیل حرکت ہے۔“

”کمال کرتے ہیں آپ۔ اس صوفی کے بچے کو دریا تو کیا لہزنا کہ وہ کس بنیاد پر الزام تراشی کر رہا ہے۔ وہ تو یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ چادریں چوری ہی ہوئی ہیں۔“

”وہ نہ کہہ سکے مگر میں کہہ سکتا ہوں۔ وہ لفنگا فقیرا تمہارے ملنے جلنے والوں میں ہے۔ کل ہی اسے نئے سبز رنگ کے تہبند میں دیکھا گیا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ فقیرا سے اول تو میرا

اور میرے زشتے کوخ کر گئے۔ یہ اسی ظالم کی آواز تھی جو سالا ہونے کے باوجود میری سات پشتوں تک کا پہنونی ثابت ہو رہا ہے۔ حضرت پاس والی کرسی پر براجمان تھے اور نسیم۔ میری دالا گھر بیگم ددر چارپائی پر بیٹھیں اس نے تعلقی سے ترکاری کاٹ رہی تھیں جیسے ان کے شوہر پردن دہائے مارا جانے والا شیخون رائی برابر بھی اہمیت نہ رکھتا ہو۔“

”آپ۔۔۔۔۔“

”ہاں میں۔ اب بھی کہہ دلا گھر پر نہیں ہے۔“

”نہیں تو۔۔۔۔۔ لاجلہ لاؤ۔ آپ سے یہ کس نے

پہنایا۔۔۔۔۔“

”بس بس کیا اس نہیں۔ میں پوچھتا ہوں تمہارا لگا ہوا پن آخر کب ختم ہو گا۔“

”رمضان کے بعد۔۔۔۔۔ اور میرا مطلب یہ ہے کہ گھر سے مضمون نہیں لکھتے۔ نہ انھیں دفنانے کیلئے نقل دیا جاتا ہے۔“

”میں تمہیں پانی کے ٹب میں اوندھا لٹکا دوں گا۔ اپنے و طیرے ٹھیک کر دلا نہیں تو سوچ لکھتا ہوں وہ گشتا لی کروں گا کہ مزاج درست ہو جائے گا۔“

”وہ تو ہو گیا“ میں نے چادریں سمیٹ کر بھیگا ہوا سر اور منہ پوچھتے ہوئے کہا ”اب شام تک بخونہ ہو جانا یقینی ہے“

”کوئی پروا نہیں۔ تازہ شہائے کی ڈائری تو میں تمہاری لاش سے بھی لکھوا کے چھوڑوں گا۔“

”باپ اے۔ آپ ذرا محسوس نہیں فرماتے کہ میری موت۔۔۔۔۔ نسیم کے لئے کیا معنی۔۔۔۔۔“

”فصول ہا میں مت کرو۔ یہ بتاؤ درذرات کو کہاں جاتے ہو؟“

میری نگاہ بے اختیار نسیم کی طرف اٹھ گئی۔ اتنا تاؤ رہا تھا کہ رپو اور نصیب ہوتا تو بے تکان فائر تھوٹک دیتا۔ ظاہر ہے ابھی بھائی کی لاڈلی نے کان بھرے ہوئے بس خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور عزم بالجزم کر لیا کہ ذرا بھٹیا جان رخصت ہوں تو ان لاڈلی نسیم کو بھی سچوں۔

ارادہ نہیں۔ محض معمولی الیک سلیک ہے۔“

”جھوٹ کہتے ہو۔ کیا یہ وہی فقیر نہیں ہے جسے تم نے صنوبری دار سے لگا کر درگاہ بلبل شاہ کے سجادے سے بھر دیا تھا؟“

”اور.... آپ کو کیا معلوم؟“

”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ — ان کی نیکی نظریں بھ اپنی ہڈیوں کے گودے میں جھپتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”نہ خیر غلط تو نہیں — لیکن چار دروں کا معاملہ لگ ہے۔ فقیر آئے تو نیا کہ نہ بھی پہتا تھا اب وہ صوفی کا بچہ کپڑے کا کہہ کر تا بھی اسی کی درگاہ سے چوری ہلائی۔“

کہہ کیا دیگا۔ وہ تو کہہ ہی رہا ہے کہ چڑھا دے کے بھادر کپڑے بھی چوری ہوئے ہیں۔“

خون لگ گیا ہے اس کے منہ کو۔ خدا کے لئے آپ اس حکار کے معاملہ میں نہ بولئے۔ میں نمٹ لوں گا۔“

”میری بلا سے اس نے پولیس میں رپورٹ درج ا دی ہے.....“

”ادہ زنیہ بات یہ ہے — آپ چاہے میرے گولی ردیں مگر اس صوفی کے بچے کی عاقبت ضرور برما کر کے ہوں گا۔“

”ختم کر دو۔ مجھے یقین ہے تمہاری موت کسی صوفی کے ہاتھ سے لکھی ہے۔“

”نا ممکن“ میں تاویں بھر گیا ”کسی صوفی کے ہاتھ سے مرنے سے پہلے میں کسی خارش زدہ کتے کے معارے میں زچا ناپسند کروں گا۔“

”لا حاصل ڈینگیں۔ صوفی درمیں بہت رسوخ کے جی ہیں۔ ہتھ چڑھ گیا تو تمہیں کچا چبا جائیں گے۔“

”چپا کے تو دیکھیں۔ پیٹ میں وہ مرد اور اٹھے گا کہ گل کتنے کی طرح بھونکتے پھر رہے گے۔“

”استغفر اللہ — بڑی گھٹیا باتیں کرتے ہو۔ خیر بھ تمہارے داہیات قصوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر فی تمہیں پھانسی پر بھی لٹکا دے گا تو میرے کانوں پر

جوں تک نہیں رہیں گے گی۔“

”منظر رہے۔ بجا آپ ان معاملات سے بے تعلقی ہو جائیں پھر میں دیکھوں گا کہ کون کسے پھانسی پر لٹکا رہا۔ آپ نہیں جانتے یہ صوفی اینا کو شراب اور افیون کا غیبہ خانوئی کا رو بار کرتا ہے۔“

”کرتا ہو گا — تم ڈائری کب دے رہے ہو؟“

”ڈڈائری تو بس.... ک کل دہروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ کل شام تک کا تب نکت پہنچ جائے نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“

وہ چلے گئے تو مجھ پر بھی یاد نہ رہا کہ چھانچوری کے سلسلہ میں بیگم کو بھی سمجھا ہے۔ البتہ مولوی رحیم الدین جو ان کے خلیا مسر تھے ان کے بارے میں ضرور فتنہ کیا۔

”سن لیا تم نے۔ وہ تمہارے خلیا مسر کیا فرماتے ہیں.....“

”غلط کیا فرماتے ہیں۔ آپ ہی نے میاں جھن پو شطرنج کی چاٹ لگائی ہوگی۔“

”سبحان اللہ۔ تمہارے خیال میں وہ لومر گھٹلیوں چلتا ہے جسے میں گود میں لے کر شطرنج کھلاؤں گا۔ اپنی حالت سدھار دو بیگم! تم نے ازدواجی آداب کو بالکل طاق میں رکھ دیا ہے۔“

”برا تو مانے مرت..... کل خالا ا مثل کی پڑوسن کہہ رہی تھیں کہ ان کے میاں کو آپ نے دہائی بنا دیا ہے۔“

”کون میاں — شیخ کلن؟“

”جی ہاں۔“

”تو پوچھا ہوتا شیخ کلن کے سینگ نکل آئے ہیں کیا؟“

”سینگ نکل آتے تو ان کے کنبے دالوں کو اتنا غم نہ ہوتا مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے یہاں کا کوئی فرد مردوں پر سجدے کرنے اور چڑھا دے چڑھانے سے انکار کر دے۔ اصلی اہل سنت و جماعت ہیں وہ لوگ۔“

یہ کہتے ہوئے بیگم نے دوپٹہ کا کونا منہ میں دبایا۔

میں اتر جائے گا۔ دل کا دھڑکن اور مرغ کی لکڑیوں کوں
میں کوئی فرق پائی نہیں رہ گیا تھا۔ اسی لئے دفتر اور اہل
دفتر سے منہ چھپائے پھرتا تھا۔ ایک دوبار خود ایک بیٹھ چکی
آدھکے نو سعادت من بیگم نے ہدایت کے مطابق پہلے ہی
مجھے مطلع کر دیا۔ پھر انھیں اندر بلایا۔ ان کی عادت ہے
پہلے اذن چاہتے ہیں پھر اجازت مل جانے ہی پر قدم رنجہ
فرماتے ہیں۔ بارہا ان کی اس عادت پر میں نے شکوہ کیا
تھا کہ آپ غیر مت برتتے ہیں۔ اس بد نصیب ہنوی کے گھر
میں داخل ہونے کے لئے استیذان کے تکلف کی کیا
ضرورت ہے جسے آپ نے غلام زادہ بنا چھوڑا ہے۔ لیکن
وہ لکیر کے فقیر نہیں پانے اور میں نے صبر کی سیل سینے پر رکھ
لی۔ مگر وہ رے تیرنگی زمانہ ان کی یہی عادت اس بار
میرے حق میں کسی لغت ثابت ہو رہی تھی۔ ایک دن
سویا ہوا تھا کہ بیگم نے انگڑھال کے اطلاع دی وہ
آ رہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا ہرن کی طرح کھانچ بھر کے
اندر کی دھڑکی کو ٹھہری میں جا سامیا۔ غلطی یہ ہوئی کہ جوتے
اٹھانا بھول گیا۔ ان کی نظر نے سربے پہلے ہی کمزوری
پکڑی۔

”تم تو کہہ رہی ہو نسیم وہ باہر گیا ہے گریہ جوتے...؟“
”جی..... وہ چل پڑے پہننے چلے گئے ہیں...“
مگر انھیں یقین نہیں آیا اور کہ ٹھہری میں ٹھسے چلے
گئے۔ اگر وہ بھی میری طرح ننگے پیروں چپکے چپکے آتے تو شاید
میں کتے کی موت ارا جاتا۔ لیکن غنیمت ہے وہ جا سو سی
نادول نہیں پڑھتے۔ یا پڑھتے ہوں گے تو ان سے کچھ سیکھنے
کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ادھر انھوں نے کہ ٹھہری میں قدم
رکھا اور ادھر میں مصیبت کا مارا اچھلا دے کی طرح ایندھن
کی کہ ٹھہری میں جا گھسا۔ وہ بھانپ تو شاید گئے تھے لیکن
ایندھن کی تنگ ڈار ایک کہ ٹھہری میں گھٹنا ان جیسے منتطیق
آدمی کے لئے مشکل ہی تھا۔ اس طرح مجھے اس شاعر کے
بال بچوں کو دے اے خیر دیے کا موقع ملا جس نے کہا تھا:-
رسیدہ بود دہائے دلے بخیر گزشت

شاہد وہ ہنسی روک رہی تھیں۔
”گھٹ گھٹ کے مت ہنسو بیگم۔ میں اس وقت
پلصر اٹھ کر اہوں۔ بتاؤ کل تک ڈائری کیسے لکھی جائیگی؟“
”کیا مشکل ہے فلم اٹھائیے لکھتے چلے جائیے۔“
”مشکل تو یہ بھی نہیں ہے کہ میں کوہ قاف کی چوٹی
سے سحر الکاہل میں چھلانگ لگا دوں.... کاش تم حقہ
پیا کر نہیں بیگم تب کہیں پتا چلنا کہ ترکاری کاٹنے میں اندر رہنے
میں مضمون لکھے میں کیا فرق ہے۔“
”آخر کیا بھی تو حقہ پیتے ہیں۔“

”ان کے سر پر کالے دیو کا سایہ ہے۔ وہ دن بھر
تو کروں پر حکم چلاتے رہتے ہیں۔“
”اجی جائیے بھی۔ آپ نے ہمت ہی تو ڈڈالی ہے ورنہ...“
”نہیں بیگم یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ زہن کو دماغ
پر غیبر معمولی بو چھڑ جانے سے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں
تو کیا تم میری ایسی لاش پسند کر سکو گی جو قبرستان تک
حقہ حقہ پکارتی جائے۔ میرا دعویٰ ہے بیگم میرے بچے تمہارا
بھیا کو چھو گیا مسکین ہنوی کبھی نہ مل سکے گا۔“
انھوں نے برا سامنہ بنایا۔ پھر چھپتے ہوئے

لہجے میں بولیں:-
”آپ تو کہتے تھے ڈٹ کے سامنا کروں گا۔ اور
کوئی پانی الٹ دیتا تو زمین و آسمان ایک کر دیتے۔“
”موڈ کی بات ہے جناب۔۔۔ ویسے تمہارے بھیا
ہی آج آپ سے باہر کہاں ہوئے ورنہ ساری سخی خاک
میں ملا دیتا۔“

کافی دیر مجھے صوفی درکین کے بلے میں غور کرنا پڑا پھر
نیند آگئی۔ ظہر کے وقت اٹھا تو یاد آیا کہ کل مضمون دینے
کا وعدہ ہے۔ معاذ اللہ جلے کس رو میں وعدہ کر بیٹھا تھا
ورنہ لکھنا اپنے بس کی بات ہی کب تھی کی کیفیت تو واقعہ یہ
تھی کہ پورے رمضان جب بھی دن میں فلم کا فلیکے بیٹھا
یہی معلوم ہوا کہ کھوپڑی میں نیم خانہ آباد ہے۔ ماتھے پر
مشکیں ڈال کر زیادہ زور ڈالتا تو ایرالگنا کبھی معاذ

کہ کر کے دارا دلا آئی۔

”اماں ملا صاحب سو گئے کیا؟“

یہ خواجہ شبن کے سوا کوئی نہ تھا۔ جبوڑا اٹھ کے دروازے پر گیا۔ وہ چھوٹے ہی پل پر ہے۔

”اماں کیا دوا ہیات ہے۔ بھتیجے کا بھی خیال نہ کیا۔“
لاحول ولاقوة تم جیسا خرے باز دیکھے میں نہیں آیا۔
”چلو۔“

”مگر میں۔۔۔۔۔“

”کیا یا مرغزے دکھاتے ہو۔ خبر بھی پٹنی والوں نے تیسری مات پیدلی پلائی ہے۔“

وہ لمبے ڈیل ڈول کے آدمی تھے ایک ہی جھونک میں کئی گز کھینچ کے لے گئے۔ مرنے کا کیا نہ کرتا۔ جانا پڑا۔ پھر دلی والوں سے دود دواتھ ہوئے۔ ظالم سچ سج پرانے گھاگ تھے۔ سحری تک تین ہاڑیاں لڑیں۔ ایک انھیں ملی ایک میں نے کی۔ تیسری برابر تھی۔ یہ بھی ہم دیوبندیوں کی مشقت ہی تھی۔ منشی چشک ملی چاہتے تھے کہ چاہے بے سحری کا روزہ رکھنا پڑے مگر دلی والوں پر مات چڑھائے بغیر اٹھانہ جائے۔ مگر میں پیشاب کے بہانے اٹھ کر بھاگ آیا اور معلوم نہیں منشی صاحب نے سحری کھائی یا غم کھا کھائے پیٹ بھرا۔ انھیں اپنی شطرنج یہ ہمیشہ ناز رہا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ انھیں باہر کا کھلاڑی ہر جائے۔ اگلے روز انھوں نے عصری کے وقت مجھے بازار میں پکڑ لیا۔

”آج یا رذر اجلی آجاؤ“ ان کی آواز میں بے حد سوز تھا۔ قسم قرآن کی دلی والوں کو نہ ہر یا تو لعنت ہے ہماری زندگی پر۔“

”مگر قبلہ یہ رمضان ہے۔ عبادت کا مہینہ۔۔۔۔۔“
”بس آگئے دبا بیت پر۔۔۔۔۔ نہ نہ بحث مت شروع کرو۔ امام شافعی کے یہاں تو شطرنج جائز ہے۔“

”مگر آپ تو حنفی ہیں؟“

”ہونے دو۔ ضرورت کے وقت دوسرا اماموں

آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نالائق ترادخ کے بعد کیوں نہ نقد بھر کے بیٹھ گئے اور مضمون کا پاپ کاٹا۔ مگر یہ بھی آپ کو برے کہ اب کی پہلے روز سے ہی منشی چشک علی کے یہاں شطرنج کا اکھاڑہ جم رہا تھا۔ یہ تو خبر نہیں کہ اہل دل روزہ فطارتے ہی ڈٹ جاتے تھے یا ترادخ پڑھ کر طبل جنگ جتا تھا۔ میں بہر حال ترادخ سے فارغ ہو کر کب بھی پہنچا ہوں بازار گھر میاں ہے۔ اور صوفی طبریز خواجہ شبن، مرزا سکین اور اچھن میاں۔ ویدر و نظر آتے ہیں۔ پھر کچھ دیر ب دوچار شوقین اور بھی آجاتے اور وہ کھسان کارن لے تاکہ الامان والحفیظ۔

پہلا ہی روزہ تھا اور دوسری ترادخ پڑھ کر میں سوخ رہا تھا کہ کاغذ قلم سے سر مارنے بیٹھ جاؤں گا۔ اچانک بیاں اچھن مسی کے دروازے ہی پر مل گئے۔

”چچا میاں آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ دیاں دن پر دن رہا ہے اور آپ یہاں ترادخ پڑھ رہے ہیں۔“

”اے پاگل ہوا ہے۔ کہاں دن پڑ رہا ہے۔“
”اجی وہیں منشی چشک صاحب کے یہاں۔ دلی کے درستم کھلاڑی آئے ہوئے ہیں۔ منشی صاحب کو دو نہیں پلا دی ہیں۔“

”تو کیا روزہ کھولنے ہی بیٹھ گئے تھے؟“
”جی ہاں۔ دلی والے کل پرسوں چلے جائیں گے۔“
ن کی خاطر۔۔۔۔۔

بس بس سن لیا۔ جاؤ کہہ دینا چچا رمضان میں شطرنج نہیں کھیلتا۔“

”ہائے چچا جان الا قسم ناک کٹ جائے گی۔ دلی والے مذاق اڑا رہے ہیں کہ دیوبند میں شطرنج کوئی نہیں جانتا۔ اجہ شبن صاحب نے کہا تھا کہ چچا کو لئے بغیر مت آنا۔“
”ارے بھاگ۔ مجھے ضروری کام ہے۔۔۔۔۔ نہ نہ سن جاؤ۔“

وہ اپنا سامنہ لئے واپس ہو گیا۔ لیکن ابھی میں نے اونٹیکے سے ٹیک لگا کے حقے کی نے منہ سے لگائی ہی تھی

جیسا کہ لیتے ہیں۔ آخر دوستِ امام بھی تو اللہ والے تھے۔“

میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ صوفی طرز بھی آٹھواں ہے۔
”اغاہ آپ حضرات ہیں“ انھوں نے بڑے تپاک
کہا ”ملا صاحب والہدات تو آپ کے کمال کر دیا،
گھوڑوں سے مات دے گئے۔“

”آہستہ۔ جناب یہ بازار ہے۔“ میں سرگوشی
انماز میں کہادہ کچھ خفیف سے ہو گئے۔

”خیر خیر انشاء اللہ رات کی ملاقات ہوگی“ یہ کہہ کر
کھن علوانی کی دکان پر چڑھ گئے۔

”تو کے بچے یہوش رخ رہے ہو؟ منشی صاحب نے پوچھا۔
”بس تراوتح کے بعد۔“

”اماں کیا ایک دروازہ تراوتح ملتوی نہیں کر سکتے
دو تھ نوروز کی ہے دلی والے کل چلے جائیں گے۔“

”جبوری ہے منشی صاحب۔ میری بیوی اپنا ایک
لہ زاد کو میرے پیچھے لگائے رکھتی ہے۔“

”ہٹاؤ یار تم بھی جو روکے غلام ہی رہے۔
کوئی بات ہے۔ خیر جامع مسجد میں جو پڑھ لینا

اُدھ گھنٹہ پہلے تم ہو جاتی ہے۔“
”یہ بھی ناممکن ہے بیگم کا اردو دے رہے کہ حملہ کی مسجد

علاوہ کہیں نہیں پڑھ سکتے۔“
کیا حماقت ہے۔ یار تمہاری بیوی ہے یا مانی

ن۔ لا حول ولا قوۃ۔“
”یہی آفت ہے منشی صاحب۔ شادی کیا کی

لی کا پاؤں گزرن پر رکھ لیا۔ آپ نکرینہ کیجئے ساڑھے
نک پہونچ جاؤں گا۔“

پھر ایسا ہی کرنا پڑا۔ اچھن میاں آج بھی مسجد
دروازے ہی پر پہرہ دے رہے تھے۔ میں جھٹلا گیا۔

”کیا مصیبت ہے۔ ارے تم چلو میں چلے پی
آ رہا ہوں۔“

”چچا جان چلے تو وہاں بھی تیار ہے۔ افطاری

بھی بہت سی آپ کے لئے سچی رکھی ہے۔“

”اے چچا کے بھتیجے تو کیوں میری بیان کا لاگو ہوا
چاکہ بننا نہیں آتے۔“

”اَلَا قسم چچا جان دیر نہ کیجئے۔ منشی صاحب کا زرب
پٹ گیا ہے۔“

”میں تیرے کان گدی میں لگا دوں گا۔ بھاگ
یہاں سے۔“

دہ منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ مگر کیا حاصل کچھ دیر
بعد خواجہ شبن چڑھ آئے بیگم ان کی آواز سن کے چونکیں

پھر دبی آواز میں مجھ سے گویا ہوئیں :-
”کیا قصہ ہے۔ کل بھی یہ نہیں لے گئے تھے؟“

”ہاں ارے بڑی مصیبت ہے۔ وہ شیخ
دلاور کا بڑا لڑکا ہے نا اسے چڑھ گئی ہے کہ دوسری دی

کر دوں گا۔ اسی قصبے میں سمجھانے بھلانے کی خاطر مجھے کھینچا
جا رہا ہے۔“

بیگم نے ناخوش گوار نظروں سے مجھے گھورا۔
”رمضان میں تو شیخ بول لیا کیجئے۔“

”ہائیں تو کیا میں جھوٹ بولی رہا ہوں۔“
”میری بلا سے۔ جائیے وہ انتظار کر رہے ہیں۔“

میں باہر آیا۔ خواجہ شبن پھٹ پڑنے والے تھے کہ
ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کما نہیں چپ کیا اور دروازے

سے ہٹا کر سڑک پر لایا۔
”یار پٹاؤ گے تم۔ میں تو خود ہی آ رہا تھا۔“

”میرا کھینکا آ رہے تھے۔ اماں کیا ایسی کر یا رانہ
کہتے ہیں۔ منشی جی دومات کھائے بیٹھے ہیں اور تم یہاں بیوی

کی دم سے بندھے دوستی کا نام بدنام کر رہے ہو۔“
”چلو بااچلو۔ میں آج خود بھی ایک درجن ماتین

کھاؤں گا جب تم لوگوں کو عین آئے گا۔“
”کھا کے تو دیکھو۔ چھراتار دوں گا تمہارے پیٹ میں

یار دلی والے اگر حبت کے چلے گئے تو ہم کس کی ماں کو
ماں کہیں گے۔“

”جی ہاں دارنٹ۔ ایڈیٹر تجلی کو جانتے ہیں آپ
آنریری مجسٹریٹ ہے پکا“

”استغفر اللہ۔ میں تو ذہری گیا تھا۔ اماں ہٹا
رمضان میں کہیں فالنگ کا مہوٹے ہیں۔“

”آپنے مسجد سے بیچنے تک پڑھ لے سبھی؟“

”کہاں فرصت ملتی ہے۔ ایک دفعہ پڑھا تھا
الٹا سیدھا معلوم نہیں کیا لکھتے ہو۔“

”سچا ہے۔ مگر تنخواہ اسی کی ملتی ہے۔“

”کیوں جھوٹ پڑھتے ہو۔ ہم نے تو ایک دفعہ
اپنا مضمون رسالہ طوفانِ ادب کو بھیجا تھا اس نے

مفت بھی نہیں چھاپا۔“

”بد ذوق ہوگا اس کا ایڈیٹر ختم کیجئے میں آؤ
نہ آسکوں گا۔“

”کیسے نہیں آسکو گے۔ خواجہ شبن کہہ رہے تھے
اگر ملانے پھر مجھ کی تو چھ ماہ اردوں گا۔“

”مار لینے دو میں فوراً اپنے شعر پڑھ دوں گا۔
نظر لگے نہ کہیں ان کے دستِ بازو کو

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
”اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ جگر میں نہیں سینے میں

ماریں گے۔“

”میرا جگر سینے ہی میں تشریف فرما ہے بھی تو دلو
دلوں کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں۔“

”قسم قرآن کی اچھا نہیں ہوگا اگر تم نے پیٹھ دکھائی
ہاں نہیں تو۔“

”نزداد تک کے بعد خواجہ شبن مسجد کے دروازے ہی
پر مل گئے۔ موڈ بڑا سخت تھا۔“

”بہت فضول آدمی ہو تم ملا۔ کیا ستلے میں مرا
آتا ہے۔“

”بھائی صاحب ستانا نہیں میری آفت آئی ہوئی
ہے۔ دن میں روزہ نہیں لکھنے دیتا۔ رات میں شطرنج

سے چھٹی نہیں۔ بتاؤ تجلی کا پیٹ کیسے بھروسے
دارنٹ“

”میری بیوی کو کہہ لیا کرنا مجھے کوئی اعتراض ہوگا۔
آج بھی سحری تک جماؤ رہا۔ دلی دالے شاید بیک

کی چربی کھلے آئے تھے۔ ایک ہی بازی میں تین بج
گئے اور نتیجہ پھر بھی صفر رہا۔ بازی چوتھی اٹھ گئی۔

لیکن معلوم ہوا دلی دالے ابھی جا نہیں رہے ہیں
عین تک جمیں گے۔ اب تو ظاہر ہے میرے لئے کلو خلاصی کی

کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ ہاجرت روزہ ہی ہوتی مگر انھی
کا پتہ بھاری رہتا۔ کیونکہ میرے پیچھے سے قبل ہی باران

طریقت دتین ماتیں کھا چکے ہوتے۔ بڑی شکل سوس
روزے کو گیارہویں بروز پنج پڑھ کر میں نے اسکو پورا

کیا اور دو ماتیں چٹھڑھا دیں۔ اب میں مطمئن تھا کہ
کم سے کم کل جان بچی رہے گی اور تجلی کا پاپ کاٹ

سکوں گا۔ مگر سنا رہی گزشتہ میں ہو تو کون کیا کر سکتا
ہے۔ گیارہویں روزے کی شام کو منشی چشمک ملے

اور بے اختیار لیٹ گئے۔

”جگ جگ جیو ملا۔ تمہارے دم سے عزت ہو گئی
بھئی کیا چالیں چلتے ہو قسم قرآن کی۔“

”شکر یہ۔ مگر قبلہ آج سے میں رخصت چاہتا
ہوں۔“

”ارے وا۔۔۔ خبر بھی ہے دلی دالے آج صوفی
رمضان کو لا رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟ صوفی رمضان تو کبھی کالنگوٹ
کھول چکے۔“

”کھول تو چکے مگر وہ ان دلی والوں کے رشتہ دار
ہیں ان کے اصرار پر پھر میدان میں اتار رہے ہیں۔“

”اتارنے دو۔ آپ سب لوگ بیٹے رہئے گا۔“

”کیا باتیں کرتے ہو۔ ان سے تمہارے سوا
کون لڑے گا۔“

”میرا تو دارنٹ کل چکا ہے منشی صاحب سچا ہی
روزہ کنڈی کھٹکتا ہے۔“

”دارنٹ“ وہ چونک کے ایک قدم پیچھے ہٹے۔

ہی جیتیں گے؟“

ان کے مایوس چہرہ پر امی کی لہر دوڑ گئی۔
”کیا تمہیں تو فتح ہے مات نکال لیے؟“
”تو فتح کس چیز کا نام ہے سو فیصدی مات
نکالوں گا بس اس کا لحاظ رکھئے کہ اگر میرے اور صوفی
رمضان کے درمیان کچھ تیز گفتگو آجائے تو آپ لوگ
داخل نہ دیجئے گا۔“

”کیوں یعنی کیا مطلب؟“

”مطلب کچھ بھی نہیں بس کہہ دیا۔“

”ارے تو کیا جھگڑا کر دے گے؟“ منشی جی خوفزدہ
آواز میں بولے۔

”ایک خاص حد تک — ہاتھ پائی کی توبت
نہیں آئے گی۔“

”اس سے کیا فائدہ؟“

”آپ کو جتنے سے مطلب ہے۔ بس دیکھ لیجئے گا۔“
دراصل صوفی رمضان کی کمزوری میں نے رات ہی
بھانپ لی تھی۔ معمولی سی جھلاہٹ میں وہ بہک گئے
تھے۔ رات آئی۔ بازی جی۔ اتفاق یہ تھا کہ وہ دونوں
دلی والے آج کہیں اٹک گئے تھے۔ شاید انھیں یقین تھا
کہ صوفی صاحب اکیلے ہی سب کی کھال کھینچ لیں گے۔
اول تو میں نے سنجیدگی سے کوشش کی کہ انھیں مات
دیدوں لیکن ہار گیا۔ پھر مجبوراً استاد رحمۃ اللہ علیہ کی
پالیسی پر عمل پیرا ہونا پڑا۔

دوسری بازی میں انھوں نے فرس چلا تو میں نے
کھٹ سے گھوڑا اٹھا کے چوتھے گھر پہ اسے مار دیا۔ وہ
گھیرا کر بولے :-

”ارے ارے کیا کرتے ہو۔ ریگھوڑا ہے فیل نہیں“

”واہ صاحب گھوڑا کہاں ہے فیل ہے۔“

”ارے وا۔ دیکھئے نا گھوڑا ہے۔ فیل تو وہ دونوں
آپ کے رکھے ہیں۔“

”اوہ ہاں میں سمجھا فیل ہے۔ لا حول لا قوۃ۔“

”جو لھے میں ڈالو محلی کو۔ اماں کیا رمضان روزہ
آتا ہے۔ چلو صوفی رمضان کب کے آئے بیٹھے ہیں۔“
”تو تم بگ نبڑنا۔“

”اک لمٹیں۔ سات بجے سے اب تک فقط دو
ڈھانٹھنے میں انھوں نے پانچ ماتیں ملا دی ہیں —
صوفی طبریز کو یہی بی بی دی۔ منشی جی کو ہرہ بڑھاکے کھلایا
اور مات دیدی۔ اماں غضب کی چالیں چلتے ہیں۔“
”میں کیا کر لوں گا۔ میری عزت بھی خاک میں ملوئے۔“
”دیکھا جائے گا۔ جب یاروں کی نہیں تو تمہاری
بھی نہیں۔“

فہر درویش بجان درویش جانا پڑا۔ صوفی رمضان
صبح بڑے ہانکے کھلاڑی تھے۔ انگریز کے زمانے میں
ایک ریاست سے شطرنج ہی کی خواہہ لیتے رہے ہیں
دور دور شہرہ تھا۔ سحری تک دو بازی اٹھیلیں۔ ایک
برابر اٹھی ایک وہ جیت گئے۔ برابر بھی اتفاقاً ہی اٹھی
انھیں ایک بات پر جھلاہٹ اٹھی اور اٹ پٹانگ
چال چل گئے ورنہ جیت دہی رہے تھے۔

انگلہ روز دہرہ میں منشی چشمک علی نے مجھے گھر بلا لیا۔
وہاں غلام جنتین اور صوفی طبریز بھی تھے۔ تینوں کے چہرے
لٹکے ہوئے تھے اور سوچ بچار اس بات پر ہو رہی تھی کہ جب
آخری ہسرہ — ملا بھی پٹ گیا تو اب کیا ہوگا۔
صوفی طبریز کہنے لگے :-

”میں نے تو آج کمر خ شاہ کے مزار پر چلیبیوں کی تھا
بھجوائی ہے۔“

خواجه شہن بولے — ”میں نے بھی بقائی درگاہ
میں چادر بچھوادی ہے۔ حلقے کا بھی انتظام کرایا ہے۔“
”مجھے کس لئے یاد فرمایا گیا ہے؟“ میں نے کتا
ہوئے لہجے میں پوچھا :-

”تمہی بتا دیا گیا جائے۔ صوفی رمضان کی جیت
دراصل دلی والوں کی جیت ہے۔“

”اجی ہٹائیے کبھی کیا آپ نے سمجھا ہے وہ روزہ

درد اٹھتے اٹھتے رہ گئے۔ بازی آگے بڑھی۔ لیکن نیتے ہوئے دماغ کی گرمی ان کے بس سے باہر تھی۔ جھلا جھلا کے چالیں چلتے رہے اور آپ ہی اپنے گہ دجال بن لیا۔ نتیجہ یہ کہ مار گئے۔ اب تو بارہ اور بھی چڑھا۔ نو بانی جملنے ہوئے کڑے لہجے میں فرمایا:-

”اگر اب کی آپ نے میاں ملا ایسی کوئی حرکت کر تو فوراً مات مان لی جلتے گی۔“

”یہ تو زیادتی ہے صوفی صاحب“ منشی چشمک لجاجت سے بولے ”اما صاحب نے تو اپنا قصور مان نکھا۔ بھول چوک تو خدا ابھی معاف کرتا ہے۔“

”کرتا ہمارا معاف۔ یہ کوئی نمائش ہے کہ فیملے گھوڑا اور گھوڑے کا فیلا۔“

”نہیں نہیں صاحب۔“ میں نے کہا ”اب یہ آنکھیں مل مل کے دیکھوں گا۔ مگر ذرا آپ بھی دیکھ بھال کے چلتے گا۔“

”کیوں میں نے کوئی چال بے دیکھے بھالے چلو دے غرائے۔“

”یہ مطلب نہیں۔ عرض یہ کہ ناچا ہوتا تھا کہ آپ اونچے کھلاڑی ہیں۔ بعض چالیں آپ کے شبانہ نہیں ہوتیں۔“

”غیر خیر آپ کھیلے۔“ وہ پزیری سے بولے، اس طرح چہرہ چلا جیسے وہیٹ مار رہے ہوں۔ ابھی ہی چاہتا تھا۔ پچھلی مات اتارنے کے لئے وہ اور بھی طرارے میں بھر گئے تھے۔ یہی انھیں چارو خانے چت گرانے کا موجب ہوا۔

دوسری مات کھا کر ان کے بڑے چہرے بڑے ہی دردناک احساسات جھلکنے لگے۔ اب ڈھنج رہے تھے۔ وہ نمیری کے لئے چہرے جمانے۔

”اب اجازت چاہوں گا صوفی صاحب سحری کا وقت ہونے والا ہے۔“

”اجی ایک اور ہو جائے۔“ صوفی صاحب

پھر چنچالوں کے بعد میں نے فیل سے دھماکی گھر پر ان کا رخ اڑا دیا۔ اب کی وہ بھٹا گئے۔

”عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ اب کی فیل کہ گھوڑا بنا رہے ہیں۔“

”کیا... فیل کیسا۔ فیل تو وہ رکھا ہے۔“ میں نے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

”تو یہ تو بہ۔ آپ کی نظر موٹی ہے کیا۔“ رخ رکھ دیجئے۔“

”کیوں رکھ دوں صاحب۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اب کی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”استغفر اللہ۔“ اجی جناب آپ حشمہ تالکے دیکھئے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔“

ان کی آواز سنگ رہی تھی۔ میں نے بڑے اطمینان سے حشمہ تارا اور فیل کہ اس انداز سے دیکھا جیسے درمیں لگا رکھی ہو۔

”مجھے تو اب بھی یہ گھوڑا ہی نظر آ رہا ہے۔۔۔۔۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ انھوں نے ”حول“ کے لام کو جھڑکی کے انداز میں ادا کیا اور دیگر حاضرین کی طرف ہیکل بھر کے ”دیکھ رہے ہیں آپ لوگ انھیں ہردن تنگ کی پہچان نہیں۔“

”معاف سمجئے گا صوفی صاحب“ میں نے بڑی نرمی سے کہا ”معلوم ہوتا ہے بقا ضلئے عمر آپ کی بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ غور سے دیکھ لیجئے یہ گھوڑا ہی ہے۔“

اب تو وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ انہیں لگا تھا کہ بساط بیخ کر بھاگ کھڑے ہوں لیکن میں کھٹ سے ان کا رخ اسی خانے میں رکھ دیا جس میں بیٹا تھا اور فیل کو اسی جگہ رکھتے ہوئے ندامت کے ساتھ عرض کیا

”معافی چاہوں گا صوفی صاحب مجھ سے ہی واقعی چوک ہو گئی۔ یہ کبخت فیل اور گھوڑے ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ قصور ان گھوڑوں کا ہے جو ہرے بنانے وقت فیل کی سونڈ نظر انداز کر جاتے ہیں۔“

ہزار کیا ” ابھی تو کافی وقت ہے۔“

”جیسے حضرت مجھے سحری کھانی ہی نہیں پکائی تھی ہے۔ بیوی آجکل مکمل ترک موالات کے مڑ میں ہے۔“
ہائے جھاری کپڑی مایوسی بھرتی ہے، جب جیتنے لاجیبیں پڑ کر کے نو دو گیارہ ہونے لگے صوفی صاحب لبس نہیں چلا دور نہ میری ٹانگ پکڑ کے کھیلنے پر مجبور کرتے ” اچھا تو پھر کل رہے گی“ انھوں نے فیصلہ کن راز میں فرمایا۔

”جی ہاں ضرور رہے گی“ منشی چشمک چپکے۔
”نہیں، جناب میں کل نہ آسکیں گا بی ضروری ام اٹکے پڑے ہیں۔“

”یہ تو کوئی شریفانہ طریقہ نہ ہوا“ صوفی صاحب بھی کے ساتھ بولے ”بارجیت کا فیصلہ تین دن سے میں نہیں ہوا کرتا۔“

”بار تو آپ کی ہر چکی صوفی صاحب۔ میں کل سے برٹ کھول رہا ہوں۔“

”کیا دواہیات ہے۔“ وہ بھٹکائے ”آپ نے کبھی ریفوں میں شطرنج کھیلی ہے؟“

”شریف تو میرے سائے سے بھاگتے ہیں صوفی صاحب۔ زندگی میں صرف ایک بار شریف آدمی نے رہے ساتھ بازی لڑائی تھی وہی آج نلت پھٹا رہا ہے۔“

”ک کیا مطلب؟ یعنی کہ آپ یعنی کہ...“
صوفی صاحب فرط غضب میں اپنا مافی الضمیر اندک کر کے منشی چشمک علی کی رگ اخلاق پھر ٹک بی۔ خواجہ شہین کو بھی صوفی صاحب پر ترس آگیا۔
”نوں ہی نے مجھے مجبور کیا کہ کل پھر لڑے گی۔ بادل ناخواستہ ہانے مان لیا۔“

”گلہ دن نیا شکر ذہ کھلا۔ میں اور خواجہ شہین ہائیں کرتے ہر سے گزر رہے تھے کہ دو توں دلی دالے بھوانی جلائی دوکان پر نظر آئے۔ انھوں نے سیر کھر گرم جلیبیاں ہیں

ادراک بڑے سے بھگوتے میں رکھ کر چٹان پورے کی طرف روانہ ہو گئے۔

”دیکھا آپ نے۔“ میں نے خواجہ شہین سے کہا۔
”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں آج ان لوگوں کا روزہ نہیں ہے۔“

”نہ پڑ گا۔ آخر مسافر ہیں نا۔“

”کیسے مسافر۔ یہ تو عبت تک کے قیام کا ارادہ کر چکے ہیں۔ پھر صوفی رمضان بھی مسافر ہیں کیا؟“

”تو ان کے بارے میں کیا معلوم؟“

”ان جلیبیوں میں یقیناً ان کا بھی حصہ ہے۔ یقین نہ آئے تو چلے تحقیق کر میں گے۔“

”مگر روزہ تو ہونے سے جلیبیوں کا کیا تعلق ہے۔ یعنی کہ جلیبیاں ہی بیکریں اور کچھ“

”آپ نہیں جانتے یہ اساتذہ فن کا خاص نسخہ ہے دماغ کے لئے جلیبیوں کے شیرے سے بڑھ کر کوئی ٹانگ نہیں چلے چلیں۔“

ہم صوفی رمضان کے گھر پہنچے۔ غور طلب یہ تھا کہ پرموت کنہہ حال کیونکر معلوم ہو۔ اتنے میں ایک چھٹا سال کا بچہ گیند اچھالتا ہوا گھر سے برآمد ہوا۔ میں نے اس کی گیند اچک لی۔ وہ جھٹ سے پھینکنے لے آگے بڑھا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا گیا۔ چپ در دانے سے اتنا فاصلہ ہو گیا کہ بول چال کی آواز گھر میں جانے کا خطرہ نہ رہا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیر سے پوچھا۔

”تمہارا کیا نام ہے بیٹا؟“

”پیو..... لاڈ ہماری گیند۔“

”ہاں ہاں گیند دیں گے۔ مگر پہلے یہ بتاؤ تمہارے دادے کیا کر رہے ہیں؟“

”حقہ پی رہے ہیں۔ لاڈ ہماری گیند۔“

”شناپاش۔ لویہ گیند۔“ مگر ہاں وہ جو د آدمی تمہارے گھر ابھی ابھی آئے ہوں گے کیا وہ بھی حقہ پیتے ہیں؟“

انہوں نے چونک کر نظر اڑا دیا۔ میں نے آنکھ پھڑ پھڑائی۔ وہ پل بھر گھومتے رہے۔ پھر جھجھکے بولے۔
”اجی ہو گا کچھ، چال چلے۔“

”واہ صاحب — یہاں تو آنکھ کھٹک رہی ہے
آپ کہتے ہیں چال چلے — منشی صاحب ذرا آپ دیکھئے گا
آنکھ کچھ نظر آ رہے کیا؟“

منشی صاحب جھجکے۔ پھر باری باری اور بھی لوگ
سعی لاجا حاصل کرتے رہے۔ وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔
میں کراہتا رہا۔ آخر کار ترخ کے بولا۔

”آپ سرب کی نگاہ موٹی ہے۔ منشی صاحب ذرا
آئینہ لائیں، میں خود دیکھ لوں گا۔“
”آئینہ یار آئینہ تو گھر میں نہ جانے کہاں
پڑا ہو گا۔ دیکھئے میں کوشش“

”اچھا بھئیے — کام یوں بھی چل جائے گا۔“
یہ کہہ کر میں بجلی کا لمپ اٹھا کر صوفی صاحب کی
چندیا کے برابر لایا اور دوسرے رہا تھکی انگلیوں سے
آنکھ کو پھیلا کر چندیا پر گردن جھکا دی۔ پل بھر کو سب
متحیر سے رہے مگر حجب صاف ظاہر ہو گیا کہ صوفی صاحب
کی چٹکتی ہوئی چندیا بطور آئینے کے استعمال ہو رہی ہے
تو فہم نہیں اور دہارڈوں کا طوقان اٹھ گیا۔ فہم خراجہ
شبن اور منشی چشمک وغیرہ کے تھے اور دہارڈوں ظاہر
ہے صوفی صاحب اور دلی والوں کی رہی ہوں گی۔
”بڑے نامعقول ہیں آپ میاں ملائے۔ یہ صوفی
صاحب کی لکڑا تھی۔“

”واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہوئی“ یہ دلی والے
بولے تھے۔

”ارے کیا ہوا؟“ میں نے حیرت کا مظاہر
کیا ”کس بات پر شور مچا رہے ہیں آپ لوگ — یہ
دیکھئے —“ میں نے چشم کی میں یکدم ہوا بھٹکا صوفی صاحب
کی طرف بڑھانے ہوئے کہا ”آنکھ سے داغ میں چڑھا
جا رہا تھا بدماش —“

”وہ تو بڑی پی رہے ہیں۔ لاؤ ہماری گیند۔“
گیند دیکر ہم لوگ لوٹ آئے۔ خواجہ شبن منہ
بھاڑ کے بولے۔

”اماں کمال ہے یہ صوفی بدماش روزہ بھی نہیں
رکھتا۔“

”رکھتا ہے — ضرور رکھتا ہو گا — مگر آج
دہ تیار کر رہے ہیں۔“

”تیار کی کی البتہ تیری۔ تیار کی کا کیا مطلب؟“
”یہ مطلب کہ آج وہ جلیبیاں کھا میں گے۔ خمیرہ
مردار یہ کھا میں گے۔ دو بار غسل کریں گے۔ نصف گھنٹہ
چت لیٹ کر دھنیے کا آدھ یا ذیل کھیا میں گے۔“

”دھت تیری کی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔“
”بیشا ہی نسخہ ہے شبن صاحب۔ کھو بڑی میں
ہنڈے چلنے لگتے ہیں۔“

”اماں تم بھی کر دنا تیار۔ قسم خدا کی رات تو
کمال کر دیا تم نے، کیا سچ گھوڑے فیملے میں دھوکا
لگا تھا؟“

”وہ تو آج بھی لگے گا شبن صاحب مگر آج باد
اور فرزند کی باری ہے۔“

”ارے کیا بات؟“ ان کی آنکھیں پھیل
گئیں۔

”سنائے! — آدمی سناروں کی چال سے
نبو ہے شبن صاحب!“

”رات کو حسب معمول پھر کھاڑہ جما۔ صوفی رمضان
کی بے آب دگیاہ چندیا آج کن کن کی طرح دمک رہی تھی
صاف مزید رکھ کے جب وہ فرش پہ بیٹھے ہیں تو کمرہ روغن
دھنیہ کی لہک سے تھکتا چلا گیا۔“

کھیل کے دوران میں نے اچانک ایک آنکھ ہاتھ سے
مٹے ہوئے کہا:-

”افیہ معلوم ہوتا ہے آنکھ میں کچھ پڑ گیا
ہے ذرا دیکھئے گا صوفی صاحب!“

پھر کچھ دیر تو میں میں کے بی کھیل چالو ہوا تو صوفی صاحب باوجود سچی نعل کے آپ سے باہر پڑ چکے تھے۔ نتیجہ دہی ہوا ہائے اور بری طرح مارے۔

اب کہاں تک یہ رزم نامہ دہراؤں۔ مختصر یہ کہ ساری راتیں تو کاٹھ کی فوجیں لڑنے میں صرف ہو چکی تھیں اب کل تک دائری لکھ کر دینی تھی۔ عام حالات میں ایڈیٹر تھلی فقط ڈانٹ پھٹکا رنگ ہی رہ جائیں تو وہ جائیں لیکن خاص حالات میں وہ واقعتاً بری طرح پیش آتے ہیں، دود فصر اس کا تلخ تجربہ کر چکا ہوں جس کی تفصیل کسی اور موقع پر عرض کروں گا۔ فی الحال تو میری بار کے تجربے سے بچنے کی فکر تھی۔ رات کو حقہ بھر دے بیٹھا تنے میں بیٹھ شمشاد کا ٹوکہ آدھ رکھا۔

”سیٹھ جی نے آپ کو یاد کیا ہے“

”بہت اچھا کیا ہے۔ کہنا وہ بھی آپ کو یاد کرنا ہے۔ فقط والسلام۔“

”جی۔۔۔ جی وہ تو اسی وقت یاد کر رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں کہہ رہا تھا آپ کو اسی وقت یاد کر رہا ہے۔“

”ارے صاحب انھوں نے کہا تھا ساتھ لکھا آنا۔“

”کیا مصیبت ہے۔ دیکھ فتن۔ کہہ بنا ملا صاحب سہا رت پور گئے ہوئے ہیں، کل آئیں گے تو مل لیں گے۔۔۔ مگر۔۔۔ ستیا ناس۔ ارے یہ رت کہہ بنا کہ کل مل لیں گے۔ دیں کہنا کہ ان کے گھر پہ کہہ آیا ہوں کہ آئیں تو سیٹھ صاحب سے مل لیں۔“

”مگر وہاں تو سیٹھ جی کے جہان بھی آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ شعر پڑھ جا رہے ہیں۔“

”اُف تو یہ۔۔۔۔۔ ارے مائی ڈیر کہنا وہ گھر پہ ملے نہیں۔ کان کھول کے سن لو میاں فتن! مجھے آج بے حد ضروری کام ہے۔ مگر یہ بھی مناسب نہیں کہ سیٹھ صاحب کی بات ٹھکراتی جائے۔ بس یہی کہنا کہ ملے نہیں۔۔۔ اگر

نہ کہا تو میں بہت برا آدمی ہوں۔“

دہ بچا را ہنگا دکارہ گیا۔

”اچھا صاحب میں آپ کی سب باتیں دہرا دوں گا۔“

”یا خا یا۔۔۔۔۔ ارے دہرانے کے بچے۔۔۔۔۔ باتیں سنت دہرانا۔ بس یہ کہہ دینا کہ ملے نہیں۔“

دہ ہاتھوں کو اس طرح التنا پلٹتا چلا گیا جیسے میری سیدھی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہو۔

ایک گھنٹہ میں اسی الجھن میں رہا کہ جانے وہ گرھا کیا جائے گا۔ پھر بمشکل موڈ درست کیا اور لکھنے بیٹھا

سحری تک محض چن سطر میں لکھی گئیں۔ میری ذہنی حالت اس بچے سے مختلف نہیں تھی جو اسکول ایک دن غیر حاضر رہ کر ذہنی طور پر تین دن غیر حاضر رہتا ہے۔

”میں کل پر دیں جا رہا ہوں یکم“ سحری کھاتے ہوئے میں نے بعد حسرت دیا س کہا ”اگر صرف پانچ سطر میں لکھی گئی ہیں۔“

”دن میں ایک دو صفحہ اور لکھ کر کاغذ کے حوالہ کر دیجئے گا پھر رات کو لکھنے گا۔“

”مشکل ہے۔ کاش کسی امام نے شطرنج کی طرح ایک آدھ روزہ صاف کرنے کا بھی جواز رکھا ہوتا

یہ امام بڑے ہی خشک ہوتے ہیں۔“

صبح ہی فجر حسب معمول سو گیا اور بارہ بجے اٹھ کر ارادہ کیا کہ قلم چلاؤں۔ مگر غدا گواہ ہے بارہ بجے سے ایک بجے تک ذہن ہی فیصلہ نہ کر سکا کہ جیب کے دونوں قلموں میں سے کونسا قلم نکالوں۔ پھر فیصلے کے بغیر ہی اکتا کر جیب پہ ہاتھ ڈالا تو دونوں ہی قلم سوکھے پڑے تھے۔ دادا تو ڈھونڈی معلوم ہوا صبح

دونوں صاحبزادیوں نے ایک چڑیا بیکڑی تھی اس کے پر پر رنگے میں ساری روشنائی کام آچکی ہے۔ اپنا قلم بیگم نے پیش کیا مگر مردانہ ہاتھوں میں کہیں نہ ملنے قلم چلتے ہیں۔ بہت کوشش کی مگر دو چار نہایت تھوڑا سا

فقروں کے ساتھ کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ اتنے میں ظہر کی اذان ہو گئی۔

سطریں بھی تھیں انھیں کپڑوں مکوڑوں میں تبدیل کر دیا ہے۔

”یہ بھی ایک آرٹ ہے سلیم۔ اور اب تم میرا ہولڈر دل باندھ دو۔ رمضان میں افطار سے نصف گھنٹہ قبل سفر کرنا بھی آرٹ کی نہایت اعلیٰ قسم ہے۔ اور اے ناظرین تجلی! اب یہ آفت زدہ ملا عین رمضان میں پردیس کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ لوٹنا نصیب ہو گیا اور اب یہ سیر تجلی نے زندہ بھی چھوڑ دیا تو خیر آتنہ قلمی ملاقات ہو جائے گی ورنہ بغلیں بجا بچلے گانے پھرے گا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
(ملا زندہ صحبت باقی)

نماز سے فارغ ہو کر بازار سے دادات لایا اور زمین سے اپنی ٹمک ڈٹ کے لکھا۔ جی ہاں ڈٹ کے۔ مگر کیا لکھا اس کا اندازہ اس سے سمجھ کر عصر کی اذان پر جب تک غم غم ہوتی ہوئی میرے قریب آئیں کہ ماشاء اللہ دو گھنٹے میں کافی لکھ لیا ہر گاتہ میں بیٹھے ہی بیٹھے کوہ قاف کی نیلم پری سے جادو کے طرے کی کہانی سن رہا تھا۔

”ارے آپ تو سو رہے ہیں۔۔۔۔۔“
میں نے بڑبڑاکے آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے سامنے رکھے ہوئے صفحے پر نظر س ڈال کر برا سا منہ بنایا۔
”تو یہ۔۔۔۔۔ یہ تو کئی پچھٹی سطریں ہیں۔ لکھا ہوا کہاں ہے؟“

”لکھا ہوا۔۔۔۔۔ بس یہی لکھا ہے۔۔۔۔۔“
”یہ لکھا ہے؟۔۔۔۔۔ یوں کہنے رات جو پانچ

خرید احضرات خطوط میں اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں تاکہ ان کی ہدایات و فرمائشات پر فوری توجہ دی جا سکے۔ منیجر تجلی

پھول کی طرح تروتازہ

اگر صلی امراض یا فساد خون کی
مسکیت ہو تو چہرہ پر مرنہ نظر آتا ہے

خون صفا

پھوٹے پھنسی غارش اور داد سے نجات دے
کو جسم اوچھلے کو پھول کی طرح تروتازہ رکھنا ہے

دواخانہ طبی کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ




بادۂ عرفان ○ قرآن پر نظم ○ انکشاف



بادۂ عرفان

حمید و نعت وغیرہ مشتمل حقیقہ بنارس کا مجموعہ
کلام ○ طباعت کتبہ اور کاغذ سب سے بہتر
صفحات ۹۷ - قیمت مجلد پانچ روپے - ملنے کا پتہ:
پروفیسر حقیقہ بنارس سی۔ ملکی محلہ - آ رہ۔

حقیقہ بنارس بہت شہرت یافتہ نہیں تو بالکل گناہ بھی
نہیں۔ ان کی غزلوں اور نطریوں کے مجموعے ”دس خشتاں“
پر بہار اردو اکبیری انعام دے چکی ہے۔
پیش نظر مجموعے پر مولانا ابوالحسن علی ندوی شاہ معین الدین
احمد ندوی اور عظیم مسرور جیسے حضرات کی تقریباتیں موجود ہیں۔
سبھی نے اسے سراہا ہے اور بجا طور پر بہت افزائی کی ہے۔ کوئی
شک نہیں کہ حقیقہ صاحب ایک عظیم العقیدہ، اعتدال پسند
مسلمان ہیں۔ فکر کا صحت مندرجہ اور اظہار و بیان کی مانتا
زبان کی سلاست ان کے اشعار کا جزو لازم سمجھئے۔ سادگی

حقیقت نگاری اور خوش فکری سے وہ ہر صاحب ذوق کو
متاثر کرے گی صلاحیت رکھتے ہیں۔
کچھ لے :-

ہے کشادہ سب کی خاطر اس کا دربارِ کرم
ہم ہے سب کے لئے فیضانِ رب العالمین
جنت الفردوس کے وارث وہی ہوں گے حضور
مجاہدوں سے تاجِ فرمانِ رب العالمین

وائے لالہ گل ہر کہ پر وہ مسرور
ہی ہے سب میں نہاں لالہ الا اللہ
ایغ بادۂ عرفان، چہ راغ راہِ ہدی
کیا بپاں جہاں لالہ الا اللہ !
زندوں کو بھی سفاکی پہ جن کی شرم آتی تھی
انہیں کو منظر آدابِ انساں کر دیا تو نے
وہ جن کی جاہلیت کا زملے بھر میں شہرہ تھا
ہیں کو علم و دانش کا نگہبان کر دیا تو نے

جہاں دہشت کا پیرہ تھا جہاں وحشت برستی تھی
اسی زادی کو رشک و گلستاں کر دیا تو نے

پھر جہاں سے بڑھ گئی ہیں زمانے کی لمبھیں
پھر آنکھ تھی ہے زلف جہاں شانہ رسولؐ

سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج پیش کرنے والے ایسے
اشعار حقیقت صاحب کے یہاں خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ لیکن
ضرورت ہے کہ وہ اپنے فن کو سنوارنے اور نکھانے پر فریاد و جہ
صرف کریں۔ ابھی ان میں پختگی نہیں آئی ہے اور انفرادیت کی
کبھی چھاپ نہیں ملتی۔ انہما زخیال میں نہ رت اور غم و آفرینی
میں باخچیں نہیں۔ بہتر سے اشعار سپاٹ ہیں اور تو مشقی کا آثار
دیتے ہیں۔ زبان کار کھار کھاؤ بھی معیار بلن تنگ نہیں پہنچا۔
ہو نہیں سکتا انا اس کے کرم کا شکریہ
اس قدر ہم سب پر ہیں احسان رب العالمین
احسان بصیغہ واحد کہا تھا تو ”ہے“ نظم کرنا چاہو تھا
”ہیں“ جمع کا متقاضی ہے یعنی ”احسانات“۔

محمد اس کی ہمیشہ سے ہر جی کی ذات حمداً کی نہیں جس کی خاطر مات
دوسرا مصرعہ مشائی کے بجائے انارٹی پن کا منظر ہے۔
عرش کی رونق و روش کی زینت صلی اللہ علیہ وسلم
یہ کیا کہہ دیا۔ مبالغہ شاعری کا حسن یہی لیکن معاملہ
حب اللہ اور رسولؐ کا ہو تو عقائد صحیحہ کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیو
”عرش کی رونق“ اللہ جل جلالہ ہے نہ کہ رسول اللہ ص۔ یہ
مضمون بہتر سے شاعر باندھتے آئے ہیں لیکن کسی صحیح الغیہ
شاعر کو تو تقلید جامد کی راہ اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ اچھا ہو گا
کہ اس طرح کی فاسد مبالغہ آرائیاں بریلوی محنت فحش کے
لئے چھوڑ دی جائیں۔

واہ سے امانت واہ سے صداقت صلی اللہ علیہ وسلم

”واہ“ کی ہا نہ صرف دہ گئی بلکہ نقل ہو گئی۔ حیرت ہے
حافظ صاحب کے مذاق شعری نے یہ قتل ناخن کیسے گوارا کر لیا۔

❦

صلح و وفا ہو جنگ و جدل ہر خواہ وہ کوئی بزمِ عمل ہو
آپؐ نے کی ہے سب کی صدارت صلی اللہ علیہ وسلم
ایک ہی شعر میں اتنے متعدد الفاظ کا غلط استعمال کم ہی
ملے گا۔ صلح کے ساتھ ”وفا“ محض تنگ بندی ہے ”بزمِ عمل“
بھی بزمِ استعمال نہیں ہوا۔ ”صدارت“ کا بھی موقع نہیں تھا
صدارت سے بہتر تو ”قیادت“ ہی رہتا۔

خار کے بدلے پھول کی بارش واہ سے انکی شانِ نوازش
”پھول کی بارش“ غلط زبان ہے۔ بارش کے لفظ میں
برسنے والی شے کا تو ذرا آپ سے آپ شامل ہے ”پھولوں کی
بارش“ کہنا چاہئے تھا۔ پھر متعجب ”خار“ بھی غلط ہی ہوتا۔
دونوں الفاظ بصیغہ جمع ہی جز و شعر بننے تو لطف آتا۔

ساتھی کو تر مالک جنت صلی اللہ علیہ وسلم
”مالک جنت“ کہنے کے گناہ کبیرہ پر حافظ صاحب سودا ہار
استغفار پر بڑھیں تو ان کے حق میں مفید ہو گا۔ تعجب ہوتا ہے
کہ جس ملت کے پاس قرآن مجید کی آیتیں موجود ہیں اس میں
اس طرح کی فاسد خیالی گھس آئے۔ پناہ بخدا یا در کھئے
جنت، دوزخ، میزان، قضا و قدر سب کا مالک اللہ اور
صرف اللہ ہے۔ اس نے سمجھی کئی طرف اپنی ملکیت منتقل نہیں
کی۔ اگر رسول اللہ جنت کے مالک ہوتے تو بھلا حشر کے دن
شفاعت کی زحمت کیوں فرماتے۔ شفاعت اور وہ بھی اللہ کی
اجازت مل جانے کے بعد صریح دلیل ہے اس حقیقت ثابتہ کہ
کہ جنت ان کی ملک نہیں۔ مالک اپنے ملوکہ علاقہ میں کسی کو داخل
کرنا چاہے تو وہ کسی کی بارگاہ میں سفارش و شفاعت کی پریشانی
کیوں اٹھائے گا۔ ہر وہ مسلمان جو اس طرح کے غلامی بننا ہے
مہر سے قبل تو یہ کرے تو جہاد کا آئینہ سلامت رہ جائے گا
دور آخرت کے عذاب سے چھٹکارا شکل ہے۔ اللہ نہ گرتا
معاف کر دیتا ہے لیکن یہ گناہ معاف نہیں کرتا کہ اس کی شان
مالکیت کو برقرار رکھا جائے۔

اللہ کے نام پاک سے مشتق ہے ان کا نام
محمد ہے خدا تو محمدؐ ہیں مصطفیٰ

❦

غیر متطا اور منطقی باتیں۔

کا معجزہ غیبت روایات سے ثابت ہے لیکن معجزات کے سلسلہ میں ”زمان“ کا لفظ بھلے خود غلط ہے۔ زمان اللہ کا ہوتا تھا۔ معجزات کسی کبھی نبی کے اپنے زمان کا حاصل نہیں ہوا کرتے۔

السلام اے نور بخش بزم ارکان السلام یہ پیرایہ بھی غلط سے خالی نہیں۔ بزم ارکان کا نور نور اللہ کی ذات واجبہ لوجود ہے۔ قرآن کی نص صریح ہے۔ اللہ نور السموات والارض۔ پھر کیا عقیدت رسول میں قرآن سے بھی معارضہ اور کابروہ جائز ہو سکتا ہے۔

تو چراغ فرشتہ بھی ہے عرش کی تذیل بھی وہی ”عرش کی رونق“ والی بات۔ خدا ان روایات گھڑنے والوں کو شاید ہی معاف کرے جنہوں نے اللہ کی بارگاہ عرش پر ہی رسول اللہ کو بھلے کسی سحر و کد کی ہے۔ آخر کیوں قرآن کو بھول جاتے ہیں لوگ۔ حیرت ثم حیرت ثم حیرت شعلہ جوالہ میں بھی مثل گل خنداں رہا یہ قطار الوہیم علیہ السلام کی منفیت کا ایک مصرعہ ہے

خفیض صاحب شاید اتفاق سے شعلہ جوالہ اور آتش خرد کا فرق بھول گئے۔ شعلہ جوالہ اس شعلہ کو کہتے ہیں جو گردا گرد پھریں۔ وہ ایک مختصر سی آگ ”سے عبارت ہے جو متحرک ہوئی ہے اور دائرہ یا گھیر بنا کر ہے۔ حضرت ابراہیم جس آگ میں ڈالے گئے وہ تو الٰہ داد بھٹی کے مان بھی۔ جوالہ

”شعلہ جوالہ میں بہ اعتبار دائرہ بھی غلط ہے۔ شعلہ طرف کے طور پر استعمال نہیں ہوتا۔ جہنم، بعضی، تنزیہ، الاو وغیرہ کی طرح اس میں ظرفیت منظور نہیں۔

محمد مصطفیٰ کی سبی اور ناکام ہوجاتی خدا خانے نہ بننے تو صنم خانے کہاں جاتے یہ خالص مشاعراتی نوع کی شاعری ہے جس کی سطح تو خوشنما ہوتی ہے مگر ان پر محض بھرا ہوتا ہے۔ کجلا کجلا بات ہوئی کہ خدا خانے نہ بننے تو صنم خانے کہاں جاتے۔ ما صنم خانوں کو کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی انھیں تو اپنے قیام مستقل کے لئے ساری ہی دنیا خالی ملتی۔ اگر

اللہ کے جوتنا تو نے نام حدیث میں آئے ہیں ان میں تو ”محمد“ ہے نہیں۔ جیل بلے شک ہے۔ لیکن یہ طرز فکر ہی اپنی بلکہ فساد سے خالی نہیں کہ خدا کے نام پاک کو مصدر اور حضور کے نام کو اس کا مشتق بنایا جائے۔ اس سے جزئیت کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی جزئیت جس کی ایک شکل نصرانیوں میں بطور ابن اللہ پائی جاتی ہے۔ خدا انوی معنوں میں بلاشبہ لہو و ہے اور حضور تو محمد ہی ہیں مگر اس مصرعہ کی یکسانیت در محالیت کو درین توضیح کا داغ نہیں بنا نا چاہئے۔ نام محمد سی خدائی نام کا مشتق نہیں بلکہ لغت عربی کے ایک مصدر مشتق ہے۔ بات اس سے آگے نہیں بڑھنی چاہئے۔ رسنہ احمد بے مہم“ والا مشرق نہ چیکہ چل نہ کھلے گا۔ العیاذ باللہ یہ اک عالم ہے مقبول کرم تنیری ہدایت کا کچھ اتنا جادہ ہستی کو آسان کر دیا تو نے پہلے مصرعہ میں ”یہ“ شتر ہے اس کے بغیر ہی معتر

رست ہوتا۔ معنوی خامی یہ ہے کہ ہدایت اور جادہ ہستی کی سانی میں کوئی مناسبت نہیں۔ مسلمان بن کر زندگی گزارنا بہت ہی مشکل ہے۔ شاعر اپنا مافی الضمیر صمیم طور پر بیان ہیں کر سکے۔

وہ تنیری پاک دامانی کہ رشک آئے فرشتوں کو طہارت کی جلدی پر حسیرا خانہ نرو دیا تو نے وہ مصرعہ۔ روحانی صاحب کے کہنے کا نہ تھا۔ اس کو قدرت ان کا افلاس ادب انھما کا نقطہ نہایا ہے۔

نری تعلیم سنے۔ ہدایت کو جسرم بھیرا یا غم و ہراں کو بھی جزو کسبم جاں کر یا تو نے ”و غنیم جاں“ یہاں چھل ہے۔ ”غم جاناں“ کا محل

شق ہوا قہناب لوٹ آیا فلک پر آفتاب زکھئے اعجاز سرمان محمد مصطفیٰ آفتاب لوٹ آنے کی روایت صحیح نہیں ہے۔ شفق القمر

کسی نہ کسی طے میں قبولیت حاصل کرے گا۔

قرآن پر ظلم

مصنف :- مولانا امام علی صاحب فاضل
راہپوری ○ ناشر :- مدرسہ رحیمین المسلمین
اہل السنۃ والجماعۃ حنفیہ - رائے پور ٹکشی۔ ضلع
مکھیم پور کھیری ○ صفحہ ۳۲ - قیمت
پچاس پیسے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے چند نمونوں کے ذریعہ
یہ دکھایا ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے امام مولانا احمد رضا صاحب
اور مولوی نجم الدین صاحب نے قرآن کے ترجمہ و تفسیر میں
کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔

میں کبھی کبھی بڑا سخت ہوتا ہے کہ کیا اللہ کیا قرآن پر ایسے
کا دعویٰ کرنے والا کوئی گروہ اتنا بے فکر اور مریض العقل بھی ہو
سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر ناک مٹھ چڑھ لے
اور انھیں عالم الغیب اور حاضر و ناظر قرار دے۔ یہ تو بدغلظت کی
انتہا ہے جسے مانجولیا ہی کہہ سکتے ہیں۔ نصیریوں کے ہمسایہ
بدعقلی "ابن اللہ" کے عنوان سے جلوہ گرہ ہوئی، مکران کے بانی
میں یہ صبر تھکا کر فی حق آسمانی مجید ان کے پاس نہیں۔ چند عجوبہ
صحیفے نے پھرنے میں جن کا یہ استناد خود ان کے اہل گھر و خانہ
کے نزدیک دائرہ یقین سے خارج ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں
کیسے صبر کریں جبکہ قرآن جون کاٹوں محفوظ ہے ادبے شمار احادیث
صحیحہ بھی انھیں روشنی دکھائی ہیں۔

اللہ کے بھید اللہ ہی جانتے۔ وہ بندوں کے لئے عبت
سامان نہیں کرتا ہے کہ وہایت دگر ای سب جاسے ہی وقت
میں ہے۔ ہم اچھے خاصے عقل مندوں کی مت مار سکتے ہیں، وہ
کے اذان و قلوب کو کباڑی کی دکان بند کئے ہیں۔

بہر حال اس کتاب کے فاضل مصنف نے چند نمونے
سبق آموز نمونے پیش کئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ بریلوی کی

تھیوری سی منطقی بحثی پیدا ہو سکتی تھی تو یوں کہنے سے ہو سکتی
تھی کہ "اگر سارے عالم میں "خدا خانے" بن جاتے
تو پکارے صنم خانے کہاں جاتے" یہ ایسا ہی ہڑتا ہجو
نگیل بدراہنی کا مشہور مصرعہ ہے
اگر دنیا چین ہوئی تو دیر الے کہاں جاتے

نہ پوچھان کا مقدر ہے کس قدر بیدار
حقیقت جن کو، مینہ میں نین آئی ہے
شاعر کی مراد غالباً یہ ہے کہ جو لوگ مدینے میں دفن
ہوئے وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔ لیکن نین آئی ہے، یہاں دم
کا شہر پیدا کر رہا ہے خواب غفلت کی طرف خیال جاتا ہے
الفاظ کچھ اور ہوتے تو بات بنتی۔
ہر لمحہ حسر کے لئے تیار رہو : دنیا سے گزر کے لئے تیار رہو
موت کے لمحے کو "سحر" سے تعبیر کرنا درست نہیں۔ محاورے
میں اسے "شام زندگی" بولتے ہیں۔
مجم کتاب پر بعض شعراء کے قطعات تاریخ دیئے گئے ہیں
جن کا عنوان ہے۔

"قطعات تاریخ و نظریات"

لفظ "انطباع" قرآن مجلی کے مصرعہ میں بھی استعمال
ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے "طبع" درست ہوتا۔ عربی میں "انطباع"
عموماً ڈھلنے اور بھر جانے کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اردو میں
اس کا استعمال ہی نہیں۔ کوئی یوں نہیں بولتا ہے کہ فلاں کتاب
فلاں ادارے کی منظم ہے۔ یا فلاں شخص فلاں کتاب کا مطلع
ہے۔ مطبوعہ، طباعت، یہی الفاظ مروج اور مانوس
ہیں۔ باب انفعال اس مصرعہ میں اردو کی حد تک شاذ ہے۔
آرہ نہ شمار کئے نعت حقیقہ

پرستہ و محمد قائم رضوی قتیل کا مصرعہ ہے۔ بھلا خمار کے
کیا چہیتہ؟

نصرہ کا حامل یہ ہے کہ حقیقہ بنارس اگرچہ برے شاعر
نہیں ہیں لیکن ابھی انھیں صف اول کے شعراء کا کلام بنو رہا ہے
اس سے کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ امیر ہے ان کا یہ مجبورہ

ان حدیث کے ساتھ کیسا سلوک ہے۔
بریلویوں میں مقبول ایک کتاب ”میلاد گوہر“ بھی ہو
ا کے کچھ اشعار زیر تبصرہ کتاب کے توسط سے ہمارے
طریق بھی گوش گزار کریں۔

میم سے تو نے چھپایا راز کو اپنے تمام
اے اجداد احمد کی صورت میں نہاں تو ہی تو تھا
لوگ کہتے ہیں کہ رخ پر نفی پڑی ان کے نقاب
نکھل احرام میں مگر دیکھا عیاں تو ہی تو تھا

ادب سے زبان مقام کر رہ گیا میں
حبیب خدا کو خراب کہتے تھے

تھی کہ سرکار تشریف لادے دو عالم کے سرکار تشریف لادے
یہ کو بھی عزت ہو خوش غلامی دکھا جاؤ بنوں کو صورت خدا کی
ان شعروں کا کہنے والا اور انھیں پسند کرنے والا
مسلمان ہو سکتا ہے تو دنیا فوٹ کرے کہ ہم اپنے مسلمان
سے سے انکار کرتے ہیں، شرک اور اتنا لوگا، حماقت اور اتنی
ن ابد غفلتی اور ایسی شخص۔

مشاف

تصنیف :- مولانا عبد الجلیل صاحب فاضل
دیوبند ○ ادارہ حنفیہ دیوبند، یو۔ پی۔ صفحہ
۲۷۲ - لکھنا چھپائی معمولی قیمت چھ روپے

بریلوی مکتب فکر کے ایک مناظر و منظر ارشاد القاری
کتاب زلزلہ پر ہم نے دسمبر ۱۹۷۷ء میں تبصرہ کیا تھا۔ یہ
مرد جو نہ بحیثیت بریلوی کتاب کے حق میں تھا تا تھا اس کو بریلوی
تھے اسے بڑی شہرت دیا اور زلزلہ کے حلیہ ایڈیشن میں بھی
یہ مشاغل کر رہا۔

یہ کتاب انکشاف، آسما زلزلہ کارہ ہے اور اس میں

ثبات کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صاحب زلزلہ علمائے
دیوبند کی عبارات پر جو بھی اعتراض کئے ہیں سب فاسد
باطل ہیں۔

کتاب کو ہم نے شروع سے آخر تک پڑھا ضرور مگر بریلوی
فرہنگی کو ذلت برداشت کرتے ہوئے کوفت کا آغاز کتاب
کا ”انٹری“ ہی دیکھ کر ہو گیا تھا۔ عبد الجلیل صاحب دارالعلوم
کے ایک دیوان فارغ التحصیل ہیں دارالافتاء میں فتویٰ لکھائی
کی مشق کرتے ہیں، یعنی بقول غالب۔

لیتا ہوں مکتبِ علم دل میں سب ہنوز
لیکن یہی کہ روت ”گیا“ اور بود ”تھا“

ان کے ساتھ مولانا اور مفتی دونوں ہی القاب
جوڑ دینا نظریہ ایسا ہی ہے جیسے سرکس میں بانس کی بانگیں
رنگ کر کسی پتہ قاصر کے کو بولیں انعامت بنا دیا جاتا ہے۔ دیوبند
کے اساتذہ سوچیں یہ کیسا نازی ہے اور ثقہ الفاظ کی پیلی
کرنا خوش زوئی کے کس قبیل سے نطق رکھتا ہے۔

بہر حال ہمارا وجدان ایسی خفیف حرکتوں پر بہت گستا
ہے۔ مزید کوفت یہ دیکھ کر ہوئی کہ عزیز معصفت طر زلف اور
طرز تحریر دونوں ہی اعتبار سے جیتے ہیں۔ نقد و نظر کھیل تو نہیں
ہے۔ وہ ابھی دو چار سال او مشق تحریر میں لگے رہتے تب اس
میں ان میں اتنا کچھ زریب دیتا۔ بحالت موجودہ کوئی بھی
سلیم الطبع اور ذی فہم قاری ان کی کتاب سے سوائے براگندہ
خیالی اور تحریک کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا۔ بلکہ حسن انشا کا ذوق
رکھنے والے تو شاید اس پانچ ورق سے زیادہ پڑھ ہی نہ سکیں

ہم اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ البتہ
چند نکات پر اس غرض سے گفتگو کریں گے کہ ہمارے اس خیال
کے کچھ شواہد لوگوں کے سامنے آئیں جسے ہم متعدد بار تجلّی کے
صفحات میں نقل کر چکے ہیں یعنی معتقدات کا غلط صرف بریلویوں
تک محدود نہیں بلکہ ہمارے حلقہ دیوبند میں بھی یہ کسی نہ کسی
مدت تک موجود اور نمودار رہا ہے۔

”انکشاف“ کے آغاز میں حلقہ دیوبند کے تین نمائندوں کی

صغریٰ کو کشف کو فی بھی کہتے ہیں، یعنی سالک اپنی قلبی توجہ سے زمین و آسمان، ملائکہ، ارواح اہل قبور، عرش، کرسی، لوح محفوظ، الغرض دونوں جہان کا حال معلوم کر لے۔ اس کشف میں غلطی بھی ہو جاتی ہے (انکشاف ص ۳۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ فقط بریلویوں ہی کے نزدیک نہیں دیوبندیوں کے نزدیک بھی سالک کی قلبی توجہ کی زرد اور حیطہ عمل سے عرش، کرسی اور لوح محفوظ بھی باہر نہیں ہیں۔ وہ دونوں جہان کا حال صرف معلوم ہی نہیں کرتا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔

ہم اساتذہ دیوبند سے دریافت کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس کی کیا بنیاد ہے؟ کون سی آیت یا حدیث ایسی پیش فرماتی ہے جس سے اس دعوے اور رائے کی تصدیق ہو سکے آپ فلاں صوفی اور فلاں شیخ اور فلاں عالم کا قول اسٹھا کر لائیں گے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ عقائد کے لئے نص قطعی چاہیے اور ایسے خامض ترین عقائد کے لئے تو اور بھی واضح اور قطعی ثبوت کی ضرورت ہے۔ ہم نہیں مانتے کہ کوئی قطب یا ابدال یا سالک عرش، کرسی اور لوح محفوظ کے منجبات کا بھی مشاہدہ اپنے قلب کی توجہ سے کر سکتا ہے کشف اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن اس کی بید و معن ہر گیری محتاج دلیل ہے۔

دوسرا اقتباس یہ ہے :-

”کشف کبریٰ۔ اس کو کشف الہی بھی کہتے ہیں یعنی

ذات حق سبحانہ کا مشاہدہ اور معائنہ ہو جانا! اور حیلہ حجابات اور اعتبارات کا اٹھ جانا اور نور بصیرت سے خلق کو عین حق، حق کو عین خلق دیکھنا سالک کا مقصود اہل ہی کشف ہے اور پہلا مفید ضرور ہے لیکن سالک کو مشغول نہ ہونا چاہیے (انکشاف ص ۳۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک سالک اسی اینٹ اور پتھر کی دنیا میں کشف کے زور سے ذات خداوندی کا مشاہدہ

تقریباً موجود ہیں (۱) محترم مولانا حامد المانصاری غازی (۲) محترم مفتی احمد علی سبیل (۳) محترم مفتی لطیف الدین صاحب ان تینوں حضرات نے کتاب کو سراہا ہے اور اسے جہل کے بالمقابل علم سے تعبیر کیا ہے۔ اب ہم جو کچھ عرض کریں گے اس کا رد کے سخن ان اساتذہ ہی کی طرف ہو گا نہ کہ سبب مصنف کی طرف۔ عزیز منصف تو ابھی ”کے آدھی دیکھ سکتی“ کے گہوارے میں بیرویش پارہے ہیں اور ان کا علمی سرمایہ پختہ و پزیرگی بالکل ابتدائی منزل میں ہے۔

کشف دکر امت محض افسانہ نہیں ہیں بلکہ ان کی ایک حقیقت ہے۔ یہ بات دیوبندیوں اور بریلویوں کے مابین نزاعی نہیں متفق علیہ ہے۔ اس کے باوجود انکشاف کے مصنف نے بیسیوں صفحات اسی متفق علیہ بات کے اثبات میں صرف کر ڈیے ہیں۔ اہل فہم، آوازہ فرمائیں کہ ایسی تحصیل حاصل خوش غلطی قارئین کے لئے کس قدر کوتاہی کا باعث ہوگی۔ مصنف نے ایک کتاب ”اصطلاحات صوفیہ“ کا ذکر بار بار کیا ہے اور اس کے اقتباسات بھی دیئے ہیں لیکن یہ بتا نہیں چلتا کہ یہ کس بزرگ کی تصنیف ہے۔ ص ۳۵ پر انھوں نے حاشیہ کا خمیر دیکھ کر شاید اس کی وضاحت کرنی چاہی تھی مگر حاشیہ میں نمبر کے بعد کچھ بھی تحریر نہیں محض بیاض ہی بیاض ہے اس طرح یہ راز راز ہی رہ گیا کہ اس کتاب کے مصنف کون ہیں جب مصنف ہی کا علم نہیں تو اس کا پایہ استناد جیسا کچھ کئی ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

نمبر۔ یہ کتاب مصنف کے نزدیک بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس کے مندرجات انھوں نے بڑی عقیدت اور وثوق کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ کشف کی تعریف حقیقت کی وضاحت انھوں نے اس کتاب (اصطلاحات صوفیہ) کے حوالہ ذیل اقتباسات سے کی۔ ان میں سے ہر ایک پر ہمیں گفتگو کرنی ہے۔ پہلا اقتباس یہ ہے۔

”پوشیدہ باتوں کا معلوم کرنا کشف ہے۔ اس کی دو قسم ہے۔ کشف صغریٰ، کشف کبریٰ، کشف

اور معائنہ بھی نہ صرف کر سکتا ہے بلکہ یہی اس کا مقصد اصلی ہوتا ہے۔

حالانکہ مسلم شریف میں نوی راویوں کے توسط سے ہم اللہ کے رسول کا یہ ارشاد اپنے مری آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ و اعلیٰ تک مرتبہ اس بکھر چکی قوم کو اس کے علاوہ حدیث اعدان میں بھی صراحت ہے کہ خدائے تعالیٰ کو اس دنیا میں ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بطور ایک اصول کے ارشاد فرماتے ہیں۔ لا ن البصر فی المدنیٰ خلقاً یلقیہ فیہ فیضاً من علیہ السلام و یدیک فیہ من حضرت موسیٰ علیہ السلام حالانکہ نبی تھے لیکن انھیں دیدار کی درخواست میں اللہ نے فیصلہ سنایا کہ تو ان پر غلطی ذات کی ایک جھلک کو بھی وہ برداشت نہ کر سکے اور ہوش و حواس نے حجاب دے دیا تو یہ راہ طریقت و تصوف کے سالک آخر کو کونسی ٹی سے پہنچا کر کس مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں کہ ذات حق تعالیٰ کا مشاہدہ و معائنہ بھی فرما لیتے ہیں۔

پھر یہ غلطی کو عین حق اور حق کو عین خلق دیکھنا کیا بے غبار باتیں ہیں۔ کیا قرآن و حدیث سے بھی اس کی دلیل ملتی ہے۔ کیا التباس یا حلول یا وحدۃ الوجود کی بھول بھلیاں میں جھٹکتا اور جھٹکتا کا بھی دین و شریعت کی کوئی مضبوطی ثابت ہو۔ بندے اور آقلے کلہ کے درمیان سے حجاب اٹھ جائیں اسے شاعری تو کہہ سکتے ہیں حقائق کی ترجمانی نہیں کہہ سکتے۔ انکشاف کے مصنف تو ابھی کہتے ہیں ”علمائے باغین“ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ کیا واقعی حلقہ دیوبندی کی ترجمانی ہے یا اس روایتی تصوف کی عمل کاری ہے جس کا مدار دلائل شرعیہ سے زیادہ تخیلات پر ہے۔

”اسکرامات الاولیاء“ سے مزید ارشاد نقل ہوا۔

”زندہ اور مردہ: دیار کے لئے کرامت کا ثبوت درست ہے اس لئے کہ دلائل و دلائل سے معزول نہیں ہوتے

میں فوجیہ قہر مرنے والے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ کیونکہ قوت بیانی دنیا میں فنا کے پیر الٰہی ہے اس لئے وہ اس ذات والا صفات کو دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتی جو غیبت میں ہے بلکہ جو لوگ کراہیاں لئے اور ڈرتے رہے۔

جیسا کہ نبوت کے بعد بھی نبی ہی رہتے ہیں۔

ہم آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ نبوت کی طرح دلائل ایک عہدہ اور منصب کس دلیل سے بنا لیا گیا ہے۔ نبوت منصب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو عطا کرتا ہے لئے کوئی شخص اپنی سعی و جہد سے نبی نہیں بن سکتا اس کے ولایت کا منصب ہو نا قرآن و حدیث سے ثبوت ثابت نہیں چنا بھی اللہ کا بندہ لغوی اور طاعت کی راہ اختیار کر کے ولی سکتا ہے۔ ولی کا مطلب ہے وہ شخص جو ایمان میں پختہ ہو شریعت پر ذوق و شوق سے عمل کرتا رہے۔ خود قرآن میں آیا کہ تعریف یہ بیان ہوئی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْا (یونس) ولی کہتے ہیں حامی، دوست، مددگار کہ قرآن میں یزید اولیاء اللہ آئیے ہیں اولیاء الشیطان بھی آیا ہے۔ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ ولایت کے مختلف مراتب و درجہ ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن وہ کوئی دینی منصب نہیں ہے جس سے عزل و نصب کے الفاظ ثابت کئے جائیں۔ نیکی، بھلائی، خوش الحالت، عبادت خداوندی، حُریت، رسول، توفیق، اخلاق، خوفِ آخرت وغیرہ سب اوصاف ہیں مناسب نہیں، اسی طرح ولایت وہ ہے نہ عہدہ۔ ہر نبی کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے کہ وہ در افتادہ اختیار کر کے اللہ کا ریل بن جائے۔ خود انبیاء علیہم السلام ہونے کے ساتھ ساتھ ولی بھی رہتا تھا۔ کیونکہ ولی ہونے کا مادہ ہے مومن کامل ہونا۔ نیک، ہونا، شفیق ہونا۔ ابو حنیفہ مالک ابو ابن مبارک، ابو بکر صائغ، عمر فاروق یہ سب بہ فرق مراتب اولیاء ہی ہوئے ہیں۔

پھر یہ کیا بات ہے کہ ولایت کی نبوت ہی کی طرح ایک علم مان لیا گیا اور یہ کھوت شروع کر دی گئی کہ نبی کی طرح ولی بھی نبوت کے بعد معزز ولی نہیں ہوتا۔ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص زندہ گاہ انسان تھا مرنے کے بعد اسے انسان ہی کہیں گے۔ جانور مرے تو اس کی اور نوع میں تبدیلی نہیں ہو جائے گا۔ برا آدمی مرے تو بھی سمجھا گئے کہ برائی اس کے ساتھ چھٹی رہی۔ نیک آدمی مرے تو بھی نبی ہوئے۔

میں فوجیہ قہر مرنے والے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ کیونکہ قوت بیانی دنیا میں فنا کے پیر الٰہی ہے اس لئے وہ اس ذات والا صفات کو دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتی جو غیبت میں ہے بلکہ جو لوگ کراہیاں لئے اور ڈرتے رہے۔

راہیں کریں گے۔ عزول و نصب کا اس معاملہ میں کیا دخل۔
یہ کون کہتا ہے کہ نیک آدمی مرنے کے بعد بھی نیکی سے معزول
ہیں ہوا۔ اس طرح کا انداز بیان صرف مناصب کے بارے
میں اختیار کیا جاسکتا ہے اور ولایت کوئی منصب نہیں ہے
یہ ایک فساد انگیز اور غیر شرعی طرز فکر ہے کہ دلی بعد
دن بھی اپنی ولایت سے معزول نہیں ہوتا۔

امام غزالی کی ایک کتاب سے اہل قبور کی انواع میں سے
یہ نوع کا حال یہ نقل کیا گیا۔

”پہلی قسم اس کے اندر انبیاء، اولیاء ہیں اور ان
کے اندر بہت سے اختیارات رہتے ہیں۔ ان
میں سے بعض زمین میں قیامت تک رہتے ہیں“
(اختلاف صفحہ ۷)

نہ سطور بعد:-

”ان میں سے اولیاء بھی ہیں جو بوث یوم الدین تک
باقی رہتے ہیں جیسا کہ زید کی روایت میں ہے کہ وہ
عروش کے زیر سایہ خواجہ نعمت الہی سے غذا حاصل
کرتے ہیں“ (در)

موت اور دفن کے بعد بھی انبیاء و اولیاء مرتضیٰ اختیار
ہے الگ ہیں یہ دعویٰ اور عقیدہ صوفیاء و مشائخ میں خواہ کتنا
عام ہو لیکن کیا قرآن و سنت سے بھی اسے ثابت کیا
جاسکتا ہے؟

موت جسموں پر طاری ہوتی ہے روجوں پر نہیں۔ جیوں
خواہ مومن کی ہوں یا کافر کی سبھی جسم سے جدا ہو کر ان
مکانوں پر پہنچ جاتی ہیں جو اللہ نے ان کے لئے مقرر کرنا ہے
بلکہ اختلافی نہیں۔ لہذا انبیاء و اولیاء کے لئے قیامت تک
فی رہنے کا جو دعویٰ مذکورہ سطور میں کیا گیا ہے اس کا تعلق غالی
واجب سے تو ہو نہیں سکتا اجماع میں سے ہو سکتا ہے احادیث
یا صرف انبیاء علیہم السلام کے بارے میں تو ایسا ہے کہ ان کے
سوں کو مٹی نہیں کھائی لیکن اور کبھی کے بارے میں ایسا نہیں آیا
نہ کا جسم کو نہ کھانا اگرچہ ایک خصوصیت ہے لیکن اس خصوصیت

کا لازمی مطلب یہ کیسے ہو گیا کہ انبیاء بعد مردن ایسے اختیارات
کے مالک ہوتے ہیں جن کے اثر و نفوذ ظہور و موضوع کا تعلق
ہواری دنیا سے ہے۔ ایسا عقیدہ نہ قرآن نے تعلیم کیا نہ رسول نے
انبیاء کو جب تک زندہ رہے ان میں وہ صلاحیتیں بھی کار فرما رہیں
جو اللہ نے عطا کی تھیں۔ جیسے جو بھی صلاحیت دی جین حیات ہی
سے اس کا تعلق تھا۔ مرنے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ وہ سب
صلاحیتیں ان میں باقی رہے جائیں۔ قرآن و حدیث اسکی تائید
نہیں کرتے۔ قیاس اس کا موید نہیں۔ ضرورت اس کی
متقاضی نہیں۔

رہے ادبیاء و نجیباء کہ ہم عرض کر آئے دلی تو ہر متقی مومن
کو کہتے ہیں صحابہ سے لے کر آخر تک لاکھوں نیک بندے ہوئے
ہیں۔ ان سب کے بارے میں یہ خیال قائم کرنا کہ انھیں کچھ اختیار
ملے ہوئے ہیں ان میں سے بعض قیامت تک زمین پر رہنے والے
ہیں عجیب و غریب خیال ہے۔ کوئی قابل فہم مصداق ہی نہیں بنتا
اس خیال کا۔ اگر فرض کیجئے کہ بعض اولیاء کے اجسام ان کی قبروں
میں خاک نہیں ہوئے بلکہ جوں کے توں موجود ہیں اور یہی فرض
کر لیجئے کہ ان کی خارجہ سترہ روحیں پھر سے ان کے جسموں میں
داخل ہو گئی ہیں تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ اس نوع کی بوسہ زندگی
آخر میں معنی کیسے رکھتی ہے کہ اس میں ماخوذی الفطرت صلاحیتیں بھی
ہوں اور یہ ہم دنیا والوں کے کسی کام بھی آ سکے۔ ایسی زندگی پر تو
اس زندگی کا اطمینان ہی نہیں ہو سکتا جو ہم دنیا والوں میں معروف
ہے۔ یہ کہنا کہ بعض اولیاء بوث یوم الدین یعنی قیامت تک
زمین پر باقی رہتے ہیں دوراؤ کار اور بے بنیاد شاعرانہ خواہ
اس کی نسبت امام غزالی ہی کی طرف ہو۔

دوسرے اعتبار سے یہ زید کی روایت کے حوالے سے کہا گیا
ہے کہ وہ یعنی اولیاء عروش کے زیر سایہ خواجہ نعمت الہی سے غذا حاصل
کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اولیاء اس طرح کی روایات حجت ہی نہیں
علم روایت کے اصول و قواعد تو جہاں یہاں بغض اللہ تعالیٰ مدون
مرتب شکل میں موجود ہیں۔ ان میں تو ایسا کوئی صفا و بھینان
نہیں ہو کہ معاملات عجیب ہیں کوئی غیر نیکی یا خیال ظاہر کرے
تو اسے دلیل راہ بنا لیا جائے۔ پھر چلے اس روایت کو ان ہی میں

نفس سے زیر بحث دنیاوی زندگی کا کیا تعلق ہوگا۔

عشر ہماری دنیا کا کوئی حصہ تو نہیں وہ دربار اور ار
 ایک مقام ہے۔ ادبیاء اللہ کی روحیں ایخیر جم کے اہم سمیت
 اگر اس کے زیر سایہ غدا حاصل کر رہی ہیں تو اس کا یہ مطلب
 یہاں سے نکل آیا کہ یہ ادبیاء اللہ زمین پر باقی موجود ہیں۔
 شہدار کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھیں
 مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق
 پا رہے ہیں مگر شریعت میں یہ زندگی دنیاوی زندگی نہیں انی
 نئی چنانچہ شہدار کا ترکہ بھی بنا۔ ان کی بیواؤں سے نکاح
 بھی کئے گئے اور تمام ہی وہ احکام جاری ہوئے جو مردوں
 پر جاری ہوتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا
 سے بالاتر کسی جہان و مکان میں اگر کچھ ہستیاں کسی بھی شکل
 میں رزق اور غایا رہی ہوں تو انھیں دنیاوی زندگی سے
 متصف نہیں کہا جاسکتا اور ان پر دنیاوی بقا کا حکم نہیں
 لگایا جاسکتا۔

بریلوی مکتب فکر کو اسی عقیدہ رکھتا ہے کہ اولیاء اللہ
 رہتے نہیں بس پردہ فرامیت ہیں۔ معلوم ہو کہ یہ ان کا فائدہ
 نقیدہ نہیں بلکہ اس تصوف کا آوردہ ہے جس پر مصنف
 انکشاف کے دعوے کے مطابق حلقہ دیوبند بھی آمنا و قنا
 ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ عقیدہ فی الحقیقت شرک کا
 زرخیز تخم ہے۔ قطعاً طبعاً اور بے بنیاد۔ قرآن اس سے
 پاکر تا ہے اور احادیث صحیحہ اس کی سر موئی نہیں کرتیں
 علم باطن اور علم طریقت کی تحسین و تعظیم کا یہ مطلب تو نہیں کہ
 سو فیائے سلف کے ہر خیال و رائے پر تسلیم کر دیا جائے
 انکشاف کے نوجوان مصنف کو تو ملزم قرار دینا بیکار ہے ان کے
 چنے ذہن پر غزالی اور سبکی جیسے نام آسان بن کر چھلکتے ہیں
 لیکن الزام ان اساتذہ پر ہے جنھوں نے انکشاف کی تحسین
 فرمائی ہے۔ کیا وہ بھی موعوبیت کے اسی بوسیدہ تخت پر
 متمکن ہیں جہاں محض چند نام کا بوس بگرد و دماغ پر سوار
 ہو سکتے ہیں۔

مزید ہمیں کچھ نہیں عرض کرنا۔ ہاں عزیز مصنف کی ایک
 سعادت ثناء سادہ لوحی کا حق سنا کر کہ بھی کر دیں۔ کتاب
 کے خاتمہ پر انھوں نے علمائے دیوبند کے کارنامے بھی گنوئے
 ہیں اور ان میں ایک کارنامہ یہ بھی شمار کیا ہے کہ علمائے
 دیوبند نے قادیانی، شیعہ، رافضی، وغیرہ متعبدین اور جہاں اسلام
 کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

گویا ہمارے کمن عزیز کو آج تک یہ بھی خبر نہیں چلا اسلامی
 کے خلاف حلقہ دیوبند سے جس طرح کی تحریریں شائع ہوئی
 ہیں انھوں نے اس حلقے کی نیک نامی کو داغدار اور علم و فہم
 کو اچھا خاصہ رسوا ہی کیا ہے نہ کہ نیک نام اور جماعت اسلامی
 کے خلاف بعض علمائے دیوبند کی معاندانہ بلکہ قائلانہ روش
 کو کارنامہ قرار دینا تقریباً ایسا ہی ہے جیسے نادور چنگیز اور
 ہٹلر و اسٹالین کی سفاکیوں پر دانشمندی کے ڈونگولے برسانا
 عزیز مصنف تحقیق کر کے دیکھیں علمائے دیوبند کی روش
 جماعت اسلامی کے سلسلہ میں ٹھیک رہی ہے جو بریلویوں کی
 علمائے دیوبند کے سلسلہ میں ہے۔

بہر حال مناسب ہوتا اگر کوئی سنجیدہ اور ذمہ دار
 بزرگ اس کتاب کی تصنیف میں عزیز مصنف کی نگارانی
 اور رہنمائی کرتے۔ بصورت موجودہ یہ کتاب قبیح نہیں
 کہی جاسکتی۔

اچھی کتابیں

- ۱/- حقیقت سماع۔ مولانا تھانویؒ۔
- ۸۰/- خا کا وجود۔ مولانا ادیس کاندھلوی
- ۷۵/- خا کی صفات۔
- ۵۰/- حکایات لطیف فارسی مع فرہنگ
- ۴۰/- اچھا قاعدہ۔ مولوی مقبول سید ہادی
- ۶۰/- اللہ میاں کی کہانی۔

مکتبہ تحسلی دیوبند (دب۔ پی)

SECRET

CONFIDENTIAL

Doc 871 83/71-7000

BROOKLAND U.P. INDIA





27 DEC 1974

تجلی

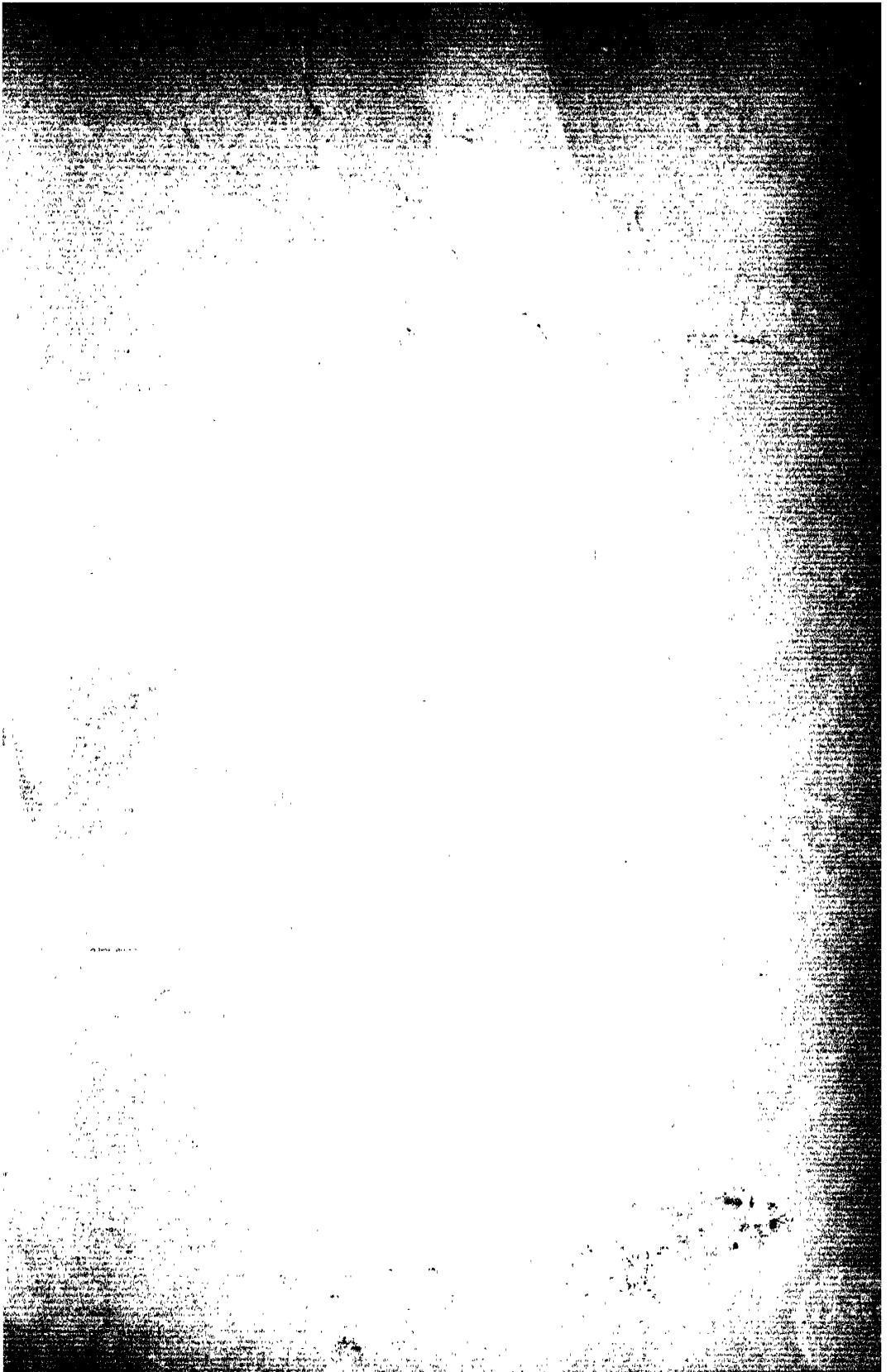
ماہنامہ

دلیونہ

خدا کی راہ میں خرچ کرنا
در اصل خرچ کرنا نہیں بلکہ جمع کرنا ہے

ایڈیٹر: عالم

نارنگیوں میں ایک حلقہ





الوہاں

چھبیس سال کا سچا شہرہ

بجلی

ماہنامہ

دہلی

فہرست ماہ ۵۵ ستمبر ۱۹۴۶ء

۹۱۶

مہر مرثیہ ماہنامہ

۲۱

۲۲

۲۳

۲۴

۲۵

۲۶

۲۷

۲۸

۲۹

۳۰

۳۱

۳۲

۳۳

۳۴

۳۵

۳۶

۳۷

۳۸

۳۹

۴۰

۴۱

۴۲

۴۳

۴۴

۴۵

۴۶

۴۷

۴۸

۴۹

۵۰

۵۱

۵۲

۵۳

۵۴

۵۵

۵۶

۵۷

۵۸

۵۹

۶۰

۶۱

۶۲

۶۳

۶۴

۶۵

۶۶

۶۷

۶۸

۶۹

۷۰

۷۱

۷۲

۷۳

۷۴

۷۵

۷۶

۷۷

۷۸

۷۹

۸۰

۸۱

۸۲

۸۳

۸۴

۸۵

۸۶

۸۷

۸۸

۸۹

۹۰

۹۱

۹۲

۹۳

۹۴

۹۵

۹۶

۹۷

۹۸

۹۹

۱۰۰

اقوال واقعی

آغاز سخن

تعلیمی و ادبی مسائل

غزل

قادیانی مسئلہ

مراستہ مع جواب

تفسیر باعدی

مفتضح کیا فرماتے ہیں

جامعت اسلامی ہند کا کل ہند خلیفہ

روح انتخاب

رنگ کے پھول

مولانا مودودی (نظم)

سجد سے میخانہ تک

امریکہ - انگلینڈ - نائیجیریا - کینیڈا - فرانس -

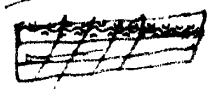
انڈونیشیا اور ملیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک

دو پونڈ - بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ -

بحرین - افریقہ - سعودی عرب قطر وغیرہ

اسے بذریعہ بحری ڈاک ٹیک پونڈ دس

شنگل - بذریعہ ہوائی ڈاک ٹیک پونڈ



عام عثمانی

سالانہ قیمت

بیس روپے

اس شمارے کی قیمت

دو روپے

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ

پر آپ کی خریدار ختم ہے - یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت

بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں - آئندہ خریداری جاری

نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں - خاموشی کی صورت میں

اگلا پرچہ وی پی سے بھیجائے گا جسے وصول کرنا آپ کا

اخلاقی فرائض ہو گا -

اعلانی فرائض بھیج کر آپ وی پی خرچ

منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ

سے جی جائیں گے

اسلامی پریس دہلی

احوال اٹنی

پچھلا نومبر کا پرچہ آپ کو ۸ نومبر تک ملنا چاہیے
 ماسکین وہ ۲۰ نومبر سے ۲۳ نومبر تک سپرد آک ہوا۔
 یہ یہ ہوئی کہ دفتر کا پورا عملہ نومبر کے پہلے ہی ہفتے میں
 قلعہ علی کا اسٹال قائم کرنے کے لئے جماعت اسلامی
 ند کے پانچویں آل انڈیا اجتماع (منعقدہ دہلی) چلا گیا۔
 اسی ۱۶ تک چوٹی تیار شدہ پرچہ اس کے بعد ہی پوسٹ
 ہو سکا۔ زیر دست شمارہ پریس تو ٹھیک ہی وقت پر جا رہا
 ہے لیکن بجلی کا رویہ کیا ہے گما یہ نہیں کہا جاسکتا۔ توقع تو
 ہے کہ اسے دسمبر کے پہلے عشرے میں حوالہ ڈاک کیا جائیگا۔
 اس شمارے کے بہت کافي صفحات "قادیانیت"
 نے تجزیہ و تحلیل میں صرف ہو گئے ہیں اور آگے کو کچھ مدت
 استناد ایسا ہی ہو گا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ پاکستان
 میں نہریت پا جانے کے بعد اب قادیانیت کی پنا گاہ اپنا
 نڈوستان ہی ہو سکتا ہے اور جب محترم مولانا عبد الماجد
 یابادی اھد جناب محمد عثمان فار قلیط جیسے بزرگ اندازہ
 طالعی اس کے سر پر دست خفقت رکھے ہوئے ہوں تو
 ہت زیادہ اندیشہ ہے کہ اس فاسد و باطل آئیڈیالوجی
 از ہر سارے سادہ لوح اور کم علم بھائیوں کے ذہنوں میں
 کی کچھ نہ کچھ مہر ایت کر ہی جائے لہذا ہمارا فریضہ ہو جاتا ہے
 دلائل کی روشنی ڈال کر اپنے بھائیوں کو گمراہی سے بچانے
 ہر گز خوش کریں۔ امید ہے کہ جو اکثر و بیشتر حضرات
 قادیانیت کے فساد کا ملہ پر پہلے ہی سے یقین رکھتے ہیں
 بھی تجلی کے صفحات میں ایسی معلومات ضرور پائیں گے
 ان کے علم کو طر حائیں گی اور مطالعہ میں صرف ہونے
 حقائق ضائع نہیں جائیں گے۔

اگلے شمارے میں

تجلی کے مخصوص کالموں کو باقی رکھتے ہوئے اولاً
 تو فار قلیط صاحب کے مضمون کا بقیہ جائزہ مکمل کیا جائے گا۔
 نیز طلاق ثلاث کی بحث بھی چند صفحات لگی۔ ثانیاً
 مولانا علی میاں مدظلہ کا ایک فقیع مضمون "قادیانیت"
 اشاعت پذیر ہو گا۔ اس سے آپ کو بعض مفید معلومات
 کے ساتھ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمتہ کے خیالات کا بھی پتہ چلیگا۔
 ثالثاً ہم چاہتے ہیں کہ قادیانی فنکار جن مخصوص دلائل سے
 اپنے فکر باطل کو سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اتارنے
 کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان کا علمی و منطقی تجزیہ تجلی کے صفحات
 میں آجائے تاکہ کوئی بھی مسلمان قادیانیت کے ظاہر و زیر
 استدلال کے پھندوں میں نہ پھنسنے پائے۔ اگر صفحات نے
 گنجائش دی تو یہ سلسلہ اگلے ہی شمارے سے شروع کر دیا جائے
 گا۔ اس سلسلے کو انشاء اللہ خواص و عوام دونوں مفید اور
 دلچسپ پائیں گے۔ واللہ المستعان۔

کہانی نمبر

ملا ابن العرب کی بڑی تلاش کے بعد گر قنار تو ہو گیا
 ہے مگر ذہنی انقلاب خیز کا شکار ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ افق
 کے بھی آثار ہیں۔ امید کی جا رہی ہے کہ کہانی نمبر کے لئے وہ
 ایک ایسی شاہکار داستان پیش کرے گا جو انتہائی دلچسپ اور
 پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ اس خشک اور پیچیدہ تھی کو
 بھی سلجھائے گی کہ کونسا تصوف واقعہ اسلامی ہے اور کونسا
 غیر اسلامی۔ احباب دعا فرمائیں کہ کم سے کم اس داستان
 کی تکمیل تک اللہ اسے ملک الموت کی دست برد سے محفوظ
 رکھے۔ آمین۔

ٹیکسٹ ڈائری (شب روز) / ۵۔ اسلامی ڈائری
 (جیبی سائز) / ۵۔ شارع کردہ جماعت اسلامی

مکتبہ تجلی دیوبند یو۔ پی

جناب محمد عثمان فارقلیط کے ارشادات کا جائزہ

انفار سنخ

گذرنا محال نہیں تو بعید از قیاس ضرور ہے شبستان ایک عمومی دلچسپی کا پرچہ ہے نہ کہ کوئی علمی و تحقیقی جریدہ۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مضمون کا لٹک لپکا اور اسٹائل انتہائی چاربانہ اور جذباتی ہے جس سے لگان ہوتا ہے کہ جناب فارقلیط صاحب دوسروں کے خیالات بیان نہیں کر رہے بلکہ ان کے اپنے جذبات و رجحانات ان میں پوری طرح شامل ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو خیالات کا اظہار اس قدر اشتعال انگیز اور شعلہ ریزہ پرداز میں نہ کیا جاتا۔

تیسری عجیب بات یہ ہے کہ ان خیالات کو انھوں نے دانشوروں سے منسوب فرمایا ہے۔ حالانکہ خیالات اس مجموعے میں دانش اور علم و تجربہ کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔ اگر محترم فارقلیط صاحب قادیانیت کی بے کم و کاست حقیقت اور فتوے کفر کے علمی و عقلی وجوہ سے واقف نہ ہوتے تو وہ ہرگز اس کی ضرورت نہ سمجھتے کہ علماء کو جواب کی دعوت دیں بلکہ خود ہی ان نام نہاد دانشوروں سے کہتے کہ زبان

قادیانی فرقہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ کافر ہے۔ گروہوں میں سے ایک گروہ ہے یہ بات مدت ہوئی علماء امت قطعی طور پر ثابت اور واضح کر چکے لیکن کچھ مسلمان پہلے بھی ایسے رہے ہیں اور آج بھی ایسے ہیں جنہیں اس فیصلہ پر اطمینان نہیں۔ ان ہی حضرات کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہوئے روزنامہ الجمعیتہ کے سبائب ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط صاحب نے اپنا ایک مضمون ماہنامہ شہستان میں شائع کر لیا ہے۔ انھوں نے مضمون کے ابتدائی نوٹ میں یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ میرے اپنے خیالات نہیں بلکہ مسلمانوں کے دانشور طبقہ کے خیالات ہیں اور انھیں اس غرض سے اشاعت کے لئے دیا جا رہا ہے تاکہ علماء اہل سنت ان پر غور نہ کریں اور محققانہ انداز میں ایسا جواب دیں جس سے تشکیک اور شبہات کا گرد و غبار دھل جائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مضمون ایک ایسے جریدے میں شائع کیا گیا ہے جس کا علمائے اہل سنت کی نظر سے

بولنے سے پہلے موضوع کا کچھ مطالعہ کر لو۔
ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ دانشور اور صاحبِ فہم وہ ہے
اسی موضوع پر اگر گہرے گفتگو سے پہلے اس موضوع کے تمام
ہندوں کا کم سے کم اتنا مطالعہ تو کرے کہ ضروری گوشوں
سے واقف ہو سکے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ اور قارئین بھی
یہ دیکھیں گے کہ محترم فارقلیط صاحب کے دانشوروں نے
معارض و احتجاج کی شکل میں جو کہا ہے وہ نامعقولیت،
تجری اور فضول گوئی کا شاہکار ہے۔ ان حضرات کے اپنے
بالفاظ و بیان سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ نہ تو انھوں
نے قادیانی لفظ کو کچھ مطالعہ کیا حالانکہ نبوت کے دعویدار
زرا غلام احمد کی کم و بیش سو تصانیف لائبریریوں میں
وجود ہیں جن میں سے چند بھی پڑھ لی جاتیں تو یہ جان
تے کہ مرزا غلام احمد کے دعویٰ کیا تھے، عقائد کیا تھے،
عجوبات کیا تھے۔ مگر ان دانشوروں نے اس کی برکت
میں اٹھائی۔ نہ انھوں نے علم الحدیث سے کوئی واقفیت
اصل کی حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ
حدیث ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ انھوں نے قرآن کو دیکھا
الانکہ احادیث رسول کا سرچشمہ قرآن سے بڑھ کر
وہی نہیں۔

مختصر یہ کہ خود فارقلیط صاحب اگر مسئلہ کی حقیقت اور
علقتہ گوشوں کے تشبیہ و فراز سے واقف ہوتے تو
ممکن تھا کہ ان لوگوں کو "دانشور" کا بھاری بھوسہ کم
طاب دیتے جنہیں اپنی ذمہ داریوں کا مطلق احساس
میں ہے۔ جو علم و خبر سے بالکل بیگانہ اور معقولیت سے
طاہر و بیزار ہیں۔ لہذا اس کے سوا کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ
رے بہت ہی محترم بزرگ جناب فارقلیط صاحب نے
دانشوروں کی آڑ لے کر اپنے ہی انکار و خیالات کے گل بوٹے
غذیر پھیر دیے ہیں۔ خدا و رے میں اسی کا نام ہے دوسرے
کے کاندھے پر بندوق جلانا۔ ہم اپنے بزرگ سے معافی چاہتے
ہے اگر ہمارا دوسرے خطاب بجائے دانشوروں کے خود
کی طرف ہو جائے۔ مقصود دہر حال ان شبہات و سوہن

کا دافعہ ہے جو اس مضمون میں پیش کئے گئے ہیں اور مقصود
انشار السنن براہ راست خطاب بھی حال ہو ہی جائے گا۔

سب سے پہلے یہ سطور لکھی گئی ہیں۔

"خلافت کے دور میں جب یہ سوال اٹھا کہ مسلمان کیسے
کہنا اور سمجھنا چاہئے یا ایک مسلمان کی تعریف (طبیعی نشیں)
کیا ہے؟ تو بڑی بحثوں کے بعد طے پایا کہ مسلمان وہ
ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے۔ اس بات
پر اکثر علماء نے اتفاق کیا (حضرت مولانا عبدالمجید
مظاہر اذہر صدق جدید لکھنؤ سے اس کی تصدیق کی
جاسکتی ہے۔"

کوئی بتائے اس عبارت میں "خلافت" سے کیا مراد ہے
ہر مسلمان جانتا ہے کہ جب ہم مسلمانوں میں "دورِ خلافت" کے
الفاظ بولے جاتے ہیں تو عموماً ان کا مطلب ہوتا ہے خلافت
راشدہ کا زمانہ۔ اگر دانشوروں کا اشارہ اسی زمانے کی طرف
ہو تو اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔
خلافت راشدہ کا حال تو یہ رہا کہ اگر کچھ مسلمان اپنی زکوٰۃ
خلافت کے بیت المال میں جمع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں
تو پہلے خلیفہ راشد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں
کہ یہ لوگ واجب القتل ہیں ان سے جہاد کیا جائے گا۔ بعض
صحابہ عرض کرتے ہیں کہ یا امیر المؤمنین یہ لوگ بہر حال مسلمان
ہیں۔ انھوں نے اسلام سے پھر جانے کا اعلان نہیں کیا۔
یہ صرف زکوٰۃ کے سلسلہ میں انحراف کر رہے ہیں۔ ان پر
چڑھائی کا جواز کیا ہو گا۔ اس پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پلٹ کر
انھیں سمجھاتے ہیں کہ یہ محض زکوٰۃ سے انحراف نہیں بلکہ دین
سے انحراف ہے۔ شریعت سے بغاوت ہے۔ یہ لوگ باوجود
دعوتِ اسلام کے ارتداد و زندیقہ کی راہ چل چکے ہیں لہذا
ان پر چڑھائی جائز ہو گی۔ خلیفہ اول کی یہ فہم کار گروہی
ہے۔ اختلاف کرنے والے صحابہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ
ابو بکر ٹھیک فرما رہے ہیں اور طبلِ جنگ بجا دیا جاتا ہے۔
یہ ہے خلافت کے دور کی نظیر۔ لہذا اگمان کو ٹاٹتا

ہے کہ دانشوروں کا اشارہ اس وعدہ کی طرف نہیں ہو سکتا بلکہ اس خلافت عثمانیہ کی طرف ہو سکتا ہے جس کا سقوط ابھی انگریزوں کے دور میں ہوا ہے۔ چلتے اسی دور پر نظر ڈال لیجئے۔ علم و تحقیق کے بالکل ابتدائی قاعدوں میں یہ بات شامل ہے کہ کوئی دعویٰ اگر کسی واقعے کی بنیاد پر کیا جائے تو اس واقعے کی تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ مگر یہ کیسے دانشور ہیں جو نہ تو یہ بتاتے ہیں کہ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ نہ یہ بتاتے ہیں کہ کس مقام پر واقعہ پیش آیا۔ نہ یہ بتاتے ہیں کہ ایسی کوئی مجلس کب کہاں کس نے ترتیب دی تھی جس میں مسلمان کی تعریف نہ ہو بحث آئی ہو۔ کون کون علماء اس میں شریک تھے کیا الفاظ ان کے تاریخ نگار نے ریکارڈ کئے۔ یہ سب کچھ گول گول رکھ کر حوالہ بس مولانا دہلوی کا دیا جا رہا ہے۔ حوالہ کا انداز ایسا ہے جیسے مولانا دہلوی خود اس مجلس میں شریک رہے ہوں۔

کیا اسی خوش گہمی کا نام دانشوری ہے ؟

سب جانتے ہیں کہ ہندو پاک کے ممتاز اور معروف مسلمانوں میں — کم سے کم اہل سنت کی حد تک تنہا مولانا دہلوی بادی ہیں جو قادیانیت کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور آج تک ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دینا کیوں معقول ہے۔ انھیں گواہ بنا کر کھڑا کرنا ایسے فیصلے میں یوں بھی ایک جاہل گواہ کی گواہی ہے مگر چلتے دہلی گواہی دیں لیکن منکشف تو ہو کہ دانشوروں کے اشارہ کردہ واقعے کی تفصیل کیا ہے تفصیل ہمارے فار قلیط صاحب کو بھی شاید معلوم نہیں در نہ قلم ان کے ہاتھ میں تھا بیان ضرور کرتے۔

۱۔ حق یہ ہے کہ بہت ہی نامعقول دعوے سے انھوں نے آغا کو کیا گیا ہے۔ یہ تعریف (ذہنی پیشکش) تو دراصل ”ہندو“ کی ہے کہ جو خود کو ہندو کہے وہ ہندو ہے ہر باخبر جانتا ہے کہ ہندوؤں میں بے شمار لوگ ایسور پر

فقین نہیں رکھتے بے شمار مورتی پوجا سے بیزار ہیں گوڑوں مورتی پوجا کے شائق ہزاروں قسم کی اصولی و اعتقادی اختلافات تضاد و تضاد کی حد تک ان میں پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ہندو ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کا یہ حال کیسے ہو سکتا ہے جب کہ دور رسالت ہی میں منافقین کی خاصی ریل پیل تھی جو زبانی دعوۃ اسلام کرتے تھے لیکن اسلام نے انھیں ترین کا خرقہ در دیا اور قرآن کی دسیوں آیات آج بھی ہانکے پھرتے اعلان کر رہی ہیں کہ اسلام میں زبانی دعویٰ کوئی چیز نہیں۔ بنیادی نظریات و عقائد فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ شخص یا گروہ مسلمان نہیں ہو سکتا جو عقائد و نظریات کے رخ پر اسلام کے اساسی ضابطوں سے منحرف ہو جائے۔ کیا فار قلیط صاحب کے دانشوروں کو یا خود محترم فار قلیط صاحب کو تر آن میں وہ آیات نظر نہیں آئیں جن میں جتنا یا گیا ہے کہ منافقین جہنم کا ایندھن ہیں۔ وہ درک اسفل میں ڈالے جا میں گے۔ وہ بدترین مجرم ہیں۔ اور کیا فار قلیط صاحب اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ منافق تو کہا ہی اس شخص اور گروہ کو جاتا ہے جو زبان سے خود کو مسلمان کہے لیکن تو اعدائے شرعیہ کے اعتبار سے مسلمان نہ ہو۔

ان ابتدائی سطور کے بعد تقریباً ایک کالم میں فار قلیط صاحب نے جو بات کہی ہے وہ اگرچہ نہایت معقول اور منصفانہ ہے مگر اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس قادیانی گروہ کی حمایت کا علم انھوں نے اٹھایا ہے اس کے لشکر کا ایک چوتھائی بھی انھوں نے نہیں ٹپکھا اور وہ ہمارے لیے حقائق ان کی نظر سے پوشیدہ رہے جنھیں کوئی بھی تحقیق پر آسانی آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا ہے۔

وہ فرماتے ہیں :-

”ایک بنیادی اصول جس پر سب کا اتفاق ہے یہ ہے کہ اگر قائل کے قول میں الجھن ہو تو اس کے قول کا مطلب اسی سے دریافت کیا جائے۔ اگر وہ اپنے قول کی ایسی تشریح کر دے جس میں کسی کو اختلاف ہی نہ ہو تو معاملہ ختم کر دیا جائے اگر اس تشریح میں اختلاف ہو تو پھر دلائل کیساتھ آہن طریق پر گفتگو کر لی جائے۔ ایسی بات نہ ہو کہ ہم دوسروں پر غلط الزام اور اتہام لگائیں اور پھر شور بلند کریں کہ وہ اپنے خیال اور عقیدہ کی رو سے کافر ہے۔“

بالکل معقول اور منصفانہ بات ۱۔

”ہمارے اسلاف نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ کسی کی بات کی ایسی توجیہ نہ کرنا جو قائل کو منظور نہ ہو پائل ہے۔“

یہ بھی بجا اور برحق۔ لیکن اس کے بعد جو یہ فرمایا گیا۔ ”پس قادیانی حضرات سے یہی پوچھو کہ مرزا صاحب نے خاتم النبیین کی کیا تشریح کی ہے ان پر دعویٰ نبوت کا الزام لگانا اور ان کی کفر کرنا ایک ایسا طریقہ ہے جو تمام مسلمانوں کو کافر بنا دیتا ہے۔ قائل کو یہ حق دینا چاہیے کہ وہ خود اپنے قول کے معنی اور اس کی تشریح بتائے۔“

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور واقعات و حقائق سے اس درجہ بے خبر ہیں جیسے کوئی مھوڑائی باشندہ یہ تک نہ جانتا ہو کہ ہمارا زمانہ بیل گاڑی اور ادنٹ گاڑی کے عہد سے نکل کر موٹر اور جوائی جہاز اور خلائی راکٹوں کے عہد میں پہنچ گیا ہے۔

بے خبری اور ایسی زبردست مےھومیت اور اس قدر بے پایاں اُلے ہمارے بہت ہی محترم بزرگ! آپ تو جہانمیدہ معافی ہیں۔ آپ بھی اگر بے خبری اور غفلت کا ایسا ریکارڈ قائم کریں گے تو بتائیے علم و خبر اور عقل و دانش کو کس کے دامن میں پناہ ملے گی؟

آپ اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ جس طرح بریلوی حضرات مولانا محمد قاسم، مولانا اشرف علی اور بعض دیگر علماء دیوبند کی کچھ عبارتوں سے بطور خود مطالعہ کر کے ان پر فتوے دلخ دیتے ہیں ایسا ہی سلوک قادیانیوں کے ساتھ بھی کیا گیا ہے۔ ان پر بھی علماء اہل سنت نے اپنے طور پر کچھ الزامات عائد کئے اور وہ بجا رہے ان الزامات کی تردید کئے چلے جا رہے ہیں مگر علماء سنی ہی نہیں اور برابرا ان کے کفر پر مصر ہیں۔

اگر واقعی ایسا ہو تو آپ کا اور آپ کے دانشوروں کا احتجاج معقول ہوتا لیکن ہم ابھی چند اقتباسات کے ذریعہ آپ کو آگاہ کریں گے کہ ایسی کوئی بات یہاں نہیں پائی جاتی بلکہ اس کے برخلاف یہاں علماء حق نے کفر کا فتویٰ ٹھیک ان تصریحات اور مزعومات پر دیا ہے جنہیں خود قادیانی حضرات نہ صرف زبان و قلم سے دہراتے چلے جا رہے ہیں بلکہ ان کی طرف تخلیق کو دعوت دیتے ہیں اور جوان کی دعوت قبول نہ کرے اسے کافر اور کینہ اور بدذات اور حرام زادہ تک قرار دے ڈالتے ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں ایک نکتہ کی وضاحت کر دیں۔ اس جائزے میں ہم اس موضوع پر بحث نہیں کریں گے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی بعثت کا عقیدہ رکھنا کفر ہے یا نہیں اور اگر کوئی شخص دعویٰ نبوت لے کر اٹھے تو اسے سچا ماننا آدمی کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے یا نہیں کرتا۔ اس موضوع پر بحث ہم اس وقت کرتے ہیں جب گفتگو کسی قادیانی سے ہوتی۔ فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور نہیں کہہ رہے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ نبوت برحق ہے۔ یادہ واقعی سچ و معنی میں۔ یا رسول اللہ کے بعد بھی انبیاء کی بعثت کا عقیدہ اسلامی عقیدہ ہے۔ اس کے بجائے ان کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ انہی تمام عقائد و روایات کو وہ بھی موجب کفر سمجھتے ہیں لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے فی الحقیقت

بدونوں ہی نکات ایسے تھے کہ فارقلیط صاحب اور ان کے دانشوروں کو اگر اپنی ذمہ داری اور آخرت کی باز پرس کا بھی احساس ہوتا تو زبان کھولنے سے قبل وہ کم سے کم اتنا تو کہہ ہی لیتے کہ پہلے مکتبہ کے سلسلہ میں مرزا غلام احمد کی ایک دوا آخری تصانیف اپنی چشم مبارک سے دیکھ لیں یا ان کے صاحب زادے اور خلیفہ اول مرزا بشیر الدین محمودی "حقیقت النبوة" ملاحظہ فرمائیں اور دوسرے مکتبہ کے سلسلے میں فتہ آن وحدیث برنظم ڈیولوپمنٹ لیس یا اتنی قابلیت اور فرصت نہ ہو تو یہ تحقیق فرمائیں کہ چودہ سو سالوں میں جو ہزاروں محققین، مفسرین، متکلمین، مجتہدین اور اصولیین گذرے ہیں انھوں نے اس مسئلہ میں کیا کہا ہے۔ کن ماخذ کی بنیاد پر کہا ہے، کن دلائل کو اختیار فرمایا ہے۔

یہ ضروری زحمت اگر وہ اٹھا لیتے تو بے خبری اور ہرزہ سرائی کا وہ طوفان اٹھانے کی ضرورت نہ پڑتی جو ہنرمندانیت سے بے نیاز ہو کر اٹھا دیا گیا ہے اور جس کی روشنی میں ہر باخبر اور عقلیت پسند آدمی ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے یہ کہ دانشوری اب چہالت فاشیہ اور حماقتیہ خیاں کا نام رکھ لیا گیا ہے۔ جو مختصر جنت زیادہ مغفل بن کا مظاہرہ کرے اتنا ہی بڑا دانش ور کہلائے اور جتنی زیادہ زبان درازی کا کھیل دکھلائے اتنا ہی زیادہ روشن فکر سمجھا جائے۔

کوئی حمید دلوائی یا چچا اگلا اس طرح کی دانشوری کا کہ تب دکھلاتا تو ہمیں نہ رنج ہوتا نہ تعجب۔ مگر غلام فارقلیط جیسا اچھا مسلمان اور حساس و ہمہ صحافی اس گھٹیا تنظیم پر اترا آیا ہے اس سے بڑا دکھ پہنچا تو عجیب بھی ہوا۔ بہر حال ہم وہ خدمت ضرور انجام دیں گے جس کی دعوت موصوف نے دی ہے اور بحث و استدلال کے معروف ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر بہرہ منکے پر تحقیقی مواد پیش کریں گے۔ جن لوگوں نے یہ طے کر لیا ہو کہ ہم فقط اپنی تہہ جابیں گے کسی اور کی نہیں ہیں

دعوہ نبوت نہیں کیا۔ یا کیا تو ایسی تاویلات کے ساتھ جن میں یہ گنجائش ہے کہ ان کی اچھی تعبیر کی جاسکے۔ لہذا ان پر کفر کا فتویٰ صادر کرنا ظلم ہے۔ یہی خیال ہے جس کا اظہار ان خطوط سے ہو رہا ہے جو ابھی ہم نے نقل کیں۔ لہذا ہم دستاویزی شہادتوں کے ذریعہ صرف یہ ثابت کریں گے کہ قادیانیوں پر کسی من گھڑت الزام کی بنیاد پر فتویٰ کفر عائد نہیں کیا گیا۔ علماء حق نے ذرہ برابر ظلم نہیں کیا۔ انھوں نے قادیانی مدعی نبوت کے کسی بھی قول سے اپنے طور پر کوئی معنی اخذ نہیں کئے بلکہ مدعی نبوت اور اس کے مستند جانشینوں کے کی چوٹ دن دھاڑے نکرار و اصرار کے ساتھ برابر ان عقائد و مزعومات کی گردان کئے چلے جا رہے ہیں جن کے کفر و طغیان ہونے پر علمائے اسلام کے کسی بھی حلقے اور طبقے کو کسی بھی زمانے اور کسی بھی ملک میں اختلاف اور شک نہیں رہا ہے۔ جو خود فارقلیط صاحب کے نزدیک بھی عین کفر ہیں۔ حتیٰ کہ ابھی جب پاکستان کی متعلقہ کمیٹی نے مستند قادیانی بزرگوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ خود اپنی زبان سے اپنے عقائد کا اظہار کر سکیں تاکہ بزرگائیت نہ رہے کہ ہمارے عقائد کی غلط ترجمانی کر کے فیصلہ دیا لایا گیا تو انھوں نے بھی ٹھیک وہی عقائد ظاہر کئے جنھیں کسی بھی نرم سے نرم تاویل کے ذریعہ اسلام سے نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ اسی لئے کمیٹی مجبور ہو گئی کہ وہ فیصلہ دے جس کا تقاضا یہ عقائد کر رہے ہیں اور کسی ایک بھی ممبر کو ایسی گنجائش نہ مل سکی کہ اس فیصلے کی خلاف ورزی کرے۔

فارقلیط صاحب کے مضمون میں جن نکات پر خلاص جذباتی انداز میں زور و قلم صرف کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

- (۱) مرزا غلام احمد کا دعوہ نبوت۔
- (۲) قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی دنیا میں تشریف آوری۔

میں سے ایک ہے۔ حیرت ہے کہ آپ جیسا ہی بصیرت
دو بالکل مختلف چیزوں کا فرق ٹھوس نہ کر سکا حالانکہ یہ
فسق باریک نہیں تھا۔

محمد دبریلوی یا کسی اور قبوری بزرگ نے علمائے دیوبند
یا علمائے اہل حدیث کے خلاف جو فتوے دیئے ہیں ان کی
پوزیشن یہ ہے کہ وہ ان علماء کی بعض عبادات سے اپنے
طور پر ایک مطلب اخذ کرتے ہیں اور اس پر کفر و ضلالت
کا فتویٰ دے ڈالتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے مولانا امین الدین
کی ایک عبارت سے یہ اخذ کیا کہ ”خدا جھوٹ بولتا ہے“
یا یہ اخذ کیا کہ انبیاء و اولیاء کو ”چمار“ کہہ دینے میں کوئی
بے ادبی نہیں۔ یا مثلاً مولانا اشرف علیؒ کے بعض فتروں کا
مطلب انھوں نے یہ نکالا کہ اللہ کے رسولؐ کا مرتبہ ہم سے
بس اتنا ہی زیادہ ہے جتنا بڑے بھائی کا۔ یا یہ نکالا کہ شیطان
کا علم حضورؐ کے علم سے زیادہ ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کا ہر عقیدہ و خیال فاسد
ہے جس کی توقع کسی بھی مسلمان سے نہیں کی جاسکتی۔ اس پر
کفر و گمراہی کا فتویٰ صادر کرنا بھی فی نفسہ غلط نہیں ہے۔ خود
علمائے دیوبند بھی ایسی دہائی باتوں کو کفر و ضلالت ہی کے
خانے میں رکھتے ہیں۔ لیکن غلطی یہ ہے کہ مذکورہ علماء کی
عبارات کا یہ مطلب تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار کہہ رہے ہیں کہ
ہمارا انشاء تم غلط سمجھ رہے ہو مگر دبریلوی حضرات ان کی
تشریحات کو سنتے ہی نہیں اور براہِ فتوہ کی گردان کے
چلے جا رہے ہیں۔ ایسی روش کو یقیناً نامعقول کہیں گے اور
یہ صریح طور پر اس اصول انصاف کے خلاف ہے جس کا
ذکر آپ بھی فرمایا ہے یعنی توحید القول بمالایرضی بہ
قائلہ۔

اس کے برعکس قادیانی مسئلوں ہے کہ مرزا غلام احمد
نے پہلے کچھ مدت تک مجدد اور مصلح ہونے کا دعویٰ کیا،
پھر یہ دعویٰ دعوۂ نبوت میں تبدیل ہوا لیکن ٹھوڑے سے
تھفظ اور تاویل کے ساتھ مثلاً ظلی اور بروزی کی قید
استعمال کی گئی مگر تیسرے مرحلے میں یہ قید بھی اٹھ گئی اور

انھیں تو دنیا کا کوئی بھی محقق اور نافت ان کی جگہ سے
نہیں ہلا سکتا مگر جو لوگ واقعۂ صمد اقتدار کے جویا ہوں
اور معقولیت انھیں اپیل کر سکے وہ انشاء اللہ توری
طرح مطمئن ہو جائیں گے کہ علمائے اہل سنت کا موقف
سو فی صدی انصاف و معقولیت پر مبنی ہے اور فارغیت
صاحب نے جن خیالات کو مثبت قرطاس فرمایا ہے وہ جیل
محض اور کوری کج سمجھی کے سوا کسی شے کے مظہر نہیں۔

فارغیت صاحب نے اپنی ابتدائی ہی سطور میں حرب
عقائد پر وادیا کیا ہے اور پھر ان فتوؤں کا تذکرہ فرمایا
ہے جو دبریلوی علماء اکثر علماء کے خلاف داغہ رہے
ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قادیانیوں کی تکفیر بھی اسی قبیل
کی ایک چیز ہے اور پاکستان میں قادیانیوں کے غیر مسلم قرار دینا
ایک غلط قسم کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے مظاہرے کے
سوا کچھ نہیں۔

محترم فارغیت صاحب کا خیال یہ ہے کہ بے دریغ کفر
کا فتویٰ جھار دینے کی جو وہاں ہمارے یہاں مدت سے
عام ہے یہ قادیانیوں کی تکفیر بھی اسی و باکی ایک نمود ہے
وہ تحریر فرماتے ہیں:-

”آج کل حرب عقائد کا فتنہ ہر چار سو پاپے“

تکفیر کی تو پیں بڑی آزادی سے داغی جا رہی ہیں

تو بچوں کو مطلق پر و انہیں کہ کون کون ان کا

نشانہ بن رہا ہے۔ قادیانیت کا فتنہ کھینچ کر

پاکستان سے ہندوستان لایا گیا ہے اور بے بہرہ

لوگ بالواسطہ اس کی اشاعت میں مدد دے

رہے ہیں۔“

ہم ان سے عرض کریں کہ اس اظہار خیال میں آپ نے
ہوشمندی اور عدل پسندی سے کام نہیں لیا۔ مثیل میں آپ
نے شد و مد سے مجدد دبریلوی کے تکفیری فتاویٰ کا ذکر کیا
ہے اور عوام کو یہ تاخیر دینا چاہا ہے کہ قادیانیوں کی خلاف
علماء اہل سنت کا زیر بحث فتویٰ بھی ایسے ہی فتاویٰ

لے کسی قول کا ایسا مفہوم نکالنا جسے خود تائیں درست نہ سمجھتا ہو۔

اب ہم کچھ ایسے اقتباسات پیش کریں گے جن سے واضح ہو گا کہ مرزا غلام احمد کا دعویٰ نبوت دو وضاحت کے کس درجے میں ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ اپنا حاصل مطالعہ پیش کیا جائے ہم فارقلیط صاحب کے دریافت (۱) میں لکھے گئے کہ جس ماہنامہ شہستان میں آپ نے اپنا مضمون شائع کر لیا ہے اسی کے ستمبر شمارہ والے شمارے میں قادیانیت کے موضوع پر دو مضمون چھپے ہیں کیا وہ بھی آپ نے پڑھے؟ اور اگر پڑھے تو کیا اس کے بعد بھی آپ اسی خیال پر قائم ہیں کہ مرزا غلام احمد اور ان کی امت کو کافر قرار دینا زیادتی ہے؟

ان دونوں مضامین کے چند مندرجات یہاں دہرائے جائیں تو بات کافی واضح ہو جائے گی۔

(۱) "ایک غلطی کا ازالہ (اشتہار) میں حضرت مسیح موعود نے فرمایا کہ محمد رسول اللہ والذین معہ اشباح الخ کے الہام میں محمد رسول اللہ سے مراد میں ہوں اور محمد رسول اللہ خدا نے مجھے کہا ہے۔" (راخبار الفضل) قادیان ج ۲، نمبر ۵: موزعہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۵ء شہستان ستمبر ۱۹۱۵ء ص ۱۶۱)

(۲) "اس کے (یعنی نبی کریم کے) لئے چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں کا۔ اب کیا تو انکار کر چکا؟" (اعجاز احمدی مصنفہ مرزا غلام احمد ص ۱)

(۳) ابن حریم کے ذکر کو چھوڑو

اس سے بہتر غلام احمد ہے

(دافع البلاء ص ۷)

(۴) "میری شان میں ہے وما یطقی عن

الہوی یعنی مرزا اپنی خواہش سے نہیں

بولتا۔" (اشتہار انعامی پانسو)

(۵) "مکمل مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اور میری

دعوت کی تصدیق کر لی ہے مگر کج بولوں اور

صاف صاف کہہ دیا گیا کہ میں ٹھیک ٹھیک ایسا ہی ہوں جیسے کہ پہلے ہوتے آئے ہیں۔ مجھ پر اسی طرح وحی کا نزول ہوتا ہے جس طرح انبیاء باسبقت پر ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے صریح قطعی الفاظ میں خود کو تمام انبیاء سے افضل قرار دیا اور پورے زور و شور سے کہا کہ جو بھی عظمت و رفعت اور شان و اہلیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آئی تھی وہ سب کی سب میرے بھی حصے میں آگئی ہے۔ بلکہ بعض اعتبار سے میں ان پر بھی ذوقیت لے گیا ہوں۔

فرمایا جائے کہ یہ سب کچھ کیا اس کے لئے کافی نہیں کہ علماء حق اسے کفر و ضلالت قرار دیتے؟ یہ دعویٰ اور بیضامین مرزا صاحب کے کسی مرموز فقرے سے اخذ نہیں کئے گئے تھے۔ نہ ایسا تھا کہ وہ اعلان کے مستند ترجمان ان دعویٰ کا انکار کرتے ہوں اور یہ کہتے ہوں کہ ہماری طرف غلط باتیں منسوب کی جا رہی ہیں۔ بلکہ وہ تو اصرار کے ساتھ انھیں دہراتے چلے جاتے تھے اور آج بھی مستند قسم کے قادیانی بلا تامل ان ہی دعویٰ پر جمے ہوئے ہیں۔ قادیانی مذہب کی بنیاد ہی اس عقیدے پر ہے کہ مرزا غلام احمد نبی ہیں۔ ان کی نبوت کو تسلیم نہ کرنے والا کاجہمی ہے۔ انھیں جس نے نبی نہیں مانا یہ مسلمان نہیں۔ کسی بھی غیر قادیانی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ کسی بھی غیر قادیانی کی نماز حجازہ بھی بائز نہیں کیونکہ وہ تو کافر ہے اور کافر کے لئے دعائے غفرت حرام ہے۔ کوئی قادیانی اپنی لڑکی کسی غیبہ قادیانی کو نہیں دے سکتا کیونکہ اس کے نزدیک نام غیر قادیانی کافروں میں۔

اب فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور انصاف رائیں کہ ایسے گروہ کی تکفیر پر جو اراغ پا ہونا اور اسے بریلویوں کی تکفیر سے مماثلت دینا کیونکر معقول ہو سکتا ہے۔

کی تحریروں میں کثرت سے موجود ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ مرزا صاحب حضرت علیؑ کے بارے میں جو توہین آمیز روایت اختیار کرتے ہیں اس کا ایک نمونہ اسی ستمبر والے شہستان موجود ہے۔

”یسوع کے ہاتھ میں سوائے مکر و فریب کے اور کچھ نہیں تھا پھر انکس کہ یہ نالائق عیسائی ایسے شخص کو خدا بنا رہے ہیں۔ آپ کا خاندان بھی نہایت پاک و مطہر ہے۔ تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زناکار اور کبھی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔“

(ضمیمہ انجام آٹھم ص ۷ نور القرآن نمبر ۲ ص ۱۲)

کیا یہ عبارت اپنے مفہوم و مدعا کے سلسلہ میں ذرا بھی مبہم اور مرمرور ہے۔ کیا علماء اہل سنت زیادتی کہتے ہیں اگر اس عبارت اور ایسی ہی متعدد عبارتوں کے پیش نظر یہ کہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد نے حضرت علیؑ کی صریح تذلیل و توہین کی ہے۔ پھر تم دانشور ان کرام سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک ایسے علیل القدر مہاجر کے خلاف بدذہابی اور یہودہ گوئی کفر نہیں ہے جس کی تکبر و تحقیر قرآن نے بہ الفاظ صریح کی ہو۔ ان صاحبِ حبشی مرزا صاحب کا حال یہ ہے کہ یہ حضرت علیؑ کو یوسفؑ پر صحنی کا بیٹا کہتے ہیں۔ (ازالۃ الاولیاء ص ۱۲۵ شتی نوح ص ۱۷) حالانکہ کسی بھی مسلمان کو یاد دلانے کی حاجت نہیں کہ قرآن کی اطلاع کے مطابق حضرت علیؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور اسی لئے ان کا نام ابن مریم رکھا گیا۔ وہ بغیر باپ کے کیونکر پیدا ہوئے اس کی بھی تفصیل قرآن میں موجود ہے۔ تو کیا قرآن کو بر ملا جھٹلانا اور خدا سے مکابرہ کرنا بھی ایسا جرم نہیں جس کے مرتکب کو گمراہ اور مردود قرار دیا جاسکے۔

فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور و کواور بعض اور لوگوں کو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی ہے کہ مرزا غلام احمد نے صریحاً دعوت نبوت نہیں کیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

بدکاریوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔ دائینہ کمالات ص ۵۲)

(۶) ”جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی، یہودی، مشرک اور جہنی ہے۔“ (نزول صح ص ۲۲۷ تذکرہ تحفہ گوثریہ ص ۳۱)

(۷) ”بلاشبہ ہمارے دشمن بیا بانوں کے خنزیر بن گئے اور ان کی عورتیں گیتوں سے بھی بڑھ گئیں۔“

(نجم الہدیٰ ص ۱۹۷ در زمین ص ۱۹۷)

(۸) ”جو شخص ہمارے فتح کا قائل نہ ہو گا تو صاف صاف سمجھا جائے گا کہ اس کو ولد الحرم بننے کا شوق ہے۔“ (انوار الاسلام ص ۳)

محترم فارقلیط اور ان کے دانشور فیصلہ فرمائیں کہ ان عبارتوں میں سے کوئی عبارت اپنے مفہوم و مدعا میں صریح نہیں ہے۔ اور یہ بھی فیصلہ فرمائیں کہ جو مطالب و مدعا فی اور افکار و عقائد ان عبارتوں سے ملنا ابہام ظاہر ہو رہے ہیں کیا وہ اس بات کے لئے کافی نہیں کہ مرزا غلام احمد اور اس کے پیروں کو خارج از اسلام، بد زبان، بدتمیز اور یہودہ گو قرار دیا جائے۔

ان عبارتوں سے ایک بات تو یہ صاف ظاہر ہے کہ مرزا صاحب خود کو نہ صرف نبی قرار دیتے ہیں بلکہ ابن مریم حضرت علیؑ سے بڑا نبی تصور کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنی نبوت کے منکر کو کافر سمجھتے ہیں تیسری بات یہ ظاہر ہے کہ وہ قرآن میں تحریف کہتے ہیں۔ مسلمان جانتا ہے کہ قرآن کا براہِ راست خطاب اس محمد عربیؐ سے ہے جو چودہ سو سال قبل دنیا سے گزر چکا۔ آج اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں آیات میں خاص طور پر مجھے مخاطب بنایا گیا ہے تو فارقلیط صاحب انصاف فرمائیں کہ اس سے بدتر اور فحش تحریف قرآن اور کیا ہوگی۔

پھر یہ نہیں کہ یہ تینوں باتیں صرف ان ہی چند اقتباسات سے ظاہر ہو رہی ہوں۔ یہ تو مرزا صاحب

سکتا ہے کہ مرزا نے کسی مستقل نبوت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک ذیلی اور ظنی نوع کی نبوت کا اعلان کیا ہے جو اپنی جوہری نوعیت میں ولایت اور تجدید کے ہم معنی ہے۔ وہ فقط ایک مصلح اور مجدد ہونے کے مدعی ہیں نہ کہ حقیقی نبوت کے۔ علماء زبردستی ان کے سر دعویٰ نبوت مرطوب رہے ہیں۔

فار قلیط صاحب کے مضمون سے پیچھے جو اقتباسات ہم نے دیئے ان سے ظاہر ہے کہ موصوف اور ان کے دانشور بھی اسی طرح کے فریب خوردوں میں شامل ہیں۔ انھیں بالکل خبر نہیں کہ مرزا صاحب نہ زینہ بزینہ جڑھ کر کہاں پہنچے اور اپنے دعویٰ نبوت میں انھوں نے تاویل و توجہہ کا کوئی قسم نہیں لگا رہے دیا۔ حرمت اور تطعیت کا کوئی پردہ دار ایسا نہیں جو انھوں نے دعویٰ نبوت میں اختیار نہ فرمایا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صرف علماء ہی نے نہیں ڈاکٹر اقبال جیسے جدید تعلیم یافتہ نے انتہائی کمر کئے ساتھ اعلان کیا کہ مرزا کا دعویٰ نبوت، نبوت محمدی کے خلاف بغاوت ہے مرزائی ملت اسلامیہ کا جزو نہیں ہیں وہ ایک نیا دین لائے ہیں جو سراسر باطل ہے۔ آگے ہم ڈاکٹر اقبال کی تحریر بھی نقل کریں گے۔

بجائے اس کے کہ ہم مرزا صاحب کی کتابوں سے کچھ نقل کریں اور فار قلیط صاحب کے دانشوروں کو اس کی تصدیق کے لئے ادھر ادھر لائبریریوں میں دوڑنا پڑے زیادہ آسان اور قابل اعتماد راہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کے صاحبزادے مرزا بشیر الدین محمود کی کتاب ”حقیقۃ النبوت“ سامنے رکھ دیں۔ یہ جزا مرزا کے خلیفہ اول بھی ہیں اور ان سے بڑھ کر مرزا کے علوم کا وارث اور عقائد و افکار کا عالم اور نمائندہ و ترجمان کوئی نہیں۔

یہ کتاب خلیفہ حبیب نے کیوں لکھی تھی اسے بھی

ختم نبوت کے منکر نہیں ہیں اس کی وجہ اس تاریخی صورت حال سے بے خبری ہے جس سے واقف ہوتے بغیر اس مسئلے کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ تاریخی صورت حال یہ ہے (جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں) کہ مرزا غلام احمد نے دفعتاً اور ایک اپنی دعویٰ نبوت نہیں کیا ہے۔ ابتداء میں وہ صرف ولایت و تجدید اور الہام کشف کے مدعی تھے اور اعتراض کرتے تھے کہ نبوت اور وحی کا سلسلہ محمد عربی پر ختم ہو چکا۔ یہ اعتراض ان کی ابتدائی تحریروں میں جگہ جگہ موجود ہے۔ پھر ایک دور آیا جب ان کے خیالات بدلے اور انھوں نے دیے لفظوں میں اپنے نبی ہونے کا اظہار کیا اور الہام کی جگہ لفظ وحی استعمال فرمانے لگے۔ لیکن ابھی کچھ نہ کچھ تحفظ و تاویل کے مدارج باقی تھے۔ ابھی وہ اپنی نبوت کو ایک ایسی نبوت قرار دے رہے تھے جو اصل نبوتوں کا سایہ اور بردہ ہے۔ یہ نبوت ان کے بقول رسول اللہ کے ختم نبوت کے منافی نہیں تھی۔ اسے مستقل بالذات بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد آخر وہ مرحلہ بھی آ ہی گیا جب انھوں نے ساری تاویلات اور تحفظات ختم کر کے برملا اعلان کیا کہ میں ٹھیک ٹھیک ویسا ہی نبی ہوں جیسے پہلے ہوتے آئے ہیں۔ رسول اللہ پر نبوت کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ میری نبوت رسول اللہ کے سوا تمام انبیاء کی نبوت سے افضل و برتر ہے۔ میرا منکر کافر ہے اور مجھ پر ایمان لانا اسی طرح پوری دنیا کا فرض ہے جس طرح مجھ سے قبل رسول اللہ پر ایمان لانا ساری دنیا کا فرض تھا۔

اب کھلی بات ہے کہ جن لوگوں نے اس تاریخ کا اور مرزا کی تمام تحریروں کا مطالعہ نہیں کیا انھیں آسانی کوئی بھی شخص مرزا کی ابتدائی تحریروں کے اقتباس دکھلا کر یہ باور کرا سکتا ہے کہ مرزا انوکھیں بھی نبوت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ علماء خواہ مخواہ ان پر الزام عائد کرتے ہیں۔ یاد و سر سے مرحلے کی تحریریں نکھلا کر یقین لا

عوام بجا رہے تو پوری طرح یہ بھی نہیں جانتے کہ
”مسیح موعود“ کا کیا مطلب ہے۔ مسیح کہتے ہیں حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کو اور ”موعود“ کا مطلب یہ ہے کہ وہی عیسیٰ
جنہیں دنیا میں بھیجے گا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس حق پر ہم
آج مستقل گفتگو کریں گے۔

حقیقتہ النبوة کے مصنف مرزا بشیر الدین محمود نے
اس کتاب میں دو چار نہیں بلکہ اکٹھے میں دلائل غلام احمد
کی نبوت و رسالت پر قائم کئے ہیں اور ان میں سے دلیل
نمبر ۱ یہ ہے کہ خود مرزا غلام احمد نے اپنے آپ کو بلا ریت
ابہام نبی اور رسول کہا ہے۔ کب کہاں کن الفاظ میں کہا
ہے اس کی وضاحت کے لئے انھوں نے مرزا صاحب کی
تخریروں سے دس دس اکٹھی ۳۹ (ایک کم چالیس)
عبارتیں پیش کر دی ہیں جو واقعہ ”دعوۃ نبوت“ کے لئے
دو اور دو چار کی طرح قطعی اور صریح ہیں۔ ان میں سے کچھ
محترم فارقلیط صاحب اور ان کے دانشوران عظام بھی
ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں۔
(۲) میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں
میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام
نبی رکھا ہے۔

(۳) پس اس میں کیا شک ہے کہ میری پیشین گوئیوں کے بعد
دنیا میں زلزلوں اور دوسری آفات کا سلسلہ شروع ہو جائے
میری سچائی کے لئے ایک نشان ہے۔ یاد رہے کہ خدا کے
رسول کی خواہ کسی حصہ زمین میں تکذیب ہو مگر اسکی تکذیب
کے وقت دوسرے مجرم بھی پکڑے جاتے ہیں۔

(۴) ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول و نبی ہیں۔
(۵) خدا نے نہ چاہا کہ اپنے رسول کو بغیر کوئی چھوٹے۔
(۶) خدا تعالیٰ..... قادیان کو اس طاعون کی خونخوار
تباہی سے محفوظ رکھے کا کیونکہ یہ اس کے رسول کا تختہ کلا ہے۔
(۷) سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں انار رسول بھیجا۔

(حقیقتہ النبوة ص ۲۱۲ سے ص ۲۱۳ تک)

گو شگزار کر لیا جائے۔ قادیانیوں ہی میں کچھ لوگ
یہ پیدا ہوئے جن کا خیال تھا کہ مرزا غلام احمد نبی
نہیں ہیں صرف مجدد ہیں۔ اس خیال کی وجہ شاید مرزا
ما صاحب کی ابتدائی تحریریں تھیں۔ یہ خیال جب
انھوں نے قائم کر لیا تو مرزا صاحب کے تمام اقوال کو
حق بنا دیا۔ اسی کے ذریعہ اسی کے مطابق کرنا چاہا اور ایک
مستقل پارٹی ”لاہوری پارٹی“ کے نام سے بن گئی۔
اس پارٹی کو مرزا کے ”خلیفہ برحق“ کیسے برداشت
نہتے۔ مرزا کے صریح و مستقل دعوۃ نبوت کے بعد
اس طرح کی پارٹی کا کوئی جواز ہی نہیں تھا لہذا خلیفہ
ما صاحب نے ”حقیقتہ النبوت“ کے نام سے کتاب لکھی جس
میں ہمیشہ کے لئے یہ قطعی فیصلہ کر دیا کہ مجددیت یا ظلی و
روزی نبوت کے جتنے بھی دعوے مرزا غلام احمد نے
بتداء کئے تھے ان سب کو خود موصوف ہی نے مسترد
کر دیا۔ فرما دیا تھا اور صاف صاف اعلان کر دیا تھا
کہ میں بلا ریب و شک اور بلا تاویل و توجہ نہی ہوں۔
میں نبی جس پر ایمان لانا ساری مخلوق کا فرض ہے
اور ایمان نہ لانے والا بالیقین کافر ہو گا۔

آئیے ”حقیقتہ النبوت“ پر نظر ڈالیں۔ فارقلیط
ما صاحب اور ان کے دانشور بھی اس مطالعاتی سیر میں
مارے شریک ہو جائیں تاکہ ان کی یہ پہاڑ جیسی غلط
بی رفع ہو جائے کہ علمائے اہل سنت نے زبردستی
مرزا غلام احمد کے سر دعوۃ نبوت طرہ دیا ہے اور ان
لے اقوال سے ایسے مطالب نکال لئے ہیں جن پر وہ
اضعی نہیں ہیں۔

”حقیقتہ النبوة“ کی پیشانی ہی پر یہ عبارت تحریر

ہے۔

”مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و
رسالت پر اجماع قاطعہ کے ساتھ ثابت کی گئی
ہے۔“

مرزا صاحب کی ان عبارتوں کے ساتھ مصنف نے مکمل حوالے بھی دیدیتے ہیں۔ فارقلیط صاحب، ارشاد فرمایا کیا ان عبارتوں میں ایک بھی عبارت اپنے مفہوم میں غیر صریح ہے۔ اگر ۳۹ عبارتیں اسی طرح کی موجود ہوں تو کیا پھر بھی کوئی صحیح الدماغ آدمی بقائمی پرورش و اس پر ہرزہ سرائی کر سکتا ہے کہ علماء اہل سنت خواہ خواہ مرزا غلام احمد پر دعویٰ نبوت کا الزام لگا سکتے ہیں۔

اور دیکھئے۔ ان عبارات کے علاوہ ”حقیقۃ النبوت“ میں ۳۹ الہامات ایسے پیش کئے گئے جن میں اللہ نے مرزا صاحب کو نبی اور رسول کہا مصنف جناب مرزا محمود صاحب ایسے ہی دلائل و شواہد کے ہجوم میں رقم طسرا نہیں۔

(۱) آپ (یعنی مرزا غلام احمد صاحب) نبی ہیں اور خدا نے اور اس کے رسول نے ان ہی الفاظ میں آپ کو نبی کہا ہے جن میں قرآن کریم اور احادیث میں پچھلے نبیوں کو نبی کہا گیا ہے (ص ۱۱۷)

(۲) پس اس میں کیا شک ہے کہ حضرت مسیح موعود قرآن کریم کے معنوں کی رو سے بھی نبی ہیں اور لغت کے معنوں کی رو سے بھی نبی ہیں۔ (ص ۱۱۷)

(۳) پس شریعت اسلام نبی کے جو معنی کرتی ہے اس معنی کو حضرت صاحب ہرگز مجازی نبی نہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔ (ص ۱۱۷)

(۴) بلحاظ نبوت ہم بھی مرزا صاحب کو پہلے نبیوں کے مطابق مانتے ہیں۔ (ص ۱۱۷)

”تاریخی و تحقیقی صورت حال کو مرزا محمود بایں الفاظ پیش کرتے ہیں۔“

(۱) ”جن کتب میں آپ (مرزا غلام احمد نے)

اپنے نبی ہونے سے صریح الفاظ میں انکار کیا

ہے اور اپنی نبوت کو جزئی اور ناقص اور

محدودوں کی نبوت قرار دیا ہے وہ سب کی

سب بلا استثناء ۱۹۷۷ء سے پہلے کی کتب میں اور ۱۹۷۷ء کے بعد کی کتب میں سے ایک کتاب میں بھی اپنی نبوت کو جزئی قرار نہیں دیا اور نہ ناقص اور نہ نبوت محمد (ص ۱۱۷)

(۲) ”۱۹۷۷ء سے پہلے کے حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے اب منسوخ ہوئی اور ان سے حجت بکڑنی غلط ہے۔“ (ص ۱۱۷)

(۳) ”پہلے بھی (یعنی ۱۹۷۷ء سے پہلے بھی) نبی کے

نام سے آپ کو پکارا جاتا تھا لیکن آپ اس کی

تاویل کرتے رہتے تھے لیکن جب بار بار الہامات

میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبی و رسول کے نام

سے پکارا تو آپ کو معلوم ہوا کہ آپ واقعہ

میں نبی ہی ہیں غیر نبی نہیں جیسا کہ پہلے سمجھتے

تھے اور نبی کا لفظ جو آپ کے الہامات میں آتا

ہے صریح ہے قابل تاویل نہیں۔“ (ص ۱۱۷)

اب دانشوران محترم سوچیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟ حقیقۃ النبوت کے مصنف نے مرزا صاحب کی نبوت کے ۳۹ دلائل اور ۳۹ الہامات پیش کرنے کے بعد نتیجہ جو کچھ ارشاد کیا ہے اس کا بھی مشاہدہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”اب کس طرح ممکن ہے کہ اس قدر الہامات کی

موجودگی میں ہم حضرت مسیح موعود کو غریبی قرار

دیں اللہ تعالیٰ تو ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں

بیسویں اور سیکڑوں دفعہ آپ کو نبی کے نام سے

یاد فرماتا ہے اور ہم سب جگہ یہ تاویل کر لیں کہ ان

سب الہامات سے مراد اسی قدر ہے کہ آپ نبی

نہیں مگر نبیوں کی کوئی صفت آپ میں پائی جاتی

ہے۔ کیا اس کی نظیر دنیا میں کسی اور انسان میں

بھی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بار بار نبی کہہ کر

پکارتا ہے لیکن درحقیقت وہ نبی نہیں ہوتا۔“

”کیا سب نبیوں کو ہم اس لئے نبی نہیں مانتے

بلکہ انھیں زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا۔ قادریانی حضرات اس کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اسی طرح انتقال فرما چکے جس طرح دوسرے انسان انتقال کرتے ہیں۔ اگر ہماری گفتگو کسی قادریانی سے ہوئی تو یقیناً ہم اس نکتہ پر بھی مدلل بحث کرتے لیکن فارقلیط صاحب کے مضمون میں اس نکتہ کو نہیں چھیڑا گیا اور توقع یہی کی جاسکتی ہے کہ تمام جہور امت کی طرح وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہوں گے کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے لہذا اسے اپنے اور فارقلیط صاحب کے مابین متفق علیہ مانتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں اور تفصیلی گفتگو اس نکتہ پر کرنا چاہتے ہیں کہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ کی دنیا میں تشریف آوری کا عقیدہ کیا علمی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں انسو سے ہے کہ فارقلیط صاحب نے مطالعہ و تحقیق کی ادنیٰ زحمت اٹھائے بغیر اس عقیدے کا نہ صرف انکار کیا ہے بلکہ اس کے قائلین کو قادیانیوں ہی کی طرح ختم نبوت کا منکر قرار دے ڈالا ہے اور اس قدر تلخ و تند الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ مسانیت اور بردباری کو پسینہ آگیا ہے۔ حتیٰ بحث ادا نہ ہو گا اگر ہم موصوف کی وہ عبارتیں نقل نہ کریں جن سے ان کے مزاجی میزچہ اور جو ش غضب کا پتا چلتا ہے۔ نیز یہ پتا چلتا ہے کہ ایک بزرگ صحافی اور نیک دل مسلمان ہونے کے باوجود وہ علم الحیرت اور بعض بنیادی معلومات سے کس قدر بے بہرہ ہیں۔

نزول عیسیٰ کے مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہمارے عوام اس کی حقیقت سے بہت ہی کم واقف ہیں اور فارقلیط صاحب کا مضمون پڑھ کر انھیں یہ باور کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی داسہاتی اور اساطیری فحش کا عقیدہ ہے جو بعض اور غلط عقائد کی طرح مسلمانوں میں گھس آیا ہے۔

فارقلیط صاحب نے رقم فرمایا ہے :-

”بہ قرآن کی نص قطعی ہے کہ حضرت عیسیٰ پہلے گزر چکے اور ان کے بعد سب آئندہ اسلام کے پیغمبر بنیں گے“

کہ خدا تعالیٰ نے ان کو نبی کہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہی خدا جس نے موسیٰ سے کہا تو نبی ہے تو وہ نبی ہو گیا اور عیسیٰ سے کہا تو نبی ہے تو وہ نبی ہو گیا لیکن آج سچ موعود سے کہتا ہے کہ تو نبی ہے تو وہ نبی نہیں ہوتا۔ اگر نبی بننے کے لئے کوئی اور لفظ ہوتے ہیں تو انھیں ہمارے سامنے پیش کر دیجئے میں معلوم ہو سکے کہ پہلے نبیوں تو اس طرح نبی کہا جاتا تھا تب وہ نبی ہوتے تھے اور سچ موعود کو اس کے خلاف کسی اور طرح نبی کہا گیا ہے پس وہ نبی نہیں ہوئے کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی یقینی وحی کی موجودگی میں کوئی شخص سچ موعود کی نبوت کا انکار کر سکتا ہے اور جو شخص انکار کرتا ہے اسے ضرور پہلے نبیوں کا بھی انکار کرنا پڑے گا کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی نبوت جن دلائل اور جن الفاظ سے ثابت ہوتی ہے ان سے بڑھ کر دلائل اور مضامین الفاظ حضرت سچ موعود کی نبوت کے متعلق موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے اگر سچ موعود نبی نہیں تو دنیا میں آج تک کبھی کوئی نبی ہوا ہی نہیں۔“

(حقیقۃ النبوة ص ۲۱۰)

یہ جتنے اقتباسات پیش خدمت کئے گئے ضرورت ہو تو اتنے ہی اور پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن زیادہ طوالت سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر ان اقتباسات سے بھی فارقلیط صاحب اور ان کے دانشوروں کو یہ اطمینان نہیں ہو کہ علماء اہلسنت نے قادیانیوں پر کوئی الزام نہیں لگایا بلکہ مرزا غلام احمد نے کھل کر ڈنگے کی چوٹ دعوۂ نبوت کیلئے تو مزید بہاروں صفحہ ۱۷ کا دفتر بھی انھیں مطمئن نہیں کر سکتا۔

اب ہم دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں یعنی قیامت سے

قبل حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کی دنیا میں تشریف آوری۔ قرآن میں آیا کہ حضرت عیسیٰ نہ تو قتل ہوئے نہ سولی دیئے گئے

رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فارقلیط صاحب کے نزدیک اس کے تمام اگلے پچھلے علماء ایک طرف عقل سے اس دور بے نیاز ہیں کہ نزول مسیح کا خلاف قرآن عقیدہ سمجھتے ہیں دوسری طرف وہ بد دین بھی ہیں کہ اپنے طور پر ایک عقیدہ گھڑ لیا ہے اور اس پر اصرار کرتے چلے جاتے ہیں ہم نہیں سمجھتے کہ جو شخص اپنے تمام بزرگوں کے بارے میں ایسی رائے رکھتا ہو وہ صحیح الذراغ کہلا سکا یا فاجر العقل۔ فارقلیط صاحب بتاتے ہیں کہ اگر کسی کی رائے ہے تو پھر اپنا دین انھوں نے کہاں سے چھوڑا کیا۔ ظاہر ہے قرآن و حدیث ان ہی علماء سے ہم تک پہنچے ہیں اور اسلام کا پورا دفتر اصول و عقائد ان بزرگوں کی عرق ریزیوں سے چھریا ہوا ہے۔ یہاں بے عقل، غیر ذکاوت دار اور بد دینوں نے جان لیوا ہمارے پاؤں تلے کو جو زمین بالی راکھ جاتی ہے۔ کاسٹل ہرم نے محسوس فرمایا ہے تاکہ ان کا جارحانہ علم کلام کچھ قتل عام کرنا چلا گیا ہے۔

اس اقتباس میں بے علمی کا شاہکار یہ ہے کہ ہمارے بلا تکلف علماء کی طرف یہ بات منسوب کر دی کہ وہ صرف نزول مسیح کے قائل ہیں بلکہ اس کے بھی قائل ہیں کہ مسیح پر وحی نازل ہوئی اور یہ وحی حضرت خیر علیہ السلام سے تھی۔ حیرت ہے کہ محترم نے اپنی معلومات کا یہ اور سرچشمہ کونسی لائبریری کو بنایا ہے۔ علمائے حق جہاں نزول مسیح کا عقیدہ بیان کیا ہے وہیں یہ بھی تشریح کر دی ہے کہ ان پر وحی نازل نہیں ہوئی۔ مثلاً علامہ فقہارانی کی شہرہ آفاق کتاب شجر عقائد نسفی ملا حلقہ کی جائے جو بنیادی عقائد شریعہ سلسلہ میں ایک معتبر ترین کتاب مانی جاتی ہے یا علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ دیکھ لی جائے۔ متاخر تقاسیم میں جامع ترین تفسیر ہے۔ محترم نے مزید فرمایا۔

اگر بقول علماء اہل سنت حضرت عیسیٰ حضور کے بعد آئے تو خاتم النبیین کا تاج ان کے سر پر رکھا جائے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا عقیدہ غلط ہو جائے گا پس جو شخص بھی حضرت مسیح کو آنحضرت کے بعد لاتا ہے وہ ختم نبوت کا منکسر ہے۔ اگر قادیانی اس لئے کافر ہیں کہ وہ آنحضرت کے بعد نماز صلا قادیانی کو مسیح موعود اور نبی مانتے ہیں تو ہمارے علماء بھی کافر قرار پائے کیونکہ وہ بھی حضرت عیسیٰ کو لاکر ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ علماء حضرت مسیح کو لاکر انھیں نبی بھی مانتے ہیں اور ان کو جہاد دجی بھی مانتے ہیں اور حضرت جبریل کی وحی لانے والا بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان علماء نے خاتمہ المسلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک حقیقی نبی کو واپس لاکر نبوت کا سارا کاروبار جاری کر دیا ہے پھر بھی وہ ختم نبوت کے منکر نہیں اور قادیانی ختم نبوت کے منکر قرار پائے۔

سب سے پہلے جو دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ جن علماء اہل سنت پر ہمارے بزرگ اس قدر گہرے ہیں ان سے مراد کون لوگ ہیں۔ ان کا مضمون پڑھنے والے عام قارئین تو کم علمی کے باعث لانا ہی سمجھیں ہوں گے کہ ہمارے آج کے زمانے میں جو علماء موجود ہیں انھوں نے ہی نزول مسیح کا عقیدہ گھڑا ہو گا اور فارقلیط صاحب ان ہی پر تیز ہو رہے ہیں لیکن حقیقت کیلئے یہ ہم سے سنتے۔ دور رسالت سے لیکر آج تک کے ہزاروں ہزار محدثین، مفسرین، مجتہدین، علماء و صلحاء، تابعین اور صحابہ وغیرہ سب کے نزدیک یہ عقیدہ ایک مسلم عقیدہ رہا ہے۔ ماضی کے جن علماء حق اور ائمہ و فقہاء پر امت اعتماد رکھتی ہے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس عقیدے سے انحراف کیا ہو اور انحراف کر بھی کیسے سکتا تھا جب کہ یہ عقیدہ تقریباً سترہ احادیث سے بطور قوت ثابت ہے اور یہ صحیح ہے اس نے اسے بہ الفاظ صریح روایت کیلئے جس کی تفصیل آگے

ہنچا ہے ان کے نام یہ ہیں:-

- (۱) بخاری (۲) مسلم (۳) ترمذی (۴) ابوداؤد (۵) ابن ماجہ (۶) نسائی (۷) مسند احمد ابن حنبل (۸) سنن سعید بن منصور (۹) کنز العمال (۱۰) مسند عبد بن حمید (۱۱) صحیح ابن حبان (۱۲) مصنف ابی یوسف ابن ابی شیبہ (۱۳) صحیح ابن خزمہ (۱۴) المستدرک للحاکم (۱۵) طحاوی (شرح معانی الآثار) (۱۶) مشکوٰۃ المصابیح (۱۷) طبرانی (معجم نثرت) (۱۸) سراج المیر شرح جامع صغیر (۱۹) شرح استندہ للبغوی

ان کے علاوہ بڑے بڑے علماء کی کتابوں میں یہ نقل ہوتی آئی ہیں جیسے امام بیہقی کی کتاب لاسار والقصا زر قاتی کی شرح الموابل للذنیہ سیوطی کی الدر المنثور وغیرہ پھر یہ نہیں کہ ان کتابوں میں صرف ایک ایک حدیث اگر رہ گئی ہو بلکہ ہر کتاب میں متعدد احادیث ملتی ہیں مثلاً بخاری میں تین (جلد اول ص ۳۶۶ و ۳۶۷) مسلم میں تین (جلد ۲ ص ۳۶۶ و ۳۶۷) مسند احمد ابن حنبل میں اکدم ۱۷ (جلد اول ص ۳۶۶ و ۳۶۷) جلد دوم ص ۲۱۶ و ۲۱۷ ص ۲۹۸ و ۲۹۹ ص ۳۰۳ و ۳۰۴ ص ۳۰۵ و ۳۰۶ جلد سوم ص ۳۰۷ و ۳۰۸ ص ۳۱۲ - جلد چہارم ص ۲۲۹ ص ۲۸۲ - جلد پنجم ص ۱۳)

اور یہ نہیں کہ یہ احادیث بس ایک دو صحابیوں بیان کی ہوں بلکہ ۲۷ صحابہؓ ان کے راوی ہیں جن کے نام یہ ہیں (۱) حضرت عائشہ صدیقہؓ (۲) حضرت علیؓ (۳) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ (۴) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ (۵) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ (۶) حضرت حسن بن علیؓ (۷) حضرت ابوہریرہؓ (۸) حضرت ابوسعیدؓ (۹) حضرت انسؓ (۱۰) حضرت عمران بن حصینؓ (۱۱) حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (۱۲) حضرت حذیفہ بن اسید الغفاریؓ (۱۳) حضرت عبداللہ بن مغفلؓ (۱۴) حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ (۱۵) حضرت عروہ بن رؤیمؓ (۱۶) حضرت کعب بن جریجؓ (۱۷) حضرت ابن کسانؓ (۱۸) حضرت سفینہؓ رضی اللہ عنہا (۱۹) حضرت ثوبانؓ

جو لوگ کسی پرانے یا نئے نبی کو لاتے ہیں وہ ختم نبوت کے منکر ہیں اور اپنے ہی فتوے کی روش سے کافر ہیں یعنی قادیانی اور ملائے اہل سنت ختم نبوت کو توڑنے میں شریک ہیں اور دونوں کا درجہ ایک ہے۔“

اس کے بھی یہی ظاہر ہوا کہ جس طرح قادیانی حضرات مرزا غلام احمد کو نبی مان کر کافر ہوئے اسی طرح فارقلیط صاحب کے نزدیک تمام اگلے پچھلے علماء اہل سنت نزول مسیح کا عقیدہ رکھ کر کافر ہوئے۔ کوئی حد ہے اس دراز نفسی کی!

آگے فرماتے ہیں:-

”کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کے بارے میں بخاری و مسلم میں بہت سی احادیث آئی ہیں ان کا کیا کیا جائے گا؟ جواب صاف ہے کہ جو حدیث بھی قرآن کے خلاف ہوگی اسے راویوں کا جھوٹ سمجھا جائے گا اور ایسی حدیثوں کو رد کر دینا قرآن کی عظمت کے لئے ضروری ہوگا۔ خود محمدؐ میں نے یہ اصول تسلیم کیا ہے کہ قرآن کے خلاف جو بھی حدیث ہوگی وہ رد کر دی جائے گی۔“

گویا ہمارے فارقلیط صاحب نے اب تک بس اتنا ہی سلسلہ کہ صرف بخاری اور مسلم میں کچھ حدیثیں نزول مسیح کے بارے میں آگئی ہیں۔ حالانکہ اگر واقعہ کوں ہی ہوتا تب بھی دنیا جانتی ہے کہ یہ دونوں حدیث کی صحیح ترین کتاب میں ہیں اور ان کی کسی بھی حدیث کو قوی فی دلائل کے بغیر رد نہیں کیا جاسکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں فقط ان دو ہی کتابوں میں نہیں آئی ہیں بلکہ حدیث کی جن چھ کتابوں کو صحاح ستہ (صحیح احادیث کی چھ کتابیں) کہا جاتا ہے ان سب میں اور ان کے علاوہ بہت سی ہونے کے سبب حدیث میں آئی ہیں۔ ہم جیسے معمولی طالب علم کی نگاہ تحقیق ان احادیث کے سلسلہ میں جن کتابوں تک

مولانا رسول اللہ (۲۰) حضرت سمرہ بن جندب (۲۱) حضرت جابر بن عبد اللہ (۲۲) حضرت نواس بن سمعان (۲۳) حضرت عثمان بن ابی العاص (۲۴) حضرت ابو امامہ (۲۵) حضرت اوس بن اوس (۲۶) حضرت ام شریک بن ابی (۲۷) حضرت مجمع بن جابر (۲۸) اگر سہارے دانشور مکتب تذکرہ بالا سے مقابلہ کر کے ہمارے حوالوں کی صحت اور عدم صحت کی جانچ کرنے پر قادر نہ ہوں تو ہم ان کی آسانی کیلئے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا نا لے دیتے ہیں۔ اس میں سورہ احزاب کی تفسیر میں (جلد چہارم) مفسر نے ایک ضمیمہ شامل کیا ہے۔ اس ضمیمہ میں انھوں نے نزول عیسیٰ سے متعلق ۱۷ صحابہ کی ۲۱ روایات اصل مع ترجمہ درج کر دی ہیں۔

یہ اصول بے شک محدثین نے طے کر دیا ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہوگی اس کی یا تو مناسبت تاویل کی جائے گی یا اسے چھوڑ دیا جائے گا لیکن یہ طے کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ کہاں واقعہ خلاف پایا جا رہا ہے اور کہاں ہماری کوتاہ نظری غلط طوطی خلاف محسوس کر رہی ہے۔ فار قلیط صاحب انصاف فرمائیں کہ اگر اعلیٰ درجے کی سائنس کی فلاں دو تھیوریوں میں سائنس کے ماہرین اور اساتذہ کوئی تضاد و اختلاف نہ سمجھتے ہوں لیکن ایک خواجہ فروش یا جنرل مرچنٹ فقط بچوں کی سائنس کے چند سبق پڑھ کر یہ فیصلہ داغ دے کہ ان دو تھیوریوں کے درمیان اختلاف ہے تو دنیا میں کون ہو شخص جسے اس فیصلے کو قابل اعتناء سمجھ گا۔ ٹھیک اسی طرح کا مسئلہ یہاں بھی درپیش ہے ایک طرف اعلیٰ درجے کے محدثین اور مفسرین اور دوسری طرف علم دین کے ائمہ اور اساتذہ بارہ سو برسوں تک خیال پر جمے رہے ہیں کہ ختم نبوت اور نزول مسیح کے عقیدوں میں ہرگز کوئی تضاد و تخالف نہیں دوسری طرف چودھویں صدی ہجری کے چند ایسے

دانشور جنکی بات بات سے جہل اور کج فکری نمایاں۔ بڑے مطراق سے کہہ رہے ہیں کہ ان دونوں عقیدوں میں تضاد ہے۔ ساری حدیثیں چھوٹی ہیں۔ علماء دین سے گھر کر لائے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ دنیا کون آدمی ذہنی تو اذن کھوئے بغیر تصور رکھتا۔ کہ ساری امت چھوٹی اور نام نہاد دانشور سمجھے۔ ہم بھی آگے چل کر دلائل کے ساتھ بتائیں گے۔ نزدل مسیح کے عقیدے کا خلاف قرآن ہونا تو کیا قرآن بجائے خود تقاضا کر رہا ہے کہ قیامت سے قبل حضرت مسیح نازل ہوں گے ابھی ہم فار قلیط صاحب کی عبارات نقل کر کے ان کی علمی و تحقیقی حیثیت واضح کر دے منقولہ بالا عبارات کے متصل بعد وہ قرآن اور حدیث میں تخالف کی مثال یہاں طور پر پیش فرماتے ہیں:-

اس کی مثال میں بخاری کی اس حدیث کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے حالانکہ تسمان کریم اعلان کرتا ہے کہ اندھ کان صدیقانید (حضرت ابراہیم سے بچے ہی تھے) حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے بارے میں مذکور ہے کہ آپ نے حدیث کو رد کر کے قرآن کے اعلان کو تسلیم کیا اور فرمایا کہ بخاری کی حدیث میں جو راوی ہیں اگر ان کے جھوٹے ہونے سے خدا کے مقدس نبی حضرت ابراہیم سے ثابت ہو تو راویوں کو جھوٹا قرار دینا ضروری ہے کیونکہ مسلمان ایک نبی کی سچائی کو ماننے کے لئے ہزار راویوں کو جھوٹا قرار دے سکتے ہیں۔ نبی کو جھوٹا کہنا ایمان میں کوئی ضعف پیدا نہیں کرتا۔ فار قلیط صاحب کے دانشور بڑے عجیب غریب تاریخی خبریں بیان کرتے چلے جاتے ہیں مگر حوالہ کوئی نہیں دیتے۔ فلاں بات اگر ابو حنیفہ نے ہی ہے تو آخر کس

کہ ان حضرات سے کسی قسم کی علمی و فکری غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ غلطیاں تو انسان کا مقدر ہیں۔ دونوں ہی حضرات سے بہتری علمی و فکری خطائیں سرزد ہوئی ہیں مگر کیا یہ بھی تصور کیا جاسکتا ہے کہ انبیاء کی شان اور حراد و احترام کو یہ دونوں جلیل القدر بزرگ آج کے دانشور ان کرام کے مقابلے میں کم جلتے ہوں اور جو حدیثیں آج کے دانشوروں کو شانِ ابراہیمی کے سراسر خلاف محسوس ہو رہی ہوں انکا خلاف ہونا انھیں محسوس نہ ہوا ہو؟

دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو آپ یکہیں کہ یہ دونوں بزرگ شانِ نبوت کے فہم سے عاری تھے یا یہ کہیں کہ مذکورہ حدیث کو شانِ نبوت کے خلاف سمجھنا دانشوروں کی غلط فہمی ہے۔

ایک سوال فارطیط صفا سے جواب چاہتا ہے۔ جس قرآن میں انہ کا صدیقاً نبیا آیا ہے اسی قرآن میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم نے ایک دن موقع پا کر بہت سے بت توڑ ڈالے اور بس ایک بڑے بت کو سالم رہنے دیا۔ کفار نے آکر یہ دیکھا تو بچھا کہ یہ حرکت کس نے کی۔ حضرت ابراہیم نے جواباً یہ نہیں کہا کہ میں نے کی بلکہ یہ کہا بنیٰ فَعَلَهُ کَبِیْرٌ مُّکْرَمٌ۔ (یہ اس بڑے بت کی حرکت ہے) سورہ انبیاء۔ آیت ۶۳ پارہ ۱۷۔

صدق کہتے ہیں بیان مطابق واقعہ کو اور کذب اس کا مقابل ہے یعنی خلاف واقعہ بیان۔ صداقت یہ تھی کہ بت حضرت ابراہیم نے توڑے تھے۔ جواب میں موصوف نے خلاف واقعہ بیان دیا۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ پر مفسر کا بیان نہیں ہے۔ اور اس خلاف واقعہ بیان پر لفظ کذب کا اطلاق کوئی اتنی نہیں کر رہا ہے بلکہ صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔

دانشور اگر یہ کہیں کہ حضرت ابراہیم نے طنزاً کہا تھا ان کا مقصد کفار کی تحقیق و تجسس بھی۔ وہ ان کا صحتی کارڈا رہے تھے۔ تو ہم کہیں گے کہ مطمئن رہتے مفسرین و محدثین

ایہ ہے معلوم تو ہو میلادِ خوانوں کی طرح بس آنا کہہ دینا کہ ”راوی کہتا ہے“ دانشوری کی کونسی قسم نکلی ہے۔ خیر ہم پہلے حضرت ابراہیم کے تین جھوٹے الٰہی حدیث پر گفتگو کریں پھر منکشف کریں گے کہ امام ابو حنیفہ کی لطف قول کی نسبت کہہ کے دانشوروں نے کتنی دلچسپی دانشوری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

محترم فارطیط صاحب! پہلے تو یسین لیجئے کہ یہ حدیث فقط بخاری ہی میں نہیں آئی بلکہ مسلم میں بھی آئی ہے۔ آپ اہل حدیث مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہو گا کہ قرآن کے بعد یہ دونوں کتابیں دنیا کی صحیح ترین کتابیں ہیں اور جس حدیث پر یہ دونوں متفق ہو جائیں اسے معتبر ترین قرار دیا جاتا ہے۔ نیز آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ دونوں بزرگ کتنے محتاط، متقی، ذی علم، بین دار اور فہیم و فرس تھے۔ آپ یہ بھی سنا ہو گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و عقیدت امام بخاریؒ کے قلب میں اس قدر تھی کہ ہر حدیث رسولؐ کو صحیح بخاری میں درج کرنے سے قبل آپ غسل کر کے دو نفل ادا کرتے تھے فلم اٹھاتے۔ اس کام سے سولہ سال میں فارغ ہوئے پھر جب یہ ارادہ فرمایا کہ جمع کردہ حدیثوں کی ترتیب مصنفین کے مطابق کر کے عنوانات (ترجمہ الباب) قائم کئے جائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور قبر کے درمیان بیٹھ کر یہ کام اس طرح کیا کہ ہر ہر عنوان سے پہلے دو رکعت نفل پڑھتے پھر عنوان لکھتے۔

اسی طرح امام مسلمؒ زہد و اتقار میں معروف ہیں۔ ان کے اتباع سنت کا یہ عالم ہے کہ زندگی بھر کسی کو کالی نہیں دی۔ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کسی کی غیبت نہیں کی۔ فن حدیث میں ان کا پایہ امام بخاریؒ سے کم نہیں۔ بہترے اہل علم ان کی صحیح مسلم کو بعض وجہ سے بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

ان اوصاف کا تذکرہ کر کے ہم یہ ثابت کرنا نہیں چاہتے

راوی کو جھوٹا قرار دینے کا نہیں بلکہ بارہ راوی یا اعتبار سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ یہ بارہ راوی ایسے جن کے نام صرف ان ہی حدیثوں کی سند میں آئے ہو بلکہ ان میں سے ہر ایک ایسا ہے جو بہت سی اور صحیح حدیث کی اسناد میں موجود ہے۔ ان تمام راویوں کو اسما مارا گیا ہے اساتذہ نے سچا اور ثقہ قرار دیا ہے۔ ایسی صورت ہے ان تمام حدیثوں کو ردی کر دینا ہو گا جن کی سند میں ان کا کوئی راوی موجود ہو۔ اس طرح ہماری تحقیق کے مطابق سے کم شتر ایسی حدیثیں پایزہ اعتبار سے ساقط ہو جائیں جن کی صحت پر اہل علم کا اتفاق ہے اور جن سے گنتے احکام شرعی اخذ کئے گئے ہیں۔

بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ کسی حدیث کو اگر اس دلیل سے غیر معتبر قرار دیتے ہیں کہ اس کی سند فلاں راوی ضعیف ہے تو اس سے قواعد فن میں کو خلل نہیں پڑتا کیونکہ راوی آپ نے متعین کر دیا ہے اس کے ضعف کا ثبوت بھی ظاہر ہے آپ اسما مارا کی کتابوں سے لائے ہوں گے۔ لیکن جب آپ راوی کا تعین کئے بغیر محض ایک خارجی اور قیاسی منطق بل پر کسی حدیث کو ردی کر ڈالتے ہیں تو اس کا مصلہ ہوتا ہے کہ اس کی سند کا ہر راوی مشتبہ ہو گیا۔ یہ کسی بھی حدیث کی سند میں آئے محاکاتو سے غیر معتبر بنا یہ محض ایک جذباتی اور ظاہر فریب بات ہے کہ ایک نبی کی سچائی کو ماننے کے لئے ہزاروں راویوں کو جھوٹا قرار دیا جاسکتا ہے۔ جھوٹے اور سچے ہر طرح راویوں کا حال کتب فن میں مندرج ہے۔ جن راویوں کو سچا قرار دیا گیا ہے اور بخاری و مسلم جیسے اساتذہ نے ان کی روایتیں لی ہیں ان میں ہزاروں کو کیا مگر وہ بھی بلکہ کس یا کچھ بھی ایسے نہیں جنہیں اسلئے جھٹلا کی نوبت آئے کہ وہ کسی نبی کی شان کے خلاف روایا بیان کر رہے ہیں۔ وہ اسی روایات جن راویوں نے بیان کی ہیں انہیں تو اہل فن پہلے ہی اچھی طرح متعاقب کر

بھی ایسا ہی کہتے اور سمجھتے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس نے اسے اس برے مفہوم میں ”جھوٹ“ قرار دیا ہو جس میں یہ لفظ بزبان اردو مستعمل ہے لیکن اس تاویل و تشریح سے بس یہی تو بتا چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خلاف واقعہ بات کیوں کہی۔ یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ خلاف واقعہ بات انہوں نے کہی ہی نہیں۔ جب کہی اور یقیناً کہی تو اس حدیث رسولؐ کے خلاف قرآن کیسے ٹھیکرا دیا گیا جس میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف خلاف واقعہ بات یعنی کذب کی نسبت کی گئی ہے۔ جن مفسرین نے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا مذکورہ جواب عام مفہوم میں جھوٹ نہیں تھا انھوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ بخاری و مسلم دلی حدیثیں غلط ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ ان حدیثوں میں حضرت ابراہیمؑ کے بعض اقوال کی ظاہری حیثیت کے اعتبار سے کذاب کا لفظ آیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے درجہ بلند کی نسبت سے ایسا کذب بھی چونکہ خلاف ادنیٰ تھا اس لئے حدیث میں اس کو ”ذنب“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام رازنیؒ جیسے بعض اکابر اگرچہ اس تفسیر کو راجح نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال یہی ہے کہ ان حدیثوں کو صحیح ماننے سے بہتر یہ ہے کہ چند راوی جھوٹے قرار پا جائیں لیکن اس خیال کے مضمرات و عواقب پر غور کیا جائے تو یہ کمزور نظر آتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن میں بہتر سے انبیاء کی کسی نہ کسی ذلت (فقرش) کا ذکر موجود ہے۔ حتیٰ کہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی بعض ایسے افعال کا ذکر موجود ہے جنہیں اللہ نے غیر پسندیدہ قرار دیا۔ اس کے باوجود اگر اس گروہ مقدس کا معصوم عن الخطا اور برگزیدہ اور سچا ہونا مسلم ہے تو وہ حدیثیں جن میں حضرت ابراہیمؑ کے تین کذب بات کا ذکر آگیا ہے انہ کا صلیقانہ کیا کے خلاف کیسے کہی جاسکتی ہیں۔ خصوصاً صاحب صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کذبات ارادہ گناہ سے خالی تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ بخاری و مسلم کی احادیث کو محض ایک وہم اور ذاتی مذاق کی بنا پر جھٹلا دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں معاملہ کسی ایک متعین

ہیں ابھی ایسی روایات کو رد کر کے لئے بخاری و مسلم کے نقیض روایوں کو چھوڑنا قرآن و حدیث کی تکفیر نہیں آسکتی۔

اب ذرا سن لیجئے کہ فارقلیط صاحب نے امام ابو حنیفہؒ کی طرف بلا سنا جس قول کی نسبت کر ڈالی ہے اس کا جغرافیہ کیا ہے۔ اس جغرافیہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے ہم موصوف کی کچھ اور مسطور نقل کر رہے ہیں۔

”قرآن کے بعد احادیث کا جو سب سے پہلا مجموعہ عہدِ اول کے مسلمانوں کے سامنے آیا وہ موطا امام مالک کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی موطا امام مالک کو بخاری پر ترجیح دی ہے لیکن اس مجموعہ احادیث میں موعود مسیح اور نزول مسیح اور دجال کے بارے میں ایک بھی حدیث منقول نہیں۔ حضرت امام مالک کو کھنور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرب زمانی حاصل ہے اگر ان کو حضرت مسیح کی آمد بانی کے بارے میں کئی ایک حدیث بھی نہ مل سکی تو بخاری اور مسلم کو تین سو سال کے بعد وہ حدیثیں کہاں سے مل گئیں جن میں ختمی ماب کی حدیث ادبی بعد نامی (میرے بعد کوئی نبی) کو غلط ثابت کرنے کے لئے حضرت عیسیٰؑ کی آمد بانی اور ان کی نبوت کا ذکر ہے۔ اگر حضرت مسیحؑ کی آمد بانی سے متعلق ایک حدیث بھی مروی ہوتی تو کیا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے اپنے مجموعے میں ترجیح دیتے؟ انھیں تو کوئی ایسی حدیث نہیں پہنچی اور بخاری اور مسلم کو ڈھائی تین سو سال بعد ایسی حدیثوں کا انبار مل گیا؟“

ان مسطور میں علم و تفقہ کے جو فوائد ہیں انھیں ہم بعد میں لیں گے۔ پہلے امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب قول کا

لطیفہ دیکھ لیجئے۔ ان مسطور میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ امام مالکؒ کے زمانے تک تو نزول مسیح کی کوئی بھی حدیث حقیقتہً پائی ہی نہیں جاتی تھی بعد میں جب بخاری و مسلم کا زمانہ آیا تو ایسی حدیثیں گھڑ لی گئیں اور اسی گھڑے گھڑائے انبار کو بخاری و مسلم نے ستر گھنٹوں پر رکھ لیا۔ ہو سکتا ہے دانشوروں کا مافی الضمیر یہ ہو کہ بخاری و مسلم بھی گھڑنے والوں میں شریک تھے یا یہ کہ گھڑا تو اور لوگوں نے مگر یہ دونوں بزرگ سادہ لوح کی بنا پر اس جعل سازی کو نہیں سمجھ سکے اور بڑے ذوق و شوق سے اس میں کثرت مواد کو اپنی صحیحین میں داخل کر لیا۔

یہ بھی مافی الضمیر ہو وہ جانیس یا ان کا اللہ بہر حال یہ دعویٰ وہ ضرور کر رہے ہیں کہ عہدِ امام مالکؒ تک نزول مسیح کی حدیثوں کا وجود نہ تھا۔ اب تاریخی حقائق ملاحظہ فرمائیے۔ امام مالکؒ ۱۵۹ھ یا ۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور وفات ۱۸۱ھ میں پائی۔ امام ابو حنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں دنیل سے چل بسے۔ گویا ابو حنیفہؒ کا انتقال امام مالکؒ سے بھی ۲۳ سال پہلے ہو چکا۔

ادھر امام بخاریؒ ۲۵۶ھ میں انتقال فرماتے ہیں۔ گویا امام بخاریؒ اس وقت پیدا ہوئے جب امام ابو حنیفہؒ کو رحلت فرمائے ہوئے ۴۲ سال گزر چکے تھے اور انہی کتاب صحیح بخاریؒ کو انھوں نے ابو حنیفہؒ کی موت سے تقریباً ستر سال بعد مدون فرمایا۔

یہ ہے وہ تاریخی صورت حال جس سے کسی کو حجاب انکار نہیں ہو سکتی۔ اب ذرا فارقلیط صاحب کے ارشاد گرامی پر بھر سے نظر ڈال کر آنکھیں بہرت سے ملی جائیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے منہ میں موصوف نے کیسا شند اور فقرہ ڈالا ہے۔ یعنی ابھی صحیح بخاریؒ کا وجود کیا ہوتا اسکے مہنف امام بخاریؒ کی پیدائش میں بھی چالیس سال سے زیادہ باقی ہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ فرما رہے ہیں کہ:-

”بخاری کی حدیث میں جو راوی ہیں اگر ان کے

جھوٹے ہونے سے خدا کے مقدس نبی حضرت ابراہیمؑ
سے نجات دیوں تو راہوں کو چھوٹا فراموش نہ فری
ہے۔

ہے کوئی جو اس عجبے کی برابری کا عجوبہ دکھلا سکے۔
تفہن برطوت۔ عموماً ایسے ہی مٹھکے خیر کار نامے سامنے
آتے ہیں جب کسی علم و فن سے بے بہرہ حضرات محض اپنے
زعم و دانشوری میں لاف و گزاف شروع کر دیتے ہیں۔

اب دوسرے پہلوؤں کی طرف آئیے۔

یہ تو دانشوروں نے کسی سے سن لیا کہ شاہ ولی اللہؒ
نے موطا امام مالک کو بخاری پر ترجیح دی ہے لیکن یہ تو فتن
نہیں ہوئی کہ ان ہی شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مستوی میں لہ
کیا لکھا ہے یہ بھی دیکھ لیں۔

امام مالکؒ کی موطا بخاری و مسلم سے زمانے کے اعتبار
سے یقیناً مقدم ہے لیکن اول تو یہ بات معقول نہیں کہ اگر
حضرت شاہ ولی اللہؒ اور بعض اور اکابر اسے بخاری سے
زیادہ معتبر سمجھتے ہوں تو ان محققین کی رائے نظر انداز کر دی
جائے جو اسے مسلم اور ترمذی سے بعد کا درجہ دیتے ہیں۔

دوسرے اس کا اتنا زیادہ معتبر ہونا دراصل بخاری
مسلم جیسے بعد کے ثقہ محدثین ہی کی تصدیق و توثیق کا نتیجہ
ہے ورنہ فی ثقبہ باعتبار فن حدیث موطا ان کتابوں
میں شامل ہے ہی نہیں جنہیں جمہور امت صحیح ستہ کا نام
دیتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ صحیح ستہ نام ہے بخاری،
مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کا۔ موطا
ان میں نہیں۔

کہوں نہیں۔ یہ تفصیل بھی دانشوروں کو شاہ ولی اللہؒ
کی مستوی سے معلوم ہو جاتی۔ موطا میں کل ۱۲۰۱ احادیث
ہیں۔ ان میں مسند و مرفوع احادیث صرف چھ سو ہیں۔
باقی تمام یا تو مرسل ہیں یا موقوفات بالامانات یا تابعین
کے اقوال و فتاویٰ۔

۱۰۰ مستوی سے بعض نسخوں میں ہر قسم کے پورے اعداد و شمار تھے مگر

دانشور صاحبان مذکورہ اصطلاحات کی تفصیل بھی سمجھ
لیں۔

مراسیل جمع ہے مرسل کی۔ حدیث مرسل وہ ہے جس کی
سند میں اس صحابی کا نام نہ ذکر کیا گیا ہو جس نے رسول اللہؐ
کا کوئی قول یا فعل روایت کیا۔

موقوف حدیث اس کو کہتے ہیں جس میں صحابی کے
ایسے کسی قول یا فعل کا ذکر ہو۔ یہ وضاحت نہ ہو کہ وہ صحابی
رسول اللہؐ کا ارشاد یا عمل یا حکم بیان کر رہے ہیں۔

یہ دونوں تفصیل حدیث صحیح کی تعریف سے خارج ہیں
کیونکہ حدیث صحیح کی تعریف یہ ہے کہ جس کی پوری سند اول
سے آخر تک متصل ہو یعنی کوئی راوی درمیان سے یا شروع
آخر سے کم نہ ہو اور رسول اللہؐ کا قول یا فعل صحابی کی زبان
سے بیان ہو رہا ہو۔ اور اس کے تمام راوی عادل و ضابط
ہوں اور کوئی شذوذ یا علت اس میں موجود نہ ہو۔

شذوذ یا علت کی تفصیل میں جانا یہاں بے محل ہوگا۔
آپ نے دیکھا کہ مرسل میں سمرے سے اس صحابی ہی کا ذکر نہیں
ہو تا جس سے حدیث چلی ہے اور موقوف میں یہ صراحت
نہیں ہوتی کہ یہ حدیث رسولؐ ہے لہذا ان دونوں کو اسانف
فن نے صحت کے زمرے سے ہٹا کر حدیث ضعیف کے خانے
میں رکھا ہے۔

جب فنی صورت حال یہ ہے تو آپ نے انہیں ہر دو کی
وہ موطا امام مالکؒ خالص فنی اعتبار سے صحیح احادیث کا مجموعہ
نہیں کہلا سکتی جس میں دو تہائی کے قریب غیر صحیح روایات
جمع ہوں۔ پھر کس لئے وہ بہت معتبر مانی جاتی ہے؟ اس کا
جواب یہ ہے کہ بعد کے ثقہ محدثین جیسے بخاری و مسلم

۱۰۰ میں لیکن غالباً کتابت کی غلطی سے ان میں گڑبڑ ہو گئی۔ ان کا
مجموعہ بجا۱۲۰۱ کے ۱۸۰۰ بن جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ
بعض اور مصنفین نے ان اعداد کو جو کتابوں نقل کر لیا اور جو
کر نہیں دیکھا کہ مجموعہ اصل تعداد سے بعد ۸۸ بڑھ
جاتا ہے۔

دیگر نے اپنے ذرائع سے تصدیق کو دی ہے کہ موطا کے مراسیل اور موقوفات وغیرہ فی الحقیقت قابل اعتبار ہیں۔ ان محدثین نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ان مراسیل و موقوفات کو مرفوع و متصل صحیح سندوں سے بیان کیا اور دنیا کو معلوم ہوا کہ منضبط شدہ فین حدیث کے اعتبار سے موطا صحیح نہ ہوتے ہوئے بھی عمدہ اور مستند احادیث کا مجموعہ ہے۔

اب اہل انصاف فیصلہ فرمائیں کہ اگر دانشوروں کے زعم کے مطابق بخاری و مسلم اور وہ تمام محدثین جن کی کتابوں کے نام ہم سمجھے دے آتے ہیں ایسے ہی کم عقل یا سادہ لوح یا معطل تھے کہ بڑے اطمینان سے موضوع و طبع زاد احادیث کو صحیح احادیث کے طور پر بیان کرتے چلے گئے تو اس موطا امام مالک ہی کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے جس کی ثقاہت کا مدار ان ہی محدثین کی توثیق و تصدیق پر ہے۔ یہ محدثین اگر موطا کے مراسیل و موقوفات کی ماہرانہ جانچ کے بعد ہر تصدیق ثبت نہ کرتے تو ہمارے فرشتے بھی نہیں جان سکتے تھے کہ موطا کی روایات قابل اعتماد ہیں۔ دانشوران کرام اسی شاخ کو کاٹ گئے ہیں جن پر انھوں نے آئینہ بنا یا تھا۔ کیا مقبولیت ہو سکتی ہے کہ اگر بخاری و مسلم کو بھی من مٹھرت اور صحیح احادیث میں تمیز نہ ہو تو ان کی تصدیق پر امام مالک کی وہ روایات صحیح مان لی جائیں جنکی سند ناقص ہے۔ اس فنی نقص کو اسی یقین نے تو دور کیا ہے کہ بخاری و مسلم ماہر فن تھے۔ حدیث کی جانچ پر کھ کا سلیقہ رکھتے تھے۔ وہ جن روایات کی تصدیق کریں وہ قابل اعتماد ہی ہوں گی۔

موطا امام مالک میں نزول مسیح کی احادیث کا نہ پایا جانا سارے ہی محدثوں کو ملزموں کے گٹھڑے میں پھنچا دے یہ عجیب و غریب منطق ہے۔ کیا واقعی دانشوروں نے یہ معیار قائم کیا ہے کہ دوسری تمام کتب احادیث کی

صرف وہ روایات صحیح ماننی جائیں گی جنھیں موطا میں بھی درج کیا گیا ہو۔ بانی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر معیار قائم کیا ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان شخصارذی احکام و ہدایات اور اخبار و اطلاعات سے وہ محترم ہو جائیں گے جن کا شمار علوم دین میں ہوتا ہے۔ ہزاروں صحیح احادیث ردی کرنی ہوں گی۔

اچھا فار قیط صاحب ایک بات بتائیں۔ قرآن سے بڑھ کر تو کوئی کتاب معتبر نہیں؟ اس میں کہیں یہ نہیں آیا کہ سنا زور و زائد یا حج وقت فرض ہے یہ اگر مغرب میں تین اور عشاء میں چار رکعات پڑھو۔ نہ یہ آیا کہ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے۔ نہ یہ آیا کہ جمعہ کے دن ظہر کے وقت میں بجائے چار کے دو رکعات پڑھنی چاہئیں۔ نہ یہ آیا کہ شرب معراج میں رسول کریم ص نے سات آسمانوں کا سفر کیا تھا۔ اور اسی طرح کی بہترین باتیں ہیں جو مسلمان دین میں شامل ہیں مگر ان کو قرآن نے بیان نہیں کیا بلکہ ان پر ایمان قرآن سے کمتر درجے کی کتابوں نے دیا۔ موطا امام مالک کو آپ کوئی بھی درجہ دیں۔ اس میں کسی حدیث کا نہ آنا اگر اس حدیث کو رد کر دینے کیلئے کافی ہے تو اسی منطق سے آپ ان تمام عقائد و احکام کو گویں رد نہیں کر دیتے جن کا اندراج قرآن میں نہیں ہوا۔ آپ کا استدلال اس سلسلہ میں یہ ہے۔

”اگر اسلام کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد ایمانیات میں داخل ہوتی اور اسے مددِ نجات قرار دیا جاتا تو قرآن کریم ضرور اس عقیدے کا ذکر صراحت کے ساتھ کرنا کیوں کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہدایت کی تمام باتیں اس میں آگئی ہیں ان علیہا الصلائی و ہدایت کا راستہ بتانا صرف ہمارا کام ہے، مگر قرآن کریم میں حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کا کہیں ذکر نہیں، اس لئے یہ سمجھنا درست ہو گا کہ کسی نبی کا دوبارہ آنا اور وہ بھی خاتم المرسلین کے بعد قطعاً غیر قرآنی

ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے کھینچ کر
کچھ نکالنا ایمان اور عقیدے سے کچھ تعلق نہیں
رکھتا۔“

اس مسئلہ پر تو تبادلہ خیال ہم آگے کریں کہ قرآن سے
کھینچ کر آپ کر رہے ہیں یا علماء اہل سنت۔ یہاں
عرض یہ ہے کہ آپ کا یہ علم کلام بالکل غلام احمد برور اور
دیگر منکرین حدیث کا علم کلام ہے جنہوں نے دینی احکام
سے جان چھڑانے اور ایک خانہ زادا پیٹوڈیٹ اسلام
تیار کرنے کی خاطر احادیث کے تحت ہونے کا انکار کر دیا
ہے حالانکہ حدیث کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو وہ نماز
نہیں پڑھی جاسکتی جو اسلام کی اہم ترین نشانی ہے۔
کیا آپ پانچ وقت کی نماز فرض نہیں مانتے۔ کیا آپ کا
اس پر ایمان نہیں ہے کہ جمعہ کی دو رکعتیں فرض ہیں؟
اگر ہے تو کیوں جبکہ قرآن نے اس کی صراحت نہیں کی۔
کیا قرآن ہی نے یہ حکم نہیں دیا کہ اے ایمان والو

جب بات سے رسول رو کے اس سے رک جاؤ اور جس
بات کا حکم دے اسے بجالاؤ۔ اگر صرف قرآنی صراحتوں
ہی کا نام تمام دین ہوتا اور جملہ عقائد کا انحصار قرآن
ہی کی تصریحات میں منحصر ہوتا پھر تو اللہ کا یہ حکم بے کار
ہی رہا۔ پھر تو اللہ کو بس یہی کہنا چاہتے تھاکہ ہمارا وہی
شرآن میں درج ہے۔ رسول کی حیثیت اس کے سوا
کچھ نہیں کہ اس نے ہمیں قرآن پہنچا دیا۔ جو کچھ قرآن
میں پاؤ اسے ہی کافی سمجھو۔ زائد کی ضرورت نہیں۔

بات موطا کی چل رہی تھی۔ موطا میں اگر فلاں فلاں
موضوع کی حدیث نہیں آئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ
نے انہی ساری زندگی مدینے میں گزار دی اور وہ مسلمان
جن کے پاس احادیث رسولؐ کا سرمایہ تھا صرف مدینے
میں محدود نہیں رہے تھے بلکہ دوسرے شہروں میں پھیل
گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کسی ایک یا چند افراد کے
پاس تمام احادیث موجود نہیں تھیں کسی کے پاس کچھ

ہیں کسی کے پاس کچھ ہیں۔ یہ سرمایہ ابھی بٹا ہوا تھا۔ کتابیں
تو بعد میں مرتب ہوئی ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ اس وقت
کے اہل مدینہ کے پاس سارے ہی موضوعات کی حدیثیں
موجود ہوں اور کیا ضروری ہے کہ اگر موجود بھی ہوں تو امام
مالکؒ تک وہ لازم پہنچیں اور کیا ضروری ہے کہ اگر پہنچیں
بھی تو موصوف کو ایسے وسائل لازم میسر رہے ہوں جن کے
ذریعہ وہ ہر راوی کے پوست کندہ حالات سے واقف
ہو سکیں۔ ایک شخص ان سے مثلاً نزول مسیح کی روایت بیان
کر رہا ہے۔ وہ اسے نہیں جانتے لہذا ابھر رہے نہیں کرتے۔
غلادہ اڑیں یہ بھی دانشوروں کو معلوم ہونا چاہیے
کہ موطا میں اصلاً دس ہزار حدیثیں امام مالکؒ نے جمع کی
تھیں۔ پھر بعد میں دو ہزار سے کم ہی رہنے دیں باقی کو
قلعہ ذکر دیا۔ کیا بعد ہے کہ ان آٹھ ہزار سے زیادہ قلعد
کردہ روایتوں میں نزول مسیح کی روایات بھی ہوں اور
امام مالکؒ کو ان کی صحت میں شبہ ہو گیا ہو شبہ ہو جانے
کا لازمی مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ واقعہ وہ حدیثیں
من گھڑت تھیں۔

ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ موطا امام مالکؒ
کے سوا مختلف نسخے ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی تصریح کے
مطابق تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے موطا کو امام مالکؒ سے
سن کر جمع کیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ بستان الحیثین میں یہ ضحمت
کرتے ہیں کہ بہتری احادیث ایسی ہیں جو بعض نسخوں میں ہیں
اور بعض میں نہیں۔ کتنی ہی ایسی ہیں جو صرف ایک ہی نسخے
میں ہیں بقایا میں نہیں۔ اب یہ نسخے اکثر دہشتراپی دہچلے
محض چند پائے جاتے ہیں اور وہ بھی خال خال۔ ہمارے
ہند میں تو ایک ہی نسخہ متداول ہے لہذا پورے وقت
سے یہ دعویٰ کیے کیا جاسکتا ہے کہ نزول مسیح کے بارے میں امام
مالکؒ نے کوئی روایت بیان ہی نہ کی ہوگی۔ احتمال بہر حال
موجود ہے لہذا ادعوے کی بنیاد ہی ہل جاتی ہے۔

فارقلیط صاحب اگر اجازت پوچھ لیتا تو علی نکتہ بھی ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں اس پر غور و فکر شاید مفید ہو۔ امام مالک کے بہت سے اساتذہ اولیٰ و ثانیہ ہیں۔ ان میں ایک بزرگ ہیں محمد بن شہاب الزہریؒ جو حضرات علم حدیث اور فن اسماء الرجال سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں ان کے لئے تو یہ نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن بھلا ہمارے دانشوروں کو ایسے علوم و فنون سے کیا اسی دلچسپی ہوگی لہذا مختصر اہم انھیں بتادیں کہ یہ امام زہریؒ ان ممتاز تابعین میں ہیں جو حدیث و روایت کا منبع و مخزن تسلیم کئے گئے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب جیسے مشہور زمانہ تابعی کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو امام زہریؒ ہی کا ہے۔ ائمہ فن کی گواہی ان کے بارے میں یہ ہے کہ ان کے زمانے میں حدیث کے متن اور سند کا حافظ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔ انھوں نے متعدد صحابہ کو دیکھا اور ان سے روایت کی سعادت بھی ان کے حصہ میں آئی۔ ان کی عظمت علیٰ کنفی مسلم تھی اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام ابن جریرؒ، امام اسحاق بن عیینہؒ، امام افداعیؒ، امام مالکؒ، امام لیتؒ اور اس سلسلے کے کتنے ہی اولیٰ محمد بن ان کے شاگردوں میں تھے۔ بخاری، مسلم، موطا امام مالک اور ابوداؤد، ترمذی وغیرہ بھی کتب حدیث میں ان کی روایت کردہ حدیثوں کی اتنی کثرت ہے کہ شمار مشکل۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی نشان لمحمد میں موطا کے سولہ نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے ہر نسخے سے ایک ایک حدیث نقل کی ہے۔ ان میں ہی پانچ حدیثیں امام زہریؒ کی سند سے ہیں۔ غرض امام زہریؒ حیثیت استاد حدیث کے مشہور زمانہ ہیں اور امام مالکؒ ان کے شاگردوں میں ممتاز تر تسلیم کئے گئے ہیں۔

اب توجہ فرمائیے کہ صحیح بخاری میں جو تین حدیثیں نزولِ عیسیٰ کی اطلاع دے رہی ہیں اور جن میں اللہ کا رسول خدا کی قسم لکھا کہ بیان کرنا ہے کہ قیامت سے پہلے عیسیٰؑ نازل ہو کر رہیں گے وہ عیسوں کی مینوں امام ابن شہاب

زہریؒ ہی سے مروی ہیں۔ علیٰ درجے کی سند۔ ایک ایک راوی سونے کی طرح گھرا۔ فارقلیط صاحب کے دانشور اگر آگاہ اپنے آپ کو عقل کل تصور کرتے ہوئے دوسرے بے شمار نکتہ راویوں کے علاوہ امام زہریؒ کو بھی جھوٹ قرار دینے پر تامل گئے ہیں تو اس سے قطع نظر کہ اس حرکت نازیبا کا نتیجہ احادیث کے اس پورے دفتر کو دبا کر کمرے کی شکل میں بندھنے کا جس کی روایت امام زہریؒ واسطے سے ہے سوال یہ ہے کہ پھر موطا امام مالکؒ ہی کا اعتبار کہاں رہ جاتا ہے جب کہ دانشور صاحبان اسے مکمل مقام عطا کر رہے ہیں۔ امام زہریؒ اگر جھوٹے تھے تو ان کے شاگرد امام مالکؒ بھی ان روایات کی حد تک یقینہ ناقابل اعتبار ہی تھیں جو انھوں نے امام زہریؒ کی سند سے موطا میں پیش کی ہیں۔ لیکن فی الحقیقت امام مالکؒ کی ساری ہی روایات کا اعتبار جاتا رہا کیونکہ اگر امام مالکؒ کسی ایک جھوٹے کو سچا سمجھنے کی فریب خوردگی میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو کیا عید ہے کہ اور بھی کتنے ہی راوی ایسے ہوں جو فی الحقیقت جھوٹے ہوں مگر امام مالکؒ انھیں سچا سمجھ کر ان کی حدیثیں لے لی ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ فریب خوردگی کا امکان بس امام زہریؒ کی پہلی ذات تک محدود رہ جائے۔ سچے اور جھوٹے کی تمیز ان کے معاملہ میں نہ ہو سکی تو دوسروں کے معاملے میں بھی دھوکا کھا جانے کا احتمال بلاشبہ موجود ہے۔

کوئی بھی ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ امام زہریؒ کی سند سے آئی ہوئیں بخاری کی تینوں روایات کو جھوٹا کہ فارقلیط صاحب کے لئے موطا امام مالکؒ کے گن گانے اور اسے تحت بنانے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی ہے (جاری)

تجلی اگر آپ کے نزدیک دینِ ملت کیلئے مفید ہے تو اس کی مزید اشاعت میں کوشش کر کے اجر آخرت کے امیدوار بنیے۔

شب قدر کا مسئلہ • فقہ ابن قیمی کے دو شعر • رجب کی ۲۷ • مشتبہ
بنیادیں • سرکاری سود • قادیانی مسئلہ •

تجلی کی ڈاک

شب قدر کا مسئلہ

سوال • از منظور انصاری۔ کامٹی۔

ان دنوں ”شب برات“ کا مسئلہ زیر بحث ہے۔
اخبار دعوت سے روزہ مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۳۹۷ء، فقہ القرآن
جلد چہارم تفسیر سورہ دخان اور ماہنامہ تجلی ڈاک نمبر
۳۱ ستمبر ۱۳۹۷ء زیر مطالعہ ہے۔ ایک سائل کے جواب میں
آپ نے جو کچھ رقم فرمایا ہے اس پر نظر پڑتے ہی مجھے بڑی
حیرت ہوئی کہ آپ کے قلم سے یہ کیسے نکل گیا۔
”شب قدر کا قطعی حکم کسی کو نہیں۔ وہ سال کے کسی

بھی پہنچے اور دن میں ہو سکتی ہے۔“

جب کہ سائل نے اپنے سوال میں لکھا ہے :-

”شب قدر لیلۃ القدر کا فارسی ترجمہ ہے اور

یہ رمضان المبارک کی ایک تبرک رات ہے

جس کی تفصیلت شب برات سے کہیں زیادہ ہے

اور سائل نے کوئی غلط بات نہیں لکھی ہے۔ خود قرآن

اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ میں :-
”رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔“

پھر سورہ دخان میں ہے :-

”قسم ہے اس کتاب کی۔ اے ہم نے لیلۃ رجب

رات میں نازل کیا۔“ (سورہ دخان۔ آیت ۳۲)

اور سورہ قدر میں فرمایا گیا :-

”اے ہم نے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔“

ظاہر ہوا کہ یہ رات رمضان المبارک کی کوئی رات ہے
پھر اس سلسلے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث
میں کہ شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاو
راتوں میں تلاش کرو۔

مولانا مودودی نے لیلۃ القدر کی تفسیر اور
سورہ دخان کی مذکورہ آیات کی تفسیر و تخریج میں بیان
فرمایا ہے کہ یہ رات رمضان کی طاق راتوں میں سے
کوئی رات ہے اور اکثر مفسرین اور علماء کے کرام کا
خیال ہے کہ یہ رمضان کی تیسویں شب ہے۔

نے اسی مسئلہ کے ذیل میں رقم فرمایا ہے کہ ہم نے تحقیق کا
پتا چلا کہ اس معاملے میں علماء کے چالیس سے زیادہ مذاہب

ہیں صحیح مسلم کے مشہور شراح امام نووی نے اگرچہ کوئی
عدد تو نہیں دیا لیکن بہتر سے اختلافات نام یہ نام ذکر
کر دیئے ہیں (ملاحظہ ہو جلد اول باب فضل لیلة القدر)
ان مختصر صفحہ پر اس کی گنجائش نہیں کہ ہم سارے
ہی اقوال نقل کریں مگر آپ کا تئیر و دار کہنے کے لئے ہم
اعتلاف کا یہ قول مشہور ضرور نقل کریں گے کہ شب قدر
صرف رمضان میں آتا نہیں بلکہ ہر مہینے سال کے کسی
کئی مہینے اور دن میں آتا سکتی ہے۔ عجمانی و مول عبد اللہ
بن مسعود اور عبد الرحمن بن عباس رضی اللہ عنہم سے بعض
اکابر نے ایسا ہی نقل کیا۔ مگر انہیں بعض تابعین بھی ہی رائے
دکھتے تھے۔ مشہور و معروف فقیہ ابن عابدین شامی نے
البحی میں تنازعہ خانیہ سے یہ بات نقل کی۔

ان المشهور عن الامام (ابی حنیفہ)
انھا قد وراى فی السنة کلھا قد تكون
فی س رمضان وقد تكون فی غیر (امام
ابو حنیفہ) کہ یہ ماہے مشہور ہے کہ شب قدر گزشتہ
کناں آتی ہے یعنی تمام کے تمام سال میں
کبھی رمضان میں آتی ہے کبھی اندر کسی مہینے
(میں)

مشہور و صحیح الطائفہ امام طریقت محی الدین ابن عربی
اپنی مشہور عالم کتاب فتوحات مکیہ میں لکھتے ہیں :-

"اختلف الناس فی لیلة القدر راعی فی
زمانها فتمتھم من قال فی فی السنة
کلھا قد ورویه اقول فانی لم أیتھا
فی شعبان و فی شہر ربیع و فی شہر
رمضان و اکثر ما دایتھا فی شہر
رمضان و فی العشر الاخر و سدر أیتھا
فی العشر الاوسط من رمضان فی لیلة

براہ کرم تجلی میں مفصل جواب سے شب برأت اور
شب قدر کی اصلیت سے آگاہ فرمائیں۔ نوازش
ہوشی۔ والسلام۔

جواب :-

ہمارے چند کہ غرض سے حریرت آپ کو مسئلے
ہوئی ہے کہ تفہیم القرآن کا مطالعہ کر کے کہنے یہ تصور
فرمادیا کہ لیلة القدر کے مسئلہ کا ہر پہلو اور گوشہ شامی کے
علم میں آگیا حالانکہ امرواقد یہ نہیں ہے۔
ذیل کے فقرے تو آپ تفہیم القرآن تفسیر سورہ
قدر ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔

"اب رہا یہ سوال کہ یہ کونسی رات تھی تو اس
میں اتنا اختلاف ہوا ہے کہ قریب قریب ۱۰
مختلف اقوال اس کے بارے میں ملتے ہیں
لیکن علماء امت کی بڑی اکثریت یہ رائے
رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تا تیروں
میں سے کوئی ایک طاق رات شب قدر ہے۔"

اس سے دو باتیں صاف صاف معلوم ہوتیں۔ ایک
ہے کہ جو متعدد احادیث حسب تفہیم نے اس مقام پر
نقل کی ہیں وہی اس مسئلہ کا کوئی قطعی فیصلہ کر دینے کے
لئے کافی نہیں کیونکہ اگر کافی دانی ہوتی تو اتنے زیادہ
مختلف اقوال اس باب میں نہ پائے جاتے۔ دوسرے
یہ کہ شب قدر کا رمضان کے آخری عشرے میں ہونا
اگرچہ اکثر علماء کی رائے ہے مگر تمام علماء کی نہیں۔

ان دونوں باتوں کا ادراک کر لینے کے بعد آپ کو
خود کچھ لینا چاہیے تھا کہ مسئلہ اتنا سیدھا سادہ اور دو کو
نہیں ہے اور کچھ اور اہم مواد بھی اس کے بارے میں
ضرور پایا جاتا ہے۔ حسب تفہیم نے "قریب قریب" جالیس
کے الفاظ لکھے۔ اس قریب قریب کا مطلب یہی ہے کہ
چالیس کا عدد حتی نہیں بلکہ شمار اس سے آگے بھی جاسکتا
ہے۔ چنانچہ بخاری کے شہرہ آفاق شارح حافظ ابن حجر

ہی کا اظہار نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اپنا مشاہدہ بھی بیان کر رہے ہیں اور یہ مشاہدہ کشف والہام کے قبیل سے نہیں ہے کہ اسے مشکوک و مشتبہ کہا جاسکے۔ یہ تو عینی شاہدہ ہے۔ ابن عربی کے بعض خیالات و آراء سے کوئی اختلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ وہ ایک زبردست زاہد و عابد و متقی اور صلہ و برکت سے انھیں بھڑا کہنا حلال نہیں ہو سکتا۔ اپنے جس مشاہدے کا انھوں نے ذکر کیا اس کی تکذیب تو جھٹلانے ہی کے ہم معنی ہو گی جس کا کوئی جواز نہیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ علم اور علمِ حرمِ آئمہ سلمتے ہوں تو اعتبارِ علم کا ہو گا۔ زید کہتا ہے میں نے ایک ایسی چھلی دیکھی جس کے کاسے سے تیز روشنی خارج ہو رہی تھی۔ دس اور آدمی کہتے ہیں کہ ہم نے تو ایسی کوئی چھلی نہیں دیکھی۔ طے ہے کہ ان دس آدمیوں کے قول سے زید کی تکذیب نہیں ہوتی اگر زید ثقہ اور معتبر آدمی ہے تو اس کی بات کو تسلیم کرنا ہی ہو گا۔

ٹھیک اسی طرح یہ معاملہ ہے کہ اگر ایک ہزار آدمی کہتے ہیں کہ ہم نے رمضان کے علاوہ کبھی شب قدر نہیں دیکھی اور ابن عربی جیسا شیخ و امام خود اپنا بارہا کا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ میں نے اسے شعبان میں بھی دیکھا ہے اور ربیع میں بھی تو ابن عربی کی تصدیق کہی ہو گی اور اس تصدیق کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ ایک ہزار آدمی جھٹلا دیے گئے۔ آئیے ذرا اسنادِ الاسانیدہ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ السلام کا ارشاد بھی دیکھیں۔ وہ مختلف اقوال کی تطبیق و توفیق مندرجہ ذیل طریقے سے کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:۔

”شب قدر دراصل دو ہیں۔ ایک وہ جس کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے یُسْرٰی كُلِّ اَمْرٍ حَکِیْمٌ اور اسی شب میں پورا قرآن سارا اعلیٰ سے سارا درنیا پر نازل کیا گیا۔ پھر وہ مجاہد اترتا رہا۔ یہ وہ شب قدر ہے جو پورے سال میں کسی بھی وقت ہو سکتی ہے رمضان ہی کی شرط

و تَوَدُّی الْوَسْمَہَا فَاَنَا عَلٰی یَقِیْنٍ مِّنْ اَنْہَا مَکْدُورٌ فِی الْمَسْنَةِ وَفِی وَتَرَوْشَفَعٍ مِّنَ الشَّہْرِ“ (لوگوں نے شب قدر کے بارے میں اختلاف کیا ہے یعنی اس بارے میں کہ وہ کب کس زمانے میں ہوا کرتی ہے۔ پس ان اختلاف کرنے والوں میں ایک فریق کی رائے یہ ہے کہ شب قدر پورے سال میں گھومتی پھرتی رہتی ہے اور میں بھی ایسا ہی کہتا ہوں چنانچہ میں نے شب قدر کو شعبان میں بھی دیکھا ہے ماہ ربیع الاول میں بھی اوماہ رمضان میں بھی۔ ہاں زیادہ تر ماہ رمضان میں دیکھا ہے، خصوصاً آخری عشرے میں۔ ویسے بھی میں نے رمضان کے درمیانی عشرے میں بھی دیکھا ہے (یعنی دس اور بیس رمضان کے درمیان) یہی نہیں کہ طاق ہی رات میں دیکھا ہو جو بعض رات میں بھی دیکھا ہے پس مجھے تو اس کا پورا یقین ہے کہ شب قدر پورے سال کی طاق اور جفت سب راتوں میں گردش کناں رہتی ہے۔“

اب غور فرمایا جائے۔ عبداللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس اور ابو حنیفہ اور ابن عمر جیسے اساطین کے بارے میں یہ تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ان احادیث سے ناواقف ہوں گے جو لیلۃ القدر کے بارے میں آئی ہیں۔ یہ حضرات واقفیت کے باوجود اگر مذکورہ رائے رکھتے ہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ احادیث لیلۃ القدر کی تخرید و تعین میں صریح اور قطعی نہیں ہیں بلکہ متعذر و مفادیم اور تاویلات کی گنجائش ان میں ہے۔ اگر انکا اصرار مفہوم ہی ہو تو کہ لیلۃ القدر صرف رمضان میں ہوتی ہے کسی اور چیز میں نہیں تو یہ حضرات خلافِ حدیث رائے نہیں رکھ سکتے تھے۔

مزید قابل غور یہ ہے کہ ابن عربی صرف اپنی رائے

نہیں، ہاں زیادہ قریباً اس کا رمضان ہی میں ہونا متوقع ہے اور اس پر اتفاق ہے کہ جب قرآن نازل ہوا تو یہ ماہ رمضان ہی میں ہوئی تھی۔

دوسری شب قدر وہ ہے جس میں خاص طور پر روحانیت کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور فرشتے زمین کی طرف آتے ہیں۔ اس رات میں مسلمان عبادتیں کرتے ہیں تو ان پر انوار و تجلیات کا اندکاس ہوتا ہے، شیطان دور کیا گیا ہے اور فرشتے قریب آتے ہیں۔ دعائیں اور عبادتیں مقبول ہوتی ہیں۔ یہ وہ شب قدر ہے جو رمضان ہی کے آخری عشرے میں ہوتی ہے کبھی پہلے کبھی بعد میں (یعنی کبھی ۲۱ کو کبھی ۲۳ کو کبھی ۲۵ کو) یہ شب قدر آخری عشرہ رمضان سے باہر نہیں جاتی۔ پس جن لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ شب قدر پورے سال میں گھومتی پھرتی ہے ان کا ردئے سخن پہلی والی شب قدر کی طرف ہوگا اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ لازماً رمضان کے آخری ہی عشرے میں ہوتی ہے ان کا ردئے سخن دوسری والی شب قدر کی طرف ہوگا“ (فتح الملہم جلد اول صفحہ ۱۹۴)

حضرت شاہ صاحب قاسم سرہ کی یہ تفسیق بہت دل لگتی ہے لیکن یہ بہر حال معلوم ہے کہ اس بیان یا قاضی خان یا ابوبکر الرازی نے جہاں حنفیہ یا امام ابو حنیفہ کا قول نقل کیا وہاں یہ تصریح نہیں کہ وہ حنفیہ کو دو قرار دیکر ایک کے بارے میں یہ قول کرتے ہیں اسلئے ہم نے بھی ضروری نہیں سمجھا کہ اس قول کو اپنے طور پر نقل کرتے ہوئے اس قسم کی صراحت کریں۔ ہمارا پورا جواب (دسمبر ۲۱ء والا) پھر سے پڑھ لیجئے۔ اس میں شب قدر کی علمی و تحقیقی حیثیت کو ہم نے مؤثر نہ ہی نہیں بنایا بلکہ فقط ضمناً ایک فقرہ لکھ دیا ورنہ ہمارا سارا ذرا اس بات پر ہے کہ ذیلی و فردعی مسائل میں

نزاع و تکرار سے بچا جائے۔ تشر دسے دوڑھا گا۔ زیادہ وقت نہ کھپایا جائے۔ ظاہر ہے کہ حنفیہ کتب فقہ میں ہم قول ابو حنیفہ ہی کی پیروی کرتے اور ہم نے اصلاً اسے ہم قول ابن مسعود اور قول ابن عباس سے کہہ سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ابو حنیفہ یا کسی صحابی ہر رائے لانا درست ہو لیکن ان کی آرا پر حاکم سید وسیع علم والے کر سکتے ہیں۔ ہم جیسے اناری کیا کر سکتے ہیں کہ اپنی کم علمی اور کم دانشی ہی کی بنا پر ہم نے تقلید ابو حنیفہ کا دامن پکڑا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں سیالپالٹہ ابن عربیؒ نے بھی شب قدر کو دو قسموں میں تقسیم نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ ایک قسم کی شب قدر کو میں نے غیر رمضان میں بھی دیکھا ہے۔ وہ اور دیگر بڑے شمار علماء اور محققین اختلاف کی وہ تاویل نہیں کرتے جو شاہ ولی اللہؒ نے کی ہے۔ لہذا شاہ صاحب کی تاویل کو نفیس مانتے ہوئے بھی ہم نص کا درجہ نہیں دے سکتے اور ابو حنیفہ یا ابن مسعود وغیرہ کے قول میں اپنی طرف سے تخصیص نہیں کر سکتے۔

آپ تفہیم القرآن نو دیکھ ہی رہے ہیں۔ صاحب تقسیم نے بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ شب قدر روز میں سورہ دخان کی تفسیر میں تو وہ صاف لکھتے ہیں کہ جس مبارک رات کا یہاں ذکر ہے وہ وہی ہے جس کا تذکرہ سورہ قدر میں ہے۔ لیکن ابھی آپ شاہ ولی اللہؒ کے کلام میں ملاحظہ فرمائیے کہ ان کا خیال اس سے مختلف ہے۔ سورہ دخان میں جو کہا گیا کہ فَبِمَا يُفَرِّقُ كُلُّ أَمْوٍرٍ حَكِيمًا اس رات میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہوائے حکم سے صادر کیا جاتا ہے (اسی کے بارے میں شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اس سے جو رات مراد ہے وہ رمضان میں مختص نہیں بلکہ پورے سال میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ علم النبیؐ میں شاہ ولی اللہؒ دیا ہے ہن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ درس حدیث کی تمام باتیں انھیں سے جاملتی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ حدیث

تھی اور ماہ رمضان میں واقع ہوئی تھی۔ یہ ایسا ہی ایک واقعہ ہے جیسے آپ یوں کہیں کہ زید میرے گھر شوال کی ایک رات میں آیا۔ اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ رات صرف شوال ہی میں آ سکتی ہے کسی اور چھبے میں نہیں۔ اسی طرح استدلال یا لایہ ثابت نہیں کرنا کہ آئینہ ہمیشہ شب قدر رمضان ہی میں آیا کرے گی۔ یہ کوئی ہماری ذہنی آفہ نہیں بلکہ متعدد اکابر نے ایسا ہی کہہا ہے اور درایت منطقی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

رہیں وہ متعدد حدیثیں جن سے پتا چلتا ہے کہ شب قدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کی جاوے گی ہے تو اسی کے ساتھ وہ حدیث بھی ملحوظ رہنی چاہیے جس میں اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ مجھے شب قدر کا متعین علم دیا گیا تھا مگر پھر بھلا دیا گیا۔ اس بھلانے کی حکمت عامہ علمائے کرام یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر تاریخ دھینہ متعین ہو جاتا تو شب قدر کی تلاش میں کسی کی بھی جدوجہد کرنی پڑتی۔ بحالت موجودہ جدوجہد ضروری ہو گئی۔ علماء کا یہ بیان حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری شرح بخاری میں ذکر کیا ہے اور دیگر متعدد اساتذہ نے بھی۔ اس حکمت کی حلوہ گری سب سے زیادہ اس صورت میں ہوتی ہے جب یہ مان لیا جائے کہ شب قدر سال کے سارے ہی مہینوں اور سالے ہی دنوں میں ہو سکتی ہے۔ دوسرے درجے میں یہ ہے کہ جفت راتوں کو خارج کر دیا جائے۔ اسی طرح تلاش کا میدان صرف آدھا سال رہ جائیگا۔ تیسرے درجے میں یہ ہے کہ گیارہ مہینے خارج کر دیے جائیں۔ اس طرح جتنی نقطہ ایک ماہ رمضان میں محدود ہو کر رہ جائے گی جو کتنی صورت یہ ہے کہ رمضان کی محض طاق راتیں خاص کر دی جائیں۔ اب گویا میدان تلاش آدھا ہی ہینہ رہ گیا۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ طاق و جفت کا فرق تو نہ کیا جائے مگر رمضان کے آخری عشرے کو مخصوص

قرآن سے بہرہ فحہ۔ وہی اگر بطایہ فیصلہ دیتے ہیں کہ ایک شب قدر ایسی بھی ہے جو رمضان تک محدود نہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ آیات و احادیث میں اس رائے کی گنجائش موجود ہے۔ پھر حباب بن مسعود اور ابن عباس اور عکرمہ اور ابو حنیفہ جیسے اکابر کا منقولہ بالا قول سامنے آتا ہے تو اور بھی یقینی ہو جاتا ہے کہ آیات و احادیث اس باب میں ایک سے زیادہ مفہوم کا احتمال رکھتی ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ اہل علم ان اکابر کی رائے کو مرجوح قرار دیں اور کوئی دوسری رائے پس فرمائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس رائے کو خلاف قرآن و حدیث ٹھہرائیں۔

جس استدلال کو آپ نے حرف آخر تصور فرمایا ہے اس پر بھی مزید غور کی ضرورت ہے۔ آپ کا اور بے شمار حضرات کا استدلال یہ ہے کہ اللہ نے سورہ بقرہ میں فرمایا ”ہم نے ماہ رمضان میں قرآن نازل کیا“ پھر سورہ قدر میں فرمایا ”کہ قرآن ہم نے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا“ اس سے ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان ہی کی کوئی رات ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بیان واقعہ سے آخریہ قاعدہ کلیہ کیسے نکل آیا کہ لیلۃ القدر ہمیشہ ماہ رمضان ہی میں ہوگی۔ آپ اول تو یہ دیکھیں کہ یہ آیات ہر اعتبار سے صریح نہیں ہیں۔ قرآن سب جانتے ہیں کہ تھوڑا تھوڑا کہ کے نازل ہوتا رہا ہے۔ لہذا سورہ بقرہ کی آیت متحدہ معانی کی تحمل ہو گئی۔ ایک یہ کہ قرآن سے مراد آغاز وحی ہوا و مراد یہ ہو کہ پہلی وحی قرآنی ماہ رمضان میں بھیجی گئی۔ دوسرا یہ کہ رمضان میں پورے قرآن کو لوح محفوظ سے سماء اعلیٰ کی طرف منتقل کیا گیا۔ تیسرا یہ کہ پورا قرآن سماء اعلیٰ سے سماء دنیا پر ماہ رمضان کی ایک مبارک رات میں اتارا گیا ہو یقین کے ساتھ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ آیت کا صحیح مصداق کیا ہے۔ پھر بھلا ایسی غامض آیت کو کسی املاہر کے لئے دلیل قطعی کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

ملاوہ ازیں مذکورہ دونوں آیات کو ملائے سے پس اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن جس رات میں نازل ہوا وہ شب قدر

ہو جسے سورہ قدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ چنانچہ صاحبِ تفہیم نے سورہ دخان کی تفسیر میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی تھی ہے اور بے شمار مفسرین بھی یہی کہہ گئے ہیں لیکن ابھی آپ نے دیکھا کہ شاہ ولی اللہ رحمہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ دونوں راتوں کو جدا جدا مانتے ہیں ان کے علاوہ خبیر احمد عثمانی رحمہ کا تفسیری حاشیہ دیکھئے۔ سورہ دخان میں مذکور الفاظ لیلۃ مہرکتہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

”بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ

وہ شعبان کی پندرہویں رات ہے جسے
خبر برآء کہتے ہیں۔“

ایسی روایات کا موجود ہونا ثابت کرتا ہے کہ جس جگہ اہل علم کے مابین یہ بات قطعی نہیں ہے کہ سورہ دخان اور سورہ قدر میں ایک ہی رات کا ذکر ہے۔ اول الذکر رات شعبان کی پندرہویں رات بھی ہو سکتی ہے جبکہ ثانی الذکر رات رمضان ہی سے مخصوص ہے۔ وہ بھی اس آخری عشرہ سے طاق کی قید کے ساتھ۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفہیم والے اہلِ اہل کی تاویل کیا کریں گے۔ قرآن نے بتایا کہ راتِ اَن ماہِ رمضان میں نازل کیا گیا۔ دوسری جگہ بتایا اسی لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا۔ لہذا تیسری جگہ یہ فرمایا گیا کہ قرآن کو ہم نے ایک مبارک رات میں نازل کیا تو اس سے مراد وہی رات ہو سکتی ہے جس کا ذکر لیلۃ القدر کے لفظ سے سورہ قدر میں آیا ہے۔

تاویل اس کی یہ ممکن ہے کہ ماہ رمضان میں قرآن نازل ہونے والی آیت کسی ایک مصداق پر قطعیت کے ساتھ دال نہیں ہے۔ ہم ذکر کر چکے کہ اس کے متبادر مصداق ہو سکتے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ سورہ دخان میں تنزیل کا مصداق وہ نہ ہو جو سورہ قدر میں ہے۔ فرض کیجئے سورہ دخان میں تنزیل کا مصداق یہ ہو کہ لوح محفوظ سے نقل کر کے سماۓ اعلیٰ یا کسی بھی اور مقام پر

کر دیا جائے۔ اس طرح چاروں ایک عشرہ میں منحصر ہو جاتی ہے۔ اور چھٹی صورت وہی ہے جو شائع ذائع ہے یعنی آخری عشرہ رمضان کی شرفِ جفت راتیں۔ اس میں تلاش و جستجو کا کلام بہت چھوڑا رہ گیا ہے۔

تفہیم القرآن کی نقل فرمودہ حاشیہ اگر یہ واضح کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کو آخری عشرہ رمضان کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کی ترغیب دی ہے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نزولِ قرآن جس شب میں ہوا وہ یقینی طور پر آخری عشرہ رمضان ہی کی کوئی طاق رات تھی۔ اسی لئے بہت زیادہ اغلب یہ ہوا کہ آن رہ بھی وہ اسی عشرہ کے کی و تر راتوں میں افح ہو۔ چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ابن عربی بھی یہی کہتے ہیں کہ زیادہ تر میں نے اس رات کو رمضان کے آخری ہی عشرے میں دیکھا ہے۔ حضور بھی گمان غالب ہی کے تحت یہ امر رکھتے تھے کہ یہ رات رمضان کے آخری عشرے اور طاق راتوں میں آئے گی۔ علم یقین اس سلسلہ میں آپ کو بھی حاصل نہیں تھا جیسا کہ خود آپ نے اطلاع دی کہ مجھے شب قدر بتائی گئی تھی مگر پھر کھلا دی گئی۔ ایسی کوئی حاشیت نہیں جس میں آپ نے فرمایا ہو کہ شب قدر کا یوم معین اگر یہ میں بھول چکا ہوں مگر یہ ہر حال مجھے اللہ بتایا ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے میں ہی ہوگی اس سے باہر نہیں ہوگی۔

اور شاہ ولی اللہ والی تاویل پیش نظر رکھی جائے تو ان بحثوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ پھر نو بات مضاف ہو جائے گی کہ حضور نے جس شب قدر کی تلاش کی ترغیب ماہ رمضان کے آخری عشرے میں دی وہ اس شب قدر سے بعلحدہ ہے جو پورے سال میں گزشتہ کتناں رہتی ہے۔

ایک اور بار ایک نکتہ یہاں ذکی و ذہین لوگوں کے لئے لائق التفات ہے۔ وہ یہ کہ ظاہر اُنہوے شک ہی معلوم ہوتا ہے کہ سورہ دخان میں جس رات کا ذکر کیا گیا وہی

اتارا گیا تاکہ وہاں سے نجا نجا زمین پر نازل کیا جائے اور سورہ قدر میں یہ ہیکہ قرآن کو اس شب میں سمارا علی سے سمار دینا پر نازل کیا گیا، یا یہ کہ قرآن کی پہلی تنزیل بصورت وحی بذریعہ جبرئیل رسول اللہ پر ماہ رمضان میں ہوئی۔

اس طرح یہ دو الگ الگ باتیں بن جاتی ہیں۔ ایک بہت ہی لطیف قرینان کے الگ الگ ہونے کا یہ بھی ہے کہ دغان میں لیلۃ مبارکۃ فرمایا گیا اور قدر میں لیلۃ القدر۔ معاً ان دونوں الفاظ کو خواہ مترادف اور یکساں سمجھ لیا جائے لیکن حرفاً بہر حال الگ الگ ہیں ایک ہی شے عظمت و شرف والی بھی ہو سکتی ہے اور خیر و برکت والی بھی لہذا اس امکان سے تو انکار نہیں کہ ایک ہی رات کو مذکورہ دو الفاظ میں بیان کیا گیا ہو لیکن اسی کے ساتھ یہ امکان بھی ہے کہ خاص طور پر ”مبارک“ کسی اور رات کو کہا گیا ہو اور عظمت و شرف والی کسی اور رات کو۔ مبارک اسی رات کو کہا گیا ہو جب قرآن لوح محفوظ سے منقول ہیکہ کسی تختانی مقام پر آیا اور عظمت و شرف والی اس رات کو جب وہ دنیا میں اترا نثر و معجز ہوا۔ علاوہ اس کے خود تفہیم میں وضاحت موجود ہے کہ لیلۃ القدر کے لفظ قدر کو بعض مفسرین نے تقدیر کے معنی میں لیا ہے۔ اس رائے کے مطابق کچھ اور زیادہ قرینہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مبارک رات کسی اور رات کو کہا گیا ہو اور لیلۃ القدر کسی اور رات کو۔

یہاں ہم تصور اس اضافہ کریں گے۔ لفظ قدر سے متعلق اہل علم میں تین آراء پائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد عظمت و اکرام والی شب ہے۔ اس کی نظیر قرآن کی یہ آیت ہے وَمَا قَدَرْنَا وَاللّٰهُ خَقَّ قَدْرُهَا (الحج)

دوسری یہ کہ یہاں قدر حسین اور تنگی کے معنی میں آیا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیر یہ ہے وَخَدَّسَ عَلَیْہِ رِزْقُہُ (الفجر) اَدَمْنِ قَدَّسَ عَلَیْہِ رِزْقُہُ فَلَیْسَتْ فِی (الطہ) مقصد یہ ہو گا کہ اس رات میں اس قدر رشتے زمین پر اتارتے

ہیں کہ حادۃ زمین تنگ ہو جاتی ہے۔

تیسری یہ کہ قدر یہاں قدس (بفتح دال کے معنی میں ہے یعنی تقدیر اور مراد یہ ہے کہ اس رات میں اس پر سورہ سال کے لئے اللہ تعالیٰ تقدیری احکام کو نفاذ و اجراء کے لئے متعلقہ فرشتوں کے سپرد کرتا ہے یا کوئی اور نامعلوم شکل اختیار فرماتا ہے۔ اس معنی کے لئے سورہ دخان کی یہ آیت دلیل بنائی گئی ذِہَا یُعْرَفُ کُلُّ اَمْرِ حَکِیْم۔

جب لفظ قدر کے تین مفاہیم ممکن ہیں تو کیسے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ہر مفہوم کے لحاظ سے یہ دہری رات قرار پائے گی جسے دغان میں دلیل مبارک سے تعبیر کیا گیا تنگی یا تقدیر کا مفہوم لے کر تو اسے برکت اور عارم برکت سے جوڑنا ہی مشکل ہے۔

بات اگرچہ پھیل گئی لیکن یہ پھیلاؤ ہر شخص کو یہ تو محسوس کرا ہی دے گا کہ شب قدر کا مسئلہ اتنا سادہ متعین اور دلکڑ نہیں کہ ایک عام آدمی کوئی ایک تفسیر دیکھ کر قطعی فیصلہ کر سکے۔ خصوصاً شاہ ولی اللہ اور ابن عربی کی تصریحات کے بعد اور دو صحابہ کے علاوہ امام ابو حنیفہ کے قول سے آگاہ ہو جانے کے بعد ہم اے اس فقیر پر ہیرت و استعجاب کی کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ جاتی جس پر آپ منتخب ہوئے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر رائے دہی درست ہو تو تفہیم سے ظاہر ہے تو یہ بشرق اسی پر قائم رہتے ہم اسے ترک کا مشورہ نہیں دیں گے۔ نیز جو رائے ہم نے ظاہر کی ہے اس پر بھی ہمیں کچھ زیادہ اصرار نہیں ہے کیونکہ خود امام ابو حنیفہ کی طرف ایک اور بھی رائے منسوب ہے اسے بھی سن لیجئے وہ یہ ہے کہ شب قدر رمضان ہی میں منحصر ہے لیکن اس کے کسی خاص حصے میں نہیں بلکہ پورے چھپے کی کوئی بھی رات ہو سکتی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کی بھی یہی رائے تھی۔ حنکہ ایک حدیث مرفوعہ بھی ان سے مروی ہے۔ ابن المنیرؒ رادہ حاطی اور بعض شافعیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ بشرح المنہاج میں علامہ سیوطیؒ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ ستر وحی نے اپنی شرح الہدایۃ میں

میں موجود ہے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اسی مجموعہ کا شعر ہو گا۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ترجمان دالے تبصرہ میں ایک جگہ یہ الفاظ ہیں :-

”ان کے دل دردمن نے اس انقلاب کا ماتم کیا ہے جس نے اخلاقی انحطاط کی رفتار کو تیز کر دیا ہے اور جس سے کرب و بلا کے ایک لتا ہی دور کا آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ فقہ کی شاعری بھی اس کربلائے حیات کی تاریخ بن گئی ہے۔“

(ترجمان دہلی یکم ستمبر ۱۹۴۲ء ص ۱۱۱، کالم ۱۲)
خط کشی یہ الفاظ پر غور کیجئے۔ یہی الفاظ، کوزل کا عنوان بھی ہیں۔ اور عجب نہیں کہ تبصرہ نگار نے اسی غزل کی بنا پر منہ رجبہ بالا رائے قائم کی ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا شعر بھی فاضل تبصرہ نگار کی نظر میں قابلِ داد ہی ہے! بہر حال شعر خواہ اسی مجموعہ کا ہو خواہ کسی اور مجموعہ کی زینت بنے والا ہو۔ براہِ مہربانی دونوں اشعار تبصرہ ضرور فرمائیے ”عروض کی کھڑکی“ بھی کچھ کم حیرت انگیز دریافت نہ تھی جو شاعر نے ”پیر کے گا“ کی پیشین گوئی کا اضافہ کر کے شعر کو عجوبہ بنا دیا! دوسرا شعر پڑھ کر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی کینڈل سٹ شاعر بول رہا ہو۔ پتا نہیں اظہر فقوی صاحب نے کیسے لکھا یا :

”انہوں نے کہیں دینی اذکار کا ماتم نہیں اڑایا ہو بلکہ اس کے برعکس ان کے شعروں میں ان کا دینی شعور نمایاں ہے“ (ایضاً ص ۱۱۱ کالم ۱۲) فقط

جواب :-

آپ کا خط پڑھ کر ”سفینہ زرگل“ کے اوراق اٹے۔ دوسرا شعر اس میں نہیں ہے حالانکہ وہ غزل موجود ہے جس کا یہ شعر ہے۔ اس کا مطلب شاید یہ ہو کہ مجموعہ مرتب کرنے وقت خود فقہا صاحب کو اس شعر کی قیامت محسوس ہو گئی ہے اور اسی بنا پر اسے غزل سے خارج کر دیا ہے۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

امام ابو حنیفہ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے ہیں انہما متنقل فی جمیع رمضان (شب قدر سارا رمضان کے تمام دنوں میں بدلتی سالتی رہتی ہے)

خود ابن عربی نے بہت سے لوگوں کی طرف اس رائے کا انتساب کیا ہے لیکن ان کا خیال ہی نہیں یقیناً چونکہ یہ ہے کہ شہد قاری پورے سال میں گردش کرتی ہے اس لئے انھوں نے ان تمام دلائل کا جواب دیا ہے جو اس کے خلاف پڑتے ہیں۔

بہر حال مختصر وقت اور صفات میں جو تفصیل آسانی ممکن تھی پیش کر دی گئی بہتر ہے کہ فی الحال اس بحث کو لمبیٹ ہی کر رکھا جائے۔ ایسی بحثوں میں لطف اس وقت آتا ہے جب سائل و مسئول دونوں کے سامنے سارا متعلقہ مواد موجود ہو۔ آپ کے لئے یہ کچھ کا دی بہت دشوار ہے لہذا کیوں بات کو طول دیا جائے۔ فقط والسلام۔

فضا ابن فیضی کے دو شعر

سوال ۱ :- از خالد پیش، نظام پور۔

اگست و ستمبر ۱۹۴۲ء کے جلی میں ”سفینہ زرگل“ پر آپ کا تبصرہ پڑھا جو دلچسپ بھی ہے اور غیر جانبدارانہ و محققانہ بھی تاہم دو اشعار تبصرہ سے مل گئے ہیں :-

(۱) کھول کر اب عرش کی کھڑکی ادھر بھی دیکھ

منتظر ہے پھر تری دنیا پیہم بر آئے گا

(۲) اسے ملا نہیں شاید شفیق بآپ کا دل

خدا کی ذات میں اپنی صفات بھی رکھ د

پہلا شعر ”ترجمان“ دہلی میں دیکھا تھا۔ اسے اظہر فقوی صاحب نے اسی مجموعہ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے شاعر کے دینی شعور کے ثبوت میں پیش کیا ہے! دوسرا پہلی کے ایک روزنامہ کی اردو جوائی سہ ماہی کی اشاعت (تراشہ) اور سالِ خیمت ہے، میں نظر سے گذرا۔ یہ فضا صاحب کی ایک غزل ”تاریخ کربلائے حیات“ کا شعر ہے۔ اس کے بارے میں یقینی طور پر یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مذکورہ مجموعہ کلام

”بادر آنا“ ہمارے خیال میں خلاف محاورہ ہے فارسی میں باد گردن بولتے اور کہتے ہیں۔ باد آمار ہمارے نظر سے ہمیں گزرا اور وہیں یہ لفظ فارسی ہی سے آ رہا ہے اور باد گردن یا کرنا استعمال ہوتا ہے باد کے معنی افق اور نقین کے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ تو ”آنا“ مستعمل ہے مگر باد کے ساتھ نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے یوں کہتے درست ہے کہ فلاں بات کا یقین ہو گیا مگر یوں کہنا نہیں کہ ہمیں فلاں بات کا اعتقاد ہو گیا جیسے محاورہ ہے کہ اسے چپ لگ گئی۔ چپ خاموشی اور سکوت ہو کو کہتے ہیں مگر یوں نہیں بولا جاتا کہ اسے خاموشی لگ گئی یا اسے سکوت لگ گیا۔ بہر حال ضرورت شعری کے عذر سے مصرعہ ثانی گوارا کر لیا جائے تو کر لیا جائے، ارد مرہ سے اس کی مطابقت نہیں ہے۔ ویسے شعرا اپنی جا خوب ہے۔

جس شعر آپ تبصرہ چاہتے ہیں اس پر ترجمان“ پر اگر توضیحی دیکھا کہ ہر لہجے تو خوب کی بات ہے ترجمان اہل حدیث کا پرچہ ہے اور اہل حدیث بھی اس شعر کا دائرہ انگور کی طرح مفہم کر جائیں تو اسے عجیب نہیں سمجھیں گے۔ ہر لہجہ دیکھا کہ دینے والے کرم خرما اظہر نقوی صاحب اہل بیڑا نہیں اور ترجمان والوں نے تبصرہ بغیر پڑھے ہی مشاعرہ کر دیا ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ یاہر کوئی ایسے صاحب ہوش جو رطب دیا بس کی تمیز نہ رکھتے ہوں۔

بہر کیف بیشتر بھی فضا جیسے نہیم نزاع کے نمایاں شان نہیں۔ عرش کوئی ایسا کمرہ نہیں ہے جس میں خدا منہ چھپا کر بیٹھ رہا ہو اور دنیا کا حال چال دریافت کر کے اسے اس کمرے کی کسی کھڑکی سے جھانکنے کی ضرورت ہو۔ العباد باللہ۔ شعر میں طنز طعن، ناز نخع، جھلجھل اور خوش گیمیاں سمجھی چلتی ہیں۔ داغظوں کی پگڑیاں بھی اچھلتی ہیں اور باد و شاہر سے پیٹیں بھی بڑھتی ہیں۔ یہ سب ردائیت گوارا ہے اور تاویل حسن کے دروازے کھلم کھلے ہیں مگر ذات باری تعالیٰ اور عرش عظیم کو بھی

دلیسے آپ اردو بانمگز کا جو تراشہ بھیجا ہے وہ جو لائی سندھ کا ہے اور مذکورہ غزل کے پانچ شعر اس میں طبع ہوئے ہیں جن میں ایک وہی ہے جس پر آپ تبصرہ چاہتے ہیں۔ پتہ نہیں معاملہ کیا ہے۔ سفینہ زرنگی سندھ میں طبع ہو چکی ہے۔ اگر اس وقت شاعر نے اس شعر کو غزل سے خارج کر دیا تھا تو بعد میں ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ پھر اسے شامل غزل کر کے کہیں چھپوا دیں گے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بہت پہلے یہ غزل کہیں اس شعر سمیت چھپی ہے اور اردو بانمگز نے اس کے کچھ اشعار وہیں سے نقل کر لئے ہیں۔ عنوان بھی غالباً اردو بانمگز ہی نے منتخب کیا ہے درتہ کتاب میں تو کئی عنوان ہی نہیں۔

بہر حال اب بیشتر پریس میں آ ہی گیلے تو ہمارا تبصرہ بھی سن لیجئے کہ بیشتر کسی تبصرہ کا تحمل ہے ہی نہیں۔ ذہن اور صاحب فکر لوگ کبھی کبھی اپنے افکار کی دنیا میں اتنے غم ہو جاتے ہیں کہ دوا درد و جارتک کا ہوش انھیں باقی نہیں رہتا۔ ایسے عالم بے نام درنگ میں ان کے زبان و قلم سے ایسے نوادرات بھی کبھی کبھی نکل جاتے ہیں جنھیں علم و منطق کی تیارہ میں نہیں تیرا جا سکتا۔ جزو ب لوگوں پر قیاس کر لیجئے۔ عالم جذبے نکات کس کی سمجھ میں آتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے یہ شعر بھی شاعر نے بولدگی، گم حتمی اور فلک سیری کے ایک خاص عالم میں کہا ہے۔ اس عالم کی حدود سے باہر اگر شاید وہ خود بھی اس کا مطلب منشاء بیان نہ کر سکیں۔ کم سے کم ہماری عقل ناقص میں یہ بات نہیں آئی کہ کوئی صحیح الیمان آدمی حالت ہوش و حواس میں ایسا شعر کہہ کر کہہ سکتا ہے۔

دوسرے شعر کا معاملہ کچھ عجیب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کتاب پڑھتے پڑھتے وہ ورق نادانگی میں ہم نے پلا پڑھے الٹ دیا ہے جس میں یہ غزل ہے۔ اگر یہ غزل ہم نے پڑھی ہو تو یہ شعر خود ہم تبصرہ نہ رہتا اور اسی غزل کے ایک اور شعر یہی ہم دوچار لفظ کہتے۔

اس قدر بولے گئے ہیں تھوڑے سچ کے نام پر حق بھی نہیں بولوں تو دنیا کو نہ بار کئے گا

اب آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا حدیث صحیح ہے۔
اس پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں۔

(ج) کیا ۲۴ مارچ شب میں عید کی طرح مسجد میں
جمع ہو کر نفل پڑھ سکتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہو
(د) کیا قہر معراج ۲۴ مارچ شب میں بیان کرنا
سلف سے ثابت ہے۔

آپ اپنی دانش میں جو جانتے ہیں وضاحت کے
ساتھ تحریر فرمائیں تاکہ ہم کم عمل انسان فائدہ حاصل
کر سکیں۔

مشتبہ بنیادیں

سوال ۱۰: (ایضاً) رسالہ رکن دین مؤلف
مولانا رکن الدین صاحب تفتی نقشبندی مجددی دہلوی رح
اور اس رسالہ کے آغاز میں غنیۃ الطالبین، و
رسالہ فضائل المشہور دیکری وغیرہ کے متعلق آپ اپنے خیال
کا اظہار کریں کہ کیا قابل عمل ہے۔

سرکاری سود

سوال ۱۱: (ایضاً) تجلی جنوری و فروری ۱۴۳۷ھ
میں ایک مضمون تھا کیا سرکاری سود جائز ہے؟ اس میں
مفتی مفتی الرحمن اور آپ کے تاثرات تھے۔

جنوری سے ابھی تک منتظر تھا کہ آپ ہندوستانی مسلمانوں
کو فیصلہ کن رائے سے آگاہ کریں، مگر آجست و ستمبر کا شمارہ
اس سے خالی تھا۔ اس لئے آپ کو تحریر کر رہا ہوں کہ ظلمائے
دقت کا فتویٰ کیا ہے تحریر کریں۔ فقط۔

جواب:-

اشرفیہ ہشتی زیور کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس میں
تو ایسا کوئی حاشیہ نہیں۔ مگر یہ نسخہ عکسی نہیں معلوم ہوتا ہے
اس کے عکسی نسخہ میں ایسا حاشیہ دیا گیا ہو گا۔
بہر حال بات مولانا اشرفیہ ہی کی درست ہے

کوئی شاعر اسی روایتی سطح پر پہنچ لائے تو اس کی جو اصل
افزائی نہیں کی جائے گی۔ پہلا مصرعہ نہ صرف باعتبار زبان
چمکانا ہے بلکہ باعتبار مفہوم سو قیام بھی ہے اور دوسرا
مصرعہ عموماً شاعر کی طرف بکھرتا دیا اس دیکھ رہا ہے کہ
آپ ہی میرا مطلب بیان کریں!

قادیانیوں جیسی ساخت رکھنے والے کچھ افراد کسی
پیمبر کے منتظر ہوں تو ہوں ورنہ اور تو کہیں ایسے منتظرین
کی بھیڑ نظر آتی نہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ فضا صاحب نے
کس ترنگ میں پیش کر دیا ہے

رجب کی ۲۴

سوال ۱۲: جمیل احمد، مقام دپور سٹ مار دل

وایا فیض پور۔ ضلع جگکڑوں (جہار اشتر)

عکسی اشرفیہ ہشتی زیور دلائل مکمل حصہ چھٹا ص ۱۲

پیر رجب کی رسموں کا بیان ہے۔ اس میں حضرت مولانا
اشرفیہ تھا نوئی تحریر فرماتے ہیں اس کو عام لوگ مریم
روزہ کا چارہ کہتے ہیں اور اس کی سنائیں تارخ میں
روزہ رکھنے کو اچھا سمجھتے ہیں کہ ایک ہزار روزوں کا ثواب
ملتا ہے۔ شرع میں اس کی کوئی قوی دلیل نہیں۔

عکسی حاشیہ ۱۲۰ ڈال کر تحریر کرتے ہیں ہزاروں
لکے ثواب کی قید کے بعد اس تارخ اور ماہ رجب کے دوسرے
دنوں کے فضائل صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ماہ رجب میں
ایک رات ہے۔ اس میں نیک عمل کرنے والوں کو سو سال کی
نیکوئیوں کے برابر ثواب ملتا ہے اور ہر رات رجب کے ہر روز
ختم ہونے سے تین دن پہلے آتی ہے۔ تو جو شخص اس رات
میں بارہ رکعتیں (اس طرح) ادا کرے کہ ہر رکعت میں سترہ

فاتحہ اور الحمد للہ واللہ اکبر سو مرتبہ پڑھے اور اپنی ذات
کے لئے دنیا و آخرت کی جو بھلائی مانگے اور صبح کو روزہ رکھے
تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر دعا قبول فرماتا ہے سوائے گناہ کی
دعا کے (بہشتی)

قسموں کے علاوہ جتنی بھی قسمیں ہیں سب محض نمن اور گمانِ لب کا فائدہ دیتی ہیں یقین و اذعان کا نہیں اور عقائد کے لئے یقینی و قطعی بنیادیں درکار ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی جو روایت محشی نے نقل کی وہ دل تو سنہرے کے اعتبار سے قوی نہیں۔ دوسرے اس کے مضمون میں یہ نقص ہے کہ ماہِ حرج کا ذکر کرنے کے بعد اس کی ایک تاریخ (۲۷ دس شب) بھی معین کر دی گئی ہے حالانکہ تاریخ کا تعین نہ ہوتا تو شاید یقین کو کم سے کم ایک ماہ تلاش و تجسس کی مشقت اٹھانی پڑتی۔ کوئی بھی انعام مشقت کے بعد ہی ملا کرتا ہے اور بہت بڑے انعامات تو کافی دشوار مراحل کے بعد ملنے لگتے ہیں۔ پورے چینی کی راتوں میں ایک خاص رات تلاش کرنا گو کہ دشوار ترین کام نہیں تھا مگر نہ کچھ دشوار اور مشقت طلب ضرور تھا جس کے نتیجے میں کسی بڑے انعام کی توقع خلاف قیاس نہ قرار پاتی لیکن صریح الفاظ میں ایک تاریخ معین کر دی گئی تو یہ معمولی دشواری اور مشقت بھی خارج از بحث ہوئی۔ اب تو ہر شخص کے لئے بالکل آسان ہو گیا کہ ۲۷ دس شب میں محض بارہ رکعات پڑھے اور دن میں روزہ رکھ لے تو روزہ کی بھر سارے دل و ردھل جائیں اور جنت گویا سامنے آکھری ہو۔

نہیں محترم بھائی۔ جنت اتنی سستی نہیں ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ جنت تو دشواریوں اور آزمائشوں سے گھری ہوئی ہے۔ آپ دیکھئے لیلۃ القدر کی کتنی تعریف قرآن میں آئی ہے۔ یہ رات حضورؐ کو بتا بھی دی گئی تھی مگر پھر بھلا دی گئی۔ اس کا یہی تہِ مطلب ہو کہ اللہ کی حکمت بالغہ اپنے بندوں سے سخت اور استقلال اور عزم و تحمل کی طالب ہے۔ اس نے جس طرح دنیاوی اشیاء کے سلسلہ میں یہ طریقہ پسند فرمایا ہے کہ بنے جادو جہاں کہیں تب انھیں سوتا اور ہرے پلیر آئیں اسی طرح آخری نعمتوں کے سلسلہ میں بھی اسے یہی طریقہ پسند ہے کہ ان کی تقسیم یوں ہی کنکریوں کی طرح نہ کر دی جائے بلکہ بنے اپنے خون اور پسینے سے ان کی قیمت ادا کریں۔ امتحان دیں۔ سختیاں بھلیں۔ کیا یہ یاد دہاں اور متین آواز بندوں کے کانوں میں نہیں پہنچی؟

محشی نے جوابات کہی ہے اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب ہی سمجھ میں نہیں آیا۔ ”ہزاروں کے ثواب کی قیاس کے بعد“ کا فقرہ اس طرح آیا ہے کہ وہاں ہی عقائد ہو کر رہ گیا پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

سو کی ایک بات یہ ہے کہ دینی عقائد و احکام ہمیشہ بہت ہی مستند ذرائع سے حاصل کرنے چاہئیں۔ اسی طرح کے جو اشیاء کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔

ہماری تحقیق یہ ہے کہ اسی بہت کم حد میں صبح ہیں جن میں تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ اجر و ثواب کی بشارت دی گئی ہے ”صبح“ کا لفظ قرآنِ حارث کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ بہتر غیر محقق اور غیر دانشمند حضرات کتنی ہی اسی خاد کو بھی صبح کہہ دیتے ہیں جو فی الحقیقت صبح نہیں ہوتیں۔ علاوہ اس کے کسی حدیث کا یہ اعتبار سننا صبح ہونا ایک فنی مسئلہ ہے جس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حدیث کا مضمون بھی صبح و ثابت ہو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سنہرے اعتبار سے ایک روایت صبح ہوتی ہے لیکن اس کے متن (اصل عبارت) میں کوئی علت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر محققین اسے قبول نہیں کرتے یا اس کی تائید کرتے ہیں۔

اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک روایت سنہرے اور متن دونوں اعتبار سے اصطلاحاً خاد و حیرت کچھ بھی ہوئی ہوئی ہے لیکن جو مضمون اس سے ثابت ہو رہا ہو تا ہے وہ کسی زیادہ مضبوط روایت یا قرآن کی کسی آیت سے ٹکراتا ہے تو اس روایت کو ترک کر دیتے ہیں۔

ان فنی بارگاہوں کے علاوہ ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جن حدیثوں میں تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ ثواب کی اطلاع پائی جائے ان کی صحت و صداقت اتنی آسانی سے نہیں مان جائے گی جتنی آسانی سے دوسری روایات کی مان لی جاتی ہے بلکہ خطا ترین تنقیہ کی چھلنیوں سے گزرا کر دیکھا جائے گا۔ اگر اس کے بعد بھی وہ علت و ادھانی سے پاک ثابت ہوں تو اگرچہ انھیں رد نہیں کیا جائے گا لیکن ان پر کسی عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی کیونکہ حدیث کی چند خصوصیات میں

حضرت ابن عباسؓ کو جھٹلایا جا رہا ہے۔ نعوذ باللہ من کلک
اس طرح کے اشتعال انگیز جالانہ شوشے کم ہم لوگ
بہت چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی جہالتِ سفاهت
ہے۔ ابن عباسؓ پہاڑے نوکھڑے ہو کر حاضریٹ بیان
نہیں کر رہے۔ انھوں نے یہ سب کہا ہو گا اسکی اطلاع
ہمیں واسطہ در واسطہ ہو کر پہنچی ہے۔ ان واسطوں
ہی کا اصطلاحی نام سند ہے۔ جب اس روایت کو
کوئی غیر مستند کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ
اس کے نزدیک سند قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں
مانتا کہ ابن عباسؓ نے ایسا کیا ہو گا۔

وہی یہ بات کہ اس روایت پر عمل کرنا کیسا ہو
تو جواب یہ ہے کہ عمل کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ کسی
بھی پہلے نقل نماز پڑھ لینا بہر حال موجبِ ثواب ہے
دعا بھی بچائے خود عبادت ہے۔ خیر دعائیں مانگیے
اللہ بے شمار دعائیں قبول کرتا ہے۔ کیا خبر کس وقت
کس کی کیا دعا قبول ہی کرے۔

(ج) ماں ۲۷ ویں شب میں مسجد میں آبا ذکرِ نادر
مختص ہو کر نقیض پڑھنا بدعت ہے۔ یہ کام صحابہ نے نہیں
کیا اور دوسرا یہ کسی نے اس کی ابتداء کی تو صحابہ ہی نے
اس کی بیخ کنی کر دی۔ اگر نیت صحیح اور ارادہ رضائے الہی
کام ہے تو آخر گھر کے کونے میں شربِ بیماری اور عبادت
کیوں نہ ہو۔ حسن اور میلے ٹھیکے والی ذہنیت آخر کیوں ہر
عاملہ میں آکر دے۔ آپ اگر سمجھتے ہیں کہ رُخِ خوب کی
ستا عیسٰیؑ میں شرب میں عبادت کا بڑا ثواب ہے تو ٹھیک ہے
تھکر کا مصلیٰ آبا دیجیئے۔ مسجد میں قائم رُخِ زمانے پر صراہ
کیوں جبکہ احادیث اور تعاملِ صحابہ سے ثابت ہے کہ
مسجد میں صرف نماز و رُض کی افضلیت ہے۔ باقی ناموزن
گھر میں افضل ہیں۔

(د) سلف سے ثابت نہیں۔ قصہ معراج ہو
و اذاعت میرت ہوں۔ نعت رسول ہو۔ یہ سب چیزیں
اصولاً مہابتِ مفیدہ دیا برکت ہیں اور اہل علم کا فرض ہی

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَنْتَا
يَا كَذِبٌ قَوْلُ الَّذِيْنَ يَخْلَعُوْنَ عَنْ قُلُوبِهِمْ
مَتَنَّهُمْ اَلَيْسَا اُولَئِكَ فِيْ سُلُوْلٍ
(کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر جنت میں یوں ہی
داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر ابھی وہ سختیاں
نہیں گذریں جو تم سے پہلے لوگوں پر گذر چکیں۔
ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور پھر پھر اگر
رکھ کرے گے)

یہ تو سورہ بقرہ میں فرمایا گیا۔ پھر آل عمران میں
کی گئی :-

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَنْتَا
يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهِ
يَعْلَمُ الصّٰدِقِيْنَ

(کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ
حالانکہ ابھی تک تمہارے فعل و عمل سے اللہ پر تو
ظاہر ہی نہیں ہو کہ کون تم میں سے کس درجہ شرف
اٹھائے والا اور کس درجہ صبر کرنے والا ہے)

یہ آیات صاف بتاتی ہیں کہ جنت اور آخرت کی بھلائی
حسرت اور غمراں و حرجت ایسی سہل لکھول اور گری پڑی
نہیں ہیں کہ دو چار ٹکے اداس کے اور خرید لیں۔ وہ بڑی قیمت
ہیں۔ مجاہد اور بے روضہ چاہتی ہیں۔ محنت اور قربانی چاہتی
قانونِ مشیت میں ایسا کوئی حساب نہیں کہ محض ایک دن
ت کر لو، محض ایک شب تسبیحات پڑھو، محض دس میں میل
چلو اور سو یا پچاس سال کے برابر نیکیاں جھولی میں پڑ جائیں
یا کوئی وقت معین ہے جس میں ہر دعا لازماً قبول ہو جاتی
ہر دعا تو انبیاءِ مکرم کی قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ بات محض
اکی جا سکتی ہے کہ فلاں فلاں اوقات میں دعا کی
یت کا زیادہ امکان ہے۔ یہ آخری وجہ ہے جس توفیق
نیں و قطعیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اننا اور سمجھ لیجئے کہ جب ہم منقولہ بالا روایت بغیر
نہ کہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ صحابی رسولؐ

دا فرم رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں علم دیا ہی کے بے شمار اہل و جاہر جمع کئے ہیں اور اہل توفیق ان سے فائدہ بھی اٹھاتے رہتے ہیں۔

مگر اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی غیر نبی معصوم نہیں۔ فکر و نظر کی خطاؤں سے بالائز نہیں۔ اس کتاب کا بھی حرف حرف حجت نہیں ہے۔ اس میں بھی بہت سی ایسی آراء ہیں جن سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور بہتری و ردایات اس میں ایسی آگئی ہیں جن کی صحت مسلم نہیں۔ مثلاً ماہ و حجب کے زیر عنوان جو ردایات اس میں درج ہوئی ہیں ان پر کچھ بن کر کے کھردر سکتے ہیں کیا جاسکتا۔

سچ یہ ہے کہ اس طرح کی دقیق کتابوں سے حقیقی فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو عالم بھی ہوں فقیر بھی اور غلوئے عقیدت کا شکار نہ ہوں۔ شاہ علی نقیؒ ان صاحبین میں ہیں جن کے بارے میں مبالغہ آرائی اور فساد طرازی کی انتہا کر دی گئی ہے۔ بہت سے لوگ تو انکی اندھی اور جاہلانہ عقیدت میں شریک بن کر جا پہنچے اور کتنے ہی صوفی ثائپ بن رگان خاں نے انھیں ذیلی خدا بنا چھوڑا۔ العیاذ باللہ۔ اسی لئے غیر عالم یا غیر فقیہ یا انارے عقیدتمند کو ان کی کتاب سے فائدہ کے ساتھ نقصان بھی پہنچے گا اور مار کر تھر کے ساتھ وہ دہر بھی پی جائے گا۔

”رکن دین“ کے محترم مؤلف نے غنیت کو کون امویہ کے لئے ماخذاً و مبنیٰ بنایا ہے یہ حجب تک معلوم نہ ہو کہ کئی نسلی بخش اظہار رائے نہیں کیا جاسکتا۔

رہیں اور کتابیں تو ان کا بھی کم و بیش یہی حال ہے کہ رطب و یابس دونوں ان میں جمع ہیں۔ اہل نظر ان سے مروتی بھی جن سکتے ہیں اور کنکر چھری بھی۔ ہمیں کیا معلوم کس نے کہاں کیا چننا ہے۔ صاف سی بات یہ ہے کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کے حضرات مسائل شرعیہ کے لئے ہستی زبور اور علم لفظ تک محدود ہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ کسی مسئلہ میں ان سے شفی نہ ہو تو دارالعلوم دیوبند یا کسی اور مستند ادارے یا عالم دینی مفتی سے دریافت کر لیں۔ مسائل سے ہٹ کر دین کے مزاج

کہ وقتاً فوقتاً مائتہ المسالین کو ایسی مجالس سے سنائی کرتے رہیں اور غیر مسلمین میں بھی مہربانیاں اور اہل اسلام کی تبلیغ و اشاعت کریں۔ لیکن اس کا خیر کو بابت کے جراثیم سے پاک ہونا چاہئے۔ یہ بابت ہے کہ اس طرح کے کسی بھی کا خیر کے لئے سال کا ایک یا چند خاص روز معین کر لئے جائیں اور عوام کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ تین کوئی شرعی چیز ہے۔ اس میں کچھ زیادہ ثواب ہے۔ قصہ معراج کا بیان جس طرح ۲۷ رجب کی شب میں کار ثواب ہے۔ اسی طرح اور بھی ہزار تہذیب میں کار ثواب ہے۔ اور اس میں غلط اسطو مبالغہ آمیز روایتیں بیان کرنا سخت گناہ کی بات ہے۔ واعظ و مقبر کو بہت احتیاط کرنی چاہئے اور تہم پستی و بوجہ پستی کے اس فاسد مزاج کو غذا نہیں پہنچانی چاہئے جو عوام الناس کی ذہنیت میں پہلے بھی بچا بسا ہے۔ خصوصاً ریلوی مکتبہ فکر کے ڈسے ہوئے عوام تو سرتاپا تہم ہی بنگر رہ گئے ہیں اور شرک و توحید کی تمیز ہی ان سے اٹھ گئی ہے۔

مشتبہ بنیادیں

جواب:-

رسالہ رکن دین ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی کیا حیثیت ہے۔ غنیت الطالبین سے مراد اگر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے تو اس کے بارے میں ہماری رائے حسب ذیل ہو: اردو دار فاری میں اس کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں۔ ہماری محروم کی حد تک شاید ہی کوئی ترجمہ ایسا ہو جسے بوری طرح اصل کے مطابق کہا جاسکے۔ بعض تراجم میں فاضل غلطیاں ہیں اور بعض میں لطیف و دقیق ہو سکتا ہے کوئی ترجمہ حیثیت مجید بھی ہر دوسرے کے قابل بھی ہو۔ بہر حال جہاں تک اصل کا تعلق ہے حضرت مصنف کی عظمت کسی بحث کی متحمل نہیں۔ وہ بہت بڑے بزرگ تھے اور علم بھی

نہ شیخ صحیح پڑھتے تو ہمارا شملہ زمانہ خرابات میں ہے۔ ایک معبر لی طالب علم۔ ایک دنیا دار دگنا ہنگامہ رادی جو کچھ ہماری عقل ناقص میں آیا لکھ چکے۔ معاملہ سود کل ہے۔ فتویٰ مفتی صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

دیسے رائے ہماری دی ہی ہے جو ظاہر کی حاجی یعنی فرض دینے کی جوابدہی میں حکومت نے جلا رکھی ہیں ان سب پر حرمت کا فتویٰ صادر کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے ان کی حقیقت اور اسپرٹ کو سمجھنے کے لیے ہی کوئی قطعی فیصلہ دینا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلیہم السلام

قادیانی مسئلہ

سوال :- محمد ابراہیم خاں - رحمت اللہ علیہ
حلقہ صراف - بھہ - رورہ -

پاکستان کے لوگوں نے قادیانیوں کی خلاف جو تحریک چلائی ہے اور جس کا فیصلہ انشاء اللہ کل پرسوں تک اسبلی ہوئے والا ہے۔ اس بارہ میں یہاں کے احمدیہ جماعت کے حامیوں میں کافی الجھن مچ چکی ہے اور انہوں نے ایک احمدیہ مشن کا مبلغ مسیحی محمد شریف امینی شہاب الدین سے منگوا لیا ہے۔ اس شخص نے یہاں ایک جلسہ میں وزیر اعظم بھٹو کے خلاف عجیب عجیب بہتان لگائے کہ وہ شراب خور ہے۔ شملہ میں جب وزیر اعظم پاکستان آئے تو نماز جمعہ تک نہیں پڑھی اور ان کی دختر کے بالے میں بھی نازیبا کلمات کہے کہ قیض پر موت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس پر غصہ احمدی بڑے جگڑے مگر جذبات پر قابو پایا۔ دوسرے روز پھر اسی مبلغ نے تقریر کی تھی مگر سرکاری طور پر اس کو تقریر کرنے کی اجازت نہ مل سکی حالات کو قابو میں رکھا گیا۔

دو دن بعد پھر لاہور میں احمدیہ یار نے جلسہ کیا جس میں مولوی سمیع اللہ لاہوری یار نے تقریر کی۔ اس نے اپنی تقریر میں نبوی کے دائرہ تک ہی محدود رکھی اور کسی شتم کی مخالفت نہیں کی۔

اب آپ سے عرض ہے کہ آپ ان نقاد پر کیا دے

مصلح، بنیادی احکام و عقائد اور رہنما ہوں کی وقعت کے لئے ایک طرف اگر دیوبند یعنی مولانا محمد تاسم، حضرت شیخ الہند، مفتی عزیز الرحمن، علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت گنگوہی جیسے سلف کی تحریروں بہترین چیز ہیں دوسری طرف جماعت اسلامی کا لٹریچر اپنا جواب نہیں رکھتا۔ خصوصاً مولانا مودودی کی کتابیں اور ان کی تفسیر قرآن۔ یہ رہنما ہی ہم آپ کو بہت ہی اخلاص سے دے رہے ہیں ورنہ ہمارے موجودہ حلقہ دیوبند میں تو مولانا مودودی کو باعقیدہ اور گرامر اور دیگر لکھنا فیشن بن چکے ہیں حتیٰ کہ کتنے ہی دار بھی ہو چکے والے نایاب بھی اسی فیشن کو اختیار کر کے اکڑتے اور غارتے پھرتے ہیں جن کے مونچھے نہیں ہے وہ خیالی مونچھوں پر تانے دیتے ہیں۔ ان کے گل غبارے پر کان دھریں گے تو دل و دماغ کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ان میں ایک عجیب یہ پیدل ہو گیا ہے کہ بات تو کہیں گے دل سے گھر کر مگر منسوب کر دیں گے اسے حلقہ دیوبند کی طرف۔ گویا یہ خود ہی خود دیوبندی کے نمائندے بھی بن جاتے ہیں حالانکہ سلاف دیوبند کی رد میں ان سے پناہ مانگتی ہیں اور رحمت کے فرشتے ان سے بیزاد ہیں۔ ہم نہ دیوبند کے وکیل ہیں نہ بریلویت کے حریف۔ ہم تو اللہ اور رسول کے نقیب اور ان کے غلام اور حق و صداقت کے وکیل ہیں انشاء اللہ فیصلہ تو آخرت ہی میں ہو گا کہ ہم لے اس عوے میں کہاں تک سچائی پہنچی اور کہاں تک خود درست تائی۔
والحمد للہ رب العالمین

سرکاری سود

جواب :-

جتنا کچھ سچائی میں اس مضموع پر آچکا اس سے زیادہ پیش کرنے کی پوزیشن میں فی الحال ہم نہیں ہیں۔ علما وقت کسی ایک دوری میں تو منسلک ہیں ہمیں جو ہم ان کا منفقہ فتویٰ چھاپ دیں۔ ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسیبتائے بیچلے ہے۔ آپ کو جس عالم پر کچھ دوسرے ہیں اس سے خود استفادہ اور استفادہ کریں۔ ہم سچائے نہ علامہ ہیں نہ مولانا نہ مفتی

میں اپنی قیمتی رائے اپنے ماہنامہ میں دیکر یہاں کے عوام میں تسلی و تشفی کا سامان ہم پہنچائیں، کیونکہ آپ کا ماہنامہ اس جگہ یعنی بھارت وادہ میں ابھی تعداد کے لوگوں میں ہرگز نہیں پہنچا ہے اور بے تابی سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ نیز عرض ہے کہ اسی معاملہ کو ذرا وضاحت سے بیان کیا جاوے اگرچہ آج کل تمام مسلم و غیر مسلم اخبارات اس معاملہ کو اپنے اپنے خیال کے مطابق اپنے جریڈوں میں اہم کالم دیتے ہیں۔ مگر یہودی محمد شریف ایمنی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اکثریت کے کوئی اختیار نہیں کہ ایسا فیصلہ اقلیت کے بارے میں کرے کہ احمادیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے اس کے بارے میں بھی اپنا خیال سپرد قلم فرمادیں۔

جواب :-

قادیانیت کے بارے میں ہماری خیالات راز نہیں ہیں۔ جب بھی تخلی میں یہ موضوع زیر گفتگو آیا ہے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فرقہ قادیانیت کوئی مسلم فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا گروہ جس نے ایک نیا دین اختیار کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ یہ اعتبار نیت مخفی نہیں۔ وہ یہی قصور رکھتے ہیں کہ ہم اسلام سے خروج نہیں کر رہے ہیں بلکہ قرآن و حدیث کا حکم بجا لا رہے ہیں لیکن علم اور فہم سلیم سے بیگانہ اخلاص کسی مرض کی دوا نہیں۔ ہم تو آپ حیات نصیر کے پی جاؤں تو ہمارا قصور اسے آپ حیات نہیں بنا دے گا بلکہ زہرا بنا کر دے گا۔

جو مبلغ صاحب بھٹو کی شان میں ”قصیدہ“ پڑھ رہے ہیں، وہ دراصل مسئلہ کو خواہ مخواہ الجھا رہے ہیں۔ بھٹو صاحب شرابی ہوں، کبابی ہوں، کیسے بھی ہوں ان کا پارٹ اس معاملہ میں اس سے زیادہ آخر ہے کیا کہ جس رائے پر ان کے عوام و خواص سب سے مکمل اتفاق کیا۔ اسے انھوں نے مان لیا۔ نہ مانتے تو کہتے کیا۔ جس ہمدست اجتماعیت کے سپرد اس معاملہ کی تحقیق و تعقیب کی گئی تھی۔ اس میں سے کسی ایک نے بھی یہ رائے ظاہر

نہیں کی کہ قادیانیوں کو مسلمان ہی مانا جائے جہاں تک قواعد انصاف کا تعلق ہے اس ہئیت نے قادیانیوں کے متعدد ذمہ دار ترہیمانیوں کو اس کا پلوں کا مو قعر دیا کہ وہ اپنا ٹھیک ٹھیک موقف و مسلک واضح کریں اور انھیں یہ ترہیمانیوں کے کاموں سے ملے کہ کسی نے ہماری طرف کوئی غلط عقیدہ منسوب کر دیا ہے۔ ان ترہیمانیوں کی وضاحت ہی سے جرب یہ محقق ہو گیا کہ قادیانی حضرات بعض ایسے عقائد کو سینے سے لٹائے ہوئے ہیں اور لگا رہنے پر مصر ہیں جن کی موجودگی میں قرآن اور حدیث انھیں مسلمان تسلیم نہیں کرتے تو کسی بھی انصاف پسند کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہ گیا تھا کہ ان کے خارج از اسلام ہونے کا فیصلہ دیا۔ اور اس بات پر متفقانہ صورت حال کو ختم کر دے کہ کچھ لوگ مسلمان نہ ہونے پر بھی خود کو مسلمان کہتے رہیں اور مسلمانوں والے تمام حقوق حاصل کرنے رہنے کے علاوہ دنیا کو اس فریب میں بھی مبتلا کئے جائیں کہ وہ تبلیغ اسلام کر رہے ہیں پاکستان تو اب بنا ہے۔ اس سے کہیں پہلے اوجھے درجے کے علماء و فقہاء فیصلہ دے چکے تھے کہ قادیانیت اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ دلائل سے مزین بہترین کتابیں قیام پاکستان سے پہلے ہی بازار میں آچکی تھیں اور اس کے بعد فقہاء کے جتنے معروف حلقے ہیں وہ سب اس سے متفق رہے کہ قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانا جا سکتا۔

خود قادیانی ہمیں مسلمان کہاں مانتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ قدرتی تھی ہے جس زمانے میں کوئی نبی آتا ہے اس زمانے کے ہر آدمی پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس نبی کو نبی مانے۔ اگر نہیں مانے گا تو لازماً کافر ہوگا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو جن لوگوں نے نبی مانا ان کے نقطہ نظر سے وہ سب لوگ کافر ہوئے ہی چاہیں جنھوں نے مرزا کو نبی نہیں مانا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے اپنے فرمودات میں مرزا کے جانشینوں کے کلام مبارک میں طرح طرح سے اس رائے کا اظہار کیا بھی گیا ہے کہ مرزا کی نبوت اور ان کی

جہاد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بددین ہے۔ ملعون ہے۔
غیر مذکور

ایسی صورت میں کسی بھڑیا فلاں فلاں کا شرابی
ہونا، بدکردار ہونا یہ نمازی ہونا آخر نفس واقعہ ہو گیا
اثر ڈالتا ہے۔ مذکورہ محمد شریف صاحب نے اپنی تقریر
میں اور کیا محل افشائیاں کی ہیں گی یہ تو ہمیں کیا معلوم
البتہ آخر میں آپ نے ان کا جو ارشاد گماہی نقل کیا اس
کے بارے میں عرض ہے کہ اکثریت اور اقلیت آجکی
سیاسی اصطلاحیں ہیں جبکہ قادیانیوں کو مسلمان ماننے
نہ ماننے کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو فالس و ان
سنت کا مسئلہ ہے۔ اس کا فیصلہ علم دین جانتے والے
مفتیوں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ سیاسی لیڈروں یا ملک کے
سربراہوں کے دست ہمارے ہیں۔ البتہ اجتماعی و سیاسی
دائرہ میں جو نیک حکومت وقت ہی کو اختیارات حاصل
ہو کر آتے ہیں اس لئے پاکستانی مسلمانوں نے اپنی حکومت
سے مطالبہ کیا کہ ایک دامنکاف سچائی اور مسلم حقیقت
کو وہ قانون دلائیں کہ صفحات میں بھی تسلیم کر لے۔

اس معاملہ کو اس انداز میں پیش کرنا کہ گویا پاکستانی
اکثریت نے اپنی اقلیت پر کیوں کر مانا فیصلہ ٹھوس دیا
ہے، ایک مقالہ سے زیادہ کچھ نہیں سہجی فی الحقیقت
رام پرشاد ہیں اور دعویٰ یہ کریں کہ محمد حسن ہوں۔ علی
پوری نقیثش و تافیق کے بعد فیصلہ دے کہ آپ رام شاد
ہی ہیں محمد حسن نہیں تو کیا اس پر یہ رہنما رک درست ہو گا
کہ فلاں شخص نے ایک آزاد شہری پر اپنا فیصلہ ٹھوس دیا۔
اسے اس کا کوئی حق نہیں تھا۔

فیصلہ تو دراصل خود قادیانیوں نے اپنے بارے
میں کیا ہے۔ اسلام کوئی نسلی و قومی مذہب تو ہے نہیں
وہ چن بیتیاری عقائد سے عبارت ہے جو شخص یا گروہ
ان عقائد سے گزرا ہو گا وہ آپ سے آپ خارج از
اسلام ہو جائے گا۔ اب اگر مفتی یا عالم یا مسلمان حکومت
اس کے غیر مسلم ہونے کا اعلان کرتی ہے تو یہ ایک مرد واقعہ

کا اعلان ہے نہ کہ کوئی جبری فیصلہ۔ اعلان ضروری
ہو کہ حقوق کی جو خود رکھو رکھو کے لئے مقرر ہے
جس میں تک نہ ہو سچے اور گھوڑوں کا حصہ گھوڑے نے چیر
کر جاتیں۔ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا یہ مطلب نہیں
کہ انہیں جیلے کا بھی حق نہ رہا۔ استغفر اللہ۔ انہیں و
نظام تحفظات اور حقوق ملت ہی پچا نہیں جو کسی «اسلام
ملک» میں غیر مسلمین کے لئے طے ہیں۔ پاکستان علیٰ تقیاد
کتنی اہی ہے راہ رد ہی گروہاں کے آئین نے بہر حال
اسلامی ریاست قرار دیا ہے اور قادیانیوں کے متعلق
پاکستان کا زیر بحث فیصلہ بھی آئین ہی سے تعلق رکھتا
ہے ورنہ دائرہ آئین سے باہر عملی زندگی اور معاشرتی
دائرہ میں تو قادیانی پہلے ہی سے خارج از اسلام مانے جاتے
نہتے ہیں۔ ہمارے ملک کے گھر گھر دینے والوں میں
مولانا عبدالمجید درآبادی کے سوا شاید ہی کوئی قابل
ذکر عالم ہو جو قادیانیوں کے خارج از اسلام ہونے میں
خفک رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا استنار اتنے اہم
اور ہمہ گیر مسئلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ خصوصاً جب
مولانا درآبادی محض کنڈلوں اور چٹیکوں سے کام چلاتے
ہوں۔ علمی و تحقیقی سطح پر انھوں نے کبھی یہ واضح کیے کی
رحمت نہ اٹھائی ہو کہ قادیانیوں کے حق میں اس قدر جرم و
کرم اور منق و فیاض بن جانے کا آخر کیا جواز ہے۔ ہمارا
دعویٰ ہے کہ دلائل کے رُخ سے قادیانیوں کا خارج
از اسلام ہونا اتنا ہی اہل ہے جتنا دو اور دو کا چار ہونا۔
کیونستوں، سوشلسٹوں، یا فلاںسٹوں کی سمجھ میں
اس مسئلہ کی نوعیت نہ تہے تو یہ قابل فہم ہے۔ بندر کیا
جانے اور ک کا مرا۔ یہ سچا ہے اپنی اینٹ اور پیٹری کی
دنیا سے بلند کسی اڑان کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ انہیں
اس کا کیا شعور کہ ایمان بالترسالت کیا ہے۔ جہادی موعود
کے کہتے ہیں اور اسلام نے کیا تعلیم دی ہے لیکن اگر بعض
مسلمان بھی قادیانی علم کلام کے چکر میں آجائیں تو یہ بالکل
قابل فہم نہیں۔ ہماری نصیحت ہے کہ قادیانی حضرات کو

گر وہ ہے جس کا حکم تمام معاملات میں رہی ہے جو غیر مسلمین کا ہے۔

مارگ ڈیپ (ہندی)

اسلام کی بنیادی تعلیمات کو غیر مسلموں تک پہنچانے والا خالص تبلیغی ماہنامہ جسے پڑھے لکھے غیر مسلم حلقوں میں وقت اور پسندیدگی کے ساتھ دیکھا جاتا ہو سالانہ جیت رہ صرف پانچ روپے لیکن اعزازی حیثیت سے آپ پچاس اور سو روپے بھی دے سکتے ہیں۔

تبلیغ دین کے مشن کی اہمیت کا احساس کرنے والے حضرات اپنے زیادہ سے زیادہ مالی تعاون کے ذریعہ دے گا ہاتھ بٹائیں۔

”مارگ ڈیپ“ ریشمی پبلشنگ ہاؤس
ہندی ماہنامہ مارگ ڈیپ کے۔ بی روڈ راجپوت (دیوبند)

فوں خاں کرنے دیجئے۔ ان پر چوٹ پڑی ہے۔ ان کا زخم تازہ ہے۔ وہ چھینیں اور گراہیں گے ضرور۔ آخر تکلیف تو بھرتی ہی جا رہے کہ اتنا پرانا دام فریب ٹوٹ گیا۔ دھوکے کی ٹٹی مشعلوں کی نادر بھوگئی۔ منافقت کا تانا بانا بکھر گیا۔ ابھی حادثہ فقط پاکستان میں پیش آیا ہے۔ آگے کو پوری دنیا نے اسلام میں یہی ہوتا ہو مسلمان کتنے بھی گئے گئے رہے ہجے ہوں مگر وہ یرثہ اللہ نہیں کر سکتے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمت کو چیلنج کیا جائے اور ایسے لوگ جہادیت کا دعویٰ کریں جن میں کوئی بھی وہ علامت نہ پائی جاتی ہو جیسے اللہ کے رسولؐ نے احادیث طیبہ میں بیان فرمایا ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہی ہو گا کہ کسی قادیانی کو جو میں شریعت میں قائم رکھنے کی اجازت نہیں۔ آئندہ شاید یہ بھی ہو کہ ہر مسلمان حکمران اپنی کتاب آئین مستقل طور پر یہ سچ فضاحت ثبت کر دے کہ احمدی فرقہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک خارج از ملت

عَمَل

اشہر اعلیٰ

شوق سے جس کے لئے جان بھی دی دل سوا
جس نے کچھ بھی نہ دیا وعدہ باطل سے سوا
جداۃ شوق میں کام آئی بصیرت اپنی
ہم سفر کوئی نہ تھا بھٹی منزل کے سوا
سرفروشی کی تمتا تھا ہمارے دل میں
سرخسہ وہوتے کہاں کو چہرہ قاتل کے سوا
آشنا تلختی دوراں سے نہیں جن کا غمیر
سوچے کیا وہ کبھی راحت ساحل کے سوا
جب بھی ماحول کی پستی کو مٹانا چاہا
ہمسوا کوئی نہ تھا حوصلہ دل کے سوا

ہم یہ اشہر یہ کھلا آج بفیض حالات

زندگی کچھ نہیں افکار و مسائل کے سوا

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

قادیانی مسئلہ اور اسکی صحیح حل

گذشتہ جل شانہ کے سانسے کچھ عذر پیش بھی کر سکتے ہیں جب کہ ہم پر انگریزی حکومت مسلط تھی اور ہم اُس کے آگے بے بس تھے اور وہ اس فتنے کی آبیاری کر رہی تھی۔ لیکن انگریزوں سے آزاد ہونے کے بعد جب پاکستان کا اقتدار خود مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اُس وقت ۲۷ سال تک اس فتنے کی آبیاری خود انگریزوں سے بھی بڑھ کر چارے مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہو نا اور اس کو اتنی طاقت پکڑ جانے کا موقع دینا کہ وہ پاکستان کی حکومت پر قابض ہو جانے کا حوصلہ کرنے لگے، ایسا اکبر الکاظمی ہے جس پر کوئی عذر ہم اپنے رب کے حضور پیش نہیں کر سکتے۔ اب اگر ہم اسی پھلے طرز عمل کو جاری رکھتے ہیں تو خدا کے عذاب سے ہمیں کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس لئے میں عام مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں کہ جو تحریک انھوں نے اس فتنہ غلام احمدیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے شروع کی ہے اسے ایک قطعی فیصلے تک پہنچائے بغیر ہرگز نہ چھوڑیں اور ملک کی حکومت اور قومی اسمبلی سے بھی کہتا ہوں کہ وہ خدا کے حضور اپنی جواب دہی کو یاد کریں۔ سیاسی اغراض و مصالح کو بھول جائیں اور پوری ایسا اندازی کے ساتھ وہ فیصلہ کریں جو عین حق کے دین و ایمان کے مطابق ہے۔

یہ معاملہ جو اس وقت اسمبلی میں زیر بحث ہے اپنے اندر کوئی عجیبی گدی نہیں رکھتا بلکہ کھلے آسان کی طرح صاف اور عیاں ہے جس شخص کو دین کی معمولی واقفیت بھی حاصل

گذشتہ ماضی کے حادثہ ربوہ پر مسلمانوں میں جو رد عمل واقع ہوا اور غلام احمدی امت کو امت محمدیہ علی الصاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے الگ کرنے کے لئے پاکستان کے تمام مسلمانوں نے کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ جو جدوجہد شروع کی وہ اگرچہ بالکل ایک فطری امر ہے مگر میں اسکو بروقت نہیں بلکہ بہت بعد از وقت سمجھتا ہوں کیونکہ یہ رد عمل اُس وقت رونما ہوا ہے جب مسلم معاشرے کے اندر اس فتنے کو پروکش پانے اور پروان چڑھنے ۸۰-۹۰ سال بیت چکے ہیں اور اب اس کے استیصال کے لئے یہ آخری موقع ہمیں ملا ہے جس کو اگر ہم نے کھو دیا تو کچھ بعد نہیں کہ یہ فتنہ ہمیں لے ڈوبے گا۔ لا فتنۃ تا اللہ۔

در حقیقت اسلامی نقطہ نظر سے یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی شخص حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کھلم کھلا نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھے اور اس کی دعوت باطل کو اپنی مسلم معاشرے میں پھیلنے کا موقع حاصل ہوتا چلا جائے۔ یہ اتنا بڑا گناہ عظیم ہے کہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی بڑا اشت نہ کیا جانا چاہیے تھا، حالانکہ اس کے معاملے میں اس قدر تساہل برتا جاتا کہ وہ صدی کی آٹھ نو دہائیوں تک نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ دوسرے مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں بھی پھیلتا چلا جاتا۔ اس معاملے میں ہم اُس دور کے لئے تو

قتلہ آن وحدیث اور اجماع کی رو سے کفر ہے۔

اب دیکھئے۔ ایک طرف تو دعوائے نبوت بعد از خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق اسلام کا صریح اور متفق علیہ حکم ہے اور دوسری طرف یہ ناقابل انکار واقعہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا، اپنی نبوت تسلیم کرنے کی لوگوں کو دعوت دی، نہ ماننے والوں کو کافر قتلہ کر دیا اور ماننے والوں کی ایک الگ امت بنائی جس کا کوئی فرد اپنے باپ کا جنازہ بھی نہیں پڑھ سکتا اگر وہ اس نئی نبوت پر ایمان نہ لایا ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ مدعی آخر سچا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ سچا نہیں ہے تو اس کے کافر ہونے اور اسکی تصدیق کرنے والے سب لوگوں کے کافر ہونے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟ اور اس نئے نبی کی یہ امت مسلمانوں ہی کے اندر کا ایک فرقہ کیسے قرار پاسکتی ہے جب کہ وہ اسلام کی سمدھ توڑ کر خود اس سے باہر نکل چکی ہے؟

لیکن یہ اس نئی امت اور اس کے بانی مدعی نبوت کی انتہائی چالاکी ہے کہ اس نے اسلام کی سرحد سے نکل کر بھی اپنے دین کو اصل اسلام قتلہ کر دیا، اسلام ہی کے نام سے اس کی تبلیغ کی اور لاکھوں مسلمانوں کو اس گمراہی میں مبتلا کیا کہ لا اِلهَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہ کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ کافر رہتے ہیں جب تک کہ مرزا غلام احمد کی نبوت کا کلمہ اس کے ساتھ نہ لائیں۔ اگر یہ لوگ سیدھی طرح اسلام سے نکل کر کسی دوسرے نام سے اپنی الگ امت بنالیتے اور اپنے آپ کو مسلمان نہ کہتے تو اتنا بڑا فتنہ نہ بنتے جتنا بڑا فتنہ وہ امت و ملت کی صورت اختیار کر کے بن گئے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کا کافر کوئی دوسرا نام رکھ کر اس کی تبلیغ کرتے تو کسی ایک مسلمان کو بھی اس بات پر آمادہ نہ کر سکتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی چھوڑ کر مرزا غلام احمد کی پیروی قبول کر لے۔ وہ نہ انگریزی حکومت کے دور

ہو وہ جانتا ہے کہ اسلام میں نبوت ایک فیصلہ کن چیز ہے اگر نبی سچا ہو اور کوئی اس کو نہ مانے تو کافر۔ اور اگر وہ جھوٹا ہو اور کوئی اسے مان لے تو کافر۔ بہر حال ایک دعوائے نبوت کے بعد یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے ایک امت میں جمع ہو سکیں۔ نبوت ایک سنگین دیوالیہ ہے جو دونوں گروہوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے حائل ہو جاتی ہے اور انھیں نہیں ملنے دیتی جب تک کہ وہ ہند نہ ہو جائے۔ ہر نبوت اپنے ماننے والوں کی ایک الگ امت بناتی ہے اور نہ ماننے والوں کو قطعی طور پر ان سے جدا کر دیتی ہے۔

یہ تو ہے بجائے خود نبوت کی اُصولی حیثیت۔ لیکن اسلام میں اس امر کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ لیکر اٹھنے والا کوئی شخص سچا نبی ہو سکے۔ اس لئے کہ قرآن حکیم، احادیث صحیحہ اور اجماع امت کی رو سے حضور اللہ کے آخری نبی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس کی نبی ہونے کی دلیل کیا ہے بلکہ بالاتفاق اس کو جھوٹا مدعی قرار دے کر اس سے اور اس کے ماننے والوں سے جنگ کی اور ان کو وہ حقوق بھی نہیں دیئے جو اسلامی قانون میں مسلح بغاوت کرنے والے مسلمانوں یا ذمیوں کو دئیے جاتے ہیں۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور سے آج تک چودہ سو برس کی مدت میں ہر زمانے کے مسلمان اس بات پر متفق رہے ہیں اور اس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے کہ بغیث محمدیہ علی صاحبہا السلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہر شخص جھوٹا ہے، کافر ہے اور اس پر ایمان لانے والا بھی کافر ہے۔ حتیٰ کہ ایسے مدعی سے اس کی نبوت کی دلیل پوچھنا بھی کفر ہے۔ کیونکہ دلیل پوچھنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا سمجھ رہا ہے اور اسے کھلا سمجھنا بجائے خود

(۱) اللہ کی توحید تمام انبیاء کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کا آخری نبی ماننا تمام کتب الہیہ کے قرآن مجید کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کرنا اور اس پر ایمان رکھنا اسلام کے لازمی بنیادی عقائد جن میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص ہوئے کادعویٰ کرے اور ایسے مدعی کو جو شخص مذہبی پیشوا مانے وہ کافر اور خارج از اسلام قطع نظر اس سے کہ وہ مدعی خود اپنے آپ کو یا اس کے پیروگر وہ اس کو ظلی یا بروزی یا امتی یا غیر تشریفی نبی کہے یا مسیح موعود، مجدد، محدث وغیرہ ناموں سے یاد کرے۔

۲۔ میری دوسری تجویز یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۱ کی شق (۳) میں جہاں اقلیتوں کا ذکر ہے وہاں بدھ مت والوں کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرووں کا اضافہ کر دیا جائے۔

۳۔ میری تیسری تجویز یہ ہے کہ دفعہ ۶ شق (۱) کے بعد حسب ذیل شق (۲) کا اضافہ کر کے بقیہ شقوں کو ان دونوں شقوں کے مطابق کر دیا جائے۔
"کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کادعویٰ کرے یا ایسا دعویٰ کرے کہ وہ اپنا مذہبی پیشوا مانے یا لوگوں کو اسے نبوی پیشوا ماننے کی دعوت دے یا اسے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دے وہ بھی خیانت عظمیٰ (HIGH TREASON) کا مرتکب سمجھا جائے گا۔"

ان ترمیمات سے دستور کی حد تک نئی نبوت کے فتنے کا کما حقہ سد باب ہو جاتا ہے۔ میری تجویز کردہ ان دستور کی ترمیمات پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ دستور صیغی متاثر نہیں کسی شخص خاص کا نام لینا مناسب نہیں ہے۔ ہمارا دستور

مسلمانوں کے حقوق کا بڑا حصہ تھمیا سکتے تھے اور نہ پاکستان قائم ہونے کے بعد انھیں یہ موقع مل سکتا تھا کہ حکومت کے نظم و نسق اور اس کی مسلح افواج اور اس کے زیر اثر معاشی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلنے اور بڑھنے چلے جاتے۔ مگر یہ ان کی انتہائی عیساری تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان سے الگ اپنی امت بھی منظم کی اور پھر مسلمانوں کی امت میں شامل رہ کر وہ سرطان کے پھوڑے کی طرح جسدِ ملت میں اپنی جڑیں بھی پھیلانے لے۔ یہ ان کی اسی عیساری کا نتیجہ ہے کہ انھیں مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھا جاتا رہا مسلمانوں کو توڑ توڑ کر وہ اپنی امت میں ملاتے اور اپنی تعداد بڑھاتے رہے اور ایک منظم طریقے سے ہمیشہ کشش کر کے مسلمان معاشرے اور حکومت پر اس طرح چھاتے چلے گئے کہ اب وہ پاکستان کے حکمران بن جاتے گئے خواب دیکھ رہے ہیں۔

یاد رہے کہ عادیۃ فیسیس منظر میں پیش آیا ہے اور یہ گویا مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آخری تنبیہ ہے کہ اگر ان میں کچھ بھی دینی حس باقی ہے تو امت محمدیہ کے اندر امت غلام احمدیہ کے پھلنے پھولنے کا ہر راستہ بند کر دیں۔ ہزار ہزار شکر ہے اس خداوند عظیم کا کہ اس تنبیہ پر پاکستان کے علماء و مشائخ سیاسی لیڈر اور عام مسلمان بھی پوری طرح بیدار ہو گئے اور حکومت بھی بروقت اس کی طرف متوجہ ہو گئی جیسا کہ صمدانی شرمیل کے قیام مسٹر بھٹو کی ۱۳ رجسٹر والی تقیر اور پوری قومی اسمبلی کے ایک کمیٹی کی صورت میں اس مسئلے کے حل کی کوشش میں لگ جانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس موقع پر میں چند ضروری تجاویز پیش کرتا ہوں جن سے میرے نزدیک مسئلہ بخوبی حل کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ میری پہلی تجویز یہ ہے کہ پاکستان کے دستور کی دفعہ ۲ میں جو ایست کا مذہب اسلام قرار دیتی ہے حسب ذیل دو شقوں کا اضافہ کیا جائے۔

رکھ کر از سر نو شرائط مقرر کی جائیں۔ نیز اگر یہ ثابت ہو کہ انھوں نے گرانٹ کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے تو اس گرانٹ کو منسوخ کر دیا جائے۔

(۸) ربوہ کو جسے انھوں نے ریاست در ریاست بنا رکھا ہے کھلا شہر قرار دیا جائے اور وہاں مسلمانوں کو جائیداد حاصل کرنے، سکونت اختیار کرنے یا کاروبار کرنے کے پورے مواقع دیئے جائیں۔

ایسی قرارداد پاس ہونے کے بعد اگر حکومت اس پر مستعدی کے ساتھ انتظامی کارروائی کرے تو ملک بہت جلد ان خطرات سے محفوظ ہو سکتا ہے جو اس فتنے کے ۸۰-۹۰ سال تک پروان چڑھتے رہنے سے اب علانیہ رونما ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ میں وزیر اعظم صاحب سے دو گزارشیں اور کروں گا۔ ایک یہ کہ صمدانی ٹریبونل کی رپورٹ کو بلا کم و کاست شائع کریں۔ دوسرے یہ کہ ختم نبوت کی تحریک پر جو بے جا پابندیاں ملک میں لگائی گئی ہیں، جو گرفتاریاں اس تحریک کو روکنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہیں اور پیرس کا کھلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے اس پورے سلسلے کو انھیں فوراً ختم کر دینا چاہئے کیونکہ یہ سب کچھ ان کی ۱۳ رجوں والی تقریر کی روح اور معنی کے بالکل خلاف ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ ترجمان القرآن (دلاہور ستمبر ۱۹۷۷ء)۔

تازہ پاکستانی قانون کا متن

”جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو آخری نبی ہیں کے حاکم بنیں ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مفہوم میں یا کسی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا نبی مصلح تسلیم کرتا ہے وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لئے مسلمان نہیں ہے۔“ (حریت دگرچی، ۹ ستمبر ۱۹۷۷ء)

قرآن سے زیادہ مقدس تو نہیں ہو سکتا۔ اس میں جب ابولہب کا نام لیا گیا ہے تو ہمارے دستور میں مرزا غلام احمد کا نام لینا کوئی عینب کی بات نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ قادیانی مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس گروہ کے بانی کا نام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ قومی اسمبلی ایک قرارداد کے ذریعہ سے حکومت کو حسب ذیل تدابیر طبعی سے جلدی اختیار کرنے کا مشورہ دے۔

(۱) تمام ملازمین حکومت سے ایک ڈیکلریشن فارم پُر کر دیا جائے جس میں ہر ملازم یہ واضح کرے کہ وہ مرزا غلام احمد کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا ہے یا نہیں۔ (۲) جو شخص غلط ڈیکلریشن دے اس کی غلط بیانی جس وقت بھی ظاہر ہو اسی وقت اس کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور اس کے تمام حقوق جو سرکاری ملازمت کی بنا پر اسے حاصل ہوں ضبط کر دیئے جائیں اور اس کو آئندہ ہر ملازمت کیلئے نااہل قرار دے دیا جائے۔

(۳) رائے دہندوں کی فہرست اور مردم شماری میں پیروان مرزا غلام احمد کا خانہ علیحدہ رکھ جائے۔ (۴) شناختی کارڈوں اور پاسپورٹوں میں بھی مرزا غلام احمد کے پیروں کے لئے ان کے نام کے ساتھ ان کے مذہب کی تصریح کی جائے۔

(۵) تمام طبعی اسامیوں سے اس گروہ کے افراد کو ہٹایا جائے۔

(۶) سرکاری ملازمتوں میں اس گروہ کے لوگوں کا تناسب ان کی آبادی کے مطابق کر دیا جائے اور تناسب بہت زیادہ مناصب ان کو دیکر مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی جاتی رہی ہے اس کا تدارک کیا جائے۔

(۷) ربوہ کی زمین جن شرائط پر انھیں دی گئی ہے ان پر نظر ثانی کی جائے اور مفاد عامہ کو ملحوظ

مراسلہ مع جواب زبان و لغت کی بحثیں

چنانچہ آپ نے بھی لفظ مغالطہ کو اسی اخیر معنی میں ہی تنقید میں استعمال کیا ہے۔

(۲) ع۔ رکھتے نہیں جگانہ دشمن میں امتیاز۔ اس مصرعہ میں آپ نے یہ لغوی غلطی نکالی ہے کہ لفظ جگانہ۔ دوست اپنا، عزیز، قرابت مند، موافق وغیرہ کے معنی میں نہیں آتا۔ بلکہ اس کا ترجمہ تو صرت یکتا ہے۔ جناب مولانا آپ نے اپنے غلط پسند اراد را لاطی کی بنا پر یہ فیصلہ فرمایا ہے اسلئے کہ لغت کی کتابیں آپ کے اس قول کی تردید کرتی ہیں اور کوٹانی صاحب کی تائید۔ دیکھئے جامع اللغات، فیروز اللغات، برہان قاطع۔ اسی ضمن میں آپ نے مزید مصیحت انگیز گلفشانی فرمائی ہے کہ:-

”شاید مغالطہ انھیں دشمن کہانی صاحب کی لفظ بیگانہ سے ہوا کہ جب بیگانہ کے معنی غیر دشمن، اجنبی وغیرہ کے ہیں تو جگانہ کے معنی اپنے، خویش، دوست وغیرہ کے ہوں۔“ جناب مولانا لغت کی کتابیں اس بات کی صراحت کر رہی ہیں کہ جگانہ وہ بے گانہ دو متقابل لفظ ہیں جگانہ کے معنی دوست اپنا وغیرہ کے ہیں اور بیگانہ کے دشمن، اجنبی، غیر کے ہیں اور اس بات کی طرف بھی مشیر ہیں کہ بے گانہ جگانہ سے بنا ہے۔ دیکھئے فیروز اللغات، جامع اللغات، ہان یہ دوسری بات ہے کہ لفظ جگانہ مختلف المعانی لفظ ہے اس لئے کہ اس کا ایک دوسرا معنی یکتا و بے مثل کے ہیں لیکن یہ لفظ اس دوسرے معنی کے لئے

محترم المقام جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ تجلی۔ السلام علیکم۔ ہر چند کہ شہیم کہانی صاحب کا زیر تبصرہ مجموعہ کلام ان جیسے شاعر کے نمایاں شان نہیں لیکن جناب نے جو ناقذانہ تبصرہ ان کے مذکورہ کلام پر تجلی ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں فرمایا ہے اس میں بعض مواقع پر فاحش غلطیاں آپ سے صادر ہوئی ہیں جو آپ جیسے بالغ النظر ادیب کے کسی طرح مناسب حال نہیں۔ مثال کے طور پر مقامات ذیل کا نشانہ دی جاتی ہے:-

(۱) ارضیں ستم پیشوہ دہشتہ کشی ہے عام ہوتے ہیں یہ مقالہ دھرتی صہجہ و شام اس شعر میں آپ نے لفظ مقالہ پر گرفت کی ہے حالانکہ لفظ مقالہ میں اگر آپ وسعت نظر سے کام لیتے تو تنقید نہ فرماتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شاعر نے ضرورت شعری سے یہ لفظ یہاں استعمال کیا ہے لیکن مقالہ کے معنی قتل ہی لیا ہے اور دوسرے اہل علم کو یہ بات معلوم ہے کہ باب مفاعلتہ کا خاصہ جس طرح مشارکت ہے اسی طرح اس کی ایک دوسری خاصیت مجرد کی موافقت بھی ہے جس کے معنی ہی عدم مشارکت اور عدم شرکت کے ہیں کمائی نوا در الاصول شرح فصول۔ بس لفظ مقالہ قتل کے معنی میں استعمال کرنا نہ خلاف کرامت ہے اور نہ خلاف لغت۔ دیکھئے فیروز اللغات مقالہ بمعنی قتل۔ اس کی نکتہ لفظ مغالطہ ہے۔ جو دھوکا بھول چوک کے معنی میں بھی مستعمل ہے

مآخذ کو مشارکت سے مخصوص رکھتے ہیں جیسے مناظرہ
فریقین کا ایک دوسرے سے بحث کرنا، مشارکت
(ایک دوسرے کا شریک کار ہونا)، مباہلۃ (ایک دوسرے
پر لغت کرنا)

کوئی مقرر بہت مدلل تقریر کر گیا ہو تو آپ یوں
نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بڑا شاندار مناظرہ کیا۔ اسی
طرح کوئی شخص جسم قتل میں گرفتار ہو جائے تو یوں نہیں
کہا جاتا کہ یہ مقاتلہ کا مجرم ہے۔ حالانکہ ”مقاتلہ“ اپنے
بعض مشتقات میں بمعنی قتل بھی مستعمل ہے جیسے قرآن ہی
میں ہے قاتلہم اللہ انی یو فکون۔ یہاں قاتل
بمعنی قتل آیا ہے۔ شاید اسی لحاظ سے بعض لغت نگاروں
نے مقاتلہ کے معنی ”قتل“ بھی لکھ دیئے ہیں لیکن زبان کا
معاملہ کیرامطوق کا معاملہ نہیں ہے دیکھنا یہ بڑے گاکہ
لفظ مقاتلہ اپنی مصدری شکل میں بھی بمعنی قتل استعمال
ہوتا ہے یا نہیں۔

سہارے محدود علم کی حد تک اردو میں ایسا استعمال
نایاب ہے۔ آپ اگر اردو کے کسی مستند ادیب و شاعر کے
یہاں اس کی کوئی نظیر دکھا سکیں تو بے شک آپ کا معارضہ
درست اور ہمارا اعتراض نادرست لیکن نہ دکھا سکیں تو
مجبور قیاس کی بنا پر اس طرح کے قصیوں کا فیصلہ نہیں ہو
سکتا۔ اس سے ہم بھی بے خبر نہیں کہ باب مفاعلتہ کے
بے شمار مصادر اردو میں بطور موافقت ہی متعمل ہیں جیسے
مجاہدہ۔ مکاشفہ۔ مراقبہ۔ معائنہ۔ مراقبہ۔ مطالعہ۔
مبالغہ۔ مغالطہ۔ گمراہی۔ مصادر بطور مشارکت ہی استعمال
ہوتے ہیں جیسے معاہدہ۔ مباہلہ۔ مناظرہ۔ مقابلہ۔ مقاتلہ۔
منازعہ۔ زید اگر تہمت کرنا ہے کہ وہ آئندہ رشوت نہیں
لے گا تو یوں یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ زید نے آئندہ رشوت
نہ لینے کا عہد کیا ہے نیک یوں نہیں کہا جاسکتا کہ رشوت
نہ لینے کا معاہدہ کیا ہے۔ حالانکہ اگر ہر جگہ با مفاعلتہ
سے موافقت کا مفہوم لیتا جاؤ تو اس کتبے میں کوئی
خامی نہ جوتی ثابت ہوا کہ ثانی الذکر قسم کے الفاظ کیلئے

مخصوص نہیں ہے جیسا کہ جناب نے سمجھا اور لکھا ہے اب آپ
فرمائیے مغالطے میں کہ ہائی صاحب! مبتلا ہیں یا آپ؟ آپ ہی
فیصلہ کیجئے۔

(۲) قتال روشنی ہے اندھروں کا ساز باز۔ اس مصرعہ
میں آپ نے لفظ قتال پر یہ گرفت کی ہے کہ قتل سے مبالغہ
کا صیغہ قتال نہیں آتا۔ جناب مولانا اگر سماعی نہیں آتا
جیسا کہ عربی کتب لغت سے معلوم ہوتا ہے تو قیاسی تو
آسکتا ہے جیسا کہ المنجی کے مولف نے مقدمہ میں لکھا ہے۔
انسان المبالغۃ کلھا سماخۃ ولا تبغی الا من التلا فی
اور جیسا کہ نوادر الاصول میں ہے فعال کا وزن طرد ہے
اور اشہر اوزان مبالغہ میں یہ وزن نمبر اول پر ہے۔ کما فی
مقدمۃ المنجد۔ اسی وجہ سے تمام ہی اردو لغات میں
قتال کا ترجمہ صیغہ مبالغہ کا کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو جامع
اللغات۔ فرہنگ عامرہ۔ فیروز اللغات۔ سعیدی دکنی
مذکورہ بالا سطر میں اس لئے تحریر کی گئی ہیں کہ آپ کو
تنبیہ ہو جائے اور جو قارئین آپ کی تقلید سے غلط فہمی
میں مبتلا ہو گئے ہوں اس کا ازالہ ہو جائے اس لئے اگر
اپنے موقر رسالہ تجلی کے کسی گوشے میں اس کو جگہ دے کر
چھاپ دیں تو آپ شکرے کے مستحق ہوں گے۔
حکیم محمد انعام الحق الاعظمی غفرلہ۔ مؤلف تجلی

تجلی

(۱) یہ بات اصولاً درست ہے کہ باب مفاعلتہ کا حق
جہاں مشارکت سے ہوا موافقت بھی ہے۔ لیکن یہ بات
درست نہیں کہ ہم اہل زبان کا طریق استعمال دیکھ بغیر جہاں
چاہے مشارکت لے لیں اور جہاں چاہے موافقت۔ زبان
انشاء میں جنی اہمیت قیاس کی ہے انہی ہی سماع کی بھی
ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل زبان بعض مآخذ کو تو باب مفاعلتہ
میں موافقت ہی کے طور پر لے لیتے ہیں مثلاً مسافرت
یعنی سفر، معاندت (عناد)، منافقت (نفاق)، مکر بعض

اول الذکر قسم کے الفاظ کو نظیر نہیں بنایا جاسکتا بلکہ اہل
زبان کا رواج 'عُرف' معمول اور طریق دیکھنا ہو گا۔
یعنی ضرورت شعری۔ تو اس کے بھی کچھ
نمود و قیود ہیں۔ اول تو یہ بات بجائے خود درج
یاب کی کمی پر دلالت کرتی ہے کہ ہم صحیح و معروف زبان
میں شعر پورا نہ کر سکیں بلکہ الفاظ میں بھیجنا کر سکیں۔ قادر
الکلام شعراء "ضرورت شعری" کے آگے ہتھیار نہیں اٹھا
تھے۔ دوسرے یہ کوئی لائحہ و قاعدہ نہیں ہے کہ ضرورت
شعری کے غرض سے جو چاہے لکھ جائے۔ محل "چڑیا" کا ہو
وہ آپ وزن "مرغاب" سے پورا کر سکیں یا محل "چارپائی"
کا ہو اور آپ "مرقد" لکھ ڈالیں تو اسے کون جائز مانے گا
الانکہ مرقد کے معنی ہیں سونا اور مرقد سونے کی جگہ کو کہتے
ہیں۔ مگر یہ لغوی منطق مجاہد کے آگے نہیں بھرتی۔ ضرورت
شعری کے غرض سے چارپائی یا سیدوم کو "مرقد" نہیں کہا
جاسکتا۔ مرقد تو کم سے کم اردو میں قبر کے لئے مخصوص ہو
چکا ہے۔ اسی طرح لفظ مقانکہ کا استعمال اردو میں صرف
یہی صورتوں میں ممکن ہے جب کوثر قتل و دوطرفہ ہو
کہ یک طرفہ۔

۲. آپ کی یہ گرفت لغوی حیثیت سے درست ہے اور
ہم اپنے تصور کا اعتراف کرتے ہیں۔ اردو اور فارسی لغت
ٹھا کر دیکھئے۔ "جگانہ" کے معنی دوست اور رشتہ دار کے
لی لکھے ہیں۔ گو کہ یہ بکثرت "میتا" ہی کے مفہوم میں
استعمال ہوتا ہے مگر ہم سے اعتراض میں بہر حال چوک
وئی۔ یہ چونکہ کسی "پندار" کا نتیجہ نہیں بلکہ جلد باری کا فقرہ
لکھ لیجئے۔ فارسی ہم نے عربی کی طرح نہیں پڑھی اور جتنی
بھی تھی اسے بھی استعمال کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا
پندار اس پر گرد کی تھیں چڑھ ہی جانی چاہئیں۔ پندار
ن غیبت شے کا نام ہے اس سے تو ہم اللہ کی پناہ چاہتے
ہیں۔ بہر حال اعتراف تصور کے ساتھ ہم اس تصور کی
حافی بھی تسلیم کر مانی صاحب سے طلب کرتے ہیں۔ آپ کے
لمر گذار ہیں کہ ہماری صحیح رہنمائی فرمائی۔

(۳) قتل ایک عربی لفظ ہے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے آپ
کو عربی لغات کے حوالے دینے چاہئیں تھے۔ جن لغات کے
آپ نے حوالے دیے ان میں المنجد کے سوا بھی اردو فارسی لغات
ہیں۔ المنجد کے مقدمہ سے جو فقرہ آپ نے نقل کیا اس سے
آپ کے استدلال کو کوئی قوت نہیں پہنچتی۔ اس سے بس اتنا
ہی معلوم ہوتا ہے کہ مبالغہ کے تمام اوزان سماعی ہیں اور
فعال کا وزن بہت زیادہ مشہور و مستداول ہے۔ ان دونوں
میں سے کسی ایک بات کا بھی ہم نے انکار نہیں کیا غور کیجئے
تو پہلی بات ہماری ہی تائید میں جاتی ہے۔ ہمارا کہنا یہ تھا
کہ قتل کے مصدر سے مبالغہ کا صیغہ قتل نہیں بنایا۔
اس عرض داشت کی تردید اس صورت میں تو ہو جاتی جب
آپ کسی عربی لغت یا کلام عربی نظیر لے آتے کہ دیکھو قتل
برائے مبالغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر آپ نظیر لانے کے
بجائے یہ معارفہ کر رہے ہیں کہ نہ ہی سماعاً۔ قیاساً تو قتل سے
قتال بنا سکتے ہیں۔ یہ تکنک اصول بحث کے اعتبار سے
درست نہیں۔

آپ نے جن اردو فارسی لغات کا حوالہ دیا ان میں سوائے
فرہنگ عامر کے ہمیں اس وقت کوئی اور چھپا نہیں ہو سکی۔
یہ مکتبہ اشاعت اردو۔ جامع مسجد ردہلی کا شائع کردہ
ایڈیشن ہے۔ اس میں تو ہمیں قتل کے معنی "بہت قتل
کرنے والا" ملے نہیں حالانکہ آپ کی تصریح کے مطابق ملنے
چاہئیں تھے۔

بہر حال خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اگر آپ کے نزدیک تسلیم
کر مانی صاحب ایسے اہل زبان کی صف میں شامل ہوں جنہیں
بطور مجتہد قبول کیا جاسکتا ہے تو آپ بشوق ان کے قیاس و
اجتہاد سر آمتا و صدقہ کہہ جائیں لیکن اردو پر اپنے حسن
اعتقاد کی ذمہ داری نہ ڈالیں۔

فقط والاعلام عارف عثمانی

تبصرہ کی آخری قسط

تفسیر ماجدی (جلد دوم)

»»»

فرمائے ہوئے ہیں لیکن اس نوٹ میں اپنی رائے کیسے انھوں کوئی بھی نقل پیش نہیں کی حالانکہ ان کی رائے جمہور مفسرین کی رائے سے ٹکرا رہی ہے۔ جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ جس طرح نصرانی حضرت عیسیٰؑ کو ٹھیک دلدار اور فرزند کے معنی میں ابن اللہ کہتے ہیں اسی طرح یہود میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جو حضرت عزیرؑ کی عند اللہ محبوبیت سے آگے بڑھ کر انھیں خدا، فرزند کہنے لگے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی داہی قول پر غصے اور ناراضگی کا اظہار فرما رہا ہے۔ ایسے موقعہ پر بہت ضروری ہو جاتا تھا کہ ممدوح جمہور کی رائے کی تردید اور اسے خیال کی تائید میں ایک طرف نقل و روایت کی شہادتیں پیش کرتے دوسری طرف دلائل عقلیہ حوالہ قلم فرماتے تاکہ ہم جیسے قارئین فیصلہ کر سکتے کہ جمہور کا خیال کیوں غلط اور ممدوح کا کیوں صحیح ہے۔

جمہور مفسرین کی رائے کے سلسلے میں ہم یہاں صرف ان اردو تفسیروں کی نقل پر اکتفا کریں گے جنھیں تقابلی مطالعہ کے لئے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے ”اللہ کا بیٹا“ ترجمہ کیا اور اس کی وجہ بھی بتائی کہ کیوں یہود نے انھیں اللہ کا بیٹا کہا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے بھی یہی ترجمہ کیا اور علامہ سید احمد عثمانیؒ نے تفسیری نوٹ میں منقسم فرمایا ہے۔

”روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہود کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عزیرؑ خدا کے بیٹے ہیں لیکن یہ عقیدہ عام یہود کا نہ تھا اور زمانہ مابعد میں تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب کوئی یہودی اس عقیدے کا

سورہ توبہ کے ترجمے پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہم اس کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے کہ یہود کہتے ہیں عزیر ابن اللہ ہیں اور عیسیٰؑ کہتے ہیں مسیح ابن اللہ ہیں۔ یہ سب واہیات باتیں ہیں۔ یہ لوگ چھلے کافروں کی راہ چل رہے ہیں۔

یہاں فاضل مفسر نے ترجمہ میں ابن اللہ کے بعد بریکٹ میں ”رخدہ کے فرزند مجازی“ کے الفاظ سپرد قلم فرمائے اور اس کی تشریح ذیلی نوٹ میں یوں کی ہے۔

”عربی میں ابن اور ولد دو الگ الگ مفہوم رکھنے والے لفظ ہیں۔“

پھر فرمایا کہ ابن اللہ سے مراد صلیبی یا حقیقی فرزند نہیں بلکہ خدا کا لادلا اور جہتیا یا فسرند معنوی و مجازی ہے۔ جیسے قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ اہل کتاب ہی کی زبان سے استعمال ہوا ہے۔ قالوا نحن ابناؤ اللہ و اٰجبتا۔ یہاں ابناء اللہ کے کھلے ہوئے معنی بھی مجازی و معنوی اولاد کے ہیں۔ یہود اسی معنی میں حضرت عزیرؑ کو اپنا مطاع کل اور بارگاہ حق میں محبوب ملنے لگے تھے۔

گویا ممدوح یہ کہہ رہے ہیں کہ یہودی حضرت عزیرؑ کو دلدار اور فرزند کے معنی میں اللہ کا بیٹا نہیں کہتے تھے بلکہ لادلے اور چہیتے کے مفہوم میں ابن اللہ کہا کرتے تھے اور یہاں تشریح اسی پر نکیر کر رہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دیسے تو ممدوح ہر درق پر کسی نہ کسی تفسیر کی شہادت پیش کرنے کی ریش اس اختیار

رکھنے والے لفظ ہیں۔ علی الاطلاق یہ دعویٰ فاحش حد تک غلط ہے۔ کہنا یوں چاہیے کہ لفظ ابن بھی فرزند کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کبھی محبوب کے معنی میں اور کبھی اولادوں سے ہٹ کر۔ محض ابتداء اللہ کی جو مثال ممدوح کے پیش کی ہے بے ترک اس میں یہ لفظ محبوب ہی کے معنی میں آیا ہے لیکن کیا اسی قرآن میں اللہ جب عیسیٰ ابن مریمؑ فرماتا ہے تو کیا یہاں بھی فقط محبوب کے معنی ہوتے ہیں بیٹے کے نہیں؟ مثلاً جب وہ ابتداء بعولتھن یا ابتداء انھوہصن یا ابتداء اخوتھن کہتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ سوائے صلیبی اور حقیقی بیٹوں کے اور بھی کچھ مفہوم لے لیا جائے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ جب اپنے حقیقی بھائی حضرت ہارونؑ کو ابن اُم کہہ کر خطاب کرتے ہیں تو کیا ابن کے معنی یہاں دل کے سوا کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔

ملکتی زبان میں ولدا اور ابن کے مابین ما خاص کی نسبت ہے۔ ہر ولد ابن ضروری ہوگا مگر ہر ابن ولد ہو یہ ضروری نہیں۔ ابن کبھی عین ولد بھی ہو سکتا ہے اور کبھی اسے دوسرے مفہوم میں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ جیسے ابن السبیل (مسافر) ابن حجر (دکنیت) لہذا بلا قید یہ دعویٰ کر گزرنے کا ابن اور ولد الگ الگ مفہیم کے الفاظ ہیں صریح خطا ہے۔

اس کے بعد یہ پہلو زیر غور لائے کہ نصرانی کس معنی میں حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہتے تھے اور کہتے ہیں۔ دنیا جاتی ہے کہ وہ صرف لاڈلے اور چہیتے کے مفہوم میں "ابن" نہیں کہتے بلکہ عین بیٹے اور فرزند کے معنی میں ابن کہتے ہیں اور ان کے لئے اولوی صفات کے قائل ہیں۔ لہذا جب ایک ہی فقرے میں عطف کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے "ابن اللہ" والے قول کا تذکرہ ہو تو کسی انتہائی قوی دلیل کے بغیر یہ نہیں مانا جاسکتا کہ پہلے ابن کے معنی تو محض لاڈلے کے ہیں اور دوسرے ابن کے معنی بیٹے کے۔

شاید اسی معارضہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ممدوح مفسر نے قول نصاریٰ کے آگے بھی بریکٹ دے کر خدا کے

باقی نہ رہا۔ اگر عہد نبوی صلعم میں یہود کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس وقت یہود قرآن کی حکایت کی تردید کرتے۔ "مولانا اشرف علی" خدا بیٹا ترجمہ کر کے تفسیر میں لکھتے ہیں "مشرکین عرب جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے مطلب یہ کہ ان کو تو یہ بھی کافر سمجھتے ہیں پھر ان ہی کی کفریات کہتے ہیں۔"

پہنیں مولانا اشرف علی نے حاشیہ میں تفسیر درمنثور سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی چارجین کے حوالے سے نقل کی کہ فلاں فلاں یہود رسول اللہؐ کی بارگاہ میں آئے اور کہا کہ ہم آپ کی پیروی کیسے کر سکتے ہیں جبکہ آپ کے ہمارے قبلہ کو کبھی چھوڑ دیا اور آپ حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا بھی نہیں مانتے۔

مولانا مودودی نے دہی "اللہ کا بیٹا" ترجمہ کر کے حضرت عزیرؑ کے بارے میں لکھا:-

"بعض یہودیوں نے ان کو ابن اللہ تک بنا دیا۔ یہاں قرآن مجید کے ارشاد کا مقصود یہ نہیں ہے کہ تمام یہودیوں نے بالاتفاق غلط کام کیا کہ خدا مسیحا بنا یا ہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا کے متعلق یہودیوں کے اعتقادات میں جو خرابی و رونا ہوتی وہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ عزیرؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینے والے بھی ان میں پیدا ہو۔

علامہ آلوسی (صاحب روح المعانی) جن کی تفسیر جملہ قدم مفسرین کے خیالات کی جامع اور مفصل ترجمہ وہ بھی ایسی کوئی بات نہیں کہتے جس سے بینگش ہو کہ فلاں یا فلاں مفسر کے نزدیک یہاں "ابن" کے معنی بیٹے کے نہیں لاڈلے اور چہیتے کے ہیں۔

اب معقولات کی طرف آئیے۔ سب سے پہلا فقرہ ہی ممدوح کا سخت قابل نظر ہے۔ کس نے کہا کہ عربی میں ابن اور ولد دو الگ الگ مفہوم

قسم کے منافقین کے لئے استعمال فرمائے۔ تو کیا یہ بات قرین تیاں ہے کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ کو اللہ کا خاص محبوب کہنا اس درجہ شدید مگر اہی اور کفر میں ہو کہ یہ ہولناک فقرہ اللہ جل شانہ قائلین کے لئے استعمال کر ڈالے۔ خود ممدوح اچلے حواشی میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ بد دعا کا یہ فقرہ سخت بیزاری اور غصہ و نفرت میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم ناچیز کا اور جمہور مفسرین کا خیال تو یہی ہے کہ ”ابن“ یہاں ولد ہی کے مفہوم میں لایا گیا ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہیں۔ مزید ایک علمی و استدلالی فریب خوردگی کا نمونہ یہاں نظر آیا۔ ممدوح فرماتے ہیں:-

”ہمارے بعض قدیم مفسرین بھی اس نکتہ تک پہنچ گئے کہ یہاں انیت سے مراد انیت نبوی و نبوی نہیں

بلکہ لاڈ و پیار والی انیت ہے اور یہ بھی کفر ہے۔“

اس کے بعد قرطبی کے حوالے سے ایک عربی فقرہ نقل فرمایا اور اسی فقرے کے لئے ”بحر“ کا حوالہ بھی دیا۔ اب فقیر کے قلم قارئین تو یہی سمجھیں گے کہ کم سے کم دو قدیم مفسر تو ایسے چپے ہی جا رہے ہیں جو ممدوح میسرے رائے رکھتے ہیں۔ وہ بے چارے نہیں جان سکتے کہ عبارت کا صحیح ترجمہ کیا ہے لہذا ہم بتانا ہو گا کہ عبارت کا مطلب ممدوح نے صحیح نہیں سمجھا ہے۔

تطویل کی معافی۔ ان کا منقولہ فقرہ یہ ہے۔ قال ان عطية ويقال بعضهم يعتقد هانبة حنوة ورحمة وحن المعنى ايضا لا يحل ان تطلق النسبة عليه وهو كفر (قرطبی) پھر اسی طویل فقرے کا یہ ٹکڑا نقل کیا گیا۔ يقال ان بعضهم يعتقد هانبة حنوة ورحمة (بحر)

کتابی اسقام کا اندازہ اس سے کیجئے کہ صحیح لفظ ان فقروں میں بنوۃ تھا یا پہلے بنوۃ بعد میں، لیکن تینوں جگہ نبوت چھپا دوں پہلے یا بعد میں، ممدوح فقیر نے جو عبارات نقل کرتے ہیں عموماً ان کا ترجمہ نہیں پیش کرتے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے لہذا اہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اگر ترجمہ کریں تو کیا کریں گے۔ جس سیاق میں انھوں نے یہ فقرے نقل کئے ہیں اس سے یہ روزنامہ کہ ان کی دانت میں صاحب تفسیر قرطبی اور صاحب

فرزند مجازی“ والے الفاظ ثبت قرطاس فرما دیئے گویا ان کے نزدیک یہاں نصرا نیوں پر بھی اللہ تعالیٰ خفگی کا اظہار اس لئے نہیں کر رہا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا سرزندہ کہتے ہیں بلکہ اس لئے کر رہا ہے کہ وہ انھیں خدا کا لاڈلا اور محبوب مانتے ہیں۔

ممدوح سوچیں کون ان کی اس تفسیر سے اتفاق کرے گا۔ اپنی تفسیر کو تقویت دینے کے لئے انھوں نے مزید ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ مسیحیت کی دو مگر یہاں ایک شہید اور دوسری شدید تر الگ الگ لگ ہیں ایک یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا فرزند مجازی قرار دیتے ہیں اور دوسری یہ کہ انھیں فرزند حقیقی یعنی ولد قرار دیتے ہیں پھر ممدوح کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن نے اول الذکر خیال فاسد کے لئے ابن اللہیت کا عنوان قائم کیا ہے۔ یعنی جب قرآن یہ کہتا ہے کہ نصرا نیوں نے عیسیٰ کو ابن اللہ ٹھہرا دیا تو اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ خدا کا محبوب اور لاڈلا ٹھہرا دیا۔

اس نکتے کے لئے ممدوح نے کوئی دستاویزی یا فنی شہاد پیش نہیں کی بلکہ صرف اتنا لکھ دیا کہ ”ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن“ ہم نہیں سمجھتے کہ جمہور مفسرین کی رائے کے خلاف رائے پیش کرتے ہوئے اس طرح کے مبہم اور ناقص حوالے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

غور طلب بات یہ بھی ہے کہ کیا حضرت مسیح اللہ کے محبوب نہیں تھے؟ ممدوح نے مطالعہ نقل اور محبوب مطلق کے الفاظ لکھ تو دیئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان الفاظ کا ماخذ کیا ہے تشران میں تو کہیں یہ الفاظ آئے نہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام یقیناً اللہ کے محبوب رہے ہیں۔ لہذا مجرد یہ بات کہ کوئی قوم ایک نبی کو اللہ کا محبوب مانے کفر نہیں ہو سکتی۔ یہاں آیت میں اللہ نے اس قول کو قول کفر ٹھہرایا ہے اور بد دعا کے وہ سخت محاوراتی الفاظ استعمال کئے جو بدترین کفر کی طرف شیر ہیں۔ قلکھم اللہ (اللہ انھیں غارت کرے) یہ شدید الفاظ اللہ نے قرآن میں بس ایک جگہ اور سورہ منافقون میں نہایت مردود

ظاہر کرتے تھے مراجع کا یہ فرق باریک ضرور ہے مگر محبوب کی مکر جیسا نہیں کہ بغیر خوردبین کے دیکھا ہی نہ جاسکے اس فرق سے نتائج بھی مختلف ہو جاتے ہیں جیسا کہ ہنری فہم پر ظاہر ہے۔

پھر قرطبی کے اس رہنما کے لیے بھی ظاہر ہے کہ مدارج نے انھیں خواہ مخواہ اپنا گواہ بنا کر لاکھڑا کیا ہے۔ ان کے فرشتوں کو بھی یہ تصور نہ آیا ہو گا کہ آنے والے زمانے میں کوئی بزرگ مجھے اس دعوے کا گواہ بنا کر قبر سے اٹھائیں گے کہ سورۃ توبہ کی تیسویں آیت میں ان کے معنی لاڈلے اور چیتے کے ہیں بیٹے اور فرزند کے نہیں ہیں۔ رہے حبیب بحر۔ تو ان بے چاروں کا قصور بس اتنا ہے کہ مفسرین قدیم کی روش کا اتباع کرتے ہوئے انھوں نے ابن عطیہ کا قول نقل کر دیا۔ اس قصور کی سزا انھیں اتنی سخت نہ دینی چاہیے کہ ایک ایسی رائے ان سے منسوب کر دی جائے جس سے وہ بری ہیں۔ زیادہ طول کا ذکر نہ ہوتا تو ہم صاحب بحر کی اگلی پھلی عبارات نقل کر کے اپنے اعتراض کو مزید قوت دیتے لیکن حق وضاحت شاید ادا ہو گیا اس لئے قلم نہیں روکتے ہیں۔

(۲) آیت ۷۴: ذکر یہ ہو رہا ہے کہ اسے پیغمبر کفار و منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ یہ بے ایمان اور جھوٹے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ کفر بات کہتے ہیں اور مکر جاتے ہیں۔ صاف قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی حالانکہ یہ بات انھوں نے یقیناً کہی ہوتی ہے۔ یہ دعوۃ اسلام کے بعد مرتکب کفر ہو چکے ہیں۔

آخری فقرے کے لئے قرآن سے یہ الفاظ ہیں وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ دَاوْرَ كَافِرٍ ہو گئے مسلمان ہو کر، اس فقرے کے ذیل میں مدارج رقم طراز ہیں:-

”اس سے فقہاء مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ اسلام ایمان کے مترادف ہے اس لئے کہ ٹھیک کفر کے مقابلے میں آیا ہے۔“

اس کے لئے حوالہ صرف ”مدارک“ کا دیا گیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر ایک آیت سے کسی اکادمک مفسر نے کوئی خاص استدلال کیا ہے تو اس سے قطع نظر کہ وہ استدلال قوی ہے یا ضعیف یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ ”فقہاء مفسرین نے استدلال کیا ہے۔“ یہ عام فقرہ تو صرف یہاں یہ مفہوم رکھتا ہے کہ جتنے بھی فقہاء مفسرین سب یکم سے کم ان کی کثیر تعداد یہی استدلال کرتی ہے۔ حالانکہ جہاں تک ہمارے محدود مطالعہ کا تعلق ہے یہ استدلال شاید ذرا نادر کیا گیا ہے اور فی الحقیقت اسے فقہاء استدلال کہنا ہی مشکل ہے۔

اشخاص کو چھوڑیے۔ مدارک یا فلاں تفسیر کے مصنف علیہ الرحمۃ کس پائے کے مفسر اور فقیہ تھے یہ بحث بے لاگ تبصرے میں عموماً رخنہ ڈال دیتی ہے۔ نفس استدلال پر نگاہ نقد ڈالنے کے اس کے ضعف و قوت کا کیا حال ہے۔

تمام فقہاء اور مفسرین کی در امرت بالاتفاق یہ ہے کہ ایمان ایک مخفی شے ہے جس کا ممکن و مستقر قلب ہے۔ اور اسلام ایک ظاہر شے ہے جو آدمی کی حرکات سے عیاں ہے۔ ایمان کی کیفیت ہے اور اسلام کیفیت۔ ایمان عقیدہ ہے اور اسلام عمل۔ ان دونوں میں ترادف کی نسبت ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ دو جدا جدا چیزیں کے نام ہیں۔ البتہ فقہاء نے غور و تحقیق کے بعد یہ قاعدہ ضرور دریافت کیا کہ جہاں کہیں ایمان اور اسلام دونوں کا ذکر ہو گا وہاں تو لانا نہ انکا الگ الگ مفہوم لیا جائے گا مگر جہاں کہیں ان میں سے فقط ایک کا ذکر ہو گا وہاں دیکھنا پڑے گا کہ سیاق و سباق اور لسانی قرآن کیا رہنمائی کر رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہاں دونوں ہی مفہوم لئے جاسکیں اور عین ممکن ہے کہ فقط ایک ہی مفہوم لینا ضروری ہو۔

ان میں سے ہر طریق استعمال کی مثال قرآن میں موجود ہے لیکن طہ الت سے بچنے کے لئے ہم امثال سے صرف نظر کر رہے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ مدارج نے جس استدلال کو تمام

پہنچا دے تو یہ اپنے ظاہری دعوۃ اسلام کا بھرم رکھنے کے
بھٹکی جی بن کر کہیں کہ خدا کی قسم ہم نے تو ایسی باتیں نہیں
یہ دطیرہ ظاہر ہے کہ منافقین ہی کا ہے۔ کفار کو اس کی کب
ضرورت پڑ سکتی ہے کہ اپنے کسی کلمہ کفر سے ٹکریں جبکہ
علامہ کفر پر قائم ہیں اور خود کو مسلمان پوز نہیں کر رہے
جب طے ہو گیا کہ کفر ذرا بعد اسلام ہم کا تعل
منافقین سے ہے تو یہ بھی طے ہو گیا کہ اسلام سے مراد یہا
ایمان ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ دکھاوے کا اسلام مراد ہے
ان منافقین نے ازراہ مکاری یا ازراہ خوف اختیار کیا تھ
اگر یہ واقعہ ایمان لایچکے ہوتے تو ان پر نفاق کا اطل
ہی کیسے ہوتا اور انھیں زمرہ منافقین میں کیوں شامل کی
جاتا۔ منافق تو یہ ہے جو فی الحقیقت بے ایمان ہو مگر مصلو
اپنے آپ کو مسلمان کہے اور مسلمانوں ہی جیسے بعض افعال ادا
بھی کرتا رہے تاکہ اپنی ایمان اسے مومن ہی سمجھا کریں۔

خدا ہی جانے کسی مفسر نے یہ خیال کیا سوچ کر ظاہر کر د
کہ یہاں اسلام ایمان کے مراد ہے حالانکہ معاملہ اس کے
برعکس ہے۔ یہاں اسلام کو ایمان کے مراد سمجھا ممکن ہو
نہیں ہے ورنہ آیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ قرآن صریحاً
بتا رہا ہے کہ منافقین ظاہراً جو دعوۃ اسلام کرتے تھے اس
پردہ فاش ہو گیا اور مسلمان جان گئے کہ یہ بہرہ دہ کافر
کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تعجب یہ ہے کہ مدح مفسرانے ترجمے میں خود یہ فقرہ
لکھتے ہیں۔

”اور اپنے ظاہری، اسلام کے بعد کافر ہو گئے“

گویا بریکٹ میں ”ظاہری“ کا اضافہ کر کے انھوں نے خود
ہی جت دیا کہ اسلام سے مراد یہاں حقیقی اسلام نہیں ہے جسک
سمجھا ایمان ہو اگر تاہم بلکہ نامنشی اسلام ہے جو ایمان سے خالی
ہوتا ہے اور محض دکھاوے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ جب
خود وہ اس پر متبہ اور متوجہ کر رہے ہیں تو آخر اس تفسیری
نوٹ کا کیا نتائج ہیں پر ہمیں کلام کرنا پڑا ہے۔

یہ بات کہ آیت کا یہ فقرہ منافقین سے متعلق ہے

فقہاء مفسرین سے منسوب کر دیا ہے وہ نہ تو تمام فقہاء مفسرین
کا استدلال ہے نہ کوئی دلیل اور قوی استدلال۔ سمجھ میں
نہیں آتا کہ اسے یہاں نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور کسی
بھی قاری کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا۔

استدلال کو غیر قوی ہم کیوں کہہ رہے ہیں یہ کوئی باریک
بات نہیں۔ اگر یہاں اسلام کو ”ایمان“ کا مراد مان لیں
تو آیت کا مفہوم یہ بنے گا کہ جو لوگ کلمہ کفر کہہ کر کافر ہو گئے
ہیں وہ اس کلمے کے تلفظ سے قبل مومن تھے۔ ان کے قلب
میں ایمان جگہ پا چکا تھا اور اب کلمہ کفر کے نتیجے میں وہ مرتد
ہو گئے۔

کیا واقعی یہ مفہوم قابل قبول ہو سکتا ہے؟ ہمارے خیال
میں بالکل نہیں ہو سکتا۔ ذکر کافروں اور منافقوں کا ہے
کافر تو وہ ہیں جو باپ دلاؤں سے کافر چلے آ رہے ہیں اور
کوئی لمحوں پر ایسا نہیں گذر کہ ایمان کی رمت بھی ان کے
سینے میں داخل ہوئی ہو۔ بلکہ یہاں تو خاص طور پر ان کافروں
کا ذکر ہے جن کا کفر شدید ہے۔ جو دعوت حق کے بالمقابل زہیم
و حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں اور ہر طرح کا امکانی نقصان
مسلمانوں کو پہنچا رہے ہیں۔ ایسے ہی کافروں کے بارے میں
اللہ نے حکم دیا کہ اے پیغمبران سے نرمی کا برتاؤ نہ کرو بلکہ
تندی اور سخت گیری سے کام لو۔ ان سے لڑو۔ ان کا قلع قمع
کر دو۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تو وہ لوگ ہو ہی نہیں سکتے جن کے
بارے میں اللہ یہ فرما رہا ہو کہ یہ قبول اسلام کے بعد کافر
ہو گئے لہذا صرف منافقین ہی رہ گئے جو اس قول باری تع
کا مصداق بن سکتے ہیں۔ آیت کا ابتدائی فقرہ بھی اس
کے لئے دلیل مبین ہے۔ فرمایا گیا۔ يُخْفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا
وَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَهُمْ يَدْرُسُونَ تَسْمِعُ لَهُمْ
کہ ہم نے فلاں کلمہ کفر نہیں کہا حالانکہ یقیناً انھوں نے یہ
کلمہ کہلایا، اب دیکھ لیجئے۔ یہ روش منافقین ہی کی ہو سکتی
ہے کہ اپنی مخصوص مجلسوں میں تو کفریات بکریں مسلمانوں کو
تباہ کرنے کی اسکیمیں بنائیں اور رسول کو ہلاک کرنے کے
منصوبے تراشیں مگر جب کوئی مخبر اس کی خبر مسلمانوں تک

”وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ہمراہ رہ جائیں۔“

اتفاق سے شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں بھی ”پیچھے رہ جانے والوں“ ہی کے الفاظ چھپے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتابت کا سہو ہو گا۔ لکھا گیا ہو ”دالیوں“ اور کتابت ہو گیا ”والوں“۔

”خوالف“ عورتوں کو کہتے ہیں۔ یہ خالف کی نہیں خالفتہ کی جمع ہے۔ فاضل ممدوح خود بھی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں کہ الخوالف سے مراد یہاں عورتیں ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ترجمے میں تانیث کا اظہار کرتے ہوئے ”پیچھے رہ جانے والیوں“ کے الفاظ نہ لکھے جائیں۔ مولانا اشرف علی نے ترجمہ کیا۔ ”خانہ نشین عورتیں۔“

شیخ الہندؒ نے ”پیچھے رہنے والی عورتوں“ کے الفاظ رقم فرمائے۔

مولانا زودودی نے تحریر فرمایا۔ ”گھر بیٹھے والی“ دوسری گفتگو ایک تفسیری فقرے میں ہے۔ قرآن نے اہل قدرت کے لئے اولوالطول کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اس پر مراح کا تفسیری نوٹ یہ ہے:-
”اولوالطول کے ذکر سے یہ مراد نہیں کہ صرف اہل قدرت و رخصت مانگتے ہیں۔“

عجیب فقرہ ہے۔ ٹھیک منطوق کلام کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ مراد نہیں حالانکہ مراد یہی اور صرف یہی ہے۔ دراصل یہاں لفظ ”صرف“ غلط جگہ استعمال ہوا۔ جو بات ممدوح فرمانا چاہا رہے ہیں اس کے لئے اس ”صرف“ کو ”یہ مراد“ سے قبل ہونا چاہیے تھا۔ یعنی یوں۔

”اولوالطول کے ذکر سے صرف یہ مراد نہیں کہ۔۔۔“

اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا کہ اہل قدرت کا رخصت مانگنا تو مراد ہے ہی مگر اس کے علاوہ بھی کچھ مراد ہے۔ ”صرف“ کو ممدوح نے جس مقام پر رکھ دیا ہے اس سے

سے بھی ممدوح نے ذیلی نوٹ میں نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ ی کے مطابق شان نزول بھی دی ہے۔ کیا منافقین کے وہ میں بھی ایمان ہوا کرتا ہے۔ یا پلٹ کر یوں کہئے کہ یادہ لوگ منافق بھی کہلا سکتے ہیں جو ایمان لے آئیں؟ ہم فضل مکتب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور پائے ہیں کہ تفسیر ماحدی کے بہترے غامات جائزے ہوئے ذہن اور کھلی ہوئی آنکھوں کی ثبوت یا نہیں کرتے۔ یہ شاید عمر کا تقاضا ہو یا پھر جلد بازی نتیجہ۔

صاحب مدارک کے استدلال کا منطقی سقم بھی دیکھ لیں۔ انھوں نے محض اس دلیل سے اسلام کو ایمان کا مراد لیا کہ یہاں وہ ”کفر“ کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے حالانکہ رک کا تقابل حقیقتہً اسلام سے ہے نہ کہ ایمان سے۔ اسلام پتا آدمی کے ظاہری افعال و اقوال سے چلتا ہے اسی طرح اس کے کفر کا پتا بھی ظاہری افعال و اقوال سے چلتا ہے۔ برآیت میں تو صرف ظاہری حالت ہی کا ذکر ہے ورنہ اگر تو یہ لوگ اس وقت بھی تھے جب انھوں نے قول نہ کیا تھا اور اس قول کی اطلاع مسلمانوں تک نہ پہنچتی تھی یہ عند اللہ کافر ہی ہوتے۔ پس ایسے کفر کے بارے میں لفظ اسلام کا استعمال تو زبان حال سے بکار اور کہہ رہا ہے کہ ایمان کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔

۱۲ آیت ۸۶:-

منافقوں کا ذکر چل رہا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے رئی آیت جہاد نازل ہوتی ہے تو ان بدبختوں میں جو سراد جہاد کی قدرت و استطاعت رکھتے ہیں وہ طرح کے بہانے ملکر رسول سے رخصت طلب کرتے ہیں کہ ہمیں گھر بیٹھا رہنے دیجئے۔ یہ بے شرم اس میں خوش ہے کہ عورتوں کے ساتھ چپکے رہیں۔

یہاں ایک چوک تو ترجمے کی ہے۔ ترجمہ ”ایمان“ تو ”اٰمَنَ الْخَوَالِفَ“ اس کا ترجمہ ممدوح نے یہ کیا۔

تو یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ فقط اہل قدرت ہی رخصت نہیں مانگتے تھے بلکہ غیر اہل قدرت بھی مانگتے تھے۔ زبان کے اس بہت ہی لطیف و نازک معنی کے بعد فقرے کا مزید حصہ بھی دیکھ لیجئے:-

”بلکہ اس سے غیر اہل قدرت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ جب قدرت والوں کا یہ حال تھا تو غیر اہل قدرت کا حال ضرور ہی یہ ہوتا۔“

جو کچھ حمد و جہاد کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے مناسب انداز بیان فراہم نہیں ہو سکا۔ آیت میں اہل قدرت کا جو حال بیان ہوا ہے وہ صریحاً ہی تو ہے کہ وہ جہاد میں نہ جانے کی رخصت طلب کرتے تھے۔ اب حمد و جہاد کے فقرے کا مطلب یہ بنا کہ جن میں قدرت نہ تھی وہ تو ضرور ہی رخصت طلب کرتے تھے!۔

یہ وہ مضمون ہے جس سے آیت کا کچھ تعلق نہیں غیر مستطیع اور معذورین کے لئے تو فریضہ جہاد ہے ہی نہیں انھیں رخصت طلب کرنے کی کیا ضرورت۔ آگے خود قرآن کہہ رہا ہے کہ ضعیفوں اور مرلویوں اور ناداروں پر کوئی گناہ نہیں وہ قدرت ہی نہیں رکھتے۔ یہاں خود حمد و جہاد نے یہ تفسیری نوٹ دیا:-

”یہ سب غدر و رافضی رکھنے والے لادیکلف اللہ انفساً الا و سحوا کے قاعدہ کلیہ کے تحت میں آجاتے ہیں۔ اس آیت میں صفائی ان اعراب کی طرف سے پیش ہو گئی جو کوئی حقیقی عذر رکھتے تھے۔“

اسے اور پچھلے نوٹ کو آگے سامنے رکھ کر پڑھیے۔ بات گنجشک ہو کر رہ جائے گی۔ یہاں غیر اہل قدرت کے حق میں کلمات خیر پر زور ہے اور وہاں ان کے خطا دار ہونے پر۔

حمد و جہاد کا جو کچھ مافی الضمیر ہے وہ ہم سمجھ گئے۔ قصیدہ ان کے فہم میں نہیں ہے بلکہ فہم میں ہے۔ پہلا نوٹ یا تو

دنیا ہی نہ تھا یا دنیا تھا تو منشاء کی وضاحت بہتر الفاظ میں کی جاتی۔ بصورت موجودہ سخن فہم قارئین کا وجداً بڑی گھٹن محسوس کرے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہزار ہزار شکریہ اُس معبود برحق کا جس نے تفسیر جلدی جلد دوم کے اس تبصرے کو تکمیل تک پہنچایا۔ بے شمار عہد رات کی رائے ہمارے طرز تحریر کے بارے میں اچھی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم تلخ گفتار بھی ہیں، گستاخ و بے ادب بھی تند خو اور بد مزاج بھی۔ اس خیال کو غلط کہنا مشکل ہے۔ واقعی ہماری نافرمانی تحریریں اور تبصروں میں ان سارے بُرے خصائل کی پرتھکانا پائی جاتی ہیں۔ ہم منہ بھٹ ہیں۔ بے سلیقہ ہیں۔ بالآخر میں مگر ہماری نیت اللہ دیکھ رہا ہے اور یہ چیز تو بندے بھی دیکھ رہے ہیں کہ تہذیب یافتہ اور حمایت یافتہ مخالفت ہم دلائل کی روشنی میں کرتے ہیں۔ چاہا کر بات کرنا ہماری سرشت نہیں۔ محض الزام رکھ کر گزر جانا ہم پسند نہیں کرتے بلکہ شرح و بسط سے برہان و شہادت کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ لاگ لپیٹ ہمارے بس سے باہر ہے اب جو بھی شکایت جسے ہو اس کا تعلق ہمارے انداز تحریر ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ مطالب و معانی سے۔ یہ کچھ زیادہ اہم نہیں۔

ابھی صدق جدید میں مولانا دریا بادی کا ایک ایسا نوٹ پڑھنے کو ملا جس میں بڑی حسرت اور مایوسی کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ تفسیر جلدی کی میسر جلد چھینا بحالات موجودہ ممکن نظر نہیں آتا۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ حسرت کی بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ اب تک جو دو جلدیں چھپی ہیں ان کا کوئی نمایاں شان ایڈیشن نہ آ سکا۔ شکوے، غرضشوں، خطاؤں اور بیماریوں سے آلودہ بہت سی جلدوں کے مقابلے میں وہ ایک دو جلدیں کہیں بہتر ہیں جنہیں دوا علاج کے ذریعہ صحت مند بنالیا جائے۔ فقط والسلام

معتزین کیا فرماتے ہیں

کی گئی۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کوشش کا کوئی تعلق عجماء اسلامی سے بھی ہے۔ نہیں۔ اجتماع میں اسٹال لگانے والے کتب خانوں پر اگر میں با آپ کی کتاب پھیلادیں تو جماعت بیجاری اس میں کیا کرے۔ مگر کتاب کا تشہیر یا جانا بہر حال یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس پر فوری توجہ دیں۔ توجہ دینا ضروری اس لئے ہے کہ اس میں تجلی کے بعض دلائل و براہین کو رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش اگرچہ اس درجہ ناکام ہے کہ جو لوگ ذرا گہری نظر اور سیدار ذہن رکھتے ہوں وہ خود ہی اس میں اور تجلی کے پیش کردہ مواد میں غلط فہمی کو از نہ کرنے کے اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ تجلی کا موقف نواد کی طرح مضبوط ہے اور نسبیاتی ثانی کے فریادات بات کی طرح کے سدا کوئی معنی نہیں رکھتے۔

مگر گہری نظر اور سیدار ذہن کی نعمتیں عام کہاں اس لئے ہیں طوعاً و کرہاً اس بحث پر مزید کچھ صفحات کا لے کر نے ہوں گے۔ خدا قار آمین تجلی کو صبر جمیل کی توفیق دے اور ہمارے بھی مغفرت فرمائے۔

تین طلاؤں کی بحث سے نہ جانے کتنے قارئین بہرہ اعلیٰ بدبور ہو چکے ہوں گے۔ ہم خود آکٹاہیٹ کا شکار ہیں۔ ہیٹ نہ ہوتی اگر عالم لوگ عالم فاضل ہوتے اور ان نکات کو سمجھنا ان کیلئے سہل ہوتا جس درمیان ہر لئے بغیر ش کی ہی نہیں جاسکتی۔ مگر عوام کبھی عالم فاضل نہیں ہوا تے اور تجلی بہر حال عوام میں بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا ت سے خواص میں لہذا اچھا تو یہی تھا کہ مکتبی نوع کی تحقیقی بحثیں اس میں کم سے کم آئیں۔ لیکن اسے کیا کیجئے فن مسائل و بر کی طرح کھینچے چلے جاتے ہیں اور ہمارے انھیں منہ سے چھوڑ کرتے ہیں کہ خواہش نہ ہونے کے باوجود سے دیر تک اُٹھتے رہیں۔

اب مثلاً تین طلاؤں کے مسئلہ کو براہر طول دیا جا ہے۔ گزشتہ ماہ کے احیاء واقعی میں جس موقع کتاب لکھ کر آچکا ہے وہ احمد آباد اسلامک ریسرچ سینٹر والوں پھاپ کر نہ صرف ہمیں بھیج دی بلکہ جماعت اسلامی ہند بالیہ اجتماع میں اسے حتی الوسع شہرت دینے کی کوشش

قطع کلام کی معافی۔ اہل فہم یہ غور نہ کریں کہ اس عبادت میں ہمارے جس اصولی معروضے کو نقل کیا گیا ہے وہ صحیح طور پر ایک حسین اور ستم معروضہ ہے۔ دنیا کا کوئی ماہر قانون نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے کوئی غلط بات یا غیر سنجیدہ بات عرض کی ہے۔ پھر بھی ہمارے دوست اس کے لئے ایک کھسپ بات "کا طنز یہ طرزِ تعبیر اختیار فرماتے ہیں۔ یقیناً انھوں نے جان بوجھ کر کیا ہے تو اس کا نام ہو گا علمی بدنمائی اور اگر بے جانے ہو جھے کیا ہے تو اس کا عنوان ہو گا سادہ لوحی۔ بہر صورت وہ اس الزام سے خود کو نہیں بچا سکتے کہ متین دلائل کا مناسبت کے ساتھ سامنا کرنے کے عوض وہ کھیل کود کے موڈ میں آئے ہوئے ہیں اور محض چٹکلوں سے علمی استدراک کو دھواں دھواں کر دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ تحریر فرمانے کے بعد انھوں نے ارشاد کیا

"سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کے مذکورہ فیصلے کی حیثیت عدالتی نہیں بلکہ سیاسی اقدام کی تھی تو حضرت عمرؓ کے تین بیگانی طلباء کو نافذ کرنے کی جو علماء یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اس کا نفاذ محض تعزیراً کیا گیا تھا ان کی یہ توجیہ کیوں غلط قرار دی جاتے؟ مزید یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کا فیصلہ عدالتی نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ استدلال نہیں ہے تو صحابہ کے فتوے جن کی حیثیت بھی عدالتی فیصلوں کی نہیں ہے حجت کس طرح بن سکتے ہیں؟"

ہم نے دوستوں کی عبارت تمام و کمال نقل کر دی ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے قارئین کو تجلی اگست و ستمبر کے صفحات میں ہمارے گزشتہ ملاحظہ فرمائی ہوں گی۔ ان کا ملاحظہ انھیں محسوس کرانے کا کہ کسی ڈوبنے والے کی طرح ہمارے دوست تنکے کا سہارا لے رہے ہیں۔ کہانی آپ نے بھی سنی ہوگی۔ ایک جاٹ تھا ایک تیلی۔ دونوں زبان کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ تیلی نے کہا "جاٹ بے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ"۔ جاٹ بھڑک اٹھا۔ دانت میں کر بولا "تیلی رے تیلی تیرے سر پر کوٹھو"

کتاب کا نام ہے۔ "ایک مجلس میں تین طلاق"۔ سیدنا کے جو مقالے زندگی کے طلاق نمبر میں شائع ہوئے تھے وہ سب اور ان کے علاوہ مزید دو مقالے اس میں شامل ہیں۔ ان دو مقالوں کو ہم نے پڑھ کر دیکھا اور شکر بھیجا کہ ان میں کوئی ایسا نکتہ نہیں جو باقی مقالات میں نہ آچکا ہو اور ہمیں اس پر بحث کرنی پڑے۔ البتہ مقالات کے بعد اعتراضات کے جوابات کا عنوان دے کر دوسرے سخن تجلی کی طرف پھیر دیا گیا ہے اور سب سے پہلے بدیز زندگی کا وہ مراسلہ زیرِ شاعت کیا گیا ہے جس کا تجزیہ ہم تجلی کے دو شماروں میں کر چکے۔ اس مراسلہ کا عنوان خاصا شاعرانہ رکھا گیا۔

"طلاق بدووق کی کوئی نہیں ہے"

کاش ہمارے دوست شاعری کو اس خشک علمی مسئلہ میں دخل نہ دیتے۔ بہر حال ہم تو اس مراسلہ کا تجزیہ پیش کر چکے اگر اس کے بعد بھی اس کی کوئی منطقی اور علمی نذر و قیمت باقی رہ گئی ہے تو مزید کچھ کہنا ہمارے بس ہے باہر ہے۔ جو لوگ تجلی نہ پڑھیں اور اسے پڑھیں وہ ضرور اس پر سبحان اللہ اور واہ واہ کے ڈونگے برسائے سکتے ہیں لیکن تجلی کے ذہنی فہم قارئین سے قطعاً امید نہیں کہ وہ محترم بدیز زندگی کے علم کلام کو خراج تحسین ادا کر سکیں گے۔

اس مراسلے کے تعلق سے ہمارے دوستوں نے چند سطریں تجلی کا تجزیہ دیکھنے کے بعد رقم فرمائی ہیں ان پر البتہ کچھ عرض کئے دیتے ہیں۔ انھوں نے رقم فرمایا ہے۔

"ایڈیٹر تجلی نے اگست و ستمبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں مولانا عروج قادری صاحب کے مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے حضرت عمرؓ کے ایک فیصلے سے استدلال کو غلط ثابت کرنا چاہا ہے۔ اس سلسلے کی دلچسپ بات موصوف نے یہ تحریر فرمائی ہے کہ "حضرت عمرؓ حکام کو وقت تھے کہ قاضی" نیز یہ کہ "ان کا فیصلہ کسی عدالت میں بطور نظریہ پیش نہیں ہوتا تھا کیونکہ عدالت میں عدالتی نظام کام آتے ہیں حکام کے انتظامی یا سیاسی یا ملایا اذانات اور فیصلے کام نہیں آتے۔"

کا اعلان نہ تھا بلکہ ایک کم شرعی مسئلہ کی یاد دہانی تھی۔ انھوں نے عوام کو توجہ دلائی تھی کہ تین کجائی طلاقیں شرعاً تین ہی ہوتی ہیں اور ہم بحیثیت امیر المؤمنین اسی شرعی کو حکم کو لازماً نافذ کرتے رہیں گے۔ کوئی غدار اور نادان مسیح نہ ہوگی۔ دین و شریعت میں تحریف و تغیر کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

ربادہ فقرہ جو صحابہؓ کے فتوؤں کے بارے میں دوستوں نے لکھا اور جس پر ہم نے خط بھیج دیا ہے تو افسوس کہ وہ خود بھی اہل کے مضمرات و ثمرات کا ادراک کرنے سے قاصر رہے۔ دو بالکل مختلف باتوں میں فرق نہ کر سکنے کی یہ بھونڈی مثال ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں حضرت عمرؓ یا کوئی بھی اور صحابی اپنا فتویٰ صادر کرے لیکن دوسرے صحابہ سے اس کی تصدیق نہ ہو سکے تو بے شک یہ فتویٰ پوری امت کے لئے حجت نہیں اور اہل علم قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن دوسری بات یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں ایک دو یا دوچار نہیں، فقہی صحابہؓ کی عظیم اکثریت ایک مافتویٰ دے رہی ہو اور قرآن و سنت سے بھی اسی کی تائید نکل رہی ہو اور کسی بھی صحابی کا اختلافی فتویٰ کہیں نہ پایا جاتا ہو تو اسے حجت ماننا ہرگز اور تمام امت اسے حجت مانتی آئی ہے۔ آخر ”اجماع“ کے حجت ہونے میں مستند علمائے سلف و خلف میں سے کس نے اختلاف کیا ہے اور اجماع کی حقیقت اس کے سوا ہے کیا کہ ثقہ ترین اہل علم ایک رائے پر متفق ہو گئے ہوں اور اختلاف کی کوئی آواز ثقہ علماء کے حلقے سے نہ اٹھے۔ ہم نے متنبہ کیا تھا کہ ابن تیمیہ سے قبل کسی ایسے شخص نے اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا جسے نقاہت اور قانون شریعت کے معاملے میں امت امام سمجھتی ہو۔ استاد جانتی ہو۔ ماہر فن تصور کرتی ہو۔ پھر کموں ہمارے دوستوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ صحابہ کے انفرادی فتاویٰ کا معاملہ دوسرا ہے اور اجماعی مسلک کا معاملہ دوسرا۔

یاد رہے نہ سمجھتے ہیں سمجھنے کی بات دے اور ان کو جو نہ سمجھ کر زبان اور

تیلی ہنسا اور بولا ”قافیہ تو ملا نہیں“۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاٹ اور کھٹاٹ ہم قافیہ ہیں۔ تیلی اور کوٹھوم قافیہ کہاں۔ جوابی گالی دینی تھی تو قافیہ تلاش کر کے لائے ہوتے۔ جاٹ چپ رہنے والوں میں نہیں تھا بر ملا بولا ”نہ ملے قافیہ تم تو بوجھ تلے دب گئے۔“ یعنی اس نے تیلی کو محسوس کر لیا کہ میرے سر پر اگر کھٹاٹ رکھی گئی تب بھی اس میں بوجھ کہاں لیکن تیرے سر پر کوٹھو چڑھا دیا گیا تو کچھ مری نکل جائے گا۔ اس طرح کی کج سمجھیاں لوگ زندگی بھر کر سکتے ہیں۔ ہمارے دوست بھی کسی ٹھوس دلیل کو سنجیدگی سے مرکبہ التفات نہ بنائیں تو ہزار برس سلسلہ گفتگو چل سکتا ہے۔ اندازہ فرمائیے۔ ہم نے دستاویزی دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ تین طلاقیں کو تین ہی ماننے کا مدعا حضرت عمرؓ کے کسی ذاتی اجتہاد یا اقدام یا اعلان پر نہیں ہے بلکہ قرآن اور احادیث رسولؐ پر ہے۔ گستاخ و ستمبرائے تجلی میں ہم نے آٹھ حدیثیں اور ۱۴ صحابہ کے آثار جمع کر دیے ہیں اور یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ ان کے خلاف کوئی ایک حدیث صریح یا کسی ایک بھی صحابی کا فتویٰ کہیں نہیں پایا جاتا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اپنے آپ کو سب سے بڑا عاشق حدیث اور پیرو قرآن و سنت پوز کرنے والے اہل حدیث کرم فرما ساری توجہ اس اہم ترین اعلان پر صرف کرتے اور دنیا کو ثمرات کے ساتھ بتاتے کہ دیکھو فلاں حدیث صریح فلاں کتاب میں صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے اور یہ تجلی کی جمع کردہ آٹھ حدیثیں وہ مفہوم نہیں رکھتیں جو تجلی پیش کر رہا ہے۔ لیکن وہ اہم ترین پہلو کو چھوڑ کر ذیلی ضمنی مباحث میں عامر نالائق کی ٹانگ کھینچنے کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے تین طلاقیں کے تین ہی ہونے کا جو اعلان کیا تھا وہ سیاسی اقدام تھا یا تعزیری یا اجتہادی صرف اس وقت اہم ہو سکتی ہے جب عام عثمانی نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلہ پر اجماع اعلان عمرؓ کی بنیاد پر ہوا ہے۔ لیکن جب اس نالائق کا یہ موقف ہے ہی نہیں اور وہ دکھلا چکا ہے کہ حضرت عمرؓ کا اعلان کسی نئی بات

مولانا محفوظ الرحمن فیاض دلو بند نے "اجماع کا غلط دعویٰ" عنوان سے کتبجلی سے اچھا خاصا معارضہ کیا ہے۔ آئیے اس معارضے پر بھی ناقدانہ نظر ڈالیں۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسئلے پر "اجماع" کا دعویٰ کرے تو اس کا منشاء یہ ہو کر تا ہے کہ تمام اساتذہ فن اس پر متفق ہیں۔ گو یادہ مدعی مسئلے کے دلائل پر گفتگو نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک خبر دے رہا ہے۔ ایک تاریخی حقیقت ظاہر کر رہا ہے۔ اب جو لوگ اس کے دعوے کو غلط و سراسر اردینا چاہتے ہوں انھیں صرف یہ کہہ کر کسی حوالے کے ساتھ کسی استاد فن کا اختلافی قول پیش کر دیں کسی جانی پہچانی کتاب کا نام لے کر بتا دیں کہ اس کے فلاں صفحے پر فلاں ماہر فن کا اختلاف صریح لفظوں میں درج ہے۔ پس دعوے کی تردید ہو جائے گی۔

لیکن ہمارے دہشت ایسا نہیں کرتے۔ ان کا تازہ علم کلام ہمارے سامنے ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف نوع کے منطقی دلائل کی اسٹ پھیر کی ہے حالانکہ یہ غیر متعلق قلم درازی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص دعویٰ کر رہا ہو کہ یزید حضرت معاویہ کا لڑکا تھا اور آپ اس تاریخی صداقت کو اس قسم کی منطقی سے جھٹلانے لگیں کہ حضرت معاویہ تو ایسے تھے اور دیسے تھے لہذا ایسے اچھے صحابی کے غلطے سے یزید جیسا خراب لڑکا پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یزید گویا یہ طرز بحث انتہائی لغو ہے۔ حضرت معاویہ اور یزید کے تاریخی رشتے کو منطقی دلائل سے نہیں صرف تاریخی شواہد جھٹلایا جاسکتا ہے۔ آپ کسی سند تاریخ میں اگر یہ دکھلا سکیں کہ یزید حضرت معاویہ کا نہیں بلکہ فلاں صاحب کا فرزند تھا تب تو مدعی کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ یزید کا ابن معاویہ ہونا متفق علیہ اور اجماعی مسئلہ ہے۔ پچاس روایات اسے ابن معاویہ ثابت کر رہی ہوں مگر بہر حال ایک بھی مضبوط قسم کی روایت اس کے خلاف مل گئی تو کسی نہ کسی درجے میں دورائے کی نجاش شکل آئی۔ اسی طرح کوئی ایک

حدیث صریح و صحیح یا کوئی ایک فتویٰ صحابی یا اس صدیوں کے کسی ایک سیکلہ امام فن کی رائے آیت کے مسئلے میں اختلافی دکھلا سکیں تو بے شک آپ عنوان بجا ہو سکتا ہے کہ اجماع کا دعویٰ غلط ایسی کوئی شہادت پیش کئے بغیر منطقی اور نظری کو طول دینا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ صداقت ساتھ نہیں دے رہی ہے اور حقائق کو آپ نکتہ کے انبار میں گم کر دینا چاہتے ہیں۔

جب صورت حال یہ ہے تو یہ بحث ہی فضو ا جاتی ہے کہ دستوں نے تجلی کے فلاں معارضے کا کیا کیا اور فلاں دلیل کو کس انداز میں رد کیا۔ تاہم کے لئے کہ ان کی یہ کوشش بھی فی نفسہ ناکام ہی ہے ہم وقت آپ کا لیں گے۔

مولانا محفوظ الرحمن صاحب تجلی طلاق نمبر سے ہمارے سات اعتراضات جن کے ہر ایک کا نمبر اور جواب دیتے گئے ہیں۔ مگر انھوں نے ہمارے اعتراضات کی ترجمانی بیکرا مغزی اور سلیقے سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ ہم جب کسی کے اعتراض کا جواب دیتے ہیں تو اعتراض کو اس صحیح شکل میں معترض کی منشاء کے مطابق نقل کر دیتے اس کے بعد اس کا ناقدانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے دوست ہمارے اعتراض یا معارضے کو ٹھیک ٹھیک بیان کرتے وہ یہ نکتہ رحمت نہیں فرماتے کہ ہمارا کوئی اگر ہمارے عبارتوں سے لیا ہے یا ہمارے عبارت کا کوئی ٹکڑا نقل کیا ہے تو ساتھ ساتھ حوالہ بھی دیدیں کہ تجلی کے شمارے اور کس صفحے سے لیا ہے۔ کتاب کے دس صفحوں میں ہمارے بیانے سات اعتراضات کا جواب لکھا اور ہمارے عبارتیں نقل کیں۔ متعدد دفعات ہم ہمارے طرف منسوب فرما لیکن بھولے سے نقطہ ایک جگہ حوالہ ان کے قلم سے نکلا۔ اور وہ بھی ناقص صفحہ ۲۲ پر ہمارا ایک فقرہ نقل کر دے حوالہ دیتے ہیں "تجلی ص ۲۹" اگرچہ پیچھے انھوں نے لکھا ذکر نہیں کیا ہے کہ لکھتے وقت تجلی کا کونسا شمارہ ان کے پیش

ہے لہذا ماہرین کی تصریح کے بغیر ”تجلی“ لکھ دینا کافی نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب طلاق کی بحث میں شماروں میں پھیلی ہوئی ہے تو اور بھی ضروری تھا کہ ہمیں کی وضاحت کر دی جاتی۔ مگر ضرورت کا لحاظ کرنا تو درکنار دوسرے سے احساس ہی نہیں رکھتے کہ حوالے کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ بتائیے اس صورت میں ان لوگوں کو کس قدر شواہد کا سامنا کرنا پڑے گا جو یہ چاہیں کہ تقابلی مطالعہ کر کے موصوف کی صحیح نقل کا اطمینان کر سکیں۔ خود ہمیں یہ لرغ لگانا کہیں کہیں دشوار ہو رہا ہے کہ ہماری طرف مسوب کردہ فلاں مفہوم یا فلاں فقرہ تجلی میں کہاں ہے۔ مختصر موصوف کو اگر بحث و نظر کے حدود و قیود سے دلچسپی نہیں تھی تو آخر نہ لنگوٹ کس کر میڈن میں کو نہا ہی کس حکیم نے نسخے میں لکھ دیا تھا۔

اب مثلاً قرآن کی آیت الطلاق مَوْتَان کی بحث میں ہم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ تجلی طلاق نمبر میں بھی اور اس سے قبل والے شمارے (نقد و نظر نمبر) میں بھی۔ اس آیت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ”طلاق دو مرتبہ ہیں جن کے بعد رجوع کیا جاسکتا ہے۔“ گو یا مَوْتَان کا مطلب ہے اثنتان (دو) دوسرا یہ کہ ”طلاق دو مرتبہ ہیں۔“ اوسنے اہل علم دونوں ہی طرح ترجمہ کرتے آئے ہیں۔ مولانا محفوظ الرحمان نے پہلا اعتراض ”عنوان قائم کر کے اسی آیت سے متعلق ہم پر معارضہ فرمایا ہے۔ اس معارضے کی علمی اور منطقی قدر و قیمت اگر قارئین اچھی طرح سمجھ لیں تو انھیں ادباک ہو جائے گا کہ نہ صرف ثانی کس طرح کے لا حاصل اور غیر ذمہ دارانہ علم کلام کے ذریعہ بحث کو طول دیتا جا رہا ہے۔

امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ یکجائی تین طلاق دینا گناہ و بدعت نہیں ہے۔ احناف کا مسلک یہ ہے کہ اگرچہ تینوں یکجائی طلاقیں پڑھ کر جاتی ہیں لیکن دینے والا گناہگار ہوتا ہے۔ احناف نے اپنے مسلک کے حق میں جو بہت سے دلائل دیئے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ نے

الطلاق مَوْتَان فرمایا مَوْتَان کا مطلب ہے دو بار طلاق دینا۔ یعنی ایک ساتھ دو نہیں بلکہ الگ الگ ایک کے بعد ایک۔ اس طرح معلوم ہو گا کہ ایک ساتھ دو طلاق دینا ہدایت قرآنی کے خلاف ہے اور جو چیز ہدایت قرآنی کے خلاف ہو وہ گناہ نہ ہو گی تو اور کیا ہو گی۔ شوافع اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ مَوْتَان سے مراد دو مرتبہ نہیں ہے بلکہ اثنتان ہے یعنی دو طلاق۔ چاہے وہ ایک ساتھ ہوں یا الگ الگ۔ بعض مقالہ نگاروں نے یہ باور کرنا چاہا تھا کہ مَوْتَان کا واحد مطلب ہے دو مرتبہ طلاق نہ کہ دو طلاق۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ ایسا دعویٰ درست نہیں۔ خود قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں مَوْتَان اور مَوْتَات کا استعمال صرف تعداد کے لئے کیا گیا ہے یکے بعد دیگرے کے مفہوم میں نہیں کیا گیا اور عربی زبان کے استعمالات میں بھی یہ الفاظ بار بار محض تعداد کے لئے استعمال ہوتے آئے ہیں۔ لہذا احناف ہوں یا دیگر اہل علم کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ آیت کا ایک ہی مفہوم قطعی قرار دے کر دوسرے مفہوم کو باطل ٹھیرا دے۔

ہماری عبارتوں کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:-
”آپ کو یقیناً علم ہو گا کہ کہتے ہی بڑے بڑے علمائے سلف نے مَوْتَان کو یہاں اثنتان کے مرادف بھی کہا ہے یعنی طلاقیں دو ہیں جن کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔“ (تجلی نقد و نظر نمبر بابت ماحج واپر اہل علم کا جواب)
”بہت سے اہل علم کی اس رائے سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکے کہ اس رائے کی کوئی گنجائش آیت میں نہیں ہے۔“ (حوالہ مذکور کا ملخص)
”مَوْتَان یا مَوْتَات کا استعمال عربی میں ان دونوں ہی طرح ہوتا ہے۔ کبھی اس میں اختلاف اوقات ملحوظ ہوتا ہے اور کبھی بالکل ملحوظ نہیں ہوتا۔“ (رد)
”جب آیت کے لفظ مَوْتَان کے دو مفہوم ملی اعتبار سے ممکن ہیں تو کسی ایک مفہوم کی قطعیت اور نصیحت کا دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے اذا جباو

الاحوال بطل الاستدلال تو علم کلام کا بنیادی

ضابطہ ہے (حصہ ۲ کالم ۲)

کوئی بھی شخص ہماری ان صریح معروضات کی موجودگی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم آیت کے کسی ایک مفہوم کو قطعی طور پر صحیح اور دوسرے مفہوم کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہم تو ان حضرات سے کھلا اختلاف کر رہے ہیں جو ایک مفہوم طے کر کے دوسرے مفہوم کو خارج از بحث مانتے ہیں۔ لیکن محترم مولانا محفوظ الرحمن صاحب نے ان تصریحات کی موجودگی ہی میں ہم پر جو الزام عائد کیا ہے وہ یہ ہے کہ علمائے اخلاف تو اس آیت میں لفظ مترمان سے ”دوبار“ کا مفہوم لیتے آئے ہیں لیکن ۱۔

”اب مولانا عامر عثمانی صاحب اخلاف کی ان متفقہ

تصریحوں کے خلاف کھڑے ہوئے اور اصرار کر رہے

ہیں کہ ان بزرگوں نے جو کچھ غلط سمجھا۔ یہاں بھی

یہ یعنی مترمان، اثنین ہی کے معنی میں ہے۔ (ترک کتب ۱۹)

فرمایا جائے کہ کیا یہ الزام درست ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا موصوف نے نقد و نظر نمبر پڑھا ہو گا اس لئے مذکورہ اقتباسات ان کی نظر سے نہیں گذرے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ بے جان عذر ہے۔ تجلی طلاق نمبر تو بہر حال مولانا نے پڑھا ہی ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰ کالم ۱ میں ہم نے جناب میں پیرزادہ کی طرف رخ کر کے یہ فقرہ لکھا ہے

”پچھلے ماہ ہم واضح کر چکے کہ ہمارے دوست کی قرآن

میں وہ آیتیں بہت جلد مل گئیں جن میں لفظ مترتین

”دومرتبہ“ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے مگر وہ آیات

بالکل نہیں ملیں جن میں دومرتبہ کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔“

یہ فقرہ پڑھ لینے کے بعد مولانا کو لازماً پچھلے ماہ کا تجلی دیکھ لینا تھا جو نقد و نظر نمبر تھا۔ اگر وہ کہیں کہ یہ شمارہ مجھے میسر نہیں تھا تو ہم عرض کریں گے کہ پھر آپ کو لفظ مترتین کے تعلق سے گفتگو کرنی ہی نہیں چاہیے تھی معقولیت تقاضا کرتی ہے کہ کسی پر کسی مسئلے میں اعتراض کرنا ہو تو اس شخص کی وہ تحریر ضرور

دیکھ لی جائے جن میں اس نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا۔ یہ تحریر جتنا نہ ہو تو اعتراض کو پھر پر اٹھا رکھا جائے۔ مگر نقد و نظر نمبر بھی تلاش نہ کر سکے اور الزام بھی عائد فرمادیا۔ لطف یہ ہے کہ ابھی جو فقرہ ہم نے طلاق نمبر ۱ میں لکھا اس سے بھی ہر شخص یہ نتیجہ بہر حال اخذ کر سکتا۔ ہم آیت کے لفظ مترمان کا کوئی واحد مفہوم طے نہ کر سکتے بلکہ دونوں ہی مفہوموں کی گنجائش مانتے ہیں۔ علاوہ طلاق نمبر کے صفحہ ۲ پر ہم نے کچھ دلائل پیش کر کے کیا تھا۔

”کیا ایس بات کا ثبوت نہیں کہ لفظ مترتین کو

اثنین کے مفہوم میں بولنا اہل زبان کے یہاں

جانی پہچانی بات تھی۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ

جب مترتین کہا جائے تو اس سے لازماً مراد یہ

ہو کہ دو واقعے الگ الگ مجلسوں میں پیش آئے۔“

یہ عبارت بھی بکا ریکار کر کہہ رہی ہے کہ ہم زیر بحث تشریحات کی کسی ایک مطلب کو لازماً غلط اور دوسرے کو لازماً صحیح قرار دینے والوں میں نہیں بلکہ اس پر اصرار کرنے والوں میں ہیں کہ دونوں ہی مفہوموں کی گنجائش ایک ہی مفہوم کو قطعی قرار نہیں دینا چاہیے۔

ان تصریحات کے باوجود مولانا نے محترم کا یہ الزام عائد کرنا کہ عامر عثمانی نے ایک ہی مفہوم کو دوبارہ مفہوم مان کر دوسرا مفہوم لینے والوں کو غلط فہمی کا تدارک دے دیا آخر دیانت، سخن نبوی اور عدل کی کوئی ہے۔

مزید عنایت یہ فرمائی گئی کہ جو حرم ہم نے نہیں اسے مسلم قرار دے کر اس کی وجہ بھی مولانا نے لینے کو بتادی۔ یہ کہ چوٹی کے علمائے اخلاف آیت کا جو لے رہے تھے وہ چونکہ فسرین مخالف کے حق میں جا رہے اس لئے عامر عثمانی نے اسے غلط قرار دیا اور دوسرے مفہوم پڑھ لکھا۔

تھا لیکن مولانا نے موصوف نے باریکی اور دقیقہ نظر کو
بالائے طاق رکھ کر ہماری تردید شروع فرمادی۔ وہ فرماتے
ہیں :-

”اگر یہی بات صحیح ہے تو آخر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ
ایک طلاق پھر کی حالت میں دینا طریقہ سنت
اور امر محمود ہے اور اگر تین طلاق بیک کلمہ یا
ایک ہی طلاق بحالت حیض دی جائے تو مصیبت ہے
اور گناہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب طلاق میں تعدد
عمل مقصود نہیں تو سنت اور بعثت کا کیا سوال؟“

یہ معارضہ طر اسطی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اللہ کو زن و
شوہر کے درمیان بقائے تعلق مطلوب ہے، نہ کہ انقطاع تعلق
مجبوری کی حالت میں طلاق دینا جائز تو کہہ دیا گیا لیکن
خوشگوار نہیں مانا گیا۔ اللہ کو جو کچھ مطلوب و مقصود ہے
اسے اس نے فرض یا واجب قرار دیا ہے۔ نماز روزہ حج
تہ بانی زکوٰۃ صلہ رحمی عدل شرافت طہارت یہ ساری
چیزیں اللہ کو مطلوب ہیں لہذا انھیں صرف ”جائز“ کے
درجے میں نہیں رکھا گیا بلکہ لازم کیا گیا۔ کسی فعل کو جو از تک
محمد و در کھنا معنی ہی یہ رکھتا ہے کہ اللہ آپ سے اس کا مطالبہ
نہیں کرتا۔ اسے مقصود قرار نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے یہ
بات بالکل صاف ہے کہ طلاق ان امور میں نہیں جنھیں اللہ
کا مقصود و مطلوب قرار دیا جاسکے۔ اب رہا یہ کہ طلاق کے
کسی طریقے کو موجب گناہ اور کسی کو خالی اور گناہ کیوں قرار
دیا گیا تو اس کا بھی جواب صاف ہے کہ اللہ آپ کا خیر خواہ
ہے اور آپ کی بیویوں کا بھی۔ وہ چاہتا ہے کہ جب بھلے
تعلق کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور آپ طلاق دینے پر
آمادہ ہو ہی جائیں تو اس کا ایسا طریق اختیار کریں جو
آپ کے اور زوجہ کے حق میں مفید ہو سکتا ہو جس پر چھٹنا
نہ پڑے۔ اس کا یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ طلاق میں تعدد
عمل مقصود ہے؟

اسی پہلے اعتراض کے ذیل میں مولانا نے اور بھی

مولانا اگر حنفی اور فاضل دیوبند نہ ہوتے تو ہمیں ان
اس اثر و ثناء پر تعجب نہ ہوتا لیکن ان میں چونکہ دونوں
ادھاف جمع ہیں اس لئے تعجب ہو کہ یہ وہ کیا کہہ
ہے ہیں۔ چوٹی کے علمائے احناف نے جہاں آیت کے
فاظ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مترتبان کا مطلب
دو مرتبہ ہے وہیں انھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس
مطلب کی رو سے آٹھویں دو باتیں طلاقیں دینا گناہ تو بڑا بڑا
نہ ہوتا ہے مگر یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ طلاقیں
فع ہی نہ ہوں۔ جب یہ مصاحت کر دی گئی تو علمائے
اف کا استدلال ان لوگوں کے حق میں کیسے چلا گیا جو یہ
نے رکھتے ہیں کہ طلاقیں پڑتی ہی نہیں۔ حنفی ہونے کی
بیت سے مولانا کو اپنے چوٹی کے علماء سلف سے اتنا
لانا تو نہ ہونا چاہیے کہ ان بزرگوں کا توازن ذہنی ہی
متبہ ہو جائے۔ مولانا کا مطلب تو یہ ہوا کہ علماء احناف
ن کی جانی طلاقوں کے واقع ہو جانے کی رائے رکھتے
ہے بھی آیت کا ایک ایسا مفہوم لے رہے جو ان کی اس
نے کے خلاف ہے اور انھیں شعور نہیں کہ اس تضاد
احساس کر سکیں۔ اگر واقعی چوٹی کے علماء احناف کے حال
ما ہے تو کوئی جواز نہیں کہ مولانا موصوف خواہ مخولہ اپنے
حقیقت کا اتہام لے جائیں۔ انھیں کسی ایسے مکتب
ر سے وابستہ ہونا چاہیے جس کے بارے میں انھیں یقین
نہ فہم و دراست کا زیادہ بہتر سرمایہ اس کے یہاں
جو ہے۔

منطق کے سلسلہ میں بھی ہیں مولانا موصوف سے
ہی کا تحفہ ملا۔ ہم نے طلاق نمبر میں امام ابن تیمیہ کے
منطقی استدلال پر مفصل محاکمہ کیا تھا جو ص ۷۵ سے
۷۶ تک پھیل ہوا ہے۔ اس میں ہم نے ایک بات یہ
نہ کی تھی کہ طلاق میں تعدد عمل مقصود نہیں۔ اس کے
نہ ہم نے دلائل و نظائر پیش کئے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک
ریک منطقی بحث تھی اس پر باریکی ہی سے غور ہونا چاہیے

ہفت سوزہ عزائم دکنوت کا خاص نمبر

جدوجہد آزادی کی تاریخ - نتائج کیا نکلتے - ہم کہاں پہنچے - ان تمام امد پر نہایت وقوع و دلچسپ اور مبصرانہ مضامین - نظم و نثر دونوں معیاری اور دل کش - یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ کی چیز ہے - قیمت - پانچ روپے ۲۵ پیسے - پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب تہجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں - یہ دراصل محمد بن عبدالوہاب کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے - اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبدالوہاب کس قدر سنت کے شہداء کی بدعت کے دشمن اور دین و ملت کے خیر خواہ تھے انگریزوں نے انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس بدنامی میں چار چاند لگائے - اس کتاب کے مصنف "قطر" کے حکمہ شریعت کا منشی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمن الاعظمی نے کیا ہے - ترجمہ کے علاوہ فاضل ترجمہ نے قیمتی نوٹ بھی خواہی پر بڑھائے ہیں -

قیمت - ساڑھے چار روپے -
جلال مصطفیٰ در قریشی کی نقوش کا دلی کش مجموعہ قیمت - ایک روپیہ

دین و شریعت اردو ایڈیشن - قیمت مجلد ۲۵ روپے
انگریزی ایڈیشن - ۱۵ روپے

بہت سے سطریں لکھی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آیت الطلاق مرتان کی موجودگی میں کھٹی دو طلاقیں نہیں پڑنی چاہئیں اس پر ہم بس اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ چاہے لاکھ بار اس طرز فکر کی گردان کرتے چلے جائیں مگر چاروں اور تو یہی کہتے اور سمجھتے آئے ہیں کہ اس آیت سے طلاقیں کے وقوع کا انکار نہیں ہوتا - اگر وہ غلطی پر تھے تو ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں کہ ہم سے بھی یہی غلطی صادر ہو رہی ہے آپ کو مبارک ہو کہ قرآن بھی اور تفقہ میں آپ چاروں نمہ سے بھی بڑھ گئے - اہل حدیث اس طرح کے پندار میں مبتلا ہوں تو حیرتناک نہیں لیکن تقلید کا قلاوہ گردن میں ڈالنے والا ایک فاضل دارالعلوم بھی پندار خود بینی کے اس اونچے اہرام پر چڑھ جانے کو اسے تیر خیز ہی کہیں گے -
موجہ حیرت ہوں کہ دنیا کیلئے کیا ہو جائیگی (جاری)

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے - اس کتاب میں مولانا اشرف علی نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں - بڑے کام کا سالہ ہے - قیمت صرف ۶۰ پیسے -

معجزہ کیا ہے؟ مولانا محمد طیب صاحب قسطنطنیہ دارالعلوم دیوبند کی ایک فکر انگیز تصنیف - معجزے کے تمام پہلوؤں پر علم و تفقہ کی روشنی میں گفتگو - قیمت مجلد - ڈھائی روپے -

شہدائے بدر شہدائے بدر کوائف - ایک روپیہ -

فرق اسماء الرجال انہ - مولانا تقی الدین مظاہری علم الحدیث کا مد ار راویوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فن اسماء الرجال پرنصر ہے - لہذا حدیث رسول سے دلچسپی رکھنے والے تمام ہی مسلمانوں کے لئے یہ کتاب نیا دی فائدہ کی حامل ہے - قیمت - ایک روپیہ ۵۰ پیسے -

مکتبہ دیوبند - دیوبند (پنجاب)

جماعت اسلامی ہند کا پانچواں اعلیٰ ہندو اجتماع

سے بے پردہ پودے کی جڑوں میں اپنی رگوں کا لہجہ بول رہا تھا۔ اور پھر پوڑھے آسمان نے دیکھا کہ پودے نے اپنی جڑیں زمین میں پیوست کر دی ہیں، کوئلیں بھونکنے لگی ہیں، بھری گہری ہوئی جا رہی ہے۔

رفتہ رفتہ یہ پودا چھوٹا سا درخت بنا، تنے سے شاخیں بھوٹیں، شاخوں نے پتوں کو جنم دیا اور اسی چھوٹے سے درخت کو سنہ میں ہم نے دہلی کے رام لالا گراؤنڈ میں دیکھا تھا۔ آج یہ درخت قد اور ہر جگہ ہے۔ دور تک سایہ ڈالتا ہوا۔ آندھیاں یا دوس ہو چکی ہیں کہ اب شاید یہ تر اکھڑ سکے۔ کہ الیس اور ہمیشہ تھک گئے ہیں کہ وہ زمین میں جتنے جتنے گہرے اترے جڑیں اس سے بھی گہری جا پہنچیں۔

اب آیت قرآنی کا حسین ترین مفہوم بھی دیکھئے۔

”یا کیزہ اور سقری بات ایک ایسے پاکیزہ اور ستھرے درخت کی مانند ہے جس کی جڑ بہت مضبوط ہو اور شاخیں زمین کی کثافت سے دور فہائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہوں

ہمیں ۱۹۶۶ء میں بھی جماعت اسلامی کے آل انڈیا جماعہ منعقدہ دہلی میں شرکت کی سعادت نصیب دی گئی مگر کہاں وہ اجتماع اور کہاں نومبر ۱۹۶۶ء میں منعقد ہونے والا حال یہ اجتماع۔ ایسا ہی سمجھ لیجئے جیسے ۱۱ سال کا ایک دبلا پتلا بچہ پچھارہ سال کا ایک ہفت مندر جوان بن جائے۔ خشیدہ قامت، وجہ یہ برکت مند رو۔ زیادہ صبر اور نفیس مثال قرآن میں ملتی ہے

لَبَنَةً طَيِّبَةً كُنْجَرَةً طَيِّبَةً أَصْلُهَا ثَابِتٌ
فَرُوعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْمِتُنِي أُكَلِّمُهَا كَلِمَاتٍ
إِذْ بَرَكْنَا

خوشایام! ایک ننھا سا نرم و نازک پودا بڑے یاسا زنگار اور یاس کن موسم میں اللہ کے ایک نازوں سے لگا ہوا تھا۔ زمین سنگلاخ، باد صحر طوفان ٹھانی ہوئی۔ مگر اس دیوانے کا جنون اسے اپنے دل بھر گون دیتا رہا۔ دیتا رہا۔ بجلیاں کوند رہی تھیں۔ ریت میں رہی تھی۔ تماشا شافی نہیں لگا رہے تھے مگر دیوانہ ہر شے

یہ دہشت اپنے پروردگار حقیقی کے فضل و کرم سے
ہمیشہ ہر وقت اپنے خیرات و فوائد سے
دنیا کو نوازنے پر آمادہ ہے۔

قریب ہے جماعت اسلامی۔ اندازے بھی قرآن ہی کے
عجیب و غریب کلام سے بزم خیال کو تھوڑا سا نور دیکھئے۔
يُثَبِّتُ اللَّهُ اَنَّكَ يَنْ اَمْنًا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ
فِي الْحَيٰوةِ وَالنَّبَاِ اِنَّيْ الْاٰخِرَةَ دَبُّضِلُّوْا لِلّٰهِ
اَنْفُسًا مَّيْنًا۔

اللہ تعالیٰ ایک ثابت و محکم قول کی بنیاد پر اہل
ایمان کو دنیا اور آخرت دونوں میں ثبات و استقلال
عطا فرماتا ہے اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔

شاید یہ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں کچھ تفسیر بھی اسی
دوبانے کی زبان سے سن لیں جس نے پودا لگایا تھا۔

یعنی دنیا میں ان کو اس کلمہ کی وجہ سے ایک
پائیدار نقطہ نظر، ایک مستحکم نظام فکر اور
ایک جامع نظر یہ حیات ملتا ہے جو ہر حقارے
کو حل کرنے اور ہر غمھی کو سلجھانے کے لئے
شاہ کلید کا حکم رکھتا ہے۔ سیرت کی مضبوطی
اور اخلاق کی استواری نصیب ہوتی ہے جسے
زمانے کی گردشیں متزلزل نہیں کر سکتیں۔
زندگی کے ایسے ٹھوس اصول ملتے ہیں جو ایک
طرف ان کے قلب کو سکون اور دماغ کو
اطمینان بخشتے ہیں اور دوسری طرف انھیں
سعی و عمل کی راہوں میں بھٹکنے، ٹھوکر کھانے
اور تلمیذ کا تشکار ہونے سے بچاتے ہیں۔

(تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۲۸۶ سورہ ابراہیم)
کیا ہے یہ ترانہ جو ہر آن ایسا ہی تروتازہ نظر آتا
ہے جیسے اگلی اترا ہو۔

عجیب یہ نہیں کہ مسلسل تین روز تک جماعت اسلامی کا
اقتدار نہایت شان و شوکت، وقار و شکوہ اور حسن و جمال
کے ساتھ چلتا رہا۔ عجیب یہ ہے کہ خود غرضی، مفاد پرستی

تن آسانی اور حقوق طلبی سے بالالب دنیا میں ایک گروہ
یہ ہوا لگتا جیسا میدان حیات میں اترتا ہے کہ اے لوگو!
ہمارے دامن میں بروردگار کے بخشے ہوئے کچھ ہم سیکر
موتی ہیں انھیں آگے بڑھ کر لے لو۔ ہمارے پاس ایک تھوڑا
کیمیا ہے جسے استعمال کر کے تم ہر طرح کی کامرانیوں سے
دوچار ہو سکتے ہو۔ ہم تم سے نعمت نہیں مانگتے۔ صاب
رنگلے کی مزدوری بھی نہیں مانگتے، خراج تحسین اور بجاہد
اقتدار بھی نہیں مانگتے، اپنی امارت و سیادت کے کبھی ظالم
نہیں ہیں، تم ٹھوڑے برسوار ہو تو ہم تمہاری نگام بیکر و جلیس
تم اختیار و اقتدار کی سنہرے بڑھکراں کو اس نسخہ کیمیا کو عام کر دو
ہم تمہاری راہ میں آنکھیں سمجھائیں گے۔ تمہاری چوکی لاری
اور چہر اس گیری کریں گے۔

جی ہاں یہی جو جماعت اسلامی کی حقیقت اور تحریک
اقامت دین کا واحد مفہوم۔ دیگر وہ جس نے وطن کے ارسلت
بہن تین دن تک ایک بے مثال اجتماعیت اور ایک تابل
رنگ نظم و ضبط کا تاریخی مظاہرہ کیا اس لئے کہ انہیں آیا
ہے کہ اپنی قوت کی نمائش کر کے کمرہ سی والوں کی کرسیاں
چھیننے، حزب مخالف بن کر حزب اقتدار کی عینیں حرام کرے
اور عوام کو کسی انداز سے بہرے انقلاب کی طرف ہٹکائے جا
وہ اس لئے آگے آیا ہے کہ گردن اکڑا کر لاف و گزاف کرے
الان تمام کا لغو ہو لگائے اور حقوق و حقوق کی پیچ و پکڑ سے
آسمان سر پر اٹھائے یہ تو ان لوگوں کا کردہ ہے جو ظلم و ظلمانیان
کے گھناؤپ اندھیروں میں اپنے اپوں سے جرماع جملانے
نکلے ہیں۔ جو اپنے ہم وطنوں کو یہ آگاہی دینے لگے ہیں
کہ جس راہ پر تم نہ اٹھائے چلے جا رہے ہو وہ دفعتاً ایک
بولٹاک الاؤ میں تمہیں جھونک دے گی۔ تم ہٹائے سمجھائی
ہو کیونکہ ہم سب کے ماں باپ ایک ہی ہیں۔ تمہارے لئے
ہمارے سینوں میں محبت ہے۔ پیار ہے۔ تمہیں ہم مددگار
یا سوں میں ہنسا کھینتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

اجتماع میں بڑھنا جانے والا ہر مقالہ اور کجاخواری

پچاس ہزار سے بھی زیادہ کا مجمع ٹھوس اور تیز نفوذ پر
کو اس تو جہ و صبر و سکون اور انہماک کے ساتھ سنتا
چلا جائے اسے لوادرات ہی میں سے سمجھئے۔ خدا کا خاص
فضل ہم اسے بھی سمجھتے ہیں کہ تمام اوقات میں نہ کوئی بھلی
وغادی نہ لاؤد اسپیکر دس نے غمرہ دکھایا۔ ظاہراً
خراج تحفین ٹھیکیداروں اور جماعت اسلامی کے کارپردازوں
کو بھی حشر دور جانے کا غمخوار کا فضل اہل کار فرما ہے
خدا انہیں چاہتا تو بڑی بڑی پیرکارشیں بھی لے دے
جاماڑ حشر سے زیادہ کچھ نہیں رہتیں۔
انگریزی اخباروں — حتیٰ کہ ریڈیو نے بھی ایکی
کسی نہ کسی حد تک حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا —
بقول جگر :-

شرائے لجا گئے دامن بچا گئے
اے عشق مر جا دہ یہاں تک تو آگئے

حکومت کی روش پہلے جو کچھ بھی رہی ہو اب شاید
اس کے حلقے میں بھی کچھ لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ جو سے
دیکھو تو یہ سودا کی آخر چاہتے کیا ہیں۔ ان کا نشانہ کیا ہے
یہ کیا سمجھتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس اجتماع کا سب سے بڑا فائدہ
یہ ہوا کہ خود ہمیں بھی اپنے طول و عرض کا کچھ اندازہ دے
ہو گیا اور دوسروں کو بھی پتا چل گیا کہ ایک چیز بہر حال
موجود ہے جسے ہم پسند کریں یا نہ کریں غلطی تو ابھی اسکے
وجود کو تو ماننا ہی ہو گا۔

جمعیت علمائے ہند کی روش بقول بعض دھڑپ
رہی مگر بقول ہمارے وہ قابل رحم بولین میں آئی ہے
یہ اجمال وہ ہے جس کی تفصیل نہ ہی کی جائے تو اچھا ہے
لڑنے جھگڑنے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ کینہ اور حسد
ہمارا شیوہ نہیں، جمعیت والے بھی ہمارے دشمن بھائی ہیں
وہ اب بھی حق نیک کا ادراک کر کے بھٹکتے ہیں جیسی
روش اختیار کر لیں تو پھیل چکیں سب لفظ۔ گویا ان کی

برقرری پر نگاہ غور دیکھ جائیے۔ آپ کہیں نہیں پائیں گے
کہ جماعت اسلامی برادران وطن سے کچھ بانگ رہی ہو۔
حالانکہ قانون عدل کی رو سے جائز حقوق کی مانگ بھی
کوئی بری بات نہیں مگر جس وقت پوری دنیا کو یہ بتانا مقصود
ہو کہ مسلمان کسے سمجھتے ہیں اس وقت جماعت اسلامی
کا فرض وہی تھا جو اس نے غلوں اور سلیقہ سے ادا کیا
اس نے دنیا کو یہ بنیادی بات بتائی کہ امرت مسلمہ دنیاوی
جاہ و اقتدار کی بندر بانٹ کے لئے بریا نہیں ہوتی —
دنیاوی تعیبات اور مناصب اس کا نشانہ نہیں ہیں وہ
تو ایک خایہ پرست امت ہے جو بن بگائے خدا کو دین خایہ اندیشی
کی روشنی سے بہرہ ور کرنا چاہتی ہے جس کا فرض منصبی
ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جو مخلوق خدا
کی خیر خواہی میں جان و مال کی بازی لگا دینے میں بھی مصالحت
نہیں سمجھتی۔

ہمیں یقین ہے خود دار اکین جماعت کو بھی اس اجتماع
کی اس قدر شاندار کامیابی کا تصور پہلے سے نہیں ہو گا۔ اس کا
معمولی سا مزین ہی سمجھ لیجئے کہ جہانوں کے لئے زیادہ سے
زیادہ اندازہ کہہ سکتے طعانی پاس اس نے چھپو لے تھے
وہ پہلے ہی دن کم پڑ گئے اور اس بنا پر نظم میں تھوڑا سا خلل
بھی آیا۔ خدا کی چشم کریم متوجہ تھی۔ غالباً اٹھارہ ملکوں
کی نمائندگی کرنے والے تقریباً ۳۵ جہان اس طرح
کھینچے جلے تے جیسے اسی دن کے وہ عرصہ سے منتظر رہے
ہوں۔ شمس عجیب ہے نظریاتی ہم آہنگی۔ فقیر و ک غریب
غالب برابرتی چلتا رہے ہیں۔ اندازہ یہ بھی ہو کر بہ گنے
والے محض سیاح نہیں تھے، دیدہ و دار صاحب بصیرت
بھی تھے۔ ان کی تہذیبیں بڑی متوازن اندیشی ملی
رہیں۔ جذباتی خروش کے بجائے انھوں نے تدبیر اور
بالغ نظری کا ثبوت دیا۔

ہم تفصیلی نظر نگاری کیا کریں سخن دراز ہو جائیگا

دور رکھنے کی سعی، خدا کی بارگاہ میں پہلے سے زیادہ الحاج وزاری اور اپنے نصب العین کی نزاکتوں اور لطافتوں پر کڑی نظریہ مسلماً زبانش کے پہلو میں۔ لکھنے والا کسی بھی درجے میں اس لائق نہیں کہ اپنے سے کہیں بہتر و متوں کو نصیحت کر سکے۔ لیکن ہر نصیحت کا مخاطب وہ خود ہی پہلے ہے دیکھ رہا ہیں۔ اے اللہ! تو اپنے کمزور بندوں کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھنا اور شرک پیدا نہ کرنے سے انھیں بچانا۔ تیری ہی نصرت سب کچھ ہے۔ تو ہی سب سے بڑھ کر رحیم و کریم ہے اور تمام تعریفوں کا واحد مستحق۔ تعالیٰ اللہ الملک القدوس، تعز من تشاء وتزول من تشاء مبدئ الخیر انک علی کل شیء قدیر۔

جوارش جالینوس خاص

جوارش جالینوس طب پڑھائی کا وہ نادر دنیائے تحفہ ہے جس پر ہر سچا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے، مگر غیر ذمہ دار عطاروں نے اس بے نظیر مرکب کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے اور پورے اجزاء استعمال نہ کر کے خواص کو بدل کر ایک معمولی مرکب بنا دیا ہے۔ ہم نے جوارش جالینوس کو پوری اجزاء اور تکنیکی باریکیوں اور نزاکتوں کے ساتھ تیار کیا ہے جو اصطلاح معرہ اور تقویت معدہ کے علاوہ اعضاء و اعضاء کیلئے بے نظیر مرکب ہے۔ اس کا استعمال قبل از وقت بالوں کو سفید ہونے سے روکتا ہے۔ جسم کو قوت و حرارت اور توانائی بخشتا ہے۔ یہ جوارش قند دالوں اور قند کے لئے یقین و اعتماد کے ساتھ لاجواب پیش کش ہے۔ قیمت ۳ روپے ۱۲ آنے مع محصول ڈاک - ۵ روپے کم روانہ نہیں کیا جائے گی۔

حکیم شاہد حسین دین پوری

انھیں مبارک۔ پارلیمنٹ کی جتنی کرسیاں وہ لے سکیں گے۔ جماعت اسلامی بھی ان سے حصہ نہیں مانگے گی نہ طعن کرے گی۔ مگر قرآن و سنت کی کھلی کھلی نفی کرنے جو دس داریاں امت مسلمہ پر ڈالی ہیں ان کی پابجائی میں جماعت اسلامی اور جمعیۃ علماء دین بدوش کام کریں تو آخر کون اس میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ دنیا کے مفادات اتنے گراں گاہیہ تو نہیں کہ آدمی بہشت کی نعمتوں سے بالکل ہی منہ پھیر لے کیا اب جمعیۃ علماء دین کو بہشت پر یقین نہیں رہا ہے؟

بڑا سخت دور تھا جب جماعت اسلامی کے ارگرد قہر و دہشت کی دیو یاں ننگا تاج تاج رہی تھیں اور در زنداں کھلا ہوا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ سخت دور وہ ہو سکتا ہے جب دنیا اپنی نعمتوں کے خوان سجا کر جماعت اسلامی کو دعوت کام دہن سے فوانے لگے اور دیوانوں کے پچھے لباس خلعت فاخرہ میں تبدیل ہو جائیں۔

تو بیش نعمت سے غافل ہونا یقیناً جرم ہے۔ بے شک اللہ نے ہمیں۔ یعنی ہم سب مسلمانوں کو ایک اچھا دن دکھایا ہے۔ صحافت کی زبان میں اسے عظیم کامیابی بھی کہا جاسکتا ہے۔ شک نہ ہر بار شکمہ لیکن یہیں سے جماعت اسلامی کے لئے ایک نئی آزمائش کا بھی آغاز ہو گیا۔ خاست مومنانہ کی آزمائش!

طاقت درجہ بدرجہ ہٹ کر رہی ہے اور وفاداری بھی۔ بارود کا ایک ڈھیر اپنے ہی گھر کی چھت بھی اڑا سکتا ہے اور راہ منزل کے پہاڑ بھی کاٹ سکتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اجتماعیت کے نازہ کامیاب منہا ہرے نے جماعت اسلامی کی طرف ایک معنوی طاقت کو مرکوز کیا ہے۔ مگر اس طاقت کی غور و برداشت، اضافے کی فکر صحیح استعمال کے ذریعہ اس کی افادیت کے عوام و خواص کے دلوں میں اتارنا، عجب اور پیرامیں مبتلا نہ ہونا پہلے سے بڑھ کر اپنا احتساب، خود اعتمادی کو سخت کے دہرے

روح انتخاب

کم بہت ہوتی ہے۔

اسلامی نظام اپنی فطرت و مزاج کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اگر اُسے پورے طور پر نافذ کر دیا جائے تو جس معاشرے میں اُسے نافذ کیا جائے گا اس کی قومی دولت میں اضافہ ہو گا اور اس میں گریے کا راز دار اور فتنہ ساز کی تعداد کم ہو جائے قومی دولت میں اضافہ ہو اور اس کے مالدار لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرنے میں صحیح راہ اختیار کریں تو اس میں معاشی مسائل آسانی سے حل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ مسائل بھی پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوں تو ایسی صورت اختیار نہیں کرتے کہ معاشرے کے لئے ایک مستقل خطرہ بن جائیں۔ جیسا کہ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہو رہا ہے وہاں بہت سے انقلابات آتے ہیں اور حق و ناحق تباہی و بربادی کا باعث ہوتے ہیں پھر سرمایہ داری اور جاگیر داری کے ظالمانہ نظام کی کوکھ سے ایسے نظام جنم لیتے ہیں جو ان نظاموں سے زیادہ ظالمانہ اور باعث فتنہ و فساد ہوتے ہیں۔ یہ ہیں نقاب پوش اور بے نقاب کمیونزم یا اشتیائیت کے نظام جو پرانے افلاس کا علاج نئے افلاس سے کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو تبدیلی لاتے ہیں یہ ہے کہ وہ فقر و غربت کو ساری قوم پر یکساں طور پر بکھوٹ دیتے ہیں۔ سوائے سر چھوٹے سے گروہ کے جو بہتیت حاکم کے ارکان فکرا جھوٹے (EXPERTS) اور ملک میں رائج نظام کے شہت پناہ ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے۔

اسلام افلاس کا تعاقب مختلف قوانین و احکام

اسلامی نظام زندگی میں لوگوں کے باہمی معاملات میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا فرض ہے۔ اسلام نے مالک اور ملازم، آجر اور اجیر، خریدار اور فروخت کنندہ اور مال پیدا کرنے والے (PRODUCER) اور صارف (CONSUMER) کے باہمی تعلقات کو نظم و ضبط کا پابند رکھنے کے لئے نہایت دور رس اور منصفانہ قواعد و ضوابط وضع کئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر حق دار اپنا حق لیتا ہے اور کوئی فرد یا گروہ کسی دوسرے فرد یا گروہ کے حقوق یا مال کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

نظام اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ قومی دولت کو بڑھانے اور اُسے غیر نفع بخش مصارف میں ضائع ہونے سے بچانے کو فرض قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام قوم کی قوتوں اور دولت اور افراد قوم کی خوشنویں کو شہر آب و سستی، بہر و لعب، رنگ و رکش اور دیگر ظاہری اور باطنی خواہش میں ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ جو قومی قوتیں اور دولت ان ضغول اور باعث فتنہ و فساد کاموں میں ضائع ہونے سے بچا کر انکار خر قومی پیداوار میں اضافہ کرنے کی طرف موڑ دیتا ہے۔

وہ قوم جو اپنے دن کا آغاز اس طرح کرتی ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر وضو کر کے نماز ادا کرتی ہے اور وہ خوش مزاج اور چاق و چوبند ہوتی ہے۔ لامحالہ اس کی قومی پیداوار اس قوم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی جو اپنی نصف شب یا اس کا بیشتر حصہ فتن و مجرور شہوت پرستی اور لہو و لعب میں گزار کر جب صبح بادل ناخو استہ نیند سے بیدار ہوتی ہے اور اپنے کاموں پر جاتی ہے تو وہ بد مزاج کسل مند اور

الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ - (النور ۶)
 ”کیا برا براہیں جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے۔“ یَرْفَعُ اللَّهُ
 الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُدْثِرُوا عَنْكُمْ ذَرْبًا
 (المجادلہ ۱۱) ”اللہ تعالیٰ تم میں سے اہل ایمان اور اہل علم کے
 درجات بلند کر دے گا۔“ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ
 وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمَسِيحُ
 ”انہما اور دیکھنے والا براہر نہیں اور جو لوگ ایمان لائے
 اور انھوں نے نیک عمل کئے وہ اور بدکار براہر نہیں“

مسجد سے منجائے تک

ملا ابن العرب مکی عرصہ دراز سے لکھتا چلا آ رہا ہے
 پہلے اس نے کیا لکھا تھا اس کا ریکارڈ تجلی کے نائل میں محفوظ
 لیکن یہ نائل ہر شخص کو کہاں میرا دار سے اس کے پچھلے فلم پار
 کے کچھ منتخبات کتابی شکل میں منتقل کر دیتے ہیں۔ آپ چاہیں
 تو مکتبہ تجلی سے انھیں منگا سکتے ہیں۔

حصہ اول

حصہ دوم

آپ دیکھیں گے کہ ملا کے فلم کا بائکین اور رعنائی اس کے
 ہر فلم پارے میں آج کی طرح پہلے بھی جلوہ دار رہی ہے۔ دکش
 دلچپ اور افادیت سے لبرنہ۔

مکتبہ تجلی - دیوبند - (دو۔ پی)

کے ذریعے کرنا ہے اور غریب کو مالدار بنانے کے لئے مختلف
 وسائل بروئے کار لاتا ہے اگر اسلامی حکومت میں کچھ فقراء
 غریبہ جائیں تو وہ بھی صورت میں ایک طبقہ نہیں ہوسرار
 دے دیتے جلتے جسے طبقہ فقراء کہتے ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی
 شرط یہ ہے کہ وہ قانون اور روایات کی مدد سے سلسلہ نسل
 چلتی رہتی ہے مگر اسلام کے قوانین اور مختلف زمانوں میں
 اس کے سامنے والوں کی قائم کردہ روایات معاشرے کے
 کسی خاص گروہ پر فقر و غربت کو اس طرح ٹھونس نہیں
 دیتیں کہ بیٹے اور پوتے اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں انہیں
 اسلامی سوسائٹی میں فقر و غربت کوئی رائی اور مستقل چیز
 نہیں بلکہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک فرد سے
 دوسرے فرد کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ختم ظاہر میں سے
 اوجھل ہو جاتی ہے اور بالآخر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ فقراء
 بھی تو آخر اندر آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو افراد آج فقیر
 ہوں کل غنی بن جائیں کیونکہ اسلامی معاشرے میں مصفاۃ
 موائع اور جائز چیزوں کے حصول کی تمنا کے دروازے
 سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کو نوا فضل اعفیہم
 اللہ من فضله (سورۃ النور) ”اگر وہ فقیر ہیں تو اللہ
 تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے امیر کر دے گا۔“ اور سُبْحٰلِ
 اللہ بعد منسی لیس (الطلاق) ”اللہ تعالیٰ غنقریب
 بد حالی کے بعد خوشحالی کر دے گا۔“

اسلامی سوسائٹی میں افلاس کے سبب مفلس کی عزت
 احترام میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور نہ اس کے حقوق با مال
 کے جلتے ہیں کیونکہ اسلام نے اپنے افراد معاشرہ کو تعلیم
 ہی سے جن میں خود فقراء بھی ہیں کہ معاشرے میں عزت و
 احترام کا معیار دولت و ثروت اور دیگر منقولہ و غیر منقولہ
 ہائے دایسم و زہ نہیں بلکہ علم و ایمان تقویٰ اور اعمال
 صالح ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقٰكُمْ - (الاحزاب ۴۹)
 ” بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ
 ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي

سید رفیع الدین احمد قادری

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ

تو مفسر ہے کلام اللہ کی آیات کا
تیرا مسلک اتباع سنت خیر المبین
حامی دین مبین و ہادی شیعہ متین
واقف امرار دین احمد مختار ہے
تو سپر ہے حملہ باطل کی قوت کے لئے
لرزہ بر اندام ہیں انکار باطل مرجا
اس زمانے میں خدا کے دین کی حجت ہے تو
تو نے سوتوں کو جگایا حق کی خدمت کیلئے
تیرے اخلاص عمل کی ہر طرف اک دھوم ہے
ایثار حق و باطل نور و ظلمت تجھ سے ہے
سارے اسرار و معانی آشکارا کر دینے
نرم ہے اور مہرباں ہے مومنوں کے واسطے
دل میں تیرے حق تعالیٰ کی محبت، شریک
دین کی تجدید و البتہ ہے تیری ذات سے
تو مجد دے محدث ہے نقیہ العصر ہے
گیتی تاریک میں تو نے اُجالا کر دیا

ترجمہاں ہے توحید حق کے ارشادات کا
تیرے ارشادات ہیں سامان تسکین و یقین
صاحب علم الیقین و فائز حق الیقین
اس لئے دین محمد کا علمبردار ہے
زلزلہ ہے تو بنائے شرک و بدعت کیلئے
جانب حق دل نظر آتے ہیں مائل مرجا
اور مسلمانوں کے حق میں آیہ رحمت، تو
اور کمر بستہ کیا ہم کو شریعت کیلئے
تیرا ایمان و یقین مشہور ہے معلوم ہے
اور دلوں میں روشنی دین فطرت تجھ سے ہے
سب عمل سے اور زبانی آشکارا کر دینے
سخت ہے فولاد سے بھی دشمنوں کے واسطے
سر میں سودا اتباع مصطفیٰ کا ہے عزیز
رسم و راہ فقر قائم ہے تری عبادت کے
ہر مسلمان کے لئے تو باعث صد فخر ہے
عالم باطل میں حق کا بول بالا کر دیا

اس زمانے میں تم پر بھی تیرا احسان ہے

تیرے پر تو سے منور اس کا بھی ایمان ہے

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے ناز تک

اچھا تو یہی ہے کہ اسے پڑھنے سے پہلے آپ اکثر برکت کا تجلی نازہ کر لیں۔ سبھ اور ان کی بیوی کے جغرافیہ سے باخبر رہیں گے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو بہر حال یہ کہانی بھی اپنی جگہ پوری ہی ہے گزشتہ سے پیوستہ نہیں کہی جاسکتی۔

کئی سال ہوئے وہ ماہ رمضان میں ایک مسجد میں تراویح پڑھ رہے تھے۔ آواز دلکش ہے مگر بھولتے بہت ہیں۔ سامع فقر دے تو موڈ بگڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو سلام کے بعد تیرم تا دہم بھی ہو جاتی ہے۔ بہر حال انیسواں پارہ چل رہا تھا جب سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت پر پہنچے فَقَدْ لَدْنَا نَحْنُ فَسُوفَ یَكُونُ لَآ مَا تَوْفَعْنَا اُنْکٰی رِبَا نَحْنُ نَحْنُ فَسُوفَ یَكُونُ نَحْنُ مَا اور غڑا پسے رکوع میں۔

سامع بیچارہ کیا کرتا۔ اول تو اس طرح کی نادر غلطی زندگی میں پہلی بار اس نے سماعت پر الجھ رہی تھی۔ دوسرے حافظ صاحب کو کئے کا موزع دینے بغیر رکوع میں غوطہ لگا گئے تھے۔ سلام کے بعد اچھا خاصا غدر برپا ہو گیا۔ وہ دن سو آج کا دن۔ لوگ انھیں حافظ بجا کہتے ہیں۔ اگلے روز میں نے علیحدگی میں ان سے پوچھا تھا۔

”اے مردود یہ تم نے قرآن میں بجا کہاں سے گھسٹ دیا؟“
”یا کیا بتائیں“ وہ بڑی معصومیت سے بولے تھے۔

ان کا اصل نام کیا رہا ہوگا یہ مجھے یاد نہیں۔ مجھے کیا شاید اوروں کو بھی یاد نہ ہو۔ میرا تو خیال ہے وہ خود بھی بھول چکے ہوں گے۔ اب وہ اپنے موجودہ نام پر اس طرح مطمئن ہیں جیسے بچپن ہی سے یہی نام چلا آ رہا ہو۔ پہلے پہل وہ اس نام پر بے حد برا فروختہ ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک صاحب پر تو انھوں نے استغی کا ڈالا کھینچ مارا تھا۔ مگر جتنا جتنا وہ چڑھے اتنا ہی اتنا یہ نام قبول عام حاصل کرتا چلا گیا۔ آخر کار انھیں صبر کرنا پڑا۔ صبر کرنے کرتے اب وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب تو وہ خود بھی اپنے منہ سے اسے دہرانے میں مضب اللہ نہیں سمجھتے مثلاً ایک روز میرے ساتھ بازار جا رہے تھے۔ میرے ایک شناسا راستے میں مل گئے۔ وہ ان سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے ان کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ آپ کی تعریف؟ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ موصوف جھٹ سے بول پڑے خاکسار کو حافظ بجا کہتے ہیں!

یہ نام دراصل ایک تاریخی قسم کے حادثے کی دہن تھا۔

آفت آئی۔

”تھیں بیٹھ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔“

”فرمایا ہو گا میں آٹھ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتا۔ ابھی ساڑھے سات بجے ہیں۔“

”تو پھر بیٹھک میں بیٹھے جاتے ہیں۔ چائے وغیرہ بھجوا دو۔ آٹھ بجے چلے چلنا۔“

”میں نے مدت ہوئی اپنے گھر سے چائے جیسی نفویات ختم کر دی ہیں۔ کیا کچھ روشنی ڈال سکو گے بیٹھ صاحب صبح ہی صبح کیوں یاد فرمایا ہے؟“

”ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ بس حکم ملا ہے کہ فوراً بلا لاؤ۔“

”اور آپ صبح ہی صبح انھیں کہاں دستیاب ہو گئے تھے؟“ میں نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے انھیں گھورا۔

”تو بار خفایوں ہوتے ہو۔ تھیں تو معلوم ہی ہے ہجاری بیوی ہٹل کر کی خالہ ہے۔ رات خواہ خواہ لڑ بیٹھی تھی چوٹھا بھی نہیں چلایا۔ اب صبح چائے بھی نہیں رکائی۔ ہم نے سوچا بیٹھ صاحب کے یہاں پی لیں گے۔ وہاں پہنچے تو انھوں نے ادھر دوڑا دیا۔“

”مگر تمہارے چہرے سے تو نہیں ظاہر ہوتا کہ رات فائدہ کیا ہو گا۔“

”فائدے کی نوبت نہیں آئی۔ بامی روٹیاں موجود تھیں وہ سو گئی تو ہم باورچی خانے میں گھس گئے تھے۔“

”چلو بیٹھک میں بیٹھو میں چائے بھجواتا ہوں۔“

”ماشاء اللہ۔ مگر یا رانڈاؤنڈا بھی بھجوانا۔ پراٹھسا بنواؤ گے تو دیر لگے گی۔ تو اس اور مکھن سے بھی کام چل جائیگا۔“

”لعنت ہے تم پر۔ چلو بس چائے بھی بیٹھ ہی کے یہاں پیس گے۔“

”ایسی بھی کیا ہے عروقتی۔ یاد وہاں تو پھنی پھی ہے تمہاری زوجہ کے ہاتھ کی چائے ہمیں بہت خوش ذائقہ لگتی ہے۔“

”زوجہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔“

”مت جھوٹ بولو۔ ابھی کوڑھی رنج سے ہمیں اسکی برچھائیں نظر آتی تھی۔“

”مسل جب ہم مسجد سے غسل خانے میں نہا رہے تھے تو کوئی غیبت دیوار پر لٹکا ہوا پا جا رہے کھینچ کر لے گیا۔ بالکل نیا تھا۔ باہر نکل کر کڑھتے تو کیسے کڑھتے۔ تراویح تہجد باندھ کر بڑھائی پڑی کیونکہ بجائے سارے دھوبی کے گئے ہوئے تھے۔ اسی بجائے کا خیال بار بار دماغ میں آ رہا تھا کہ خدا غارت کرے چڑے کی زبان کو لیزا کا قافیہ بجا مار زبان سے نکل گیا۔ ہمیں تو پتا بھی نہ چلا ہم کیا پڑھ گئے ہیں بعد میں احساس ہوا۔“

”اب کون تم سے تراویح پڑھوائے گا۔ ڈوب کے مر رہو۔“

”نہ پڑھوائے۔ بڑے خزانے بخش رہے ہیں لوگ۔ مدر اس اور میوہ کی طرف تو حافظ کو سیکڑوں ہزاروں روپے مل جاتے ہیں۔ یہاں اٹل صاحبے قرآن بھی مفت سناؤ اور بک بک جھک جھک بھی سنو۔“

تو یہ تھے حافظ بچا ما۔

اب صفیے ناشتہ کے انتظار میں میں حقہ کڑکڑا ہی رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے ہانک لگائی۔

”ملا صاحب!“

میں جواب دینے کے بجائے زوجہ کی طرف دیکھا جو چوٹھے پر زانی پن میں کبوتر کے اندے توڑ رہی تھی۔ کبوتر کے بجائے انگرچڑیا کے بھی میسر آ جاتے تو آج وہی نہر مار کر لے

ٹرنے کیونکہ مرغیاں سب کی سب تین دن سے ہڑتال پر تھیں۔ زوجہ کے ماتھے پر دو تین شکنیں نظر آئیں۔ چوہا با

اس نے میری طرف دیکھا۔ اتنے میں پھر آواز آئی۔

”ملا صاحب!“ میں بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ اندازہ پوری طرح ہو گیا تھا کہ حافظ بچا ما کے سوا کوئی نہیں دروازے پر پہنچا تو وہ میری بار صدا لگانے کے لئے پر تو لے رہے تھے۔

”سلام الیکم“ میں نے مردہ سے لہجے میں خیر مقدم کیا۔

”یار کمال کرتے ہو۔ اب تک سو رہے تھے کیا؟“

”تمہاری بلا سے۔ یہ بتاؤ سویرے سویرے کیا

”پر چھائیاں ناشتے نہیں تیار کرتیں۔ کیا کہا پر چھائیاں
لے مرودہ اب تم نانکا جھانکی بھی کرنے لگے ہو۔“
”تمہارے سر کی قسم۔ وہ تو بس اتفاق سے ریح
سامنے آگئی تھی۔“
”ریح سے تو صحن نظر آ سکتا ہے۔ زود جرتو باورچی خانے
میں ہے۔“

”ہے نا معلوم ہوتا ہے پراٹھا بنا رہی ہے کسی سوئدی
سوئدی خوشبو آ رہی ہے۔“
”منہ دھو رکھو۔ ہم لوگ عرصے سے چوہوں کے آچا
کانا شستہ کر رہے ہیں۔“
”کچھ بھی ہو۔ تم تو تمہارے دوست ہیں۔ جو تم کھاؤ گے
وہی ہم بھی کھالیں گے۔“
”تم جیسے دوستوں نے میری مٹی پیدا کر کے رکھ دی ہے
چلو مروٹھک میں۔“

اندھے کو تر کے بھی بس دو ہی تھے۔ زوجہ لے دو نوں
کا آملیٹ پلٹ میں الٹ کر میری طرف بڑھادیا۔
”لیجئے ٹرے میں رکھ لیجئے میں جائے بھی دیتی ہوں۔“
یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا۔ چہرے
پر سجدگی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔
”آؤ آملیٹ تم اپنے لئے لے لو۔ آج تو شاید
باسی روٹی بھی نہیں ہے۔“ تھے اس پر ترس آ رہا تھا۔
”آپ میری فکر نہ کیجئے۔ جائے لے جائے۔“
لے جانے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ حافظ بچا مانے
ٹرے دیکھ کر ہراسا منہ بنایا۔

”بار تو س کھن کچھ بھی نہیں!“
”غیبت سمجھو کچھ بھی ہے۔ تم جیسے احباب میری
گھر بلوز زندگی تباہ کر کے چھوڑیں گے۔“
”خواہ مخواہ کی باتیں مت کیا کرو۔ ہماری زوجہ
ڈھنگ کی ہوتی تو تمہیں روز حلوے پر اٹھٹھ لایا کرتے۔“
یہ کہتے کہتے انھوں نے سارا آملیٹ ایک ہی چپے میں
صاف کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہم عنایت منزل کے ہال کمرے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ سیٹھ عنایت کے چہرے پر کچھ فکر مند سی تھی اور سنہ
عنایت یعنی زریا غوثیہ بھی خاموش ہی تھیں۔ حافظ بچا مان
غیر ضروری تفصیلات سے بے نیاز ناشتے کی پلیٹوں سے
دو دو ہاتھ کر رہے تھے۔

”تھیں ایک زحمت دہی ہے صاحب ذرا سیٹھ
صاحب نے دفعاً فرمایا ”آج ہی ٹھوڑے شاہ کی درگاہ تک
جانا ہے۔“

”آپ کے حکم سے میں نے کبھی سرتابی نہیں کی۔ قطب شمال
تک بھی دوڑا چلا جاؤں گا۔“

”جانتا ہوں سعادت مند ہو۔ دراصل میں خود جاتا
مگر مجبور ہی پیش آگئی ہے۔“

”فرمائیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟“
”مراذ شریف پر چادر چڑھانی ہے اور کچھ نذرانہ
سہانے صبا کے حوالے کرنا ہے۔“

”اللہ اکبر۔ یہ کام آپ صوفی طہیر آبادیل سے
بھی لے سکتے ہیں و تو آپ کے جانثاروں میں ہیں۔“
”یقیناً ہیں، لیکن وہ اتفاق سے ہری پور گئے ہوئے
ہیں جن اتارنے۔“

”آجائیں گے لوٹ کر۔ آج ہی کیا جلدی ہے؟“
”جلدی ہی تو ہے۔ صوفی ہتھابے زرا سچے پھینچ کر
بتایا ہے کہ آج میرے ستارے شاندار ہیں۔ ریح کی تاچ
ختم ہونے ہی عقب برج نہم میں داخل ہو جائیگا۔“

”ہو جایا کرے۔ میرا دعویٰ ہے کہ صوفی ہتھاب
علم نجوم کی اسجد بھی نہیں جانتے۔ عقب برج جس دن برج
نہم میں داخل ہو گیا قیامت آجائے گی۔ ابھی تو وہ
برج خشم میں بھی داخل نہیں ہوا نہم کا کیا سوال پیدا ہوئے۔“
”کو اس نہیں۔ تم کیا جانتو علم نجوم۔“

”تھے حیرت ہے آپ اتنے اسماٹ ہو کر علم نجوم پر
اعتماد رکھتے ہیں۔“

”خود آپ کو آخر کیا عذر پیش آگیا؟“

”بات یہ ہے آج ہی وزیر زراعت کے ایک قریبی رشتہ دار آ رہے ہیں ان سے ملنا ہے۔ ان کا کارپوریشن میں بڑا اثر ہے۔ کیا بعید ہے کہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی جائے۔ روحانی تدابیر کے ساتھ ساتھ ظاہری تدابیر بھی تو ہونی ہی چاہئیں۔“

”آپ کی مرضی۔ مجھے کس وقت جانا ہو گا؟“
”بس ابھی۔ میری امپالائٹ جاؤ۔ یہ تمہاری زوئی بھی تمہارے ساتھ جائیں گی۔“
”جی“ میں اچھل پڑا۔

”اے بھئی یہ کئی دن سے اپنی خالہ کے یہاں جانے کو کہہ رہی ہیں۔ تم راج گاؤں سے گنگاپور کی طرف مڑ جانا۔ وہیں تو رہتی ہیں ان کی خالہ۔ انھیں وہاں اتنا دینا پھر واپسی میں ساتھ لیتے آنا۔“

”آپ خواہنا وہاں کہہ رہے ہیں۔“ زوئی ناخوشگوار سے لہجے میں بولی ”یہ مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔“
”کیوں بھئی“ سیٹھ نے مستفسرانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”محترمہ کا خیال درست ہے۔ میرے لئے یہ بڑا دشوار مسئلہ ہے۔“

”کس قسم کی دشواری؟“ سیٹھ برا سامنے بنا کر غرائے ”آپ نہیں سمجھتے میری زوجہ کو اگر بتا چل گیا کہ میں نے اسیلوں کا سفر کسی ناخوش کے ساتھ کیا ہے تو وہ زمین آسمان ایک کر دے گی۔“

”میری جوتی بھی ان کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“ زبیرا دفعتاً بھڑک اٹھی۔ اس کے چہرے پر طیش کی جلیاں کو ندنے لگی تھیں۔
”بہت ہی بد تمیز ہو تم ملا۔ آخر شائستگی کب سیکھو گے۔“

”الکھ جانور۔“ سیٹھ کو بھی طرارہ آگیا تھا۔

”آپ کا حکم ہو تو ہم چلے جائیں ملا کی جگہ“ حافظ چچا نے دبے بچھے لہجے میں کہا۔

”نکو اس مت کرو۔“ سیٹھ نے ایسے انداز میں کہا

”یہ ایک الگ بحث ہے کہ میں اعتماد رکھتا ہوں یا نہیں رکھتا مگر تمہیں یاد ہو گا اسمگلنگ کے سلسلے میں کس بری ج میں پھنس گیا تھا۔ صوفی مہتاب ہی تو تھے جن کے مشورے پر شاہ کی درگاہ میں چادر چڑھائی تھی۔ پھر دیکھ لو جس حیرت ناک طریقے پر ساری ملا غلطی چلی گئی۔“

”تو کیا خدا خواستہ پھر کوئی بلا نازل ہو گئی ہے؟“
”بلا تو نہیں مگر ایک چکر پھنس گیا ہے۔ وہ تم نے دیکھا جو کاسٹلر اسٹریٹ اور نیو کالونی کے کراس پر ایک پلاٹ انی پڑا ہے۔ اس کی خریداری کے سلسلے میں سیٹھ نعمانی سے مقابلہ چل رہا ہے۔“

”بھلا اس پلاٹ کا آپ کیا کریں گے؟“
”سنیما ہال کے لئے لا جواب جگہ ہے۔ قیمت بھی یادہ ہیں۔ بس تین لاکھ میں ہاتھ آ جاتی اگر نعمانی بیچ میں نہ کود رہا ہوتا۔“

”تین لاکھ“ میں حیران رہ گیا ”وہ تو بہت تھوڑی جگہ ہے۔“

”سنیما ہال کے لئے کافی ہوگی۔ مقابلہ بازی کی بنا پر آٹھ لاکھ تک بات چاہی جی ہے۔ میں تو دس لاکھ کی بھی پروا نہ کرتا مگر کارپوریشن کے کچھ آفیسران نعمانی کا پارٹ لے رہے ہیں۔ بظاہر وہی کامیاب ہوتا نظر آ رہا ہے۔ میں نے اس آفیسر سے سو دیا تھا وہ سو کا سچہ ہارٹ فیل کر گیا۔ اب کوئی بھی شکل کامیابی کی باقی نہیں رہی۔“

”تو کیا آپ کو یقین ہے کہ ٹو بے شاہ کی درگاہ کے لئے کوئی معجزہ ظہور میں لائے گی۔“

”پہلے بھی اس نے معجزے ہی کو جنم دیا تھا۔ آزا لینے لایا حرج ہے۔“

”ایسی صورت میں چادر آپ خود چڑھائیں۔ مجھے یا کو بھیجنا مرنے ہو گا۔“

”میرا بھی ایسا ہی خیال تھا لیکن صوفی مہتاب نے براعذر منکر مینظور کر لیا ہے کہ وہ ایک وظیفہ بڑھ کر اس جی کی تلافی کر دیں گے۔ چادر ہر صورت آج ہی چڑھنی ہے۔“

لفظ بجانے کالی بکٹی ہو۔
”حرج تو کچھ نہیں۔ آپ میری جگہ انھیں بھیجیں۔“
زارش کی۔

”اے مسٹر اتم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔“ زبیرا دفعتاً
ٹپٹری ”تم جیسے ہزاروں گلیوں میں جوتے چھاتے
ہیں۔ آئے بڑے لاٹ صاحب۔“

”یہ تو پاگل ہے۔ ڈارلنگ تم پروا مت کرو۔
میں خود انھیں لے کر جاؤں گا۔“ سیٹھ نے بیوی کو
ی۔

”نہیں۔ میں آج ہی جاؤں گی انھیں ساتھ جاؤں گی۔
یہ کیسے نہیں لے جاتے۔“

”ٹھیک ہے تم جا کر کپڑے بدل لو۔ یہ ضرور تمھیں لے جائیگا
مارووں گا۔“ سیٹھ نے پہلے بیوی کی طرف پھر میری
یکھا۔

زبیرا تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اب میں نے

”مائی ڈیر سیٹھ صاحب! کیا واقعی آپ سٹھیا گئے ہیں۔“
”تم سمجھنے کی کوشش کرو فرزند“ انھوں نے زلفنا نانا
ے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دبی آواز میں کہا ”کل بھی میں نے
مانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس کا صرف شوہر ہوں۔
دوست بھی جا رہے۔ آج بھی سمجھاتا ہوں کہ احسن
تھاری شرافت پر مجھے بھروسہ ہے۔ تم کتنی کاٹو
نی نہ کوئی لفنگا تھاری جگہ لے لے گا۔ کیا انھیں زبیری
ہیت پر ترس نہیں آتا؟“

”آپ کچھ بھی کہیں۔ تنہا میرے ساتھ ان کا جانا ٹھیک
لفظ صاحب کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔“
جھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بھی اپنے ہی آدمی ہیں گو کہ
کے گاؤ دی ہیں۔“

لفظ بجا ایسے نیاز منانہ انداز میں سکر ائے جیسے
کا خطاب خلعت فاخرہ کے ہم معنی ہو۔ پھر کچھ دیر
مپلا کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ حافظ صاحب

میرے برابر کی سیٹ پر اور زبیری پیچھے۔ زبیری نے بہت
معمولی قسم کا لباس پہنا تھا۔ چہرہ بھی میک اپ کے لیے نیاز
تھا۔ بالوں میں لنگھی بھی لیں برائے نام ہی کی تھی تھی۔ چہرے
پر تاؤ کے اثرات تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے سے قبل اٹلی
درجے کے ٹیری کاٹ کا ایک سبز رنگ کا تھان اور ایک لپک
کلوٹھائی کے بیس ڈبے گاڑی میں رکھ دیئے گئے۔ ساتھ ہی
سورہ پے کا نوٹ بھی سیٹھ نے مجھے پکڑا یا تھا کہ سامان کیساتھ
یہ بھی کیوڑہ شاہ کے سجادے کو دیدوں۔

گاڑی جب شہر کی راہوں سے گزر کر رام گاؤں والی
نیم سندان مٹک پر نکل آئی تو زبیری کی آواز سنائی دی۔
”انت تیز رفت چلاؤ۔ کیا گاڑی الٹو گئے۔“

میں نے عقب نما آئینہ کا زوہ بدلا۔ اب زبیری کا
چہرہ سامنے تھا۔

”کیا ہر ناموس کا غصہ اتر گیا؟ میں نے مسکرا کر پوچھا۔
”تم اپنی کہو۔ بڑے لاٹ صاحب نے تھکے ساتھ نہیں گئے
جائیں گے۔“ اب اس کے چہرے پر ستم کھیل رہا تھا۔ پھر
دفعتاً اس نے ایک بچکانہ حرکت کی۔ زبان ہونٹوں کے درمیان
لا کر مجھے آئینے میں منہ چڑایا۔

”گننا کھٹیا جوڑا بدلا ہے تم نے۔ تمھاری خالہ کیا
سوچیں گی۔ آج تو ایوننگ ان ہزاریں بھی نہیں لگائی۔“

”تم سے مطلب۔ میری خالہ بہت غریب ہیں میرے
پاس اس سے کھٹیا جوڑا نہیں تھا ورنہ وہ بدل کر جاتی تم بہت
بدتمیز ہو۔ اگر پہلے ہی ساتھ لے چلنے پر تیار ہو جاتے تو کون سی
تمھاری شان میں سرتن آ جاتا۔“

”میں اب بھی زبردست خطرہ مول لیکر تمھیں ساتھ
لے چل رہا ہوں۔ اگر میری زوجہ کو علم ہو گیا تو مجھ کو کہ بس حشر
برپا ہو جائے گا۔“

”انھیں تو میں خود جا کر بتاؤں گی۔ تم نے ابھی تک ان
سے مجھے نہیں ملوایا۔ کل میں خود پہنچوں گی۔ ریمانہ آپا کہہ رہی
تھیں کہ ملا کی بیوی بڑی شاندار ہے۔ اکہم اسٹارٹ۔“
”مگر اس حد تک بھی نہیں کہ.... کہ....“

”ہاں ہاں کہہ کر کیوں گئے۔“

”بس کیا کہوں تم بہت بھولی ہو۔ پتا نہیں سکنڈا ایر تک کیسے پہنچی ہو گی۔“

”پھر تو ہیں۔ ایک تم ہی تو ہو نادیا میں قتل مندر۔ یہ وہ کہیں گے۔“

”ارے یا تم سیٹھانی صاحبہ کو خستہ کیوں دلاتے ہو۔“
 دفعتاً حافظ صاحب بولے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گردن موڑ کر جیسے بچھا ڈال لیتے تھے۔

”اے حافظ جی۔ خبردار جو جیسے سیٹھانی کہا ”زوبی بھنا گئی۔“

”ا۔۔۔ اچھا معاف کر دیجئے۔“ حافظ صاحب بوکھلا گئے۔ ”آپ بتا دیں وہی کہہ یا کروں گا۔“

”ضرورت ہی کیا ہے کہنے کی۔ میں آپ سے تو گفتگو نہیں کر رہی۔“

گنگا پور صرف میں میں تھا۔ وہاں زوبی کو اتار کر ہم زوبی کی طرف چلے گئے جہاں کٹورے شاہ کی درگاہ ہے۔ چلتے وقت زوبی نے کہا تھا۔

”ایسا نہ ہو میں یہاں منتظر رہوں اور تم ادھر ہی سے ادھر غائب ہو جاؤ۔“

”منکن تو یہ بھی ہے محترمہ!۔ کٹورے شاہ بڑے جلالی مشہور ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے آداب کی کوئی غلطی ہو جائے اور آتش جلال میں جھسم کر دیا جاؤں۔“

”ارے جاؤ۔ تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔ اچھا اس میں کیا حرج ہے اگر میں بھی تمہارے ساتھ درگاہ دیکھ آؤں۔ آبا میاں سے بھی اس درگاہ کی تعریف سنی ہے۔“

”سیٹھ صاحب کی اجازت کے بغیر میں تمہیں وہاں نہیں لے جا سکتا۔“

پھر میں نے جواب سے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

زوبی کا فاصلہ یہاں سے تیس میل ہو گا۔ گاڑی پُر فضا مناظر سے گزرتی جا رہی تھی کہ یکایک حافظ پچاما

بولے۔

”یار تیری کاٹ کی چادر میں مزاروں پر کون چڑھاتا ہے۔ یہ تھان کم سے کم تین چار سو کا تو ضرور ہو گا۔“

”اچھا تو پھر؟“

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ گاڑی یا معمولی لٹھ کا تھان خرید لیا جائے۔ تیری کاٹ ہم تم بانٹ لیں۔“

یہ کہتے ہوئے حافظ صاحب نے ایک ہاتھ پچھی سیٹ کی طرف بڑھایا اور مٹھانی کا ایک ڈبہ اٹھالیا۔

”ہائیں ہائیں یہ کیا کہتے ہو۔“ میں غرایا۔

”سچی بات ہے بھوک لگ ہی ہے۔“ یہ کہتے کہتے انھوں نے ڈبہ کھول ڈالا اور ایک گلاب جامن منہ میں رکھ گئے۔

”کیا خباثت ہے۔ ارے ہبیضہ ہو جائیگا خبیث یہ نذر کی مٹھانی ہے۔“ میں چیخا۔

”بہت ہو اسہضہ۔ پیارے ہم نے تو مزاروں کے چراغوں سے نیل چرا چرا کر گھر میں چلایا ہے کچھ بھی نہیں بگڑا۔“

”ملعون چوری اور سنیہ زوری۔ جہنم میں جلے گا۔ فرستے جوتے جوتے مار کر چند یا کچھ کر دیں گے۔“

”پھر ہم اکیلے ہی کیوں جلیں تم بھی جلو۔“ یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک گلاب جامن میرے منہ میں ٹھونس دی۔

میرے ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے۔ گاڑی ایک تنگ راستہ پر چل رہی تھی۔ گلاب جامن پھسل کر میرے حلق تک پہنچی اور حلق سے معدے میں۔

”ہو گیا کام تمام۔ خبیث لاؤ اور دو۔ جہاں ناس دہاں سواستی ناس۔“ میں گرا ہوا۔

چند ہی منٹوں میں ڈبہ صاف ہو گیا۔

”ابھی انیس ڈتے باقی ہیں“ حافظ صاحب بولے۔

”یار سوچو تو بارہ روئے کلو سے انیس کلو کتنے کی ہوئی۔ باپ لے باپ دو سو اٹھائیس روئے کی۔“

”ارے تو ملعون ہمیں کیا۔ ہمارے باپ کے گھر سے کیا جا رہا ہے۔“

مٹھائی حافظ کے دست ہی نے چھرو پے کلو کے حساب خریدی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ دام چند روز بعد دینے کا وعدہ کیا ہو۔ میں اس خجانت پر آمادہ نہ ہوتا کہ میرے علم میں یہ بات نہ ہوتی کہ ٹورے شاہ کی درگاہ کا سجادہ پکا چار سو میں ہے۔ نشیات کا تاجر ہے۔ اسمگلنگ بھی کرتا ہے۔ اور بھی خدا جانے کیا کیا کرتا ہو گا۔

حافظ حسب قرار داد ٹیری کاٹ لیکریس اسٹینڈ چلے گئے۔ میں گنگا پور لوٹا۔

زوبی مجھے اکیلا دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”حافظ جی کہاں گئے؟“

”رجولی میں ایک دوست کے یہاں رہ گئے۔ چلو مجھے“

میرا خیال تھا وہ ادب کے آگے بیٹھ گئی مگر وہ پچھلی

سید پر چلی گئی۔

”بہت بہت شکریہ“ میں نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

”کس بات کا شکریہ؟“

”آپ نے اسی صحیح جگہ سنبھالی۔“

”اب اتنی احمق بھی نہیں کہ موقع محل نہ دیکھوں۔“

کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کہیں نہ کہیں سے ہمیں اس وقت

ضرور دیکھ رہا ہو گا۔“

”اوہو اس وقت تو کافی تھکنہ معلوم ہو رہی ہیں۔“

”اب اشارت کرو۔ خواہ غصہ دلاتے رہتے ہو۔“

میں سوچ رہا تھا کیسا دشوار اس گھات ہوا ہے مجھ

ناہنجار سے! سیٹھ کو مجھ پر کس قدر اعتماد ہے اور یہ زوبی

مجھے کتنا بھلا آدمی سمجھتی ہے۔ ایسی کمینہ حرکت تو کوئی شرابی

کبائی بھی نہ کرے گا۔

گاڑی بہت ہی پر فضا مناظر سے گزر رہی تھی۔

”منہ میں قفل ڈال لیا ہے کیا؟ زوبی بھلا کر بولی۔“

”آں۔ ہاں شروع کیجئے کوئی موضوع۔“

”میری سبھی میں آج تک یہ نہیں آیا کہ جلال اللہ والے

مرکز میں چلے جاتے ہیں وہ دنیا والوں کی مدد کیسے کرتے ہیں۔“

”پھر سوچو۔ کم سے کم تین سو کا ٹیری کاٹ۔ اتنے کی

مٹھائی۔ سو نقد۔ اب کون سے سیٹھ جی عالم الغیب ہیں۔“

”اے اے۔ کیا داغ خراب ہو گیا ہے۔ بے اپنا

کھار ہلچلے زائد شب زندہ دار کو۔“

”سیٹھ جی بڑے ایسا نادر دھرمے ہیں۔ کروڑ پتی

کوئی ایسا ننداری سے تو بننے سے رہا۔“

”اے ابلیس تو حافظ ہے یا ابو جہل۔ میری بھی

آخرت برباد کر اسے گا۔ چل ایک ڈوبہ اور اٹھا۔ یہ گناہ

کبیرہ بھی آج تو بے کرا ہی دیا۔“

حافظ نے تعمیل میں دیر نہیں کی۔ مٹھائی بڑی شاندار

تھی۔ ہو سکتا ہے سولہ روپے کلو کی رہی ہو۔ پھر خدا

غارت کرے اس شیطان کو برا بیٹی پڑھا تا رہا کہ ٹیری

کاٹ کے چلو دریں مزاروں پر نہیں چڑھیں۔ اے انصاف

والو میں بھی آدمی ہی ہوں۔ آدم کو شیطان نے بہکا کر تنگ

نہیں کھلا دیا تھا تو ٹیری کاٹ کا اتنا شاندار تھا نہ

کئی من گہوں سے کم تو نہیں ہو سکتا۔ حافظ کی رائے یہ

نہی کہ رجولی کے بازار سے معمولی اٹھایا گاڑھا خرید لیں گے۔

ٹیری سمجھ میں یہ آیا کہ اس تکلف کی بھی کیا ضرورت۔ کیوں

خواہ مخواہ پیسے برباد کئے۔ سیٹھ جی سے کہہ دیں گے چڑھا

آئے چادر۔

”رجولی میں میرا ایک دوست ہے“ حافظ نے کہا

”مٹھائی تو اس کے ذریعہ بیچ لیں گے۔ ٹیری کاٹ گھر

لیتے چلیں گے۔“

”اور وہ جو تمہاری مٹھائی جی واپسی میں ساتھ

چلیں گی۔ کیا وہ نہیں دیکھیں گی کہ تمہان ساتھ لوٹ لیا ہے۔“

”ارے ہاں۔ اچھا تو پھر ایسا کریں۔ میں تمہا

نے کر لیں گے ذریعہ پھن پور کی طرف سے گھر لوٹ جاؤں گا۔

تم مٹھائی جی کو لیتے جانا۔ بار بڑے چلتا پرزہ ہو۔ سیٹھ جی

کو کیا گھول کر بلار کھا ہے۔“

”اے حافظ بچا ما۔ اپنے کام سے کام رکھو۔“

”الاف قسم ایسی حسین ہے کہ بس دیکھو تو دیکھے ہی جاؤ۔“

”بس بے وقوف نہ بناؤ۔ یہ مولویت تو جماعتِ اسلامی
گھارتی ہوگی۔“

”کیسی بھولی ہو۔ کیا تمہارے خاندان میں کسی نے پردہ
نہیں کیا؟“

”اُمی کے علاوہ سچی پردہ دار ہیں۔ گڈ کارڈ۔ ہاں
بات تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ہمارے خاندان میں کوئی
بھی جماعتِ اسلامی کو نہیں مانتا۔ اچھا تو کیا سچ حج اللہ
رسول پر دے کو کہتے ہیں؟“

”صرف پر دے ہی کو نہیں وہ اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں
ہم دونوں اس وقت مجرم ہیں۔ ہمیں ایک میل بھی تنہا سفر
نہیں کرنا چاہیئے تھا۔“

”واہ اس میں کیا برائی ہوئی؟“

”جان لو مجھ کہ انجان مت بنو۔ تمہارے محل میں
آخر یہ خیال کیوں پیدا ہوا تھا کہ خالہ کے گھر کا کوئی
فرد تمہیں اگلی سیدٹ پر نہ دیکھ لے؟“

وہ چند ثانیے خاموش رہی عقب نما آئینے میں اس
کے چہرے پر اتنا چڑھاؤ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پھر
دبی زبان سے بولی :-

”تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میرا خیال ہے پردہ بُرے
لوگوں سے ہوتا ہو گا۔“

”تمہیں پر کسی کے بھی کچھ نہیں لکھا ہوتا محترمہ مذہبی
میں بالکل اچھا آدمی نہیں ہوں۔ تم اگر میری اصلیت کو جان
جاؤ تو نہ جانے کس قدر لعنتیں بھیجو۔“

”خیر یہ تو میں نہیں مانتی۔“

”بے شمار عورتیں اسی بھولپن میں ماری جاتی ہیں۔
یہ میضوع بڑا دل خراش ہے۔ تمہاری عمر تو بارہ سال سے
زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔“

”اتنا حق مت سمجھو۔ میں نے اسکول کالج میں اچھی
بری نظریں خوب دیکھی ہیں شرافت اور کمینگی میں امتیاز
کا سلیقہ رکھتی ہوں۔“

”سچی ہو۔ تم کچھ نہیں جانتیں۔ کچھ نہیں جانتیں“

”یہ سمجھ سے بالاتر باتیں ہیں۔ اور کوئی موضوع چھڑو۔“
”ابامیاء کہتے ہیں کہ غوث الاعظم پیرانِ پیر دستگیر

ساری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی تم نے
تو قرآن پڑھا ہو گا۔ کیا اس میں ایسا ہی لکھا ہے۔“

”ہمارے والے قرآن میں تو ایسا نہیں لکھا مگر صرفوں
کا ایک الگ قرآن ہے۔ وہ لکھا ہوا نہیں ہے سیدہ بسینہ
چل رہے۔“

”یہ میں نہیں مانتی۔ ابامیاء نے تو کبھی دوسرے قرآن کا
ذکر نہیں کیا۔“

”نہ کیا ہو گا۔ تم ایسی بوریاتیں مت کرو۔ روئاس
کا خون ہوتا ہے۔“

”یہ منہ اور مسور کی دال۔ تم کیا جانو روئاس۔“

”اچھا صاحب۔ آپ ہی روئاس کی واحد
حاکمہ خاندان ہیں۔ تحریک اقامتِ دین کا نام اُسٹا ہے آپ نے
کبھی؟“

”یاد تو پڑتا ہے کہ سنائے۔ ارے ہاں بہت دن ہوئے
ابامیاء کسی سے کہہ رہے کہ کوئی ٹرے میاں ہیں مولوی
مودودی۔ انھوں نے اس نام سے اپنی فِرم کھول رکھی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اور جماعتِ اسلامی کا نام
سنائے کبھی؟“

”گئی بار سنائے۔ شاید یہ جماعت اللہ و رسول کو نہیں
مانتی۔“

”یہ بھی تمہارے ابامیاء ہی بتایا ہو گا۔“

”وہی کیا اور لوگ بھی کہتے ہیں۔“

”تم مانتی ہو اللہ رسول کو؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جان قربان ان
ابک ناموں پر۔ کاش تم مجھے کچھ پڑھا دیا کرتے۔ مجھے کچھ
بھی خبر نہیں کہ اللہ رسول کیا کہتے ہیں۔ اسکی آواز میں
یک طرح کا تا سَف بھی تھا اور حسرت بھی۔“

”اگر اللہ رسول یہ کہیں کہ تم پردہ کیا کرو تو بقتاؤ
تمہارا رویہ کیا ہو گا؟“

میرا بھو خاص جاذبہ بن گیا تھا۔

”اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو تو کشش کر دو کہ میں کچھ جان جاؤں۔ کیا مجھ سے تمہیں کوئی بہتر دی نہیں ہے؟“

”بہتر دی ہو بھی تو میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میری طاقت اسی میں ہے کہ تم سے دور ہی دور رہوں۔“

”اتنی زیادہ نفرت ہے مجھ سے؟“ وہ کسی معصوم بچے کی طرح شکایت کر رہی تھی۔

”بال لڑکی۔ تم سے نفرت کون کر سکتا ہے تم سے اسی لئے تو وہ بھاگنا چاہتا ہو کہ تم سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔“

”ایسی اٹھی سیدھی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پتہ نہیں کیوں تمہاری ہر بات مجھے اچھی لگتی ہے چاہے سمجھ میں بھی نہ آئے۔“

”یہ اور بھی خراب ہے۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ اچھا اب گفتگو ختم۔ سفر تمام ہو رہا ہے۔“

سو بوج غروب نہیں ہوا تھا کہ ہم غایت منزل پہنچ گئے۔ سیٹھ ہمارے منتظر ہی تھے۔

”لو ڈار لنگ۔ سفر تو خوشگوار رہا؟ کچھ بھی سمجھی نظر آرہی ہو۔“

”نہیں تو۔ بس یوں ہی ذرا تھکن سی ہو گئی ہے۔“

”اور آپ کہنے سب کام ٹھیک ٹھاک کر آئے؟“

”سیٹھ جی نے مجھے مخاطب کیا۔“

”بالکل۔ سجادے صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے۔ بڑی اچھی طرح پیش آئے۔ خلیق آدمی ہیں۔“

”کیوں نہ ہوں۔ اولیاء کے خادم ہیں۔ اور وہ حافظ بابا کہاں گئے؟“

”وہیں رہ گئے ایک دوست کے گھر۔ شاید کل لوٹینگے۔“

”مرنے دو۔ عجیب لپٹو آدمی ہے۔ زہنی سے رشتہ داری

ہوتی تو میں اسے یہاں گھسنے بھی نہ دیتا۔“

”آپ کہنے وزیر زراعت کے رشتہ دار صاحب سے

لانات ہوتی؟“

”ہوئی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ وہ خود آج کل ایک اسکینڈل میں ملوث ہیں۔ ان کی وجہ سے وزیر زراعت کی بھی رسوائی کا اندیشہ ہے۔ پرسوں پلاٹ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ بظاہر تو اپنا کوئی چانس نہیں نظر آتا۔ نعمانی کے مقابلے میں پر شکست میرے لئے بڑی تکلیف دہ ہو گئی۔“

”چھوڑیے بھی شکست و فتح تو جلتی ہی رہتی ہے۔“

”شکست اب بھی میں نہیں مانتا۔ کیا تمہیں توقع نہیں کہ پہلے کی طرح اب کی بھی کوئی کرامت ظہور میں آئے گی کیونکہ آج جہتا بے آج بھی یقین دلایا ہے کہ درگاہ کا چڑھا دے کار نہیں جا سکتا۔ اولیاء اللہ اپنے نیاز مندوں کو مایوس نہیں کرتے۔“

”خدا بہتر جانے۔“

اگلادین مجھ پر بڑا اقیامت کا گندرا۔ دل دھک دھک کئے چلا جا رہا تھا۔ میں نے خود کو بہت سمجھا یا کہ اے بد بخت دل تو سیشہ ہی دھک دھک کرتا ہے پھک پھک کی توقع اس سے کون کر سکتا ہے لیکن داغ میں تو جیسے آندھیاں اٹھ رہی تھیں کیا ہو گا جب سیٹھ کو پتا چلے گا کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے یا نہ کی ساری ذمہ داری وہ مجھ پر ہی ڈالیں گے۔ میری مدت کیسی ماری گئی تھی کہ حافظ بجا مائے بہکانے میں آگیا۔ لعنت ہے مجھ پر۔ رات کو جب زوہر سو گئی میں پانگے اٹھا۔ وضو کی دوسری کمرے میں مصیبت سمجھایا اور نفلوں پر نفیس شروع کر دیں۔ یاد نہیں کتنی بڑھی ہوں تھی۔ جب تھک گیا تو یوں دھاک۔

”اے رب العلیین۔ تو سارے جہانوں کا رب ہے۔ کافروں

کا بھی اور گناہگاروں کا بھی۔ میں روسیہ پکا گناہگار

ہوں مگر کافروں نہیں ہوں۔ میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں

سیٹھ کو سنبھالنے لئے پلاٹ دلا دے۔ تیری قدرت سے

کچھ بعید نہیں۔ تو نے لوح کی کشتی کو طوفان سے نکالا تھا۔

میں ملعون حافظ بجا مائے بہکانے میں آگیا۔ آخر تیرے

نیا آدمی ہو گیا تو یہ ہوں۔ وہ شیطان کے جھانے میں آ گئے

تھے۔ تو نے انھیں معاف کر دیا۔ مجھے بھی معاف کر دے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ بس جا کے لیٹ ہی گیا۔

پھر اپنے رب کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔ عصر کا وقت تھا کہ سیٹھ عنایت کی امپالا غریب خانے پر رکی۔ زو بی بھی سمراہ تھی۔ ایسے دلکش لباس میں کہ بس غزل کا سہرا پا۔ ہارن سنکر میں ڈرتا ڈرتا باہر آیا۔

”آؤ آؤ“ سیٹھ نے دودھ ہی سے اپنے برابر سیٹھ کی طرف اشارہ کیا۔ زو بی کچھلی سیٹھ پر تھی۔ ان کا لہجہ کھنک رہا تھا۔

”سلا مالیکم تشریف لائیے نا۔“ میں نے اخلاق کہا۔
”نہیں۔ ہم بس تمہیں لینے آئے ہیں۔ دعوت تو تمہارے یہاں بھی ضرور کھانی ہے مگر کسی اور دن۔ آؤ بس جلدی۔“ میں اگلی سیٹھ پر جا بیٹھا۔ گاڑی چل دی۔

”کیا کہا تھا ہم نے عزیزم۔ اولیاء اللہ اپنے نیاز مندوں کو باپوس نہیں کرتے۔ اے کیا پانسہ پلٹا ہے مزا آ گیا۔ نعمانی تو عرصے تک اپنے زحم چاٹتا رہے گا۔“

”مبارک باد قبول فرمائیے۔ کیا فطعی فیصلہ ہو گیا؟“ بالکل فطعی۔ جانتے ہو کیا چکر پڑا۔ صبح اچانک

درد کا پرشاد جی پلین سے آہنچے۔ سیدھے میرے یہاں آئے۔ اندازہ کرو یہ کوئی معمولی بات ہے۔ ان کے اثرات بے پناہ ہیں۔ اب دیکھ لو جب دھنوں میں سارا معاملہ اُلٹ گیا۔ پلاٹ اب میرا ہے نعمانی پچھیاں کھا رہا ہے۔

گاڑی شہر کی سب سے بڑی مٹھانی کی دکان پر رکی۔ سیٹھ نے آرڈر دیا۔

”ایک ایک کلر کے تلوڑ بے دو گھنٹے میں کوٹھی پہنچ جائیں۔“

پھر کچھ دیر بعد ہم صوفی ہتھاب کے در دولت پہنچے۔ زو بی گاڑی ہی میں بیٹھی رہی۔ میں اور سیٹھ صوفی حجاب سے لے۔ سیٹھ نے سو سو کے بانچے نوٹ بڑی عقیدتمندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔

اگر سیٹھ کو پلاٹ مل گیا تو انھیں اس کی پروا نہ ہوگی۔ لکھنا کہ گھر گیا۔ اللہ قسم انھیں تو میں خود ہی بتاؤں گا کہ یہ کون سے شاہ کی کرامت نہیں ہے۔ وہ تیرے بجائے قبروں کے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ میں تیرے آگے ہاتھ جڑتا ہوں پلاٹ دلائے۔ میری بے ایمانی کی مناجا بھی تو دے گا پھر دے جو میں تیرے در پر بھکاری بن کر آیا ہوں۔ میں تیرے سو کسی کو ذرہ برا بھلا نہیں سمجھتا۔ میں تیری رحمت کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے چاہے دوزخ میں ڈال دینا مگر سنیسا کا پلاٹ سیٹھ عنایت کو ضرور دلوادے۔“

آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ میری آنکھوں کے انک رواں تھے۔ بوس پور ہاتھ جیسے دل گھل کر بہہ جائے گا۔ شاید ایک بے ٹیک میں اسی طرح خمر گڑا تار مار۔ زبان رکتے ہی کا نام نہیں رہی تھی۔ یہ تک ہوش نہیں تھا کہ میری آواز اچھی خاصی سہ ہو گئی ہے ہوش اس وقت آیا جب رخ موڑنے پر دیکھا زو بی دور سے ٹیک لگائے تصویر بنی کھڑی ہے۔ ظاہر ہے اس نے دعا باجبر کا کچھ نہ کچھ حصہ سن ہی لیا ہو گا۔

”کیسے ناؤں کہ یہ آپ ہی ہیں!“ وہ ڈرامائی اسٹائل میں

”اب تو رگے ہاتھوں پکڑ گیا ہوں جو چاہے کہہ لو تمہیں نا نہیں جانتے تھا۔“ میں بوکھلا گیا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے میری بہت بڑی غلط فہمی دور ہو گئی کچھ دنوں سے یہ سمجھنے لگی تھی کہ صوفیوں کی صحبت نے آپ کے بدوں میں کچھ نہ کچھ بگاڑ ضرور پیدا کر دیا ہے۔“

”شکریہ۔ مگر تم یہ نہیں پوچھو گی کہ سنیسا کے پلاٹ کیا قصہ ہے۔“

”میری بلا سے۔ میں جانتی ہوں آپ متقی پرست ہیں۔ میں۔ آپ بڑی بجا حرکتیں کرتے پھرتے ہیں۔ مگر بندہ ہی کیا جو ہر پھر کر اپنے خدا ہی کے قیروں میں رہ نہ رکھ دے۔ چلتے سو جائیے۔ دعا انشاء اللہ بے کار میں جائے گی۔“

”یہ حقیر سا نذرانہ قبول فرمائیے۔ پلاٹ مل گیا ہے۔“
”وہ تو یقیناً ملتا۔ رات ہی مرا لے میں ہمیں بشارت
مل گئی تھی۔ قطب الاولیاء نے بڑی محبت سے آپ کی نذر
قبول فرمائی ہے۔“

صوفی صاحب کے چہرے پر نور ہنس رہا تھا۔
”قطب الاولیاء سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ میں نے
خواہ مخواہ سوال کیا۔ صوفی صاحب نے اٹھے پر بل ڈال کر مجھے
گھورا اور ناخوشگوار لہجے میں بولے۔
”گدھے تک جانتے ہیں کہ قطبیت کا مرکز آج کل
رجولی ہے۔“

”گدھے یقیناً جانتے ہوں گے۔ مجھے اپنے آدمی ہونے پر
ندامت ہے صوفی صاحب!“
”تھیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ پر لے سرے کے
وہابی ہو۔“

”نہیں صوفی صاحب! یہ بات نہیں“ سیٹھ نے معذرت
آئینہ انداز میں ہیچ بچاؤ کیا۔ ”یہ تو اپنے ہی مشربوں میں ہیں۔
آپ کے بڑے متداح ہیں۔ اب اجازت چاہوں گا۔ تھوڑی
سی تمٹھائی بچوں کے لئے پہنچے گی قبول کر لیجئے گا۔“
یہ کہہ کر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور ٹھیسے ہوئے گاڑی
تک لے گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میرے اور صوفی کے درمیان
بات بڑھے۔ آخر کار مغرب تک ہم عنایت منزل پہنچ گئے۔
”زوبی ڈار لنگ تم بناؤ ملا کو کیا انعام دیا جائے؟“
سیٹھ پھولے نہیں سارے تھے۔

”انھوں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔“ زوبی طنز پر
مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”غریب کا دل کیوں توڑتی ہو۔ اگر یہ آمادہ نہ ہو جاتا
تو ٹھیک وقت پر چادر کشید ہی چڑھ سکتی۔ یہ بھی مولویوں
کے خاندان سے ہے کچھ نہ کچھ برکت اس کے ہاتھ کی بھی شامل
ہوئی ہوگی۔“

”پھر لے ڈالئے دس سیں ہزار۔ یا چلئے ایک ارے
دیکھئے۔ بچائے پیدل پھرتے ہیں۔“

”کاروں کی اس کے لئے کیا کمی۔ اپنی گاڑیاں کس
میں۔ یہ تو بیوقوف ہے۔ میں اسے ایک سپورٹ امپورٹ
شاندار بندس کر اسکا ہوں۔ کیوں بر خور دار ہو تیار؟ آؤ
نے بڑی بے تکلفی سے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔
”ہر معاملے میں آپ بندس کیوں لے دوڑتے ہیں۔“
بولات۔ یہ خوشی کا تو قصہ ہے ضرورت ہے کہ نماز شکرانہ پڑھا
جائے۔“

”ارے ہاں بات تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میں ا
نوکر کے ہاتھ صوفی ہتھاب کو کہلا بھیجتا ہوں وہ میری طرف
پڑھ دیں گے۔ کیا سمجھتے ہو میں اپنے نماز روزے کی زکوٰۃ
انھیں کو دیتا ہوں۔ وہ اسے غریب تک پہنچا دیتے ہیں۔“
”بڑے بھلے آدمی ہیں۔ شاید انھوں نے آپ سے یہ
کہا ہو گا کہ حمزہ زریا صاحب کے بھی نماز روزے کی زکوٰۃ
انھی کو دی جائے۔“

”وہ نہ کہتے جب بھی میں دیتا۔ آخر مرنے کے بعد کی
تو کچھ منکر رکھنی ہی چاہیے۔ زوبی کے سلسلے میں انھوں نے
تھا کہ غور توں کی زکوٰۃ دگنی ہوتی ہے۔“

”ماشاء اللہ۔ اور دلیل یہ دی ہوگی کہ عورتوں کا
در اثنت میں چونکہ دھابہ اس لئے ان کے نماز روزے
زکوٰۃ دگنی کیسے نہ ہو۔“

”میاں ہم ان حجت نہیں کرتے جو دلیل و دلیل کی ضد
پڑے۔ کیا سمجھتے ہو وہ مدرسہ عرفان العلوم کے فارغ التحصیل
ہیں۔ ہر طرح کے مسائل سے پوری طرح واقف ہیں۔“

”کیا اور بیت شروع کر دی آپ لوگوں نے“ زوبی
ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آج کی شاندار کامیابی کی خوشی میں؟
کیوں نہ دیکھی جائے۔“

”ضرور ضرور“ سیٹھ بولے ”گھر دار لنگ تو بھی
ایک منگ میں شرکت کرنی ہے۔ تم ہو آؤ۔“
”میں اکیلی؟“

”واہ اکیلی کیوں۔ یہ جو ہے۔“ انھوں نے میری طرف
”نہیں جناب دالا۔ مجھے خود بعد عشاء ایک جلسہ

نہیں مل رہے ہیں۔ ان سے میری کاٹ کا تھان لے بغیر سیٹھ عنایت اللہ کو کیسے بتاؤں کہ میں کیا کر کے بٹھا ہوں۔ اللہ میری مدد فرمائے۔

درِ نجف

سونے کا بھاؤ کہاں سے کہاں پہنچا
سچے موتیوں کے دام کیا سے کیا ہو گئے

جرئی بوٹیوں کی تمبتوں میں کس قدر اضافہ ہو گیا

لیکن

سرورِ درِ نجف

اب بھی قدیمی نسخے کے عین مطابق تیار ہو رہا ہے

اسی لئے

اب سے تیس سال پہلے اس کے جو اثرات تھے

وہی آج بھی ہیں

بے شمار لوگ اس کے برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ایک تولہ آٹھ روپے۔ چھ ماشہ ساڑھے چار روپے (محبوب نڈاک
سارے تھیں روپے)

آپ بھی اپنی آنکھوں کی طرف سے غافل نہ ہوں

دار الفیض رحمانی۔ دیوبند (دیوبند)

کی صدارت کرنی ہے۔ میرا بیچ کھڑا تھا۔

”آپ بار بار ان سے میری توہین کرتے ہیں۔“ زوبی
منہ سبز کر لیتی۔ ان کے ساتھ تو میں قیامت تک نہیں جاؤں گی۔
”کیا مصیبت ہے۔ تم دونوں کس قدر لڑتے ہو۔“

اب کھانا کھایا گیا۔ میں کشمکش میں مبتلا تھا کہ اصل ماجرا
اسی وقت بیان کروں یا نہ کروں۔ کشمکش نہ ہوتی اگر حافظ
بچا ماتھان سمیت واپس آگئے ہوتے۔ تھان اور سو روپے
کا نوٹ میں سیٹھ کے آگے رکھ دیتا۔ اس صورت میں وہ
اور جو چاہے سوچتے مگر یہ نہ سوچتے کہ میری حرکت ناشائستہ
کا حوک مالی اتعاف رہا ہو گا۔ فی الحال وہ کبھی کبھ سوچ
سکتے تھے۔

”ہائیں ہائیں۔ یہ کیا کرتے ہو۔“ دفعتاً سیٹھ دہائے
زوبی زور سے ہنسی۔ میں کٹ کر رہ گیا۔ دراصل خیالات
کی غرقابی میں روٹی کا نوالہ میں نے شور بے کے بجائے پاس
رکھے ہوئے پانی کے گلاس میں ڈھولیا تھا۔
”میاں تم تو چڑیا گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو۔“
سیٹھ نے بھی زوبی کے تہقیر کا ساتھ دیا۔ ”آخر کس دنیا میں
کھوٹے ہوئے ہو۔“

”انھیں شاید آپ کی کامیابی سے صدمہ پہنچ رہا ہے۔“
زوبی نے مصرعہ لگایا۔

”کیوں بھئی؟“ سیٹھ نے مجھے گھورا۔
”مجھے اس وقت حافظ بچا کی یاد ستا رہی ہے۔ انھیں
کمٹورے شاہ کی قبر نے سمو چا نگل لیا تھا۔“
”لاحول ولا قوۃ۔ کس پودم کا ذکر کیا۔ چلو کھانا کھاؤ۔“
کھانے کے بعد میں نے رخصت چاہی۔

”واقعی جارہے ہو؟“ سیٹھ نے برا سامنے بنا کر پوچھا۔
”کیا کروں۔ میلاد کی صدارت کرنی ہے۔“
”جھوٹے۔ مکار دنیا بھر کے۔“ زوبی کڑوے لہجے میں

بولی۔

میں دم دبا کر نکل ہی آیا۔ نہ نکلتا تو بات بڑھتی۔
اب میں کئی دن سے حافظ بچا ما کو ڈھونڈ رہا ہوں یہ

بظاہر ایک کہانی
لیکن
فی الحقیقت سچائیوں کی ایک
مربوطہ لٹری
بے انتہا دلچسپ
معنی خیز
سبق آموز

ملازمین کا انٹرویو

کے
نکلیے قلم سے

الحاجی



ماہ اشاعت کا اعلان جلد
کیا جائے گا

مولانا علی میاں کے خامہ زرنگی سے
حیات عملی ایک ممتاز عالم دین اور خادمِ مذمت

کی ایک ایمان افروز سوانح - قیمت جلد ۱۳/۷۵

مکتوباتِ مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد رضا

ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا گنجینہ ہے جسے
ہیں۔ سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھیں

قیمت جلد اول - بندہ روپے

جلد دوم - اٹھارہ روپے

جلد سوم - بندہ روپے

احکام شریعی میں انہوں نے مولانا تقی امینی جی کا
حالاتِ زمانہ کی رعایت نام سے ظاہر ہے۔ بشریعت کے

تغیر پذیر حالتوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تمام موادِ اولوں سے
آراستہ - قیمت غیر جلد - ۸/۷۵

بدعت کیا ہے؟ بدعات کے رد میں چار اہل جواب
ذہن کو روشنی اور قلب کو نورانیت

دینے والے۔ قیمت جلد - ساڑھے چھ روپے۔

تفسیر تشیدی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے
بیس آیاتِ قرآنیہ کی قابل مطالعہ

تفسیر عارفانہ اور محققانہ - قیمت - ڈھائی روپے۔

انفاسِ علیی حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانی
تہذیبات سے تصوف و شریعت اخلاقی

اصلاحِ معاشرہ اور دیگر بشارت موضوعات پر دین و
دانش کی روشنی میں دلچسپ و درجہ پرور - قیمت ۲۵/۰۰

تجارتی سود تاریخی و فقہی نقطہ نظر سے جدید و قدیم
دونوں علوم

کی روشنی میں تجارتی سود پر گفتگو - زبان سلیس، اسلوب
تسکین دلائل قوی، موادِ محققانہ - قیمت - آٹھ روپے۔

دارج سلوک ڈاکٹر میر ولی الدین کی مفید کتاب -
موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مطالعہ

آپ کے لئے مفید ہو گا۔ قیمت - ساڑھے چھ روپے۔

وحدۃ الوجود اہل معرفت کے مشہور مسلک وحدۃ الوجود
پر محققانہ گفتگو - حضرت میر الدلف ثانی

کا بیان اور اس کے اسرار - جلد - ۳/۱۲

مکاتیب گیلانی مولانا مناظر حسن گیلانی کے قابل قرا
خطوط کا مجموعہ - معقول و منقول کا

خزانہ - قیمت جلد بلا شک - دس روپے۔

فضائل نماز شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب
کی مشہور کتاب - علمی طباعت کیساتھ

قیمت - ایک روپہ ۷۵

فتاویٰ عجیبہ مولانا عبدالحی کا مشہور و محجود
فتاویٰ ایک جلد میں ممکن نظر آتی

کے بعد - قیمت - بیس روپے۔

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ مولانا منظور نعمانی کی مقبول
کتاب - اس میں وہ عام

فہم زبان میں قرآنی مطالب بیان کرتے ہیں۔

قیمت - چھ روپے پچاس پیسے۔

آدابِ یاریت قبور شاہ اسماعیل سہید اور مولانا
محمد سلطان کے فرمودات

قیمت - ۶۵ پیسے۔

معارف سلیمان نمبر ۱ مولانا شہد سلیمان ندوی کے
تعارف پر نمبر بڑا شاندار ہے - قیمت - پانچ روپے

الحجج مولانا اشرف علی کے خلیفہ شاہ مسیح اللہ کا
نادار تصنیف - موضوع نام سے ظاہر ہے۔

قیمت - دو روپہ۔

دہر قسم کی کتابیں اس پتہ سے طلب فرمائیں

مکتبہ تجلی - دیوبند (دیوبند)

مناجات مقبول (دکیمی) عکسی مولانا شرف علی مدنی کی کتاب برائے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔

قیمت — چھ روپے۔ (مجلد سات روپے)
اسکھو کی اٹھنا مسلمان اس غلط خیال کا شکار ہیں کہ رسول اللہ بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل۔ فقہاء و مجتہدین کے مستند حوالے۔ قیمت مجلد — آٹھ روپے۔

رمضان کیا ہے؟ مولانا محمد عبداللہ دہلوی کے رشحاتِ قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوب سر کتاب۔ قیمت مجلد — تین روپے۔

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار راضی میں دین کی عہد سلف میں تبلیغ و تعلم کیلئے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ کی مسجدیں، راستے، بازار کہیں بھی ہوں مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا۔

انہی قاضی اظہر مبارک پوری۔ قیمت — ڈیڑھ روپے

التشوق تصوف کی معرفت میں مولانا شرف علی مدنی کی معروف کتاب۔ قیمت — سو گروپے۔

امت مسلمہ کی رہنمائی مولانا تقی الدینی کی ایک نرہ تصنیف انفرادی و اجتماعی حضرت عمر کی تعلیمات میں زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات دور رس حکمتوں سے بریز قیمت — دو روپے۔

سفر مصر و حجاز امیر شریعت مولانا مانت اللہ بہاری کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افرا سفر نامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے۔

آن اور تعمیر تیر تعلیمات قرآنی کا بخوبی تصوف اہل ادب صاحب کا دلکش مجموعہ

لتر میر ولی الدین کے قلم سے قیمت — ۷/۵
نذرہ ترجم قرآنی دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے۔ اس کی دقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ بہت عمدہ و معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت — چھ روپے۔
میتہ الطالبین (اردو) مصنفہ: شیخ عبدالقادر جیلانی۔ قیمت مجلد — تیس روپے۔

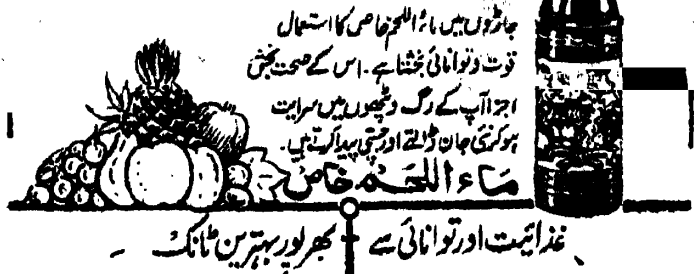
سیرت اسلام کے حیرت انگیز لمحات قاضی اظہر مبارک پوری کے ایک عالم و علم کی تحقیق کی روشنی۔ ساتھ ساتھ روپے
سلام اور ترقی لبریز ارشادات۔ قیمت — ۶۰ پیسے
لبرہ موصوف عبداللطیف نعمانی ملکہ ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا

عبداللطیف نعمانی شیخ الحدیث فقیر العلوم مئو۔
 ۱۳۵ھ کی دینی، علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندہ ریکارڈ اور اہل علم و رہنمایان ملک و ملت کے اچھے عقیدت۔ قیمت — پانچ روپے۔

سیر الفخری تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اردو فارسی اور فرنگی نوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو بہ حاضر ہے۔ قیمت — ۱۳/۵

وہاب خواجہ معصوم سرہندی اعارف و اسرار ہدایات و نصائح اور تدریسی لکچر سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ بہترین چیز۔ قیمت — چھ روپے۔

صحت کا توازن ...



غذائیت اور توانائی سے بھرپور بہترین ٹانگ



... مسکن ...

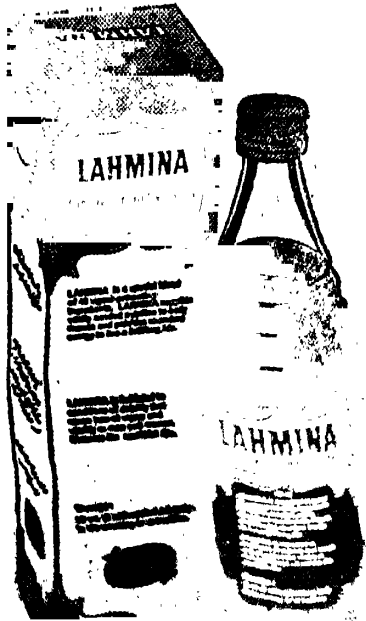
سرور و خوشی چاہنے والوں کے لیے



مردوں اور عورتوں کے لیے ایک نئی قوت
جو کمزوری اور اس کے اسباب و علاج پر ہزاروں کی
تحقیقات اور تجربات کا نچوڑ ہے۔
لحمینہ میں توانائی اور تھکے سے بھرپور چائیس ہوا شامل ہیں،
جو انسانی جسم اور اس کے اعضا کو بہت اور طاقت دہلاتے ہیں
آپ بھی آج کھا لیں۔



جسمانی قوتوں کی بیداری کے لیے



Monthly

TAJALLY

DEOBAND, U.P.

تجلی

REGD. NO. 1072

DURR-E-NAJAF

Surma

سچے موتی

سونے چاندی کے ورق

اور ۲۶ دواؤں کا یہ مرہب

طب قدیم کے ایک

نادر نسخے سے قدیم ہی

طرز پر تیار کیا جاتا ہے۔

د آنکھوں کی تمام بیماریاں

میں مفید۔

د نگاہ کو قوت آد

پائنداری دینے والا۔

آنکھوں کی

حفاظت، شادابی اور نکھار

کے لیے

ایک تولہ
7/-

ڈاک خرچ
2-50

بچھ ماشہ
4/-

گنتا باکل نہیں ہے
بکارتھنک اور سکون
پیدا کرتا ہے

کوئی بھی بینائی پریشان ہو اسے اس کے لیے نہنگی پٹا

دائر الفیض حیات
دوبند ۴۰

سپر حضرات
قواعد انجمنی
طلب فرمائیں

ہماری تمام جتنی
سلانی ۱۵ پیسے

